موقع لا ہے لیکن وہ سوچتے ہیں کہ انھوں نے اپنا کام کر دیا ہے اب آیندہ پود کا کام ہے کہ وہ اُن کے کام کو آگے بڑھائے۔ اس آیندہ پود میں وہ ہمیں بھی شامل کرتے ہیں لیکن ہم خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتے۔ ہر کارے و ہر مردے آج کل کی مصروف زندگی میں ظاہر ہے ایک آدمی ایک ہی موضوع پر ڈھنگ کا کام کر سکتا ہے۔ اگر ہر طرف ہاتھ پانو مارے گا تو پھر اُس کے کام کی حیثیت و وقعت معلوم!

ہیں ہم نے حق رسی کی کوشش کی ہے اور بس۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ اپنے وقت اور پیسے کی بربادی سے ہم نے ادب کی کوئی بہت بڑی خدمت کی ہے لیکن اگر تلاشِ حق اور حق رسی کی کوئی اہمیت ہے تو ہم نے یقیناً خدمت کی ہے۔ ہمیں بخوبی علم ہے کہ ہماری اس خامہ فرسائی سے تاریخ ادب کے مفروضات، جواب مسلمات کا درجہ اختیار کر چکے ہیں، آسانی سے بدلنے والے نہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ سرے سے اغلاط کی نشاندہی کی کوشش ہی نہ کی جائے۔ ہمارا دور سہل انگار ہے۔ ہمارے اساتذہ، پچاس برس پہلے جو کتابوں میں لکھا گیا تھا، اُس سے انحراف کرنا گوارا نہیں کرتے۔ اس کے لیے پڑھنا پڑتا ہے، محنت کرنا پڑتی ہے، اپنے ذہن کو زحمت دینا پڑتی ہے، اور یہ ہمارے دور کا وطیرہ نہیں۔ اس کے باوجود ہمیں تلاش و تحقیق پر یقین ہے۔ ہم آزاد کو ذوق کا آلیند ماننے کو تیار نہیں خواہ کوئی اس پر کتنا ہی بضد ہو۔ ممکن ہے بیشتر لوگوں کے لیے اس بات کی کوئی اہمیت نہ ہو۔ یہ اُن کے لیے بہت معمولی بات ہو سکتی ہے لیکن تاریخ ادب کی معمولی سے معمولی غلطی کی اصلاح بھی ہمارے نزدیک، بلکہ ہر محقق کے نزدیک، یقیناً اہم ہے۔

محققوں کی طرح ہمارے ناقد بھی سہل انگار واقع ہوئے ہیں۔ یہ مزاجِ وقت ہے۔ اس کے باوجود ذوق پر اب تک لکھی گئی تنقید، ان صفحات میں پیش کیے گئے حقائق کی روشنی میں نظرِ ثانی کی محتاج ہے۔ اگر ہمارے ناقدین نے نفس تین قصیدے پڑھ کر ذوق کی قصیدہ نگاری پر رائے دی ہے یا مفروضات بنائے ہیں تو پھر اب وہ از مرنو ذوق کے سارے قصائد کو پڑھ کر ان کے بارے میں صحیح رائے دینے کی کوشش کریں گے۔ ذوق کی غزل گوئی پر بھی از سرنو تنقید کی ضرورت ہے۔ اور یہ تب تک ممکن نہیں جب تک ان کے کلام کو تمام تر تحریفوں سے پاک نہ کر لیا جائے۔ کچھ تحریفوں کی نشاندہی پروفیسر شیرانی نے کی تھی۔ کچھ پر عطا کاکوی نے قلم اٹھایا تھا۔ چند ایک کا ذکر اِن صفحات میں بھی آگیا ہے۔ تاہم اس کا حق جبھی ادا ہوگا جب کلام ذوق کو تدوین متن کے اُصولوں کے تحت مُرتب کیا جائے گا۔ ابھی تو ایسا ہوتا نظر نہیں آتا، اس لیے کہ اب مذاق شعر بدل گیا ہے۔ کلام ذوق کی اہمیت کم ہوگئی ہے۔ نصابوں سے بھی رفتہ رفتہ انھیں بے دخل کیا جارہا ہے۔ اس کے باوجود قدما کے کلام کی تدوین بے حد ضروری ہے۔ ہم آج بھی ادب کی مستند اور تنقیدی تاریخ سے محروم ہیں۔ تاریخ تب تک مُرتب نہیں ہو سکتی جب تک قدیم متون صحیح صورت میں مرتب ہو کر عام نہ ہو جائیں۔ موجودہ دور میں استاد محترم ڈاکٹر تنویر علوی نے کلیات ذوق کو مرتب کیا ہے۔ موصوف اُصولِ تدوین سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ اس موضوع پر ایک بسوط کتاب کے مصنف بھی ہیں۔ لیکن خدا جانے کیوں کلام ذوق کی تدوین میں وہ اِن اُصولوں پر پوری طرح عمل نہیں کر سکے۔ انھوں نے بھی عقیدت مندوں کی طرح سارا کلام یکجا کر دینا چاہا ہے جو ذوق کے نام سے منسوب ہے۔ کلیات کے بسوط مقدمے میں کئی نکتے اٹھانے کے باوجود انھوں نے دستیاب کلام پر گہری تنقیدی نظر ڈالنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ ہمیں وقتاً فوقتاً زبانی بھی اور بہ ذریعہ مراسلت بھی۔ اس سلسلے میں اُن سے گفت گو اور استفادے کا

چہچہے گلشن میں فصلِ گل تھی جہاں ... بلبلیں جوں ترانہ سنج ہزار

گر نہ ہو خط میں بے قراری دل ... نامہ بر ہو کبوترِ بسمل

مضطرب اب جو ہو رہا دل ہے ... دل ہے یا مرغِ نیم بسمل ہے

دل کی واشد کی کیا کروں تدبیر ... غنچۂ دل ہے غنچۂ تصویر

اب ہو یک لخت دل کہ ہو صد لخت ... تھی یہ تقدیر سنگ آمد و سخت

برق کا وہ ذرا چمک جانا ... اور بغل میں ترا دبک جانا

نسخۂ آزاد کا جائزہ ختم ہوا۔ اس میں نسخۂ ویران سے تقریباً دوگنا کلام ہے۔ دس بارہ اشعار، جن کے لیے ہم یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے، کے علاوہ باقی سب آزاد کا اضافہ ہے۔ اور اس میں اکثر و بیشتر اشعار غلط، مہمل یا بے ربط ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ذوق غلطی نہیں کرتے یا ان سے غلطی نہیں ہو سکتی۔ ان کے ہاں سُست بندشیں بھی ہیں اور کہیں کہیں مبہم اشعار بھی لیکن وہ مہمل گو نہیں ہیں اور نہ ہی اتنے عاجز بیان ہیں کہ کہنا کچھ چاہیں اور بندہ کچھ جائے۔ ان کا سارا کمال زبان میں ہے اور ان کے ہاں زبان و محاورے کی ایسی فاحش غلطیاں نہیں ملتیں جو آزاد نے ان سے منسوب کر دی ہیں۔ اگر ترمیموں اور تحریفوں کو دیکھا جائے، تو پھر سارا دیوان مجروح نظر آتا ہے۔ سوائے دو کے، کوئی غزل ایسی نہیں جو ان کی اصلاح سے مجروح نہ ہوئی ہو۔ اشعار کو مہمل بنانے میں، آزاد کو ملکہ حاصل ہے، وہ ایک آدھ لفظ کی ترمیم سے اچھے بھلے شعر کو ناقابلِ فہم بنا دیتے ہیں۔ اس کے دو سبب ہیں: ایک ذوق کو بلند پرواز اور خلاق دکھانے کی خواہش، دوسرے جنون کا اثر ورنہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جو شخص محض چند فقروں میں بڑے سے بڑے شاعر کی خصوصیاتِ کلام کا نچوڑ پیش کرنے اور اس پر بہترین تنقید کی صلاحیت رکھتا ہو، جب ذوق کے کلام میں اضافہ کرنے بیٹھے تو ایسا مہمل گو بلکہ لغو گو ہو جائے۔ چشمِ امتیاز کی یہ کمی یقیناً جنون کا اثر ہے، جس میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ تحریر خاتمہ میں انھوں نے خود کہا ہے کہ میں نے جو کچھ کیا نیک نیتی سے کیا اس لیے ان کی نیت میں شک کرنا کفر ہے۔ لیکن نیک نیتی کے باوجود ان کی کوششوں سے ذوق کے کلام کو بہت نقصان پہنچا اور اس کی تلافی اب تک نہیں ہو سکی اور شاید آیندہ بھی نہ ہو سکے۔ باب تحقیق سے دیدہ ریزی اور دیانت داری کی روایت ختم ہو رہی ہے۔ آج کے محاورے میں اسے گورکنی، نقطہ شماری اور حماقت کہا جاتا ہے۔ نو واردانِ میدانِ تحقیق محض ڈگریوں کے لالچ میں ادھر آ نکلتے ہیں۔ انھیں تحقیق سے غرض ہے اور نہ وہ اس کی اہمیت اور مفہوم ہی کو سمجھتے ہیں۔ آزاد کی تحقیق پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جس میں ہر طرح کی افراط و تفریط ملتی ہے۔ ہمیں خدا نخواستہ آزاد مرحوم سے نہ کوئی عناد ہے نہ دشمنی۔ آزاد شکنی بھی ہمارا مقصد نہیں۔ ہمارا مقصد صرف تلاشِ حق ہے جو تحقیق کا صحیح مفہوم ہے، جھوٹ خواہ کتنی ہی خوبصورتی سے بولا گیا ہو، ہمیں راس نہیں آتا۔ آج کے محاورے میں آپ اسے الرجی کہہ لیجیے۔ چناں چہ ان صفحات

کس کی تاریخ؛

سبزہ رنگاں کہ بباغ حسنند | تازہ چوں شاخ گل لالہ وورد
(ورد اور گل دونوں ایک ہیں)

از کمر تا دہن شاں موہوم | چوں خط جوہری وجوہر فرد
(؟ کمر سے دہن تک کا دھڑ غائب ہے، باقی کیا بچا؟)

چشم دارند بقتل عشاق | چوں حریفے کہ کند قصد نبرد [؟]
بجمال رخ آنہا معروف | مدتے شد کہ دلش خوش میکرد [؟اور نثر]
رفت صیت سخنش از دہلی | تا صفاہان و عراق و ما درد
واندراں حال تنہا می گفت | ہمہ چوں نالۂ موزوں پُر درد
صد ویک مطلع رنگیں آخر | گفت با نالۂ گرم و دم سرد
شد چو تسبیح زمرد نامش | رونق و آب دگہر رفت بگرد [کذا]
گرد فیروزہ وخوں شد دل لعل | کہربا چوں یرقانی شدہ زرد
پیش آں گنج گہر نیست چو خاک | گنج خسرو کہ بود باد آورد
ذوق چوں خواست دو تاریخش را | اندریں دفتر معنی بدو فرد
اول از دائرۂ خوش رنگ شمار | کرد وآں عقدۂ مطلب واکرد
باز با خامۂ رنگیں بنوشت | طرفہ تسبیح زمرد آورد

"قطعۂ تاریخ تعمیر چاہ معمرہ محمد شاہ سہارنپوری"

سید باصفا محمد شاہ | کرد تعمیر طرفہ مسجد و چاہ
ذوق تاریخ سال ہر دو بہم | زد رقم ساخت کعبہ وزمزم

یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ تاریخ ذوق نے کہی تھی۔ یہیں کہیں اور نہیں ملی۔

مثنوی

نسخۂ ویران میں اشعار "متفرقات مثنوی" کے عنوان سے ۲ شعر درج کیے گئے ہیں۔ آزاد نے اس پر ایک طویل افسانوی نوٹ لکھ کر شائع کیا ہے جس پر پیچھے مفصل بحث ہو چکی ہے۔ یہاں وہ آٹھ شعر درج کیے جاتے ہیں جو آزاد نے کہے ہیں؛

نمک افشاں ہے عشق شور انگیز | زخم دل کرتے ہیں بریز بریز
عکس ہے سبزۂ لب جو کا | وسمہ قوس قزح کے ابرو کا

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ　　　کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

ذوق کی پوری رباعی مربوط و بامعنی ہے۔ دوسری بیت کتنی مکمل کتنی برجستہ ہے: ممکن نہیں ہو ترک کسی سے

ممکن نہیں ہو ترک کسی سے دنیا　　　جب تک نہ کرے آپ اسے دنیا ترک

آزاد کے مصنفہ قطعہ کا دوسرا مصرع نہ صرف بے تکا اور بے ربط ہے بلکہ چوتھا مصرع بھی خیال کو پوری طرح ادا نہیں کرتا۔ کہنا تو یہ تھا کہ تو دنیا کو نہیں چھوڑ سکتا جب تک کہ یہ خود تجھے نہ چھوڑ دے، لیکن کہا:

" یہ پیرہ زال گر تجھے چاہے تو چھوڑ دے" ؛ محض "پیرہ زال" کے لیے آزاد نے پیری میں یہ جعل کیا اور رباعی کو قطعہ میں بدلنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ جیسے اور بے شمار اضافے کیے تھے یہ قطعہ بھی شامل دیوان کر لیتے۔ مولفین دیوان سابق کو تتمہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

مندرجہ ذیل قطعہ، چوتھے مصرعے کی برجستگی کے باوجود ذوق سے تب تک منسوب نہیں کیا جاسکتا جب تک اس کا کوئی ٹھوس ثبوت نہ ہو۔ پہلا شعر محض خانہ پری لگتا ہے۔ یہ قطعہ ویران میں بھی موجود نہیں ہے

تندرویں نفس کس کو دنیا دار　　　واہ کیا تیری کارسازی ہے

سچ کہا ہے کسی نے یہ اے ذوق　　　مال موذی نصیب غازی ہے

اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اہل نفس، غازی ہیں۔

مندرجہ ذیل قطعہ میں صرف املا کا غلط صرف اسے ذوق سے منسوب کرنے میں مانع آتا ہے

دل سے میں اپنے رسول عربی کا ہوں غلام　　　دل کھو جان کھو جائیں ہیں اس بات کو سب [؟]

میں حضوری میں رہوں اس کی نہ کس طرح مدام　　　ہے یہ مشہور مثل مال عرب پیش عرب

"ایک دوست کا چند اشخاص سے کچھ تنازع تھا استاد کے مزاج میں سلامت روی اور صلح جوئی بہت تھی۔ دوست کو مجبور کر کے صلح کروادی۔ اور اس قطعہ سے اس کی بھی دلجوئی فرمائی۔ گویا اس کی زبانی کہتے ہیں:

ناصحا مجھ کو ملامت تو نہ کر　　　کس طرح میں عشق سے بے زار ہوں

بسکہ مجھ کو عشق بازی کا ہے شوق　　　کیا کروں میں ذوق سے ناچار ہوں

استاد کی طبیعت میں یقیناً صلح جوئی بہت ہوگی لیکن اس قطعہ سے کسی کی دلجوئی نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی تنازعہ نمٹتا ہے بلکہ آخری شعر تو مبتذل لگتا ہے۔

"اشعار در تاریخ دیوان نواب الٰہی بخش خاں معروف"

یہ عنوان ہے "تسبیح زمرد" کی تاریخ کا۔ اس پر شروع میں خاصی بحث ہو چکی ہے۔ دو شعر بھی نقل کیے گئے تھے۔ البتہ یہاں پورا قطعہ درج کیا جاتا ہے تاکہ قارئین کرام خود اندازہ کر لیں کہ یہ کس کا کلام ہے اور

ہم پیرو عشق و عشق اپنا ہادی   جو عشق کہے ذوق کہو سلّمنا

عقل کو وحشی رم دیدہ - کہنا عجیب ہے -

کھلتا نہیں ذوق یہ ہم پر مضموں   ہر شخص جو مذہب کا ہے اپنے مفتوں
کہیے کسے حق پہ اور باطل پہ کسے   بکل حزب . بمالدیھم فرحون

اپنے مذہب کا مفتون ہونے میں کوئی الجھن والی بات نہیں ۔

۹ - آخری رباعی ہے :

اے زاہد و تم سے کیا جھگڑا کرلوں میں   غصہ سے کروں کس لیے دل کو خوں میں
میخوار و صنم پرست کہتے ہو مجھے   تم ہو تم ہو۔ جو کچھ کہو ہوں میں ہوں میں

بادنیٰ تغیر یہ رباعی سکندر کی ہے ۔

دیوان میں جو تین مزید رباعیاں ہیں وہ آزاد کے آخر میں بھی موجود ہیں بلکہ ان میں ایک قطعے کو بھی رباعیوں کے ذیل میں درج کر دیا ہے ۔

قطعات

دیوان میں ذوق کی ایک رباعی ہے :

اے ذوق کرے گا کوئی دنیا کیا ترک   دنیا ہے بری بلا ارے کیا ترک
ممکن نہیں ترک ہو کسی سے دنیا   جب تک نہ کرے آپ ہی دنیا ترک

آزاد نے حاشیے میں یہ رباعی درج کی ہے لیکن متن میں ایک قطعہ درج کیا ہے اور اس پر یہ نوٹ لکھا ہے :

رباعی مرقومہ حاشیہ میں نے ایک دن استاد مرحوم کے سامنے پڑھی اور کہا کہ حضرت اس میں وہ گرمی اور تیزی اور صفائی نہیں جو آپ کی زبان کا جوہر ہے ۔ فرمایا کاٹ دو۔ میں نے کہا مضمون تو بہت خوب ہے ۔ فرمایا رباعی کی بحر میں تو یہی ہوگا ۔ اچھا قطعہ کر دیتے ہیں :

دنیا سے ذوق رشتۂ الفت کو توڑ دے   جس سر کا ہے یہ بال اسی سر میں جوڑ دے
پر ذوق تو نہ چھوڑے گا اس پیرہ زال کو   یہ پیرہ زال گر تجھے چاہے تو چھوڑ دے

اور حاشیے میں لکھا : " رباعی مرقومہ ذیل دیوان مروّج مطبوع میں مولفوں کی بے خبری سے درج ہو گئی تھی۔ الحمدللہ کو جو اس میں اصلاح ہوئی ۔ بندہ آزاد کو یاد تھی ایسی اصلاحیں ان کی ہمیشہ جاری تھیں ۔

یقیناً جاری ہوں گی ورنہ سارا کلام نہل کیسے ہو جاتا ۔ آزاد نے غزلیات میں سوائے دو غزلوں کے کسی کو بے داغ نہیں چھوڑا ۔ اور تقریباً ہر جگہ شعر نہل ہو گیا ہے ۔ مُردوں پر تہمت رکھنا کچھ اچھی بات نہیں لیکن آزاد کو اس سے کیا غرض ۔ غالب نے یہ شعر غالباً انھیں کے لیے کہا تھا :

اضافے

مُتفرّقات

رباعیات قطعات وغیرہ

ذیل میں پہلے وہ رباعیات پیش کی جاتی ہیں جن کا انتساب ذوق سے مشکوک ہے:

جن دانتوں سے ہنستے تھے ہمیشہ کھل کھل اب درد سے ہیں وہی رُلاتے ہل ہل
پیری میں کہاں اب وہ جوانی کے مزے اے ذوق بڑھاپے سے ہے دانتا کل کل

ذوق کے سوانح میں آزاد نے کہیں اُن کے دانتوں کے ہلنے یا تکلیف کا ذکر نہیں کیا۔ البتہ خود آزاد کے بڑھاپے میں ہل گئے تھے اور تکلیف بھی رہتی تھی (ملاحظہ ہو ناصر نذیر فراق سے جلیبوں والا واقعہ) یہ انھوں نے اپنی 'دانتا کل کل' کا بیان کیا ہے۔

۲۔ دل جن کا ہے آہن کی طرح سخت وسیاہ وہ لطف سخن سے نہیں ہوتے آگاہ
بد اصل کو کیا نام خدا کوئی بتائے بندوق کا طوطا نہ کہے حق اللہ

کلیات میں ڈاکٹر علوی نے اس رباعی کا ماخذ نسخہ ویران کو بتایا ہے لیکن یہ ویران میں نہیں ہے۔ دوسرا اور تیسرا مصرع ہمیں مشکوک کرتا ہے۔ لہٰذا جب تک کسی مستند ماخذ میں نہ ملے ذوق سے اس کا انتساب مناسب نہیں۔

اس جہل کا ہے ذوق ٹھکانا کچھ بھی دانش نے کیا نہ دل کو دانا کچھ بھی
ہم جانتے تھے علم سے کچھ جانیں گے جانا تو یہ جانا کہ نہ جانا کچھ بھی

ڈاکٹر علوی نے اسے بھی بحوالہ ویران شامل کلیات کیا ہے۔ ویران میں یہ بھی موجود نہیں۔ اگرچہ یہ رباعی بہت مشہور ہے لیکن شہرت ذوق سے انتساب کا جواز نہیں ہو سکتی۔ بغیر ثبوت کے اسے بھی مولانا آزاد کے کھاتے میں ڈالنا پڑے گا۔

ذیل کی دونوں رباعیوں پر انشا کا اثر صاف دیکھا جا سکتا ہے۔ ہمیں یہ کہیں اور نہیں ملیں۔ لہٰذا انھیں آزاد ہی کی تصنیف کہنا پڑے گا۔

مشکل ہے یہاں پلئے خرد کا جمنا اس وحشی رم دیدہ کو کیسا رمنا

۱۶۱۔ ایک دن فرمایا کہ ہمارا عالم شباب تھا۔ ایک بزرگ کہن سال نے کسی پرانے شاعر کا مطلع سنایا۔

آبلے دکھلائے جب اس دل رنجور نے — دانتوں میں تنکا لیا خوشۂ انگور نے

ہمارے چشمۂ طبع میں لہر آئی اور اسی وقت یہ مطلع ہوا ؎

اشک کے دانے جو مژگاں پر اکٹھے ہو گئے — خوشۂ انگور کے بھی دانت کھٹے ہو گئے

اس زمانے کے لوگ بڑے باانصاف ہوتے تھے۔ سنکر بہت تعریف کی۔"

افسانہ بھی غلط اور مطلع بھی مشکوک۔

نسخۂ آزاد میں متفرقات یا ختم ہوئے۔ اسی کے ساتھ غزلوں کا بیان ختم ہوا۔ اب آخر میں رباعیات، قطعات وغیرہ متفرقات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

۱۴۸۔ مطلع :

نہیں ہچکی یہ ہچکی شام سے اک دم ٹھہرتی ہے / ترے بیمارِ غم کو موت شاید یاد کرتی ہے

کلیات میں اسے "مسودہ" کے حوالے سے درج کیا گیا ہے اور اس میں دونوں مصرعے مؤخر و مقدم ہیں۔

۱۴۹۔ مطلع :

ناخن سے منقار کی میرے داغِ جنوں کو زاغ کھائے / عشق یہ تیری فطرت ہے تو سر سہلائے بھیجا کھائے

۱۵۱۔ مطلع :

پھر بہار آئی کفِ ہر شاخ پر پیمانہ ہے / ہر روش پر جلوۂ بادِ صبا مستانہ ہے

کلیات میں اسے بیاض کے حوالے سے درج کیا گیا ہے لیکن یہ مطلع ناسخ کا ہے۔

۱۵۶۔ مطلع :

لال کتاب اپنی اب بادۂ لالہ رنگ ہے / میکدہ اپنے واسطے مدرسۂ فرنگ ہے [؟]

۱۶۵۔ مطلع :

کترے پر رکھنے میں صیاد یہ اغماض کہ ہائے / ملتی اس پر کفِ افسوس ہی مقراض کہ ہائے [؟]

۱۶۶۔ مطلع :

وحشت اگر تنگ دکھا ہووے گی داغ سے / زنجیر گھر کے ڈالیں گے دودِ چراغ سے

۱۶۸۔ مطلع :

دکھانے کو نہیں ہم مضطرب حالت ہی ایسی ہے / مثل ہے رو رہے ہو کیوں کہا صورت ہی ایسی ہے

مثل "روتے کیوں ہو صورت ہی ایسی ہے" کہ جس طرح آزاد نے باندھی ہے۔

۱۶۹۔ مطلع :

پہلے بتوں کے عشق میں ایمان پر بنی / پھر ایسی آ بنی کہ مری جان پر بنی

۱۷۰۔ مطلع :

جو ترے ناخن پا تیرا مائل دھو کے پی جاوے / تو اس کے دست و پا پھر ماہِ کامل دھو کے پی جاوے

۱۷۱۔ مطلع :

جس طرح ماہ سارے ستاروں میں ایک ہے / یوں میرا مہ جبیں بھی ہزاروں میں ایک ہے

ساری دنیا میں ایک ہوتا، کروڑوں میں ایک ہوتا، ہزاروں میں ایک سے پہلے مصرعے کو کیا مناسبت؟

۱۷۲۔ شعر :

آپ آتا ہے عیادت کو نہ تو آتی ہے / تیری خاطر سے اجل تجھ سے فراموش ہوئے [؟]

[یہ ادنیٰ تغیر یہ شعر پہلے بھی آ چکا ہے]

۱۱۰۔ آزاد ، ۲۔ کام لیجے گا کہیں اور ہی دانائی سے

کیوں کر عینک کو نہ آنکھوں سے لگاؤں لے دل — ناصحو جاؤ نہ لپٹو کسی سودائی سے

ذوق کے کسی مصدقہ شعر میں زبان کی یہ قدامت نہیں ملتی۔ البتہ پیچھے ایک شعر نقل ہو چکا ہے جس میں

آزاد نے تحریف کر کے "چار آنکھیں ہوئیں تجھ قوتِ بینائی سے [؟]

ہو بحث وا تروں سے " بنا دیا تھا۔

۱۱۵۔ آزاد ، ۲۔ دیوان میں اس سے پہلے وہی دو شعر ہیں جن کے لیے ورآن سے " پاؤں تلے کی زمین نکل جائے"

کا محاورہ باندھنے کا استفسار کروایا گیا ہے معلوم ہوتا ہے۔ آزاد کو ع زمین کیا ہے فلک پاؤں کے نیچے سے نکل جائے

کے غلط ہونے کا احساس ہو گیا تھا لہٰذا انھوں نے اسے دوبارہ باندھ دیا

جو دل سے اپنے دمِ آتشیں نکل جائے — فلک کے پاؤں تلے سے زمین نکل جائے

[پاؤں تلے سے زمین نکل جائے، تو ہے لیکن فلک کے، اور یہ بھی غلط ہے]

۱۱۷۔ آزاد ، مطلع :

تم نے سیم تنوں کے کیا ہے ناک میں دم — الٰہی تن سے مرا دم کہیں نکل جائے [؟]

۱۲۵۔ آزاد ، مطلع :

پیش آ اکرام سے ساری کرامت ہے یہی — عادتِ بد ترک کر تو خرقِ عادت ہے یہی

۱۲۸۔ آزاد ، مطلع :

جسے ہم چاہتے ہیں وہ بتِ گمراہ بھی چاہے — ہمارے دل نے تو چاہا مگر اللہ بھی چاہے

ڈاکٹر علوی نے یہ مطلع کلیات میں شامل نہیں کیا۔

۱۴۰۔ آزاد ، مطلع :

جنوں کے دستِ مبارک ہیں پیرہن کو لگے — رہا بھی تار نہ باقی کہ جو کفن کو لگے

۱۴۱۔ مطلع :

رازِ درونِ خم سے کسے اس پردے میں آگاہی ہے — یوں تو ہر اک زعم میں اپنے افلاطونِ الٰہی ہے [کذا]

۱۴۶۔ یہ شعر عمدہ میں موجود ہے۔

وہ لعلِ شیریں کسی کے دل کی الٰہی کیا ہو گیا دوا ہے — کہ میٹھا میٹھا سا درد کل سے مرے کلیجہ میں ہو گیا ہے

۱۴۷۔ " مطلع :

کوئی جو اس کو پڑھ کر عاشق کا خط سنائے — اک حرفِ مدعا پر سو بے نقط سنائے

لاشے کے ساتھ بھی نہ مری قبر تک چلے — ہوتے ہی اذنِ عام کے گھر کو کھسک چلے

ہیں اِس میں ذوق کے اِس مصرعے کا عکس نظر آتا ہے ع

جب کہ اذنِ عام میرے اقربا کہنے کو ہیں

بے دردِ دل اگر نہیں ہمدرد میرے پاس — دلسوز اگر کوئی نہیں سوزِ جگر تو ہے (؟)

[غم خوار اور رفیق کے معنی میں دلسوز کا یہ نیا استعمال ہے]

اُس بت سے غائبانہ کہا یا نہیں کہا — چپ ہوگیا وہ بارے مجھے دیکھ کر تو ہے (؟)

ت۔ دیوان ۲، ۹۶؛ آزاد ۲۔ دیوان میں "قطعۂ خاتمہ" کے عنوان سے یہ دو شعر کا قطعہ ہے۔ آزاد نے تین شعر شائع کیے ہیں اور اپنا شعر دونوں شعروں کے درمیان رکھا ہے۔ اس طرح قطعہ برقرار نہیں رہا۔ وہ شعر یہ ہے

خوں کے دریا بہ گئے عالم تہ و بالا ہوئے — اے سکندر کس لیے! دو گز زمیں کے واسطے

کلیات میں ڈاکٹر تنویر علوی نے دس شعر کی غزل درج کی ہے اور ماخذ اس کا بیاض کو بتایا ہے قطعے کے پہلے شعر کو بجائے مطلع اور دوسرے شعر کو مقطع کی جگہ لکھا ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب آزاد نے بیاض میں دس شعر لکھے تھے تو پھر انھیں شاملِ دیوان کیوں نہیں کیا؟ اس کے علاوہ مندرجہ بالا شعر جو دیوان میں شامل کیا ہے آسے بیاض میں بھی درج نہیں کیا گیا۔ گویا یہ ترتیبِ دیوان کے وقت کہا گیا۔

اب نسخۂ آزاد میں متفرقات یا نئے اضافوں کو دیکھ لیا جائے۔ ان کا کوئی شعر کہیں اور نہیں ملتا۔

۹۷۔ آزاد، ۳۔ ایک ن؛ مطلع :

سوزشِ دل سے مرے نالے جو شرر بار ہوئے — مُدّعی جل گئے اچھا ہوا فی النار ہوئے

آزاد فیصلہ نہیں کر پائے چناں چہ حاشیے میں "ن" موجود ہے :

نالۂ دل مرے سو بار شرر بار ہوئے — پر جو سرگرم شرارت تھے وہ فی النار ہوئے

باقی دو شعر یہ ہیں :

گر مرے اُڑ جائیں قفس کے تو اڑیں گے نہ کبھی — ہم ہیں صیاد کی اُلفت میں گرفتار ہوئے

چمن دل سے ہوئے گر نہ گلِ لختِ جگر — وہ اگر خشک ہوئے اور ہرے چار ہوئے (؟)

۹۸۔ آزاد، ۳۔ "اِک لمبی سی غزل تھی تین شعر یاد رہ گئے"۔

چھپا کے پھولوں میں منہ صبا سے جو مسکرائے سحر کلی ہے — تبسم اس گل کا یاد کر کے عجیب ہوئی دل کو بے کلی ہے

تپش دکھائی جو میں نے دل کی تو لوٹا پروانہ داغ کھا کر — دکھایا تم نے جو رو کے روشن تو شمع محفل میں کیا جلی ہے

بنا و للہ چوبِ صندل سے میرا تابوت لے عزیزو — کہ قتل مجھ کو کیا کسی نے دکھا کے رنگ اپنا صندلی ہے

۱۰۶۔ آزاد، ۲۔ مطلع :

یاں لگ چکے سب دین و دل و جان ٹھکانے — اب تک نہیں کافر ترا ایمان ٹھکانے

یہ ذوق کے اِس مطلعے کا چربا ہے :

اگرچہ لے چکا ہے تو دل و دیں اِک زمانے سے — نہیں اِس پر بھی کافر ترا ایماں ٹھکانے سے

(۲) کیا جانے خبر لایا ہے کیا واں سے کہ قاصد — آتے نہیں تیرے نظر اوسان ٹھکانے

ملنا ہمارا اُن کا تو کب جائے جائے ہے / البتہ آدمی ۔ سو کبھی آئے جائے ہے [؟]

جو اس گلی میں شل جبا آئے جائے ہے / فردوس میں کب اس کو تمنائے جائے ہے [؟]

ابر رقرہ برس کے اگر کھل گیا تو کیا / نالہ تو وہ ہی آگ سی برسائے جائے ہے [؟]

نسخۂ ویران میں "ردیف یا" کی غزلیں اور متفرقات ختم ہوئے البتہ کچھ اشعار تتمے میں بھی ہیں پہلے ان کا ذکر اور پھر آزاد کے متفرقات پیش کیے جائیں گے.

ویران ت ۔ ۱۷ : ۹۰ آزاد ۔ ۱۲ : مطلع :

کرے ہے کام تیغ یار کس کس بیدلی سے / دکھاتی اپنی گلکاری ہے کیا کیا زخم کاری سے

اضافہ شدہ شعر یہ ہے:

رواں ہے شمع کے اشکوں میں چربی تک گھل گھل کر / بہا جاتا ہے دل خوں ہو کے اپنا اشک باری سے [؟]

ویران ت ۰ ۳۰ : ۵۹ آزاد ۰ ۷ : مطلع :

ستمگر تو نے روکا سب کو میرے پاس آنے سے / اجل بھی گر کبھی آئے تو شاید کچھ بہانے سے [؟]

اس میں ۴ شعر کا اضافہ ہوا ہے:

ڈھلیں گے شمع کے سانچے میں کدرے سر پہ جو گذرے / بہیں گے ان کے آگے آنسوؤں میں اس بہانے سے [؟]

تمہاری زلف کے کوچوں میں پھرتا ہے وہ دیوانہ / پتہ لینا ہو گر دل کا تو لینا اپنے شانے سے [؟]

کہاں جاؤں گا اُڑ کر جائے بے بال و پر ہوں میں / قفس صیاد کا بہتر ہے مجھ کو آشیانے سے [؟]

نہ کیجیو خوانِ دوں ہمت پہ ہاتھ اے ذوق آلودہ / کہ یہ کھانا مرے آگے ہے بدتر زہر کھانے سے

[عجیب زبان ہے]

ت ویران ۰ ۲ : ۶۹ آزاد ۰ ۱۱ : مطلع :

اک صدمہ دردِ سر کا مری جان پر تو ہے / لیکن بلا سے یار کے زانو پہ سر تو ہے

[آزاد: "دردِ دل" بجائے "دردِ سر"] تتمے میں مطلع و مقطع ہے. آزاد میں ۴ شعر ص ۲۲۵ پر اور ، شعر ص ۲۲۷ پر ہیں. درمیان میں "یاد رہے" ردیف کی دو جعلی غزلیں ہیں. تنویر علوی صاحب نے کلیات میں اس کے دس شعر شامل کیے ہیں اور یہ بھی بتایا ہے کہ بیاض میں اس کے ۹ شعر ہیں. غرض اس میں بڑی افراتفری ہے.

آزاد کے مصنفہ اشعار کا نمونہ یہ ہے:

ہے سر تمہید عشق کا زیب سنان یار / صد شکر بارے نخل وفا بار ور تو ہے

[گویا "سنان یار" نخل وفا ہے.]

اے شمع دل ہے رونے میں جلتا تو کیا ہوا / ہو جاتی اس میں رات بلا سے بسر تو ہے

[تو کیا ہوا کہنے کے بعد "بلا سے" بے ضرورت ہے.]

اڑائیں یوں جادوگر بلا سے ہم نہیں ڈرتے — پر اپنا دم [ہوا] ہوتا ہے اس چشمِ پُر افسوں سے

بہ قول ڈاکٹر علوی یہ شعر نگارستان میں ملتا ہے:

خدا جانے ہوئے بخت اپنے واژوں اس کی زلفوں سے — وہ زلفیں ہیں اس کی واژگوں مجھ بخت واژوں سے

یہ ذوق کی زبان نہیں آزاد کی زبان ہے۔ کلیات میں دوسرا مصرع اِس طرح ہے:

کہ زلفیں واژگوں اس کی ہیں اپنے بخت واژوں سے

ہیں یہ پھر بھی مشکوک لگتا ہے۔

۱۲۲۔ دیوان ۴۳؛ ۷۴۔ آزاد ۶؛ مطلع:

کہتے ہیں لوگ جھوٹ نہیں پانو جھوٹ کے — جھوٹے تو بیٹھتے بھی نہیں پانو ٹوٹ کے

آزاد نے اِس ناتمام • غزل میں تین شعر بڑھائے ہیں:

ڈھالا جو تجھ کو حسن کے سانچے میں اے صنم — آنکھوں کی جا ہے بھر دیے موتی سے کوٹ کے

بیدرد — سینہ کوٹنا خالی نہیں مرا — دل میں بھرا ہے درد مرے کوٹ کوٹ کے

اس شمع رو سے رات کو رخصت ہوئے جو ذوق — روئے ہیں دل کے آبلے کیا پھوٹ پھوٹ کے

۱۲۳۔ دیوان ۴۴، ۸۴ آزاد ۱۷؛ مطلع:

ہر دم دل خوں گشتہ میں اک جوشِ فزوں ہے — جو آہ ہے سینہ میں سو فوّارۂ خوں ہے

اس ناتمام غزل میں ۱۲ شعر کا اضافہ کیا ہے چند شعر یہ ہیں:

میں درد سے ہوں عشق کے بیٹھا ہوا لبریز — پر دل یہی کہتا ہے کہ ہرگز نہ کہوں ہے [؟]

اِک غمزہ تری چشمِ فسوں کار کا کافر — سو چشمِ پری کو سبقِ آموزِ فسوں ہے [؟]

(آزاد نے کئی جگہ ذوق کو اصلاح دے کر پری کا لفظ کھپایا ہے ذوق نہیں باندھتے)

جس دن سے ہوا عشق ہے درپئے تعلیم — ہر خارِ بیاباں قلمِ مشقِ جنوں ہے [؟]

بیتابیِ دل لفظوں میں کیا آئے کہ ہر حرف — دکھلا رہا گا ہے حرکت گاہ سکوں ہے

بیتابیِ دل کا کوئی مضموں جو ہوا منظم — ہر حرف پہ میرے حرکت جائے سکوں ہے

(دونوں ایک ہی شعر کی مختلف صورتیں ہیں)

کیوں حالِ زبوں اپنا بیاں ہو اُن سے (کذا) — اے ذوق ترے واسطے یہ سخت زبوں ہے [؟]

۱۲۶۔ دیوان، مطلع؛ ۵۵ آزاد ۱۲؛ مطلع:

کہتے ہیں لوگ موت تو سب جائے جائے ہے — پر میرے پاس آئے بھی کوئی کھائے جائے ہے

• غزل مرقومۃ الذیل ابتدائی مشق کی ہے۔ ردیف کو دیکھو۔ عہدِ مذکور کا محاورہ سناتی ہے۔ اس کے بعد آزاد نے مطلعِ مذکور پر ۱۱ شعر کا اضافہ کر کے اسے غزل بنا دیا کچھ شعر دیکھیے:

بھول گئے کہ مرنے سے تین گھنٹے پہلے کہا تھا ع کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا۔] حافظ ویران نے کئی
دن پہلے کہا تھا کہ حضرت اِس محاورے کو کیونکر باندھیں؛ پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ بیماری کا دوسرا یا تیسرا دن
تھا۔ فرمایا۔ حافظ تم نے اُس دن کیا کہا تھا؟ پھر یہ دو شعر پڑھے اور مجھ سے کہا لکھ لو یادداشت میں۔
بہرحال بیچارے حافظ ویران پر بھی اتہام رکھا اور غلط محاورہ باندھ کر ذوق کی روح کو بھی شرمندہ کیا۔ ملاحظہ
ہو:

زمیں کیا ہے فلک پاؤں کے نیچے سے نکل جائے
ہماری خاک پر دکھلا دو رفتارِ سمند اپنی

پوچھا تھا: پاؤں تلے کی زمین نکلنا، باندھا، پانو کے نیچے سے۔ ہم اسے بھی درست مانے لیتے ہیں
لیکن فلک پانو کے نیچے ہوتا ہے جو نکل جائے گا؟

۱۱۱۔ ویران، فرد؛ ۱۰۵۔ آزاد، ۲۔ ویران میں محض ایک فرد ہے آزاد نے اس پر یہ مطلع بڑھایا ہے اور فرد کا
قافیہ "لڑکپن" "بچپن" سے بدل دیا ہے۔

اسیری پر تری تڑپا ہوں اے قمری لڑکپن سے
جدا تن سے ہوئی گردن نہ اترا طوق گردن سے

۱۱۲۔ ویران، ۲؛ ۹۴، آزاد، ۸؛ مطلع:

کوئی اِن تنگ دہانوں سے محبت نہ کرے
اور جو یہ تنگ کریں منہ سے شکایت نہ کرے
[آزاد: اور یہ تنگ کریں منہ تو......]

اِن ناتمام" غزل میں آزاد نے ۹ شعر بڑھائے ہیں، نمونہ یہ ہے:

ہر قدم پر مرے اشکوں سے رواں ہیں دریا
کیا کرے جادہ اگر ترکِ رفاقت نہ کرے (؟)
آج تک خوں سے مرے تر ہے زبانِ خنجر
پر کرے کیا جو طلب کوئی شہادت نہ کرے (؟)
پھر چلا مقتلِ عشاق کو قاتل اے ذوق
سر پہ برپا کہیں کشتوں کے قیامت نہ کرے (؟)

۱۱۷۔ ویران، ۲؛ ۹۹۔ آزاد، ۳؛ مطلع:

ساتھ تیرے ہم بھی جوں سایہ مقرر جائیں گے
آگے جائیں پیچھے جائیں جائیں گے پر جائیں گے

فرماتے تھے ہمارا لڑکپن تھا مشاعرہ میں طرح ہوئی۔ ہم نے بھی غزل لکھی تھی۔ یہ اِس نوٹ کے باوجود آزاد
صرف ایک شعر کا اضافہ کر دیا ہے:

مر کے جب زیرِ زمیں ہم دیدۂ تر جائیں گے
خشک ہیں جتنے کوئیں پانی سے سب بھر جائیں گے

کلیات میں تین شعر ہیں اور تیسرا شعر عمدہ کے حوالے سے درج کیا گیا ہے لیکن عمدہ میں وہ شعر نہیں ملتا۔

۱۲۱۔ ویران، ۲+۴؛ ۵۲ آزاد، ۸؛ مطلع:

اڑائی طرزِ نالہ کی جو اک دن تیرے مجنوں سے
تو اب تک دیکھ لو منقارِ طوطی سرخ ہے خوں سے

دو مطلعے ویران کے متن میں ہیں اور ۳ شعر تتمے میں ہیں۔ آزاد نے ۲ شعر کا اضافہ کیا ہے، لیکن یہ شعر چھوڑ دیا ہے:

سنگ جراحت گھس کر لگایا جاتا ہے یا چھڑکا جاتا ہے ؛

حریصوں کو نہیں جا، وسعت آبادِ قناعت میں　　جو کھینچے ہاتھ کو وہ پاؤں پھیلائے فراغت سے

یہ آتش کے شعر کو بگاڑ ہے : ع ہاتھ کو جو کھینچ لے گا پانو کو پھیلائے گا۔

آخر میں مقطع اور اس کی عجیب و غریب تاویل بھی دیکھ لیجیے :

زبان ریختہ کردی زباں اہل ولایت کی　　محبت ذوق کو از بسکہ ہے شاہِ ولایت سے

حاشیہ : ۳۰۰۔۴۰۰ برس ہوئے کہ اہل ولایت، مرد تازہ ولایت، شمشیر ولایت، عناب ولایتی، مرد ولایتی اور مرد ولایت زا اور بلی ولایتی کہتے تھے۔ اور لوگ اِس سے ولایت ایران سمجھتے تھے۔ اب کوئی ولایت کہتا ہے تو انگلستان سمجھتے ہیں۔ دیکھو لفظ وہی ہے، مفہوم بدل گیا : [؟] مگر مطلب کیا ہوا ؟

۱۰۷۔ ویران، مطلع ؛ ۱۵ آزاد، ۱۰، مطلع :

دل کہاں سیر تماشے پہ مرا لگتا ہے　　جی کے لگ جانے سے جینا بھی برا لگتا ہے

[آزاد نے دونوں مصرعوں میں "دل" کر دیا ہے۔] ویراں میں صرف مطلع ہے۔ آزاد نے ۷ شعر کے اضافے سے غزل مکمل کرنے کی کوشش کی ہے۔ دو مطلعے کہے ہیں اور پہلے اپنا مطلع رکھا ہے۔

باغ عالم میں جہاں نخلِ حنا لگتا ہے　　دل پرخوں کا وہاں ہاتھ پتا لگتا ہے

"ہاتھ پتا لگتا ہے" کیا؟ یہ نخل حنا بھی آج ہی دیکھا۔

جو حوادث سے زمانے کے گرا کب اُٹھا　　نخل آندھی کا کہیں اکھڑا ہوا لگتا ہے

"حوادث سے گرا" ؟ "آندھی کا نخل" ؟ یا "آندھی سے اکھڑا ہوا" کہتے یا "آندھی کا اکھاڑا ہوا"۔

دل بگی کا بے مزا یہ کہ گزک میں لے دل　　سب کبابوں سے نمک تجھ کو سوا لگتا ہے　[؟]

آب خنجر ہے جو زہر آب وفاداروں کو　　ملک سر حد ہے وفا پانی ذرا لگتا ہے[1]　[؟]

۱۰۸۔ ویراں، مطلع ؛ ۱۴۱۔ آزاد، ۲، مطلع ؛

رہے خاطر نہ بے شغلِ محبت کیوں کہ بندا پنی　　کلید قفلِ دل فرہاد ہے شکلِ سپند اپنی

اس پر ایک نوٹ لکھا ہے : "یہ دو شعر سب سے آخر کا کلام ہے اس کے بعد کچھ نہیں کہا [آزاد کا اپنا یہ قول

---

[1] حاشیہ: "بعض بعض پہاڑوں یا جزیروں کا پانی خاص خاص طبیعت کے اشخاص کو ایسا ناموافق ہوتا ہے کہ امراض مہلک میں گرفتار ہو کر مر جاتے ہیں۔ محاورہ میں کہتے ہیں کہ فلاں مقام کا پانی لگتا ہے۔ فلاں شخص فلاں سفر میں مر گیا۔ پانی لگا تھا :" پانی لگنا اور پانی لگ جانا دو محاورے ہیں اور دونوں کے راس آنا بھی ہے اور ضرر پہنچانا بھی۔ آزاد جیسے بھی محاورے کو اپنے انداز سے باندھتے ہیں اس کی تاویل ضرور کرتے ہیں۔ بہرحال "پانی ذرا لگتا ہے" کی تاویل کو درست بھی مان لیجیے تو بھی شعر بے تکا ہے۔ آزاد الٹی بات کہہ رہے ہیں۔

حسن کیفیت سے ہو معمور اگر مینائے دل
پھر تو جامِ جم سے قدر کاسۂ زانو بڑھے [۹]

۹۹. دیوان، ۵؛ ۴۴. آزاد، ۱۲؛ مطلع:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

ہم نے پیچھے کہیں ذکر کیا ہے کہ آزاد نے تین ضرب المثل شعر کہہ کر ذوق کو بخش دیے لیکن ایسے اچھے اشعار کی بھی کمی نہیں جنھیں آزاد نے مسخ کر دیا ہے۔ انھیں میں یہ ضرب المثل مطلع بھی ہے جس کا دوسرا مصرع آزاد نے یوں بنا دیا: مر گئے پر نہ لگا جی تو کدھر جائیں گے۔ بہرحال، اس غزل میں آزاد نے ۷ شعر بڑھائے ہیں۔ دو ایک شعر دیکھیے:

سامنے چشمِ گہر بار کے بہہ دو دریا
چڑھ کے گر آئے تو نظروں سے اتر جائیں گے [۹]

تم نے ٹھہرائی اگر غیر کے گھر جانے کی
تو ارادے یہاں پھر اور ٹھہر جائیں گے [۹]

۱۰۰. دیوان، ۴؛ ۴۵. آزاد، ۹؛ مطلع:

دل بچے کیونکر نگاہِ چشمِ شوخ و شنگ سے
اپنا گھر تو سوجھتا ہے سینکڑوں فرسنگ سے

اس ناتمام غزل میں ۵ شعر کا اضافہ کر کے آزاد نے اسے مکمل کرنے کی کوشش کی ہے۔ کچھ شعر یہ ہیں:

ایک بھی نکلے نہ میری سی صدائے دلخراش
خوں اگر ٹپکے نوائے مرغِ خوش آہنگ سے [۹]

چھپ کے بیٹھے گا کہاں تو ہم سے اے رنگیں ادا
ہوگا تو جس رنگ میں مل جائیں گے اس رنگ سے [۹]

جوشِ گریہ سے رہی برسات برسوں پر کبھی
اس کی تیغِ تیز آلودہ نہ دیکھی زنگ سے [۹]

پہلے یہ نیت وضو کی ہے نمازِ عشق میں
دل سے کہہ دیجیے کہ دھوئے ہاتھ نام و ننگ سے

نماز کی نیت کی جاتی ہے لیکن وضو کی نیت، آج ہی سنی۔

۱۰۲. دیوان، مطلع؛ ۱۲۹. آزاد، مطلع: دیوان میں مطلع اس طرح ہے

گاہ تھی خلق اس در پہ حیراں پڑی، آواز نہ تھی
گاہ یہ غل کہ سنائی دیتی کان پڑی آواز نہ تھی

آزاد نے اسے اس طرح بنا دیا:

جس در پہ یہ غل تھے کہ آتی کان پڑی آواز نہ تھی
عقلِ سحر اس در پہ تھی حیران کھڑی آواز نہ تھی

۱۰۵. دیوان، ۲؛ ۵۴. آزاد، ۱۶؛ مطلع:

وہ ہوں میں پُر معاصی سوختہ سوزِ ندامت سے
خند دوزخ کرے جس کے شرارِ سنگِ تربت سے

اس ناتمام غزل میں آزاد نے ۱۴ شعر بڑھائے ہیں۔ انداز یہ ہے:

وہی ہے ایک سب میں دیکھ تو چشمِ حقیقت سے
بنا واحد کے کیوں ٹوٹے گا ملا جمع کثرت سے [۹]

نہ سوکھے دامنِ تر فتنہ میرا۔ اور جوں اختر
رواں ہوں اشکِ خجلت چشمِ خورشیدِ قیامت سے [۹]

نمک ہو مشک ہو یا سودۂ الماس تم چھڑکو
جراحت کو مرے کیا کام ہے سنگِ جراحت سے [۹]

کوچے میں آپڑے تھے ترے خاک ہو کے ہم ‏ ‏ یہاں تو صبا نے اور بھی مٹی خراب کی
قاصد جواب جان مری دے چکی مجھے ‏ ‏ پر منتظر ہیں آنکھوں میں خط کے جواب کی [کذا]

آنکھوں میں کون منتظر ہیں:

۹۰۔ ویراں، مطلع؛ ۷۶۔ آزاد، ۸۰، مطلع:

آتے ہی گھر کے تو نے پھر جانے کی سنائی ‏ ‏ ہو جاؤں سن نہ کیونکر یہ تو بُری سنائی

اس مطلع پر آزاد نے، سات شعر بڑھا کر اسے غزل بنا دیا؛ کچھ شعر یہ ہیں:

مجنوں و کوہکن کے سنتے تھے یار قصے ‏ ‏ جب تک کہانی اپنی ہم نے نہ تھی سنائی
جس بات پر تمہاری سب غش ہیں ہم سے پوچھو ‏ ‏ ہم کہیں آنکھوں دیکھی واہ] سب سنی سنائی [کون سب]
شکوہ کیا جو میں نے گالی کا آج اُس سے ‏ ‏ گالی کے ساتھ اس نے ایک اور بھی سنائی [کیا]
کیا جانے کیا کہے گا کچھ کہنے کو ہے ناصح ‏ ‏ دیتا نہیں مجھے تو لے بے خودی سنائی
[ناصح کچھ کہنے کو ہے اس کا تو ہوش ہے؟]

۹۴۔ ویراں، مطلع؛ ۱۱۱ آزاد، ۲؛ مطلع:

کون سے دن نگہ تیز نہ خوں ریز رہی ‏ ‏ مجھ پہ ظالم تری پر زور چھری تیز رہی

آزاد نے یہ شعر بڑھایا ہے:

آتش عشق تو ہے گلشن جنت کی ہوا ‏ ‏ یاں مگر آتش دوزخ سے بھی کچھ تیز رہی [؟]

۹۵۔ ویراں، فرد، ۱۱۲۔ آزاد ۲۰۔ آزاد نے مندرجہ فرد سے پہلے ایک مطلع بڑھا دیا ہے:

کیا بشر مانند یوسف کیا ملک ہاروت وار ‏ ‏ عشق کے ہاتھوں سے ہو جاتا اسیر چاہ ہے
[آزاد: بشر بجائے ملک]
ہم کو کیا یاں راہ پر ہے یا کوئی گمراہ ہے ‏ ‏ اپنی سب سے راہ ہے اور سب سے یاد اللہ ہے

۹۶۔ ویراں، مطلع؛ ۹۹۔ آزاد، ۱۵، مطلع:

خط بڑھا زلفیں بڑھیں کاکل بڑھے گیسو بڑھے ‏ ‏ حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے

آب میں آزاد نے اس پر صرف ایک شعر بڑھایا تھا وہ ذوق کے انداز کا لگتا ہے:

بعد رنجش کے گلے ملتے ہوئے رکتا ہے جی ‏ ‏ اب مناسب ہے یہی کچھ میں بڑھوں کچھ تو بڑھے

البتہ ترتیب دیوان کے وقت ۱۲ شعر اور کہہ لیے، کچھ ملاحظہ ہوں؛ کلیات میں اس غزل کے دو شعروں کو ویراں میں موجود بتایا ہے لیکن اس میں سوائے مطلع اور کوئی شعر نہیں ہے۔

ہاتھ ملنے کو جو مجنوں سے بڑھائے دشت میں ‏ ‏ ضعف سے مدت میں جوں شاخ سرا ہو بڑھے [؟]
بڑھتے بڑھتے بڑھ گئی وحشت وگرنہ پہلے آہ ‏ ‏ ہاتھ کے ناخن بڑھے سر کے ہمارے مو بڑھے [؟]

ہمیں اس میں ترمیم وتحریف سے متعلق کچھ نہیں کہنا البتہ اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ آب میں آزاد نے نسیم وناسخ سے متعلق ایک افسانہ بیان کیا ہے کہ ناسخ نے مصرع دیا: شیخ نے مسجد بنا مسمار بت خانہ کیا۔ نسیم نے برجستہ کہا: پہلے اِک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا۔ اگرچہ یہ داستان بھی فرضی ہے تاہم یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ ذوق کا شعر واضح طور پر مذکورہ شعر سے ماخوذ ہے لیکن آزاد نے اس پر کشوا دینے کی کوئی کہانی نہیں بنائی۔

۶۱۔ ویران ۔ مطلع؛ ۱۰۰۔ آزاد ۳۰ ؛ مطلع؛

گر دو ہے کھونا دلِ مضطر سے کسی کے
پانی دو پلا واہ کے سر پہ سے کسی کے

آزاد نے یہ کہہ کر اس میں دو شعر کا اضافہ کیا ہے کہ: لڑکپن کی غزل ہے۔ والد مرحوم کبھی کبھی پڑھا کرتے تھے۔ ۲ ہی شعر یاد تھے۔ اس پر یقین کرنا مشکل ہے۔ بہرحال وہ دو شعر یہ ہیں:

دل بس میں پڑا اس کے کہ جو بس میں نہ آیا
جادو سے نہ ٹونے سے نہ منتر سے کسی کے

اللہ کرے یاں ہمیں پیوند زمیں کا
جب وصل ہو بستر ترا بستر سے کسی کے

۶۲۔ ویران ۲، ۴۳۔ آزاد ۱۱، مطلع؛

کوئی کر کوتری ہو اگر کر تو سب کہے
کہ آدمی جو کہے بات سوچ کر تو کہے

آزاد نے اس مطلع پر ۵ شعر کا اضافہ کیا ہے۔ پروفیسر شیرانی نے اس غزل کو بھی مشکوک قرار دیا ہے۔ کلیتاً نہ سہی، بیشتر اشعار تو جعلی ہیں۔ اس پر یہ نوٹ ہے: "یہ غزل بھی اسی عہد کی ہے۔ مسوداتِ مذکورہ سے نقل کی ہے۔" یہ کن مسودات سے؟ مسودہ تو غدر میں ایک بھی سلامت نہیں رہا تھا۔ بہرحال کچھ شعر دیکھیے۔ بات واضح ہو جائے گی:

یہ آرزو ہے جہنم کو بھی کہ آتشِ عشق
مجھے نہ شعلہ گر اپنا کہے شرر تو کہے

جو جیب لگا کے نہ بیٹھے تو کیا کرے ناصح
کہ جانتا ہے کہے کا ہو کچھ اثر تو کہے

شہیدِ عشق کا ہر قطرہ خوں انا الحق ہے
کہے جو حق کوئی منصور اس قدر تو کہے

مجال کیا کہ ترے آگے فتنہ دم مارے
کہے گا اور تو کیا۔ پہلے الحذر تو کہے

باقی شعر نظر انداز کیے جاتے ہیں۔

۸۴۔ ویران ۲۰، ۶۲۔ آزاد ۵۔ ویران میں یہ دو شعر کا قطعہ ہے جو اس طرح شروع ہوتا ہے: ع

اے ذوق بس نہ آپ کو صوفی جتائیے

آزاد نے اسے ۵ شعر کی غزل بنا دیا ہے اور قطعے کے پہلے شعر کو مقطع اور دوسرے شعر کو چوتھا کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

حالت نشہ میں دیکھنا اس بے حجاب کی
ہر ناز سے ٹپکتی ہے مستی شراب کی

تمہارے ہاتھوں ہمارے دل فگار میں آہ — سنان و خنجر و پیکاں کی ہے دکان لگی [؟]

مقطع: خدنگ یار کو کس طرح کھینچ لوں دل سے — کہ اس کے ساتھ ہے لے ذوقؔ میری جان لگی

۶۳ - ویراں ۰ ۲،۹ ۔آزاد ۰ ۹ ۔ مطلع:

پاک رکھ اپنا دہن ذکرِ خدائے پاک سے — کم نہیں تیری زباں منہ میں ترے مسواک سے

اس ناتمام غزل میں آزاد نے سات شعر بڑھائے ہیں۔ اس پر وہی ایک لوٹا پانی سے کلیاں کرنے والا نوٹ ہے جس پر حصّہ اوّل میں نہ صرف خاصی بحث ہو چکی ہے بلکہ بعض اشعار پر روشنی بھی ڈالی جا چکی ہے یہاں صرف مقطع درج کیا جاتا ہے:

عیبِ ذاتی کو چھپائے گا نہ حسنِ عارضی — زیب بد اندام ذوق کیا پوشاک سے [کذا]

ذاتی عیوب کو لباس نہ چھپا سکے یہ دوسری بات ہے۔ حسنِ عارضی نہیں چھپائے گا۔ سے کیا مطلب! کیا حسنِ مستقل چھپا سکتا ہے ؟

۶۴ - ویراں - مطلع، ۶۰ آزاد ۰ ۹ - مطلع:

دل نقش لب جاں بخش پر جاں طرۂ مشکیں پہ ہے — عیسائی اپنے دیں پہ ہے موسائی اپنے دیں پہ ہے

اس مطلع میں ترمیم کے علاوہ آزاد نے ۸ شعر تصنیف بھی کیے ہیں۔ دو ایک شعر دیکھیے:

دے سین کی صورت دکھا، تو ہنس کے دانت اپنے ذرا — یاسین کیا پڑھوا رہا۔ قاتل مرے بالیں پہ ہے [؟]

حرفِ زبانی ہو کہ خط۔ قول ان کا یہ جو یا غلط — میری تو اب تسکیں فقط اے دل تری تسکیں پہ ہے

دو جام مے بھر کر چڑھا پھر دیکھ کیفیت ہے کیا — یہ خوب عینک حق نما چشمِ حقیقت بیں پہ ہے

میں کیا کروں اظہارِ غم ہے بارِ غم پر بارِ غم — دن رات ایک انبارِ غم میرے دلِ غمگیں پہ ہے

۶۶ - ویراں ۲۰، ۱۴۲ آزاد ۰ ۹ - مطلع:

یہاں سے آنے کا مقرر تھا صبا وہ دن کرے — جو تو مانگے گا وہی دوں گا خدا وہ دن کرے

اس غزل پر طویل نوٹ میں وجیہ الدین تنیر فرزند شاہ نصیر سے معرکے کی داستان بیان کی ہے۔ آب ہیں روایت مختلف ہے۔ اس پر حصّہ اوّل میں تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ صرف مطلع اور مقطع ذوقؔ کا ہے باقی سات شعر آزاد نے خود کہے ہیں۔ مزید تبصرے کی ضرورت نہیں۔ ...

۶۷ - ویراں میں صرف مطلع ہے۔ آزاد نے اسے ۱۵۰ پر درج کیا ہے لیکن پہلا مصرع بدل کر اسے مہمل کر دیا ہے۔ ہم نے ترامیم کو نظر انداز کر دیا ہے۔ لیکن محسوس ہوتا ہے کہ مدوّن کا حق ادا نہیں ہوا۔ امید ہے کہ آئندہ کوئی محقق اس کمی کو ضرور پورا کرے گا۔ بہر حال ذوقؔ کا مطلع تھا:

ہوس میں کعبے کی کیوں شیخ بت خانہ سے گمرہ ہے — یہاں تو کوئی صورت بھی ہے وہاں اللہ ہی اللہ ہے

تے تہی نکلے جو اس دام بلا سے اے ذوق — ورنہ تھے پیچ میں اس زلف کے آتے تو ہمی اکتا

۴۹۔ آزاد ۸، مطلع:

خیال دل میں پری نہ لاؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے — تم آئے آؤ نہیں نہ آؤ۔ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے

مکمل غزلوں میں آزاد کی کہی ہوئی یہ آخری غزل ہے۔ اس پر نوٹ ہے: "یہ بھی اسی زمانہ کی غزل۔" اس پر زیادہ بحث کی گنجائش نہیں۔ محض دو شعر دیکھ لیجیے:

تم اپنے رخ میں جو کررہے دن۔ جو زلف میں شب کے عقد گن گن
ہزار دل سے ہیں بھلاؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے

ڈاکٹر علوی نے کلیات میں کہا ہے کہ "مسودے میں آزاد نے ایک سے زیادہ مقام پر اپنی یادداشت سے تبدیلیاں کی ہیں۔ یہیں تو پوری غزل بدلی ہوئی لگتی ہے۔" حیرت صرف یہ ہے کہ پہلا متن نسبتاً بہتر تھا بعد کی تبدیلیوں سے اشعار یک سر مہمل ہو گئے ہیں:

مکان و دیدہ پسند خاطر اگر نہیں ہے کہ ہوں گے ظاہر — تو خیر تشریف تم نہ لاؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے

ان بے ربط مصرعوں کا ماقبل یہ شعر ہے:

تمہارے واسطے دل سے مکاں کوئی نہیں بہتر — جو آنکھوں میں رکھوں تم کو تو ڈرتا ہوں نظر ہوگی

اس کے بعد نسخۂ آزاد میں بھی متفرقات شروع ہوتے ہیں چناں چہ ذیل میں دیوان و آزاد کے متفرقات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

۵۱۔ دیوان، مطلع؛ ۱۰۱ آزاد ۳۰، مطلع

جو دل نہ کش مکش طرۂ دوتا میں پڑے — تو پھر بلا کو غرض ہے کوئی بلا میں پڑے

آزاد نے دو شعر کا اضافہ کیا ہے:

ہوائے سایۂ طوبیٰ نہیں ہے مستوں کو — رہیں گے تاک کے نیچے کہیں ہوا میں پڑے
بتوں کے دزد نظر سے ہے دل مرا نالاں — یہ چور وہ ہیں کہ جو خانۂ خدا میں پڑے

۵۲۔ دیوان، مطلع؛ ۵۳۔ آزاد ۱۰، مطلع:

نگہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی — چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

مختلف تذکروں اور دیوان میں صرف یہی مطلع ہے۔ آزاد نے ۹ شعر کہہ کر غزل مکمل کر دی:

ترا زباں سے ملانا زباں جو یاد آتا — نہ ہائے ہلتے ہیں تالو سے پھر زبان لگی

آزاد کا پسندیدہ مضمون ہے، کئی جگہ باندھ چکے ہیں:

خدا کرے کہ کچھ تجھ سے یہ کچھ خدا لگتی — کہ زلف اے بت بدکیش تیرے کان لگی
[؟ ہے تیرے کان زلف معنبر لگی ہوئی]

اِصلاح سے کام لیا ہے۔ بہرحال، مقطع ہے:

گلوں سے بن چکے جب دونوں ہاتھ گلدستہ　　　　تو بوئے ذوقؔ جلا تن بدن نہیں دیتے　(؟)

۸۴۔ آزاد، ۱۱؛ مطلع

اے صنم ہجر میں ہم جیتے بھلا پتھر تھے　　　　سینہ تھا ہاتھ تھا سر اپنا تھا یا پتھر تھے　(؟)

دونوں مصرعوں میں ربط کیا ہے؟ یہ غزل بلکہ دو غزلہ بھی آزاد کا کہا ہوا ہے۔ کچھ شعر دیکھیے:

دلِ مجروح نے کھائے جو جنوں میں پتھر　　　　اس کو وہ سنگِ جراحت سے سوا پتھر تھے

دل نے پتھر کھائے؟

پوچھا اُس بت نے تو نکلی نہ زباں سے اک بات　　　　حضرت دل وہاں کیا بارِخدا پتھر تھے

اُس بت نے کیا پوچھا؟ "وہاں" یعنی بارِخدا کہاں پتھر تھے۔ بالفرض یہ "وہاں" ہو تو "پتھر" کہتے۔ علاوہ ازیں یہ "بارِخدا" کا نیا استعمال بھی آج ہی دیکھنے میں آیا ہے۔

تھے دلِ سنگ میں جب تک تو رہے قطرۂ خوں　　　　تاجِ شاہی میں لگے لعل تو کیا پتھر تھے　(؟)

مقطع ہے:

کعبۂ عشق کا اے ذوقؔ کیا ہم نے طواف　　　　آئینہ خاک تھی اور سنگِ صفا پتھر تھے　(کذا)

"سنگِ صفا پتھر تھے" یعنی چہ؟ اب اِسی زمین کی دوسری غزل بھی ملاحظہ ہو:

۸۵۔ آزاد، ،، ؛ مطلع:

دل کے مفلس جو تونگر تھے تو کیا پتھر تھے　　　　اب تونگر ہیں جو گوہر تھے تو کیا پتھر تھے　(؟)

کون اب تونگر ہیں؟ مقطع:

سنگ دل وہ رہے اے ذوقؔ صدا (کذا) حق میں مرے　　　　غیر کے حق میں جو گوہر تھے تو کیا پتھر تھے　(؟)

۸۶۔ آزاد، ۹؛ مطلع:

بزم میں ذکر مرا لب پہ وہ لائے تو سہی　　　　وہیں معلوم کروں ہونٹھ ہلائے تو سہی　(؟)

یہ غزل بھی آزاد کی کہی ہوئی ہے۔ دو ایک شعر اور دیکھیے:

سنگ پر سنگ ہر اک کوچہ میں کھائے تو سہی　　　　پر بلا سے ترے دیوانے نے کھائے تو سہی　(؟)

ڈاکٹر علوی نے کلیات میں "دیوانے نے کہائے تو سہی" چھاپا ہے اور یہ بہتر ہے اِس کے باوجود شعر درست نہیں۔ پہلے مصرعے میں ردیف مربوط نہیں۔

کیونکہ دیوار پہ چڑھ جاؤں کوئی کہتا ہے　　　　پاؤں کاٹوں گا انگوٹھے کو جمائے تو سہی

ذوقؔ کو دیواریں پھاندنے اور کوٹھے پھلانگنے کا کوئی شوق نہیں، آزاد کو ہے۔ یہ اِنشا کا اثر ہے۔ جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے ع دیوار پھاندنے میں دیکھو گے کام میرا۔ آزاد اس مصرع کو بھول نہیں پائے۔ مقطع:

ر

سب شعر اسی قبیل کے ہیں۔ زیادہ اشعار نقل کرنا بے سود ہے۔ اس غزل پر نوٹ ہے: "یہ غزل بھی عالم شباب کی ہے طرح مشاعرہ میں لکھی گئی تھی"۔ ظاہر ہے یہ غلط ہے۔

۸۱۔ آزاد، ۲۳؛ مطلع:

دکھلا نہ خالِ ناف تو اے گل بدن مجھے
ہر لالہ یاں ہے نافۂ مشکِ ختن مجھے (؟)

مسودات شیرانی میں مصرع اولیٰ اسی طرح ہے، لیکن ڈاکٹر صادق کے مسودے میں "دکھلا دے خالِ ناف" ہے۔ غزل بہرحال جعلی ہے تاہم دو ایک شعر دیکھ لیجیے:

ہمدم وبالِ دوش نہ کر پیرہن مجھے
کانٹا سا ہے کھٹکتا مرا تن بدن مجھے (؟)

بیچ دور بزم میں دیکھو امام کو
بخشی ہے حق نے زیبِ سرِ انجمن مجھے (؟)

سب شعر جعلی ہیں حتیٰ کہ وہ بھی جو ذوق کے مشہور اشعار سے اخذ کیے ہیں، مزید مثالیں دینا فضول ہوگا۔ قارئین کرام خود ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

۸۲۔ آزاد، ۱۷؛ مطلع:

مار کر تیر جو وہ دلبرِ جانی مانگے
کہدو ہم سے نہ کوئی دے کے نشانی مانگے (؟)

"یہ غزل بھی آغازِ شباب کی ہے۔ مضمون مطلع بھی گواہی دیتا ہے"۔ یہ صریحاً غلط ہے۔ آزاد نے یہ غزل نہ صرف غالب کی غزل پر کہنے کی کوشش کی ہے بلکہ غالب کی پرواز سے ساتھ اڑنے کی بھی کوشش کی ہے۔ اس کے مسودے پروفیسر شیرانی اور ڈاکٹر صادق، دونوں کے مسودوں میں شامل ہیں۔ ڈاکٹر صادق کے مسودے میں مطلع کا مصرعِ اولیٰ ہے: "تیرے پہلو میں لگا دلبرِ جانی مانگے"۔ مقطع یہ ہے:

جلوہ اس عالمِ معنی کا جو دیکھے اے ذوق
لطفِ الفاظ نہ دے حسنِ معانی مانگے (؟)

۸۳۔ آزاد، ۱۸؛ مطلع:

نہ دیں گواہی جو داغِ کہن نہیں دیتے
دکھائی کیا مرے تن پر چمن نہیں دیتے (؟)

اس کا مسودہ پروفیسر شیرانی کے مسودوں میں موجود ہے، البتہ ڈاکٹر صادق کو اس کا مسودہ نہیں ملا تھا۔ کچھ شعر دیکھیے اس کا اہمال و جعل واضح ہوجائے گا:

جفا میں بات وہ کیا حکمتیں نہیں دیتے
کہ دردِ جاں ہیں اب زخمِ تن نہیں دیتے (؟)

ہیں شمع کر ہے رونے کو یہ جو ناداں دوست
بجھانے کیوں مجھے دل کی جلن نہیں دیتے

"بجھلنے" تو چیز "بجھلنے" ہوگا لیکن "جلن بجھانا"؟

یہ پڑگئیں تنِ لاغر میں دھجیاں ہیں مرے
کہ اتنے زلف میں بھی وہ شکن نہیں دیتے

"تنِ لاغر میں دھجیاں"؟ آج معلوم ہوا کہ "دھجیاں" کے معنی "جھریاں" ہیں۔ ڈاکٹر علوی نے اس غزل کا ماخذ مسودے کو بتایا ہے اور اس میں اکثر مصرعے مختلف ہیں۔ گویا آزاد نے درجِ دیوان کرتے وقت مزید حک در

حرم کو مخاطب کرتے تو پھر ایک بات تھی، "طوافِ حرم پرے" رہنا کے کیا معنی ہیں؟ آخر میں ایک شعر اور دیکھیے جس میں اِنشا کا منہ چڑایا ہے:

شب اُن کے گھر میں غیر نے آلیا تھا پر — دیوار بام پر سے چڑھے ہم کو دھم پرے

مصرعِ ثانی کا مطلب کیا ہے؟ یہ "دھم پرے" اِنشا کے اس مصرعے سے ماخوذ ہے:

جب دھم سے آ کہوں گا صاحب سلام میرا

۷۹۔ آزاد ۱۰: مطلع:

ذکرِ مژگاں تیرا جس کے روبرو نکلا کرے — اس کے بے نشتر رگِ جاں سے لہو نکلا کرے

اس جعلی غزل کے مسودے بھی پروفیسر شیرانی اور ڈاکٹر صادق کو الگ الگ ملے تھے۔ یہ پہلی غزل ہے جس کے مطلع کا مصرعِ اولیٰ دونوں مسودوں میں مطابق ہے۔ یہاں بھی ردیف بہ لحاظِ زبان غلط ہوگئی ہے۔ زیادہ اشعار نقل کرنا بے سود ہے البتہ مقطع دلچسپ ہے، ملاحظہ ہو:

خدمتِ پیرِ مغاں سے لو وہ دارو چل کے ذوقؔ — نشہ جس سے بے جام و سبو نکلا کرے

کیا نشہ جام و سبو سے نکلتا ہے؟ "دارو پیرِ مغاں سے لو" یا "خدمتِ پیرِ مغاں سے"؟ یا "خدمتِ پیرِ مغاں میں چل کے"؟ اس شعر کا محرک ذوقؔ کا یہ مصرع ہو سکتا ہے:

پیرِ مغاں کے پاس وہ دارو ہے جس سے ذوقؔ

۸۰۔ آزاد ۳۳: مطلع:

خمِ ابرو ترا جب یار نظر آتا ہے
خط تری مانگ کا جب یار نظر آتا ہے
} کوئی کھینچے ہوئے تلوار نظر آتا ہے

پروفیسر شیرانی کو ملے مسودے میں مصرعِ اولیٰ پہلا ہے اور ڈاکٹر صادق کے مسودے میں دوسرا۔ اس سے ایک بات یہ بھی واضح ہوتی ہے کہ ڈاکٹر صادق والے مسودے مقدم ہیں اور شیرانی والے مسودے موخر۔ ترتیبِ دیوان کے وقت تک آزاد یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ کون سا مصرع رکھا جائے۔ بہرحال ایک بات طے ہے کہ یہ غزل جعلی ہے۔ اس میں آزاد نے چھ مطلعے کہے ہیں، ان میں دو یہ ہیں:

گھر میں جو روزنِ دیوار نظر آتا ہے — چشمِ افعی مجھے بے یار نظر آتا ہے
ضعف سے تارِ تنِ زار نظر آتا ہے — سرِ راتق پہ گرانبار نظر آتا ہے (؟)

دو ایک شعر اور دیکھیے:

معنیٔ رنگِ خموشی سے جو دل ہو آگاہ — برگِ گل میں لبِ اظہار نظر آتا ہے (؟)
جتنا بے ہوش ہو اتنا ہی ہو آرام سوا — مست ہاتھی ہو تو بے بار نظر آتا ہے (؟)
خوابِ غم میں بھی آرام اگر آجائے — بے وہ بے چین جو ہشیار نظر آتا ہے (؟)

تمام اہلِ سخن بزمِ سخن میں ذوقؔ حیراں ہیں

پہلوے تحریر کیا، یا باندھا۔ آزاد نے اِس پہلو پر حاشیہ لکھا ہے: لڑکپن کا کلام ہے۔ مگر یہ پہلو جس طرح

ملا جو قافیہ تو نے کیا تحریر پہلوسے

بٹھایا ہے جاننے والے ہی جانیں گے۔ اللہ کی قدرت ہے جس کو جب چاہے دے دے" یہ آزاد کی

طبیعت کا خاصہ ہے کہ جہاں کوئی خامی ہو اس پر اس طرح نوٹ لکھتے ہیں کہ خوبی نظر آئے۔

ایسے اکثر اشعار خود ان کی اپنی تصنیف ہوتے ہیں۔ دو ایک جگہ ذوقؔ کے اشعار پر بھی اس قسم کے نوٹ لکھے ہیں:

،،آزاد، ۱۵، مطلع:

برق میرا آشیاں کب کا جلا کر لے گئی

کچھ جو خاکستر بچا آندھی اڑا کر لے گئی

اس کے جعلی مسودے بھی دستیاب ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر صادق کے ہاں البتہ مصرعِ اولیٰ میں "جلا" کی جگہ "اٹھا"

ہے۔ ایک شعر اور مقطع پیش ہے:

اُس کے قدموں تک نہ بے تابی بڑھا کر لے گئی

ہائے دو پلٹے دیے اور پھر ہٹا کر لے گئی

کہاں لے گئی؟

ذوقؔ مرجانے کا تو اپنے کوئی موقع نہ تھا

کوے جاناں میں اجل ناحق لگا کر لے گئی

،،آزاد، ۲۰، مطلع:

حد رقم سے وصفِ جبیں ہے صنم پرے

برحق ہے شاخِ سدرہ سے لوح و قلم پرے (؟)

اس غزل کے بھی آزاد کے وضع کردہ مسودے دونوں بزرگوں کو ملے تھے۔ ڈاکٹر صادق کے مسودے

میں مصرعِ اولیٰ اس طرح ہے: بینی ہے تیری چینِ جبین سے صنم پرے اِس غزل کے جعلی ہونے میں کوئی شبہ

نہیں۔ ایک بھی شعر درست و مربوط نہیں۔ آزاد نے اس پر نوٹ لکھا ہے: "عالم شباب کی غزل ہے" لیکن

مقطع یہ ہے:

کرتا ہے کیا مسافتِ منزل کا فکر ذوقؔ

ہے اب تو یہاں سے ملکِ عدم دو قدم پرے

اول تو عالمِ شباب میں یہ مضمون، پھر عجزِ بیان! "یہاں سے"؟ "کہاں سے ملکِ عدم دو قدم پرے ہے

نوٹ میں آگے لکھا ہے: "شاہ نصیر مرحوم کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا۔ وہیں پڑھی تھی۔ ان کی شاگردی کا

تمغہ ایک قطعہ بھی موجود ہے" یہ "تمغہ" آپ بھی ملاحظہ فرمائیں!

کچھ اپنی شرحِ سوزِ دلِ بے قرار آج

آیا تھا جی میں بیٹھ کے کیجیے رقم پرے

اللہ رے اضطراب کہ جوں آتشیں قلم

ہاتھوں سے جا پڑا مرے چھٹ کر قلم پرے

اسے شاہ نصیر کی شاگردی سے کیا تعلق؟ پہلے شعر کا مصرعِ ثانی مہمل ہے بھلا کس سے پرے بیٹھ کر رقم

کرنا چاہتے تھے؟ ایک شعر اور دیکھیے:

کعبہ نہیں، یہ کعبۂ دل ہے مقامِ دوست

رہنا ذرا یہاں سے طوافِ حرم پرے

بہ قلم آزاد شیرانی مرحوم اور ڈاکٹر صادق کو مل چکے ہیں۔ لہٰذا اس کے جعلی ہونے میں شبہ نہیں۔ مقطع ہے:

نہ دیتا عشق اگر چشم اشکبار اے ذوقؔ — جلا چکی تھی مری آہِ شعلہ بار مجھے

۴۲۔ آزاد، ۹، مطلع:

مرضِ عشق جسے ہو اُسے کیا یاد رہے — نہ دوا یاد رہے اور نہ دعا یاد رہے

معلوم ہوتا ہے یہ وہی ۰۰ ویں غزل ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ غالباً مطلعوں والا حصہ ہوا الگ چھپ گیا ہے اور یہ مطلع ۱۴ اشعار الگ۔ اس میں تین مطلعے ہیں۔ ڈاکٹر علوی نے کلیات میں بغیر کسی تصریح کے ان اشعار کو مذکورہ غزل ہی میں شامل کیا ہے۔ آزاد نے اس پر یہ نوٹ لکھا ہے: لڑکپن کی غزل ہے نظرثانی نہیں ہوئی۔ لیکن آزاد کو مندرجہ ذیل مقطع کہتے وقت شاید یہ خیال نہیں آیا کہ لڑکوں کے منہ سے ایسی باتیں اچھی لگتیں:

محو اتنے بھی نہ ہو عشقِ بتاں میں اے ذوقؔ — چاہیے بندہ کو ہر وقت خدا یاد رہے

۴۴۔ آزاد، ۱۴، مطلع:

تدبیر نہ کر فائدہ تدبیر میں کیا ہے — کچھ یہ بھی خبر ہے تری تقدیر میں کیا ہے

اس جعلی غزل کے مسودے بھی پروفیسر شیرانی اور ڈاکٹر صادق دونوں کو مل چکے ہیں۔ لہٰذا اس پر تبصرہ ضروری نہیں۔ صرف پہلا اور آخری بے ربط شعر دیکھ لیجیے!

اے اہلِ نظر عالمِ تصویر کو دیکھو — تصویر کا کیا دیکھنا تصویر میں کیا ہے [؟]

ٹک آدمی طرف دیکھو نہ تم میرے دمِ ذبح — لو نام تم اللہ کا تکبیر میں کیا ہے [؟]

۴۵۔ آزاد، ۱۱، مطلع:

پری رو کیا ستمگر پیشتر ایسے نہ ہوتے تھے — ولیکن جیسے تم ہو فتنہ گر ایسے نہ ہوتے تھے۔

اس غزل کے مسودے بھی دونوں مذکورہ بزرگوں کو مل چکے ہیں البتہ ڈاکٹر صادق کے ہاں مطلعے کا مصرعِ اولیٰ یوں ہے: پری رو خوش نظر کیا پیشتر ایسے نہ ہوتے تھے۔ چناں چہ مزید تبصرہ بے سود ہے صرف ایک شعر اور مقطع درج کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے:

وہ جب واں بے تکلف رات بھر ایسے نہ ہوتے تھے — صبا کے جھوکے یاں وقتِ سحر ایسے نہ ہوتے تھے

ہمارے شعر سن کر ذوقؔ جیسے بزمِ عالم میں — ہوئے قائل ہیں اب اہلِ نظر ایسے نہ ہوتے تھے

وہ "رات بھر ایسے بے تکلف، کہاں نہ ہوتے تھے" مقطع میں "پہلے ایسے قائل نہ ہوتے تھے" کا مقام ہے۔

۴۶۔ آزاد، ۱۱، مطلع:

نہ کھینچو عاشقِ تشنہ جگر کے تیر پہلو سے — نکلتے ہے بسمل یا ہی تصویر پہلو سے [؟]

اس کے مسودے بھی ہر دو حضراتِ مذکور کو ملے تھے۔ خود مطلع ہی جعلی کی شہادت کے لیے کافی ہے البتہ مقطع اور دیکھ لیجیے!

۶۸۔ آزاد، ۱۴، مطلع: ؟

کیا دل کا بازارِ الفت میں سودا
زیاں کو ہم اے ذوق یہاں سود سمجھے

اس غزل کا جعلی مسودہ پروفیسر شیرانی کو ملا تھا اور ڈاکٹر صادق کو بھی اور وہ دونوں مختلف تھے
اس امر کا ثبوت موجود ہے کہ ان مسودوں میں مطلع موجود تھا۔ پروفیسر شیرانی نے اس کا ابتدائی مصرع؛
رفِ عشق جسے ہوئے کیا یاد رہے، اور ڈاکٹر صادق نے: جسے بیماری غم ہوئے کیا یاد رہے، درج کیا ہے۔
آزاد نے دیوان میں مطلع دانستہ ترک کر دیا ہے یا سہواً رہ گیا ہے، کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ویسے یہ دو غزلہ ہے
اگلی غزل کا ذکر بعد میں پہلے اس غزل کے چند شعر دیکھ لیجیے:

رات کا وعدہ ہے بندہ سے اگر بندہ نواز
بند میں دے لو گرہ تاکہ ذرا یاد رہے

کس بند میں گرہ دے لو، شلوار بند میں یا ازار بند میں؟

قاصدِ عاشقِ سودا زدہ کیا لائے جواب
جب نہ معلوم ہو گھر اور نہ پتا یاد رہے

سودا زدہ عاشق ہے یا قاصد؟ اگر عاشق ہے تو پتا کس کو یاد نہیں رہتا، عاشق کو یا قاصد کو؟ ان
مہملات پر بحث کرنا فضول ہے بس مقطع دیکھ لیجیے:

عالمِ حسن خدائی ہے بتوں کی اے ذوق
چل کے بت خانہ میں بیٹھو کہ خدا یاد رہے

۶۹۔ آزاد، ۷، مطلع:

چشم قاتل ہمیں کیونکر نہ بھلا یاد رہے
موت انسان کو لازم ہے سدا یاد رہے

پروفیسر شیرانی نے اپنے مسودے سے مصرع اسی طرح نقل کیا ہے لیکن ڈاکٹر صادق کے مسودے
میں اس طرح ہے: قتل کر کے مجھے چل دیجو سنا یاد رہے
دو ایک شعر دیکھیے:

میرا خوں ہے ترے کوچہ میں بہا یاد رہے
یہ بہا وہ نہیں جس کا نہ بہا یاد رہے [؟]

کشتۂ زلف کے مرقد پہ تو اے لیلیٰ وش
بید مجنوں ہی لگانا کہ پتا یاد رہے [؟]

خط بھی لکھتے ہیں تو دیتے ہیں خطائی کاغذ
دیکھیے کب تک انھیں میری خطا یاد رہے [؟]

اس "خطائی کاغذ" کو آزاد نے ایک اور جگہ بھی استعمال کیا ہے اور ذوق کے ہاں بھی ایک بار آیا ہے۔
آزاد نے اس پر حاشیہ آرائی کی ہے جس پر پروفیسر شیرانی اپنے مضمون میں مناسب تبصرہ کر چکے ہیں،
اعادے کی ضرورت نہیں۔

۷۰۔ آزاد، ۹، مطلع:

خدا نے میرے دیا سینہ لالہ زار مجھے
بتو نہ بن کے نظر آؤ تم بہار مجھے

آزاد کہتے ہیں کہ: "یہ غزل عنفوان شباب کی ہے۔ نظرِ ثانی نہیں ہوئی۔" لیکن اس کے مسودے خود

لگے کیوں تم پہ مرنے ہم ابھی سے　　لگا یا جی کو اپنے غم ابھی سے
ولا ربط اس سے رکھنا کم ابھی سے　　جتا دیتے ہیں تم کو ہم ابھی سے
غضب آیا ہلیں گر اس کی مژگاں　　صفیں یاروں کی ہیں برہم ابھی سے
لگے سیسہ پلانے مجھ کو آنسو　　کہ ہو بنیادِ غم محکم ابھی سے

بقیہ شعر نظر انداز کیے جاتے ہیں۔

۶۴۔ آزاد، ۱۶، مطلع:

قفلِ صدخانۂ دل آیا جو تو ٹوٹ گئے　　جو طلسمات نہ ٹوٹے تھے کبھو ٹوٹ گئے

پروفیسر شیرانی کے ہاں یہ غزل مشکوک کلام میں ہے۔ البتہ ویران کے تتمے میں مندرجہ مطلع موجود ہے۔ باقی سب شعر آزاد کی تصنیف ہیں۔ اس لیے اس غزل کو یہاں درج کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ "ٹوٹ گئے" کی زمین میں آزاد نے ایک اور غزل بھی کہی ہے اور وہ بھی اسی کے ساتھ درج ہو جائے گی۔ کچھ شعر یہ ہیں:

تو جو کہتا ہے کہ دے غیر کو بھی ساغرِ مے　　ہاتھ کیا اس کے ہیں ایے عربدہ جو ٹوٹ گئے [؟]
دخترِ رز نے وہ انداز دکھائے سرِ بزم　　رات یاروں کے وہاں غسل و وضو ٹوٹ گئے۔ [؟]
کیونکہ بن کشتیِ مے کیجیے سیرِ دریا　　میکشو زیرِ بغل اب تو کدو ٹوٹ گئے [؟]
کہہ بہ تبدیل قوافی غزل اک اور بھی ذوق　　دیکھیں بٹھلاتا ہے کس طرح سے تو ٹوٹے گئے
رات جو شیشۂ مے تجھ سے عسس ٹوٹ گئے　　ہائے نہ گنبدِ مینا کے کلس ٹوٹ گئے

"عسس سے ٹوٹ گئے" یا اس نے "توڑ دیے"!

ذوق ہم ہو گئے گم۔ ایسی ہوئی گم آواز　　آج کیا قافلہ کے سارے جرس ٹوٹ گئے

۶۵۔ آزاد، ۷، مطلع:

ہم اوّل ہی سے خود کو نابود سمجھے　　کہ تجھے عشق جلوائے بے دود سمجھے

(عمدہ مطبوعہ میں یہاں نقطے ہیں یعنی اتنا ناقص ہے کہ کچھ پڑھا نہیں جاتا)

آپ ہیں آتش کی اس ترکیب پر اعتراض کرنے کے بعد غالباً آزاد کو اسے خود درست کرکے باندھنے کی سوجھی!

تری ناگ کی تیغ کا ہو جو زخمی　　وہ بے زخم۔ دل کو نمک سود سمجھے [؟]
خدا کی خدائی اگر آگے آئے　　وہ کافر کسی کو نہ موجود سمجھے [؟]
ہمارا جو دل ہو گیا موم ان پر　　ہم اُلفت کو اعجازِ داؤد سمجھے [؟]

کیا آپ کا دل لوہا تھا؟ عاشق کا دل تو گداز و دردمند بتایا جاتا ہے، معشوق کا دل موم ہوتا تو البتہ اک بات بھی تھی۔

یاد آتا ہے جو آبِ دمِ تیغ کا مزہ
بھر آتا میرے زخم کے پانی دہن میں ہے

آبِ تیغ یا آبِ دمِ تیغ، بمحاورہ منہ میں پانی بھر آتا ہے نہ کہ دہن میں۔

ہیں روزنِ دہن میں جو کتر دم لیے ہوئے
یہاں کام ان کا نیش زنی ہر سخن میں ہے

دکھلا دو پشتِ لب پہ تم اپنا درِ بُلاق
دیکھیں سہیل کیوں کہ چمکتا یمن میں ہے

جب یہی مضمون اس سے زیادہ چستی اور درستی سے ذوق نے باندھا تھا تو آزاد کو پسند نہ آیا:

اللہ ری تابِ حسن کہ اس کا درِ بُلاق
چشمک زنی کرے ہے سہیل یمن کے ساتھ

اور آزاد نے پہلا مصرع یوں بنا دیا: لب پر ترے پسینے کی بوند اے عقیقِ لب۔ لیکن اب اسی مضمون کو بگاڑ کر ذوق کو بخشنے میں انھیں تامل نہیں ہوا۔

۴۹۔ ویران ۲۰، ۳، ۹۲ آزاد ۴۰ مطلع:

ناقص کا صفا کیش سے مطلب نہ بر آئے
جو کور ہو عینک سے اسے کیا نظر آئے

اس ناتمام غزل میں آزاد محض ایک ناقص شعر کا اضافہ کر سکے:

بت خانہ میں گمراہ کروں عشقِ صنم سے
ناقوس کا دل آبلہ کی طرح بھر آئے

ویران میں یہاں سے متفرقات شروع ہوتے ہیں جن کی تعداد ۱۲۳ ہے اور بیشتر میں ایک ایک دو دو شعر ہیں، لیکن آزاد کے یہاں ابھی ۲۲ کامل غزلیں ایسی ہیں جو خود ان کی تصنیف ہیں۔ باقی ۱۰۱ میں انھوں نے خاصے اضافے کیے ہیں۔ پہلے ان ۲۲ غزلوں کا ذکر کر لیا جائے اس کے بعد ہم متفرقاتِ ویران و آزاد کا جائزہ لیں گے۔ یہاں سے نمبر شمار آزاد کے مطابق ہیں۔

۵۰۔ آزاد ۱۱، مطلع:

یار حال ہنسے پر ہم دل فگاروں کے لگے
کاشکے ایسے ہی یارب دل کو یاروں کے لگے

(ڈاکٹر تنویر علوی نے بیاض کے حوالے سے اس کے صرف دس شعر درج کلیات ج ۱ کیے ہیں) بقیہ شعر نظر انداز کیے جاتے ہیں البتہ ایک دو شعر کا قطعہ ملاحظہ ہو:

سرزمینِ باغِ الفت میں ترے اے فتنہ گر
نخلِ قامت جب ترے سینہ فگاروں کو لگے [؟]

ٹہنیاں تیروں کی نکلیں پھوٹے سوفاروں کے گل
خنجروں کے برگ نکلے پھل کٹاروں کے لگے

بھلا سینہ فگاروں کو نخلِ قامت کیونکر لگیں گے؟ ایسے اشعار تصنیف کرتے ہوئے آزاد معقولیت کی آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔

۵۱۔ آزاد ۱۵، مطلع:

اگر ہوتے ہو تم برہم ابھی سے
تو پھر ہوتے ہیں رخصت ہم ابھی سے

اس پوری غزل میں دو تین شعروں کو چھوڑ کر ہر جگہ ردیف بے کار ہو گئی ہے، دو ایک شعر دیکھیے:

اس ناتمام ۰ غزل میں آزاد نے ۲ شعر کا اضافہ کیا ہے:

بھرے جاؤں گا میں صیاد دمِ گلشن کے چلنے کا   میرے سینہ میں جب تک دم بزیرِ دام چلتا ہے
سمندِ وحشت اپنا شاخِ گل کے تازیانہ سے   جنوں کی شاہراہوں میں سدا شہ گام چلتا ہے

آزاد نے اس شعر پر حاشیہ لکھا ہے: "پہلے فرمایا تھا: سمندِ وحشت اپنا چوبِ گل کے تازیانہ سے۔ پھر فرمایا ہر شخص نہ سمجھے گا تو عام لوگوں کو کیا خبر ہے کہ ایران میں جسے موسم بہار میں جنوں ہو جاتا ہے اُس پہ یہ ٹوٹکا کرتے ہیں تو اچھا ہو جاتا ہے۔ اور اسے چوبِ گل زدن کہتے ہیں۔" یہ ویسی ہی تاویل ہے جیسی آزاد نے کبادہ ۰ کے سلسلے میں کی تھی۔ ایک اور جگہ بھی "چوبِ گل" پر آزاد نے اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ اسی پر پروفیسر شیرانی نے اپنے مضمون میں خاصی روشنی ڈالی ہے۔ حیرت ہے کہ آزاد سیدھے سادے شعروں کی تو اس قسم کی شرح کر دیتے ہیں لیکن واقعی مہمل اشعار میں جو الٹی سیدھی تراکیب لاتے ہیں اُن پر ایک حرف بھی نہیں لکھتے۔

عجب شطرنج گردوں ہے کہ جس میں اپنے گھوڑے کو   نئے منصوبے سے روز ابلق ایام چلتا ہے

مقطع ہے:

خرد نے رازِ عالم کچھ نہ پایا ذوق اگر پایا   کہ بے آغاز آیا اور بے انجام چلتا ہے

کون بے آغاز آیا؟ کیا عالم!

۴۲۔ ویران ۰ ۴۴: ۵۸ آزاد ۰ ۸ مطلع

. لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے   اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

اس ناتمام غزل میں آزاد نے ۴ شعر کا اضافہ کیا ہے جن میں ایک مہمل اور تین ضرب المثل ہو گئے ہیں۔ ان میں اور ذوق کے کلام میں امتیاز ممکن نہیں۔ ڈاکٹر علوی نے ۲ شعر جلد اول میں اور دو شعر کلیات کی جلد دوم میں شامل کیے ہیں جس میں وہ کلام شامل کیا گیا ہے جو بروایت آزاد ہے۔ بہرحال ملاحظہ ہو:

لیلیٰ کا ناقہ دشت میں دکھلاتا ذوقِ شوق   سن کر فغانِ قیس بجائے حدی چلے

تین ضرب المثل شعر یہ ہیں:

نازاں نہ ہو خرد پہ جو ہونا ہو سو ہی ہو   دانش تری نہ کچھ مری دانشوری چلے
دنیا نے کس کا راہِ فنا میں دیا ہے ساتھ   تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے
جاتے ہوائے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوق۔   اپنی بلا سے بادِ صبا اب کبھی چلے

آزاد نے آب میں اس غزل کی تقریبِ تصنیف میں جو افسانہ درج کیا تھا اُسے شاملِ دیوان نہیں کیا۔

۴۳۔ ویران ۰ ۵: ۴۱۔ آزاد ۰ ۹ مطلع:

مہ میں کہاں جو تابِ رخِ سیم تن میں ہے   پردہ سا عنکبوت کا سقفِ کہن میں ہے

اس ناتمام غزل میں آزاد نے ۴ شعر کا اضافہ کیا ہے:

تغافل سے فرصت نہیں واں نظر کو ‏ ‏ یہاں منتظر لب پہ جانِ حزیں ہے
نہ ہوئے اگر تجھ کو دم کا بھروسا ‏ ‏ تو جو دم ہے غافل دم واپسیں ہے (۹)
جو تم عرش سے دور بیٹھے تو بیٹھو ‏ ‏ لگائے ہوئے میرا دل دوربیں ہے (۹)
نہیں وہ رہے ہم سے تم تھے جو پہلے ‏ ‏ زمانہ کو تو کچھ تغیّر نہیں ہے (۹)

۴۱۔ ویراں، ۱۲؛ ۲۸ آزاد، ۲۷۔ مطلع:

تو آنکھ میں نہ سرمہ دنبالہ دار دے ‏ ‏ مفتونِ چشم کو یونہی اِک تیر مار دے

ڈاکٹر تنویر علوی نے حواشی کلیات میں اس غزل کے کل ۲۵ شعر بتائے ہیں۔ آزاد میں ۲۷ شعر ہیں۔ انھوں نے شعر چھوڑ دینے کا سبب نہیں لکھا۔ ویراں میں یہ غزل 'ناتمام' ہے لہٰذا آزاد کو ۱۴ شعر بڑھانے کا موقع مل گیا۔ ان ۱۴ شعروں میں کئی مطلعے ہیں:

ہاتھ اپنا میرے ہاتھ میں کب وہ نگار دے ‏ ‏ جو اپنے ہاتھ کا نہ مجھے پشت خار دے
ٹانکے نہ زخم دل میں ترا دل فگار دے ‏ ‏ تو جب تلک نہ گیسوئے مشکیں کنار دے
گلشن کو آب گر مژہ اشک بار دے ‏ ‏ بُلبل بجائے بیضہ دُرِ آب دار دے
وہ زلفِ مشکبار اگر ایک تار دے ‏ ‏ پھر میں نہ لوں اگر کوئی مُشکِ تتار دے

اور اشعار میں اس طرح کے شعر ہیں:

عشق اس پری کا ہو وہ بلا جائے لے کے جان ‏ ‏ یہ جن نہیں ہے جس کو سیانا اتار دے
جاں باز عشق جان تلک اپنی کھیل جائے ‏ ‏ لیکن قمار عشق میں ہمت نہ ہار دے

اور شعر نقل کرنا فضول ہے۔ اندازہ لگانے کے لیے یہی شعر کافی ہیں۔

۴۲۔ ویراں، ۵؛ ۲۹ آزاد، ۱۳۔ مطلع:

پوچھ مت راہِ وفا اس نگہِ پرفن سے ‏ ‏ رہنمائی کی نہ رکھ چشم دلا رہزن سے

[اب تک کی سیکڑوں غزلوں میں یہ پہلی غزل ہے جس میں ذوق نے 'دلا' باندھا ہے اور شاید اس کے علاوہ کہیں اور نہیں باندھا جب کہ آزاد نے بے شمار اشعار میں یہ لفظ باندھا ہے] ویراں میں یہ غزل اگرچہ 'ناتمام' نہیں ہے تو بھی آزاد نے اس میں ۸ شعر کا اضافہ کیا ہے۔ کچھ یہ ہیں:

خار نکلے عوضِ سبزہ مرے مدفن سے ‏ ‏ بچ کے جانا کہ یہ الجھیں گے ترے دامن سے (؟)
تارِ ہر سانس کے پردہ میں محبت کے سبب ‏ ‏ ایک فریاد نکلتی ہے دلِ آہن سے (؟)
چشم میگوں وصراحی بہ بغل، جام بکف ‏ ‏ دیکھنا آج وہ گل آتا ہے کس جوبن سے (؟)

۴۳۔ ویراں، ۴۰؛ ۴۰۔ آزاد، ۱۱۔ مطلع:

فلک تو ٹیڑھا ہی کی صبح سے تا شام چلتا ہے ‏ ‏ مگر سیدھی نظر سے تیری اپنا کام چلتا ہے

اضافہ بھی کیا ہے، ملاحظہ ہو:

ہو معرکے میں عشق کے قاضی نہ کیونکر موت — جھگڑا یہ وہ نہیں ہے کہ جو بے قضا چکے
اپنا ہی دل نہ پھیر سکے رنج سے یار کے — سر اپنا خوب حضرتِ ناصح پھر اچکے (؟)
دیکھو خدا کے نام نے روشن کیا نشاں — دشمن ہمارے نام کو کیا کیا مٹا چکے (؟)

۳۶۔ دیوان = ۱۱؛ ۲۵۔ آزاد = ۱۸۔ مطلع:

ابرِ تر آنسو بہانا کوئی ہم سے سیکھ جائے — برقِ مضطر تلملانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

آزاد نے "ابرِ تر" کو "ابر کیا" اور "برقِ مضطر" کو "برق کیا" ہے — بدل کر مطلع بے کار کر دیا۔ اس سے جی نہیں بھرا تو دوسرا مطلع کہا اور اسے مقدم رکھا:

چپکے چپکے غم کا کھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے — جی ہی جی میں تلملانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

ڈاکٹر علوی نے حواشی میں اس غزل کا حوالہ اس طرح درج کیا ہے ۱۸، بیاض، طبقات لیکن انھوں نے مختلف تذکروں کے ذیل میں اس کے صرف "اشعر کی نشاندہی کی، ۲ شعر کا اضافہ کیا ہے جس میں ایسے اشعار بھی ہیں:

جھوٹ موٹ افیون کھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے — آن کو کف لا کر ڈرانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
زخم تو سیتے ہیں سب پر سوزنِ الماس سے — چاک سینے کے سلانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
پوچھے مُلّا سے جسے کرنا ہو سجدہ سہو کا — سیکھے گر اپنا بھلانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

اور انھیں بے ثبوت ذوق سے منسوب کرنا مشکل ہے

۳۸۔ دیوان = ۵؛ ۶۳ آزاد = ۱۱۔ مطلع:

جو خانۂ ہستی میں ہے انساں کے لیے ہے — آراستہ یہ گھر اسی مہماں کے لیے ہے

اس "ناتمام" غزل کو چھٹے شعر کے اضافے سے آزاد نے "تمام" کرنے کی کوشش کی ہے:

میں کس کی نگاہوں کا ہوں وحشی کو مری خاک — اک کحلِ بصر چشمِ غزالاں کے لیے ہے (؟)
کچھ میرے نصیبوں سے زیادہ جو سیاہی — باقی ہے تو میری شبِ ہجراں کے لیے ہے (؟)
عاشق کا جنوں طرفہ تماشا ہے کہ ہر بات — گویا سبق اطفالِ دبستاں کے لیے ہے (؟)
وہ زلفِ سیہ پھینکتی کیوں دام ہے دل پر — یہ صید کسی پنجۂ مژگاں کے لیے ہے (؟)
دل بھی ہے مرا جان ترے مشقِ ستم کی — جو تیر ہے اس تودۂ طوفاں کے لیے ہے (؟)
دل قیدِ تعلق سے نکل سکتا نہیں ذوق — کیا در نہیں اس خانۂ زنداں کے لیے ہے

۳۹۔ دیوان = ۸+۱؛ ۳۷ آزاد = ۱۷۔ مطلع:

چینی تو نے افشاں جو لے مہ جبیں ہے — تاروں میں کیا کیا چناں و چنیں ہے

دیوان میں کل ۹ شعر ہیں جن میں ایک تتمے میں ہے۔ آزاد نے ۸ شعر کا اضافہ کیا ہے۔ کچھ شعر یہ ہیں:

آزاد نے اسے یوں بنا دیا :

جو تھے مژگانِ پرخوں سب وہ خارِ دشتِ نکلے
جنوں یہ کیسے نشتر تھے کہیں ڈوبے کہیں نکلے

اگرچہ ان کو اس کا حق نہیں پہنچتا تاہم مصرعِ ثانی میں آزاد کی اصلاح اچھی ہے۔ البتہ "تھے" کی جگہ "ہیں" بہتر ہوتا۔ بہرحال اس غزل میں ۸ شعر کا اضافہ کیا گیا ہے لیکن جس طرح آزاد تحریف سے اچھے بھلے شعر کو مہمل کر دیتے ہیں۔ اسی طرح اضافے کے اشعار بھی کچھ مہمل قسم کے ہوتے ہیں۔ چند شعر دیکھیے :

قلم کی دیکھو گل کاری دمِ تحریرِ حالِ دل
کہ جائے حرف گلہائے انارِ آتشیں نکلے

مصرعِ ثانی میں کاف بیانیہ محض وزن پورا کرنے کے لیے ہے۔ مصرعے پوری طرح مربوط بھی نہیں۔

زیادہ جان کے جانے سے غم ہے تیرے جانے کا
الٰہی جانے سے پہلے مری جانِ حزیں نکلے [؟]

تباہی میں ہے موذی کی حلاوت اہلِ عالم کی
کہ ویراں خانۂ زنبور ہو جب انگبیں نکلے [؟]

ہوئے تم چیں بر ابرو ہو کے میرے قتل کے درپے
جھکنے سے تمہارے جوہرِ شمشیرِ کیں نکلے [؟]

۳۲ ویران ۰، ۱۱؛ ۳۱ آزاد ۰، ۹ مطلع :

ہم تم۔ ساعدِ ا اپنا کسی کو نہیں پاتے
تم پاتے ہو ہم کو تو چھری کو نہیں پاتے

اس میں یہ دو شعر بڑھائے گئے ہیں :

رکھتے ہیں دمِ شعلہ فشاں اژدرِ دوزخ
لیکن مری آتشِ نفسی کو نہیں پاتے

وہ دن ہیں کہاں بہتے تھے جب چشم سے چشمے
اب نام کو بھی ان میں نمی کو نہیں پاتے

۳۴۔ ویران ۰ ۲۵؛ ۳۲ آزاد ۰ ۲۹ مطلع :

مژے یہ دل کے لیے تھے نہ تھے زباں کے لیے
سو ہم نے دل میں مزے سوزشِ نہاں کے لیے

اس غزل سے پہلے ایک طویل نوٹ ہے جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔ یہاں وہ ۴ شعر درج کیے جاتے ہیں جو آزاد نے بڑھائے ہیں :

دمِ عروج ہے کیا فکر نردباں کے لیے
کمندِ آہ تو ہے بامِ آسماں کے لیے [؟]

نگاہِ ناز نے کی دیر ورنہ میں تیار
ہوں کب سے بیٹھا ہوا مرگِ ناگہاں کے لیے [؟]

مری تو گور پہ جام و سبو کی ہو تصویر
کہ یادگارِ زمانہ رہے نشاں کے لیے [؟]

اشارہ چشم کا تری یکایک اے قاتل
ہوا بہانہ مری مرگِ ناگہاں کے لیے

یہ دوسرے شعر کو دوبارہ کہا ہے۔

۳۵۔ ویران ۰ ۱۲+۱؛ ۲۴ آزاد ۰ ۱۷ مطلع :

جو دل قمارخانہ میں بت سے لگا چکے
وہ کعبتین چھوڑ کے کعبہ کو جا چکے

ویران میں اس غزل کے ۱۲ شعر ہیں۔ ڈاکٹر تنویر علوی نے ایک شعر بیاض نخر میں بتایا ہے اور وہ تتمے میں موجود ہے۔ آزاد نے غزل سے پہلے جو کہانی لکھی ہے اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ تحریفوں کے علاوہ انھوں نے تین شعر کا

فائدہ دے ترے بیمار کو کیا خاک دوا　　اب تو اکسیر بھی دیجے تو ضرر دیتی ہے
غنچہ ہنستا ترے آگے ہے جو گستاخی سے　　چٹخنا منہ پہ وہیں بادِ سحر دیتی ہے
شمع بھی کم نہیں کچھ عشق میں پروانے سے　　جان دیتا ہے اگر وہ تو یہ سر دیتی ہے

یہ شعر انھیں پسند نہیں آیا لہٰذا نسخے میں اسے یوں بنا دیا:

حسن بھی کم نہیں کچھ عشق میں جانبازی سے　　جان پروانہ جو دے شمع بھی سر دیتی ہے
نخلِ مژگاں سے ہے کیا جانئے کیا چشمِ ترمر　　چشم پانی کی جگہ خونِ جگر دیتی ہے [۹۱]
کہتے سنتے نہیں کچھ ہم تو شبِ ہجر میں پر　　نالۂ دل کا جواب آہِ سحر دیتی ہے [۹۱]

۲۸۔ دیوان، ۷۔ ۲۷ آزاد، ۱۰۔ مطلع:

مزے جو موت کے عاشق بیاں کبھو کرتے　　مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے

معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کے ذہن میں میر درد کا مطلع چھایا ہوا تھا:

یہ آرزو تھی تجھے گل کے رو برو کرتے　　ہم اور بلبلِ بیتاب گفتگو کرتے

لہٰذا یہ مطلع تصنیف کیا اور پہلے اسی کو درج کیا:

مزہ تھا ہم کو جو بلبل سے دو بدو کرتے　　کہ گل تمہاری بہاروں میں آرزو کرتے [۹۱]

اس کے علاوہ یہ دو شعر بھی آزاد ہی کی تصنیف ہیں:

نہ رہتی یوسفِ کنعاں کی خوبیِ بازار　　مقابلہ میں جو ہم تجھ کو رو برو کرتے
چمن بھی دیکھتے گلزارِ آرزو کی بہار　　تمہاری یادِ بہاری میں گر رفو کرتے [۹۱]

۲۹۔ دیوان، ۹۔ ۲۷ آزاد، ۱۰۔ مطلع

ناساز ہے جو ہم سے اُسی سے یہ ساز ہے　　کیا خوب دل ہے واہ رہیں جس پہ ناز ہے

اس میں آزاد نے یہ شعر بڑھایا ہے:

ہر برگِ گل کے لب سے ٹپکتا ہے خوں پڑا　　گلشن میں کس کی خاکِ شہیدانِ ناز ہے [۹۱]

"کس کی خاک ہے" یہ مصرع مکمل اور بامعنی تھا، "کس کی خاکِ شہیدانِ ناز" مہمل ہے۔

۳۰۔ دیوان، ۹؛ ۲۹ آزاد، مطلع:

ساقیا عید ہے لا بادہ سے مینا بھر کے　　کہ مے آشام پیاسے ہیں مہینا بھر کے

آزاد نے یہ شعر بڑھایا ہے:

دل ہے آئینہ صفا چاہیے رکھنا اس کا　　زنگ سے بھرتا ہے کیوں اس میں تو کینہ بھر کے

۳۱۔ دیوان، ۹؛ ۳۰ آزاد، ۱۷۔ مطلع:

نہیں مژگاں پہ خونِ خارِ غم تجھے دلنشیں نکلے　　جنوں یہ نیشتر کیسے کہیں ڈوبے کہیں نکلے

گل میدھی کیوں نہ باغ میں ہو پائمال رشک
پاؤں میں تیرے دیکھ حنا گر لگی ہوئی

۲۱۔ دیوان، ۱۸/۲۰ آزاد، ۱۹۔ مطلع:

تجھ کو کچھ یاد بھی ہیں پہلے وہ الفت کے مزے
بے مزہ ہونے کے لطف اور وہ شکایت کے مزے

آزاد نے اس سے پہلے اپنا کہا ہوا مطلع درج کیا ہے:

مجھ سے کچھ پوچھو نہ خوننابۂ حسرت کے مزے
بے مزہ ہونے کے لطف اور وہ شکایت کے مزے

۲۲۔ دیوان، ۱۱/۱۷ آزاد، ۱۳۔ مطلع:

اوّل ہی سے بشر کو ہے رغبت خلاف سے
لیتا تھا کام منہ کا شکم میں یہ ناف سے

آزاد نے اس میں دو شعر بڑھائے ہیں:

طوف سیاہ خیمۂ لیلیٰ ہوا نصیب
مجنوں سمجھو کعبے کے بہتر غلاف سے [؟]

طواف کعبے کا کیا جاتا یا غلاف کا؟

جوں تیغ خوش غلاف نگہ تیری اے پری
بے دم بدم نکل کے جھکتی کے غلاف سے [؟]

۲۳۔ دیوان، ۲۲/۱۷ آزاد، ۱۸۔ مطلع:

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے
اُن کی قسمت میں ہے جو لوگ ہیں قسمت والے

آزاد نے ایک شعر بڑھایا ہے:

بے نصیبوں کے نصیبوں میں کہاں یار کا وصل
اُن کی قسمت میں ہے جو لوگ ہیں قسمت والے

۲۵۔ دیوان، ۱۱/۲۴ آزاد، ۱۳۔ مطلع:

ہوئے وہ کب قائل قیامت جو ترا قامت نہ دیکھ لیں گے
رہیں گے رویت سے بلکہ منکر جو تیری صورت نہ دیکھ لیں گے

آزاد نے اس میں دو شعر بڑھائے ہیں:

کہوں یہ کیوں میں کہ حضرت دل شکر لبوں پر نہ زہر کھاؤ
کہ آپ ہی تلخی محبت کی وہ حلاوت نہ دیکھ لیں گے

اگرچہ حد محبت اپنا کہا نہ میں نے زباں سے اپنی
وہ میری صورت نہ دیکھ لیں گے وہ میری حالت نہ دیکھ لیں گے

۲۶۔ دیوان، ۲۶/۵ آزاد، ۱۴۔ مطلع:

یہ اقامت ہمیں پیغام سفر دیتی ہے
زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے

آزاد نے اس میں ۲ شعر کا اضافہ کیا ہے۔ ذوق کا ایک شعر تھا:

تپ دل شمع کی جب کم نہیں ہوتی ناچار
اس کو کافور سفیدی سحر دیتی ہے

آزاد نے اسے اپنے مزاج کے مطابق بدل دیا:

شمع گھبرا نہ تپ غم سے کہ اک دم میں ابھی
آکے کافور سفیدی سحر دیتی ہے

لیکن شاید اس سے طبیعت نہیں بھری۔ چنانچہ اس شعر کا اضافہ کر دیا:

شعر یہ ہیں:

رات بھاری تھی سر شمع پہ سو ہو گزری
کیا طباشیر سفیدی سحر دیتی ہے

یہاں یہ ذکر کردینا مناسب ہوگا کہ کلیات میں اور آزاد میں ان اشعار کے متن میں خفیف سے اختلافات بھی ہیں گویا بعد میں اصلاح ہوئی ہے اور یہی بات انھیں مشکوک کرتی ہے

۱۷۔ ویران ، ، ، ۱۵۔ آزاد ، ۹ ۔ مطلع :

خوب روکا شکایتوں سے مجھے　　　تونے مارا عنایتوں سے مجھے

آزاد نے یہ دو شعر بڑھائے ہیں :

حالِ مہر و وفا کہوں تو کہے　　　نہیں شوق ان حکایتوں سے مجھے

ذوق کو بلند پرواز بنانے کی دھن میں کبھی کبھی آزاد ایسی عجیب و غریب باتیں کرتے ہیں کہ ان کی شعر فہمی بلکہ صحیح الدماغی پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ مثلاً "مہر و وفا" پر آزاد حاشیے میں لکھتے ہیں : "مثنوی مہر و وفا فارسی میں ایک عمدہ مثنوی ہے۔ پہلے زلیخا، بوستان، سکندر نامہ کی طرح تعلیم میں داخل تھی۔ اب اُس کا رواج نہیں رہا۔ یہ اُسی طرف اشارہ ہے۔ کون سمجھتا ہے اب ان اشاروں کو۔ خواجہ حافظ نے بھی کہا ہے :

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم　　　از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس"

ہم اُس دور کی فارسی درسیات سے واقف نہیں، لیکن اتنا سمجھتے ہیں کہ حافظ کے شعر میں مہر و وفا کسی مثنوی کا نام نہیں ہے۔ آزاد کے اس بیان پر پروفیسر شیرانی مرحوم نے اپنے مضمون میں تفصیل سے بحث کی ہے۔

کی گریہ نے جلا دیا دل　　　ہوا نقصاں کفایتوں سے مجھے

یہ ذوق کے اس شعر کا منہ چڑایا ہے :

کرنہ گریہ میں تو کمی اے چشم　　　شوق کم ہے کفایتوں سے مجھے

۱۹۔ ویران ، ، ۱۱، ۱۸۔ آزاد ، ۱۲۰ ۔ مطلع

دل کی معاش عشق اسے غم کی تلاش ہے　　　ڈرتا ہوں دل سے میں کہ بڑا بدمعاش ہے

ذوق نے کاش کا قافیہ چھوڑ دیا تھا۔ آزاد نے باندھ دیا !

ہے کس مزہ سے عشق میں اپنی ہوئی بسر　　　افسوس لب پہ کبھی دل میں کاش ہے

"بسر ہوئی" "نہیں" بسر ہوتی" کا مقام تھا۔

۲۰۔ ویران ، ۱۱، ۱۹ آزاد ، ۱۲۰ ، مطلع :

ہے تیکر کان زلفِ معنبر لگی ہوئی　　　رکھے گی یہ نہ بال برابر لگی ہوئی

آزاد نے یہ شعر چھوڑ دیا ہے :

بیٹھے ہیں دل کے بیچنے والے ہزار ہا　　　گذری ہے اُس کے راہگذر پر لگی ہوئی

اور اس کی جگہ یہ دو شعر بڑھائے ہیں :

میرا گل امید شگفتہ ہو کس طرح　　　دل کی گرہ ہے اس کی گرہ پر لگی ہوئی [؟]

کیا ہے۔ اس لحاظ سے ہمارا حساب غلط ہوا کہ ۱۱ میں سے نکالنے تھے ۱۲ میں سے نہیں]
اس طرح ۵ شعر ویران سے زیادہ ہیں۔ آزاد نے ایک شعر اس طرح نقل کیا ہے ؛

مت لگائے عشق دل کے آبلہ پر نقش غم — ٹوٹ جائے گا یہ گنبد اس کلس کے بوجھ سے

"نقش غم" غالباً سہو کتابت ہے، "نیش غم" ہوگا۔ باقی چار شعر حسب ذیل ہیں؛

تھا قدرعنا کبھی پر لب ہوس کے بوجھ سے — جھلملاتا سا ہے شعلہ اک نفس کے بوجھ سے

بدنصیبی سے مری اس بام پر ٹوٹی کمند — ورنہ میں کیا۔ وہ نہ ٹوٹے مجھ سے دس کے بوجھ سے

انشا کے اثر سے آزاد نے دیواریں پھاندنے کے ایسے اوشعر بھی ذوق کو بخشے ہیں۔ یہ بھی انھیں کے ذہن کی اپج ہے۔

شاخ گل کیا مال ہے گر ہم گراں جاتی پہ آئیں — توڑدے لوہے کے حلقے کو قفس کے بوجھ سے [؟]

سر جھکاتے ہیں وہ آزاد اپنا کب مانند سرو — ہے سبکساری جنھیں بارہوس کے بوجھ سے

"بارہوس کے بوجھ سے" ؟ کیا مطلب۔

۱۳۔ ویران ۰ ۱۴؛ آزاد ۰ ۱۵۔ مطلع

زخمی ہوں میں اُس ناوکِ دزدیدہ نظر سے — جانے کا نہیں چور مرے زخم جگر سے

آزاد نے یہ ایک شعر بڑھایا ہے ؛

لبریز صفا سے سو جام بلوریں — زمزم سے ہے مطلب نہ صفا سے نہ حجر سے [؟]

۱۴ ویران ۰ ۱۴؛ ۵، آزاد ۰ ۱۵۔ مطلع ؛

کچڑا ذرا سا اور وہ پتھر میں گھر کرے — انساں وہ کیا نہ جو دل دلبر میں گھر کرے

اس غزل میں مقطع نہیں تھا۔ آزاد نے مقطعے کا اضافہ کیا ہے ؛

دزدیدگہ تو آنکھوں میں گھر کر رہے ہیں ذوق — دل جس کا گم ہوا۔ کہو کس گھر میں گھر کرے [؟]

۱۵۔ ویران ۰ ۹؛ ۱۴ آزاد ۰ ۱۴۔ مطلع ؛

آتا نہیں ہے طلعت کیا دیر لگائی ہے — کھینچ اے کشش الفت کیا دیر لگائی ہے

ویران میں اسے ناتمام کہا گیا ہے۔ ڈاکٹر علوی نے اس کے ۱۶ شعر درج کیے ہیں۔ ماخذ بیاض ہے لیکن اس میں ۱۴ شعر ہیں علوی صاحب نے اس کے ۱۲ شعر بیاض باجر میں موجود بتائے ہیں۔ ویران میں جو پانچ شعر آزاد سے کم ہیں ان کا انداز ذوق کے کلام سے کچھ مختلف نہیں لگتا۔ البتہ مندرجہ ذیل تین شعر بیاض باجر میں بھی نہیں ہیں؛

آنا بھی کہیں تیرا آنا ہے قیامت کا — اے دلبر خوش قامت کیا دیر لگائی ہے

پروانے سے کہتی ہے یہ شمع کہیں جل چک — ہے تجھ میں اگر جرأت کیا دیر لگائی ہے

کس فکر میں ہے ساقی دے بادہ جو ہے باقی — تھوڑی ہے یہاں فرصت کیا دیر لگائی ہے

۱۰۔ ویران ، ۲۸؛ آزاد ، ۳۱۔ مطلع:

الگ تا ہو نہ کھینچ کھینچ کر مرا ہر تار دامن سے — نہ دامن خار سے چھوٹے نہ چھوٹے خار دامن سے

ڈاکٹر تنویر علوی نے کلیات میں اس غزل کے ۲۴ شعر درج کیے ہیں اور اس کا ماخذ بیاض اور بیاض فخر کو بتایا ہے لیکن ان دونوں میں اشعار کی تعداد ۲۰ بتائی ہے۔ آزاد میں ۳۱ شعر ہیں گویا ایک شعر ترتیب دیوان کے وقت بڑھایا گیا۔ جو تین شعر ویران میں نہیں ملتے بہ قول ڈاکٹر علوی بیاض فخر میں موجود ہیں۔ ویران میں اس غزل کو نا تمام نہیں لکھا۔ اس لیے جو ۳ شعر اس میں نہیں ان کے بارے میں شبہ پیدا ہوتا ہے۔ بہر حال چوں کہ دوسرے تذکروں میں انھیں موجود بتایا گیا ہے، ہم انھیں نظر انداز کرتے ہیں۔

۱۱۔ ویران ، ۷؛ آزاد ، ۱۲۔ مطلع:

ہوں یہ لاغر جھک کے قامت ایک خس کے بوجھ سے — جوں کباوہ لچکے ہے پلّے مگس کے بوجھ سے

آزاد نے خط کشیدہ ٹکڑے کو "ہے کباوہ جو لچک جائے" کر کے شعر مہمل کر دیا ہے۔

بہ قول ڈاکٹر تنویر علوی تذکروں میں اس کے ۸ شعر ہیں فی الوقت پاکستانی اڈیشن کے حواشی پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوا کہ تذکروں میں اس کے سات ہی شعر ہیں۔ ممکن ہے کلیات کے ہندستانی اڈیشن میں ڈاکٹر صاحب نے ۸ شعر بتائے ہوں یا پھر یہ ہے کہ حواشی میں ڈاکٹر صاحب نے مختلف تذکروں میں ۴۔ ۴ مختلف اشعار کو عدم موجود بتایا ہے۔ ہو سکتا ہے ہم نے ۱۲ میں سے ۴ منہا کر کے یہ نتیجہ نکال لیا ہو کہ تذکروں میں ۸ شعر ملتے ہیں۔ حالاں کہ ڈاکٹر علوی نے اس غزل کے ۱۱ شعر ایک جگہ اور ایک مطلع بروایت آزاد دوسری جگہ درج

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ

پاس نہیں تھا گزشتہ برس کی طرح اس برس بھی ہم نے تعطیلات کے دوران دلّی میں بیٹھ کر کتاب کی تکمیل کا پروگرام بنایا چناں چہ گزشتہ ایک ماہ ۱۲ دن سے ہم دلّی میں بیٹھ کر لکھنے کے کام میں مصروف ہیں۔ اسی اثنا میں کئی ایسی کتابیں جو پہلے نہیں مل سکیں تھیں میسر آگئیں اور وہ کتابیں بھی دستیاب ہوئیں جنہیں ایک بار دیکھ کر واپس کر دیا تھا۔ انھیں میں کلیات کے پاکستانی اڈیشن کی دو جلدیں بھی ہیں جو برادرم رشید حسن خاں نے یہ کہہ کر ہمارے حوالے کر دی تھیں کہ لے جائیے۔ خدا جانے کتنی بار دیکھنے کی ضرورت پیش آئے: آج (۵ اگست ۸۵ء) مسودہ صاف کرتے ہوئے کلیات دیکھا جائے: پر نظر پڑی تو ہم نے دونوں جلدیں نکال کر حواشی دیکھنا شروع کیے معلوم ہوا کہ وہی شعر جو ویران میں ہیں کئی دیگر تذکروں میں بھی موجود ہیں۔ ہم نے مذکورہ بالا اشعار جن کے لیے کہا ہے: "کسی طرح ذوق کے نہیں ہو سکتے" کا حوالہ تلاش کرنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ یہ کسی تذکرے میں نہیں ہیں۔ ہمارے حساب سے ۱۲ شعر اضافہ شدہ ہیں۔ ان میں صرف ایک شعر:

روزِ ازل سے زلفِ معنبر کا ہے اسیر — کیا اڑ کے تجھ سے طائرِ نکہت بھلا چلے

کے لیے ڈاکٹر علوی نے لکھا ہے کہ گلستان میں ملتا ہے۔ اس سے ہمارے شبہے کی تصدیق ہوئی کہ صرف آزاد میں ملنے والا کلام ذوق کا نہیں۔ بلکہ آزاد کا مصنّفہ ہے۔ اور ذوق نے کوئی دو غزلہ نہیں کہا۔ (عابد)

عشق کو گر امتحاں پر میرے قصد فال ہے
اُس کی ٹھوکر کا ہوں دیوانہ کہ جس کے پاؤں میں
پوچھے کیا ہو شکستہ دل کی صورت دیکھ لو
بندش کے اس شعر کی ہئیت کذائی ہے :
کھل گیا مضمون شکستِ دل کا بے خطے پڑھے

۱۔ دیوان ۰۰۱: ۵۹ آزاد ۰ ۱۲۔ مطلع :
کچھ نہیں چاہیے تجہیز کا اسباب مجھے
اس میں دو شعر کا اضافہ ہے :
سفرِ عمر ہے یارب کہ ہے طوفانِ بلا
ہر شعر پر درد کے شعر کا چربہ ہے :
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ذوق کی غزل میں مقطع نہیں تھا۔ آزاد نے یہ مقطع بڑھا دیا:
گردشِ چرخ ہے لے ذوق بہندس کے لیے

۹۔ دیوان ۰۰۱: ۸ آزاد ۰ ۲۲۔ مطلع
لیتے ہی دل جو عاشقِ دل سوز کا چلے
کلیات میں کچھ اشعار کے لیے فخر اور گلستان کا حوالہ دیا گیا ہے ؛ لیکن اس غزل میں مندرجہ ذیل اشعار بھی ہیں جنھیں ذوق سے منسوب کرنا مشکل ہے :
دنیا میں جب سے آ گئے رہا عشقِ گل رخاں
قاتل سے وصل کیا ہے کہ جا تر ہو اپنا ہوش
فکرِ قناعت ان کو میسر ہوئی کہاں
اس رو سے آتشیں کے تصور میں یادِ زلف

جوشِ داغِ دل بجوم نقطہ رماں ہے [۹]
گردشِ رنگِ پری لئے حلقہ خلخال ہے [۹]
نامہ ہے چیں بر جبیں قاصد شکستہ حال ہے [۹]

نامہ بر کا اس قدر اپنے شکستہ حال ہے

عشق نے کشتہ کیا صورتِ سیماب مجھے

ہر قدم سیلِ حوادث کا ہے گرداب مجھے

ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

آسماں اس کو نظر آتا ہے دولاب مجھے [۹]

تم آگ لینے آئے تھے کیا آئے کیا چلے

ہم اس جہاں میں مثلِ صبا خاک اڑا چلے
گراز کے مثلِ طائرِ رنگِ حنا چلے
دنیا سے دل میں لے کے جو حرص و ہوا چلے
ہے کیا غضب کہ آگ لگے اور ہوا چلے

دیوان میں اس غزل پر "غزل اول ناتمام" لکھا ہے۔ اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا اس زمین میں ذوق نے دو غزلہ کہا تھا اور یہ ان میں پہلی ہے اور ناتمام ہے ؛ اگر ایسا ہے تو پھر ممکن ہے جن شعروں کا گلستان وغیرہ میں ملنے کا ذکر کلیات میں آیا ہے وہ اس دوسری غزل کے ہوں۔ تاہم مندرجہ بالا اشعار کسی طرح ذوق کے نہیں ہو سکتے۔

متن میں یہ دعویٰ ہم نے بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے کر دیا تھا لیکن غالباً دل کی کھٹک فرو نہ تھی بلکہ مندرجہ اشعار کے ساتھ مسودے کے حاشیے میں ہم نے لکھ دیا تھا۔ کلیات دیکھا جائے۔ کلیات سے مراد پاکستانی اڈیشن ہے کہ اسی میں حواشی لکھے ہیں اور یہ ہمارے

اضافہ نہ کرسکے۔ صرف ایک شعر بڑھانے پر اکتفا کر گئے۔ ذوق کا مقطع تھا،

بے تمیزوں کو ہو نقصان لطف ذوق — لیں ہیں نام طفل آدھا پیار سے

آزاد کو یہ مقطع پسند نہیں آیا۔ چناں چہ انھوں نے اسے اپنی اصلاح سے شعر بنا دیا:

بے تمیزوں کی ہے اُلفت نقص نام — لیں ہیں نام طفل آدھا پیار سے

(آزاد، خود تو اتنے مبہم شعر کہتے ہیں لیکن ذوق کے کلام میں ذرا سا ابہام ان سے برداشت نہیں ہوتا۔ چناں چہ اُسے دور کرنے کے لیے شعر میں اصلاح کی لیکن مفہوم یکسر بدل گیا اور معنی خبط ہو گئے) چناں چہ بدلے میں انھیں اپنا قطع کہنا پڑا:

دل کو ہر دم عالم معنی سے ذوق، — ہے خبر آتی نفس کے تار سے

عالم معنی سے ذوق کا سلسلہ وہ پہلے بھی وابستہ کر چکے ہیں

سلسلہ وابستہ تھا کچھ عالم معنی سے ذوق — ورنہ تھیں یہ تیلیاں کب اپنے بس کی تیلیاں

۲۔ دیوان، ۲۰، آزاد، ۳۰ مطلع:

ترے کوچے کو وہ بیمار غم دار الشفا سمجھے — اجل کو جو طبیب اور مرگ کو اپنی دوا سمجھے

اس میں آزاد نے ۳ شعر کا اضافہ کیا ہے۔ اس سے پہلے آدمی یہی کوئی چھوٹی ایک کہانی بھی درج کی ہے جسے نظر انداز کیا جاتا ہے:

غلط فہمی ہماری تھی جو اُن کو آشنا سمجھے — ہم اُن کو دیکھو کیا سمجھے تھے اور وہ ہم کو کیا سمجھے

جو کچھ دل پر گزرتی ہے سنائیں گے ہم اس بت کو — تمہی کہو ذرا دل میں کہ سمجھے بھی تو کیا سمجھے (؟)

۳۔ دیوان، ۱۳، آزاد، ۲۰۔ مطلع:

کہاں تلک کہوں ساقی کہ لا شراب تو دے — نہ دے شراب ڈبو کر کوئی کباب تو دے

آزاد نے اس میں سات شعر کا اضافہ کیا ہے:

دل برشتہ کو میرے نہ چھوڑیے نے خوار — جو لذت اس میں ہے ایسا مزا شراب تو دے (کباب)

کہاں کبھی ہے تہہ خاک میری آتش دل — کہو ہوا سے ہلا دامن سحاب تو دے (؟)

شہید کرتا ہے قاتل تو پھر ہے جلدی کیا — ذرا ٹھہرنے تہ تیغ اضطراب تو دے

زبان خنجر قاتل نے کیا کہا تجھ سے — دل شہید تو چپ کیوں ہے کچھ جواب تو دے

بلا سے کم نہ ہو گریہ سے میرا سوز جگر — بجھا پر ان کی ذرا آتش عتاب تو دے

ان میں ذوق کے اشعار کی سی کوئی بات نہیں ملتی۔ ان کی بے ربطی اور مہمل پن کسی تبصرے کا محتاج نہیں۔ کلیات میں بیاض کے حوالے سے جو شعر نقل ہوئے ہیں اُن کا متن اور بھی عجیب ہے۔

۵۔ دیوان، ۱۱، آزاد، ۲۰۔ مطلع:

زخم دل پر کیوں مرے مرہم کا استعمال ہے — مشک گر نہ بنگا ہے تو کیا لون کا بھی کال ہے

اس میں آزاد نے دس شعر کا اضافہ کیا ہے، دو تین شعر دیکھیے:

چشم و دہانِ حرص سے، کون غیرِ مرگ

آخر چمن سے نکہت گل کر گئی سفر — بخیہ کا تا بدان کے بے تار کفن کے ساتھ [؟]

ہوا مصرع، نہیں ہوتی، کا متقاضی ہے۔ — خانہ بدوش کو نہیں الفت وطن کے ساتھ

نا کوئی وطن ہو۔ اس کا تو سرے سے کوئی وطن ہی نہیں ہوتا۔ بہرحال خانہ بدوش کو وطن کے ساتھ الفت تو جب ہو یا نہ ہو کہ جب

بوں زلفِ عنبریں کا جو کشتہ تو کیا ہوا — کہ دو کفن سیاہی مشکِ ختن کے ساتھ

رے مربوط نہیں ہیں۔

منظور مجھ کو کب ہے یہ اے میرے آفتاب — ہو کوئی تیرہ بخت ترا سایہ بن کے ساتھ [؟]

داغِ دلِ فسردہ پہ پھاہا نہ ہو نہ ہو — کام اس چراغِ مردہ کو کیا ہے کفن کے ساتھ [؟]

جلد اگر مر جائے کوئی خانماں خراب — ٹکرا کے اپنا سر در بیت الحزن کے ساتھ [؟]

. کلیات میں یہ مطلع ویراںؔ اور عمدہؔ کے حوالے سے درج ہے۔ ہمیں دونوں میں نہیں ملا :

کر دعا میرے لیے شیخ مناجات میں یہ — ہو خرابات میں یہ

کر خراب اور زیادہ

اب سب سے بڑی ردیف شروع ہوتی ہے یعنی ردیف یائے تحتانی۔ نسخۂ ویراںؔ میں تمام و ناتمام

حروفات ملا کر ۱۱۰ غزلیں یا ۶۵۴ شعر اور ۲۱ شعر تتمے میں ہیں۔ اس طرح کل ۶۸۵ شعر ہوئے۔ آزادؔ میں تمام و

ناتمام غزلیات ملا کر ۲۵۲ ہو گئی ہیں اور اشعار ۱۲۲۳۔ اس طرح آزادؔ نے ۶۲۸ شعر یعنی تقریباً اتنے ہی شعر کا

اضافہ کر دیا ہے جتنے شعر ذوقؔ کے ہیں۔ ذیل میں فرداً فرداً سب اضافوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

۱۰ ویراں = ۳۱، آزاد = ۳۲ مطلع :

ہیں ترے رشکِ خطِ رخسار سے

دل میں آئینے کے جوہر خار سے

پروفیسر شیرانی نے اس غزل کو مشکوک کلام میں رکھا ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ جب انھوں

نے اپنا مضمون لکھا تھا، اس وقت نسخۂ ویراں ان کے پیشِ نظر نہیں تھا اور دوسرا سبب آزادؔ کا یہ نوٹ ہوا ہوگا:

بہت پرانی غزل ہے۔ والد مرحوم کے لڑکپن کی بیاض میں لکھی تھی..... اوّل تو یہ لڑکپن کی یا آغازِ شباب" کی

باقی بہ قولِ آزاد ضائع ہو چکی تھی۔ دوسرے بہت پرانی غزل کا کوئی ثبوت نہیں۔ ذوقؔ کے کلام کا آغاز

معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں ذوقؔ نہ صرف مختصر غزلیں کہتے تھے بلکہ ان میں مطلعوں کی بھرمار بھی نہیں ہوتی

تھی۔ اسی بات نے شیرانی مرحوم کو مشکوک کیا ہوگا۔ ویسے اس زمین میں مومنؔ کی غزل بھی موجود ہے۔ اس

کا مطلب ہے یہ طرحی ہوگی۔ مومنؔ اگرچہ ذوقؔ کے خواجہ تاش ہیں۔ تاہم وہ ان سے عمر میں چھوٹے تھے

شعر کہنا بھی بعد میں شروع کیا ہوگا۔ اس غزل میں دس مطلعے ہیں۔ ان سب باتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے

آزادؔ کا مذکورہ بیان تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال یہ غزل پہلے ہی خاصی طویل ہے اس لیے آزادؔ اس میں

۴۳ ۔ یہ مطلع بھی اور کہیں نہیں ملتا :

نہ شبنم کو کہو بلبل کے آنسو　　　یہ ہنتے ہنستے نکلے گل کے آنسو

۴۴ : * ایک دن نئے اور پُرانے الفاظ کے اِستعمال پر کچھ فرما رہے تھے۔ ایک اپنا مطلع پڑھا اور کہا کہ بچپن میں ہم تک اکثر بزرگوں سے سُنتے تھے۔ خود بھی کہہ دیتے تھے :

ٹک دیکھیو اس لذتِ پیکاں کے اثر کو　　　جنبش مرے اب تک ہے لبِ زخم جگر کو

(آزاد) دوسرے مصرع کو دیکھو کیا چستی سے لفظوں کو بٹھایا ہے کہ ایک جنبش نہیں ہو سکی :

اس بیان پر یقین کرنا مشکل ہے۔ آزاد پہلے بھی زخم جگر کے لبوں کو ہلا چکے ہیں، اب ایک بار پھر کوشش کی ہے: اس کے پیکاں کی لذّت کے اثر کی جگہ "اس لذتِ پیکاں" کہنا عجزِ بیان نہیں تو عجیب ضرور ہے۔ دوسرے مصرعے کی تاویل بعینہٖ اُسی انداز کی ہے جو انھوں نے "ولیکن تو بھی گر جا ہے کہ میں ٹھہروں نہ ٹھہرے گا" کے سلسلے میں اختیار کیا تھا۔

مطلع مرقومۃ الذیل لڑکپن کا کہا ہوا ہے :

دریا میں ترے حسن کے بلے ہیں بھنور دو　　　اور اس پہ غضب یہ کہ پڑے اس میں گرد دو

یہ لڑکپن کا کلام ہو یا نہ ہو اس انداز کا شعر ضرور ہے جو آزاد نے آگے چل کر کہا ہے۔ ع ایک طرح مچھلیاں دو کشش کش آپس میں ہے

ردیف ہائے ہوز

دیوان میں مکمل و متفرقات ملا کر کل ۹ غزلیں یا ۵، شعر ہیں آزاد میں دس غزلیں یا ۲ ۸ شعر۔ گویا آٹھ شعر کا اضافہ ہے۔ تفصیل حسب ذیل ہے :

۴۵ دیوان ۱۵ ؛ آزاد ۲۲۔ مطلع :

ہوش و خرد گئے نگہِ سحر فن کے ساتھ　　　اب جو ہے اپنی بات سو دیوانہ پن کے ساتھ

ترتیب اشعار میں اُلٹ پھیر کے علاوہ کئی جگہ آزاد نے پورے مصرعے بدل دیے ہیں اور شعر ذوق کے نہیں رہ گئے۔ ایک مثال دیکھیے :

اللہ ری تابِ حسن کہ اُس کا دُرِ بلاق　　　چشمک زنی کرے ہے سہیلِ یمن کے ساتھ

آزاد نے رعایت لفظی کے شوق میں پہلا مصرع یوں بنا دیا :

ع　لب پر ترے پسینے کی بوندا ئے عقیق لب۔ بہرحال ہمیں اضافوں سے واسطہ ہے اور یہاں آزاد نے سات شعر کا اضافہ کیا ہے، کچھ شعر پیش ہیں :

بزمِ صنم میں حضرتِ دل ذکرِ کعبہ کیا　　　تھی جس چمن کی بات گئی اس چمن کے ساتھ

مصرعے نامربوط، بیان غلط، مفہوم مبہم۔

۱۸۔ اشعار ۰ ، ؛ مطلع ؛

دم ذبح تیغ جفا میں جب تری بہتا آب حیات ہو
توشہید ناز کو کیونکہ پھر نہ حیات بعد ممات ہو

اس پر آزاد نے یہ نوٹ لکھا ہے ؛

مجھے ابتدا سے سن رسیدہ لوگوں کی باتیں سننے کا شوق تھا۔ ایک بڈھے نے ایک دن کہا کہ ہمیں تمھارے اُستاد کی ایک غزل یاد ہے اُن کے لڑکپن کی ہے۔ وہ بے چارہ بے علم تھا اور طولِ عمر نے بدحواس کر دیا تھا۔ غلط سلط جو کہتا گیا میں نے لکھ لیا۔ اُستاد کو لا کر سنائی تو ہنسے اور فرمایا۔ بہت لڑکپن کی غزل ہے۔ کہاں سے ہاتھ آگئی۔ سرسری طور پر درست کر کے لکھوا دی۔ اور کہا کہ رکھ چھوڑو کسی فرصت میں بنائیں گے (کذا) (بندہ آزاد کہتا ہے) کہ کچھ ہو مگر اس کے قافیوں کو دیکھو کہ کیا کیا برجستہ پہلو سے بیٹھے ہیں۔ اور مضمون بھی صاف لڑکپن کے معلوم ہوتے ہیں۔

اس بیان پر یقین کرنے کا تو خیر کوئی سبب نہیں البتہ اتنا ضرور کہنا ہے کہ پروفیسر شیرانی نے اسے مشکوک کلام میں رکھا تھا۔ ڈاکٹر صادق کے مسودوں میں اگرچہ اس کا مسودہ شامل نہیں۔ تاہم اشعار کا انداز صاف جعل کی چغلی کھاتا ہے۔ آخری دو شعر بطور نمونہ درج ہیں :

ترا حسن وہ بت مہ جبیں کہ بصد وجہ پہ زباں نہیں
جو دکھائے رُخ تو ہو دن وہیں جو چھپائے منہ ابھی رات ہو

وہ مہ جبین رُخ دکھائے یا اس کا حسن ؟

جو ہیں مرتے حسن صفات میں وہ رہے گئے اپنی ہی بات میں
تو فنا ہو ذوق اسی ذات میں کہ جو ذات جملہ صفات ہو

حسنِ صفات پر مرتے ہیں یا صفات میں مرتے ہیں ؟ جو ذات ذاتِ جملہ صفات ہے۔ یہاں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ظہیر دہلوی نے اُستاد کے کلام میں ان ردیفوں سے چند کا اضافہ کیا جن میں ذوق کے اشعار نہیں ہیں اور آزاد نے انھیں ان بحروں میں شعر کہہ کر دینے کی کوشش کی جن بحروں کو انھوں نے چھوا بھی نہیں۔

۲۶ - یہ مطلع کہیں اور نہیں ملتا۔ تنویر علوی صاحب نے اپنے کلیات میں بھی شامل نہیں کیا ہے۔

غیر نے ایسا پڑھایا کچھ مرے محبوب کو
لاکھ ہجّوں سے پڑھا اس نے مرے مکتوب کو

فرماتے تھے یہ ہم نے امیر خسرو کے شعر کا ترجمہ کیا ہے اور ترجمہ کرتے ہیں تو اسی طرح کیا کرتے ہیں :

حق نے تجھکو اک زباں دی اور دیے ہیں کان دو
اس کے یہ معنی کہے ایک اور سُنے انسان دو

نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ترجمہ ہے اور واقعی ذوق نے کیا ہے، لیکن یہ یقین کہا جا سکتا ہے کہ اس کا ماخذ ذوق کا یہ شعر ہے جو اسی کے نیچے درج ہے اور دیوان کے تتمے میں موجود ہے

کہ حق نے زبان ایک دی کان دو
کہے ایک جب سُن لے انسان دو

یہ ممکن ہے امیر خسرو کے ہاں اس مضمون کا کوئی شعر موجود ہو اور آزاد نے حسب عادت اُستاد کو الزام سے بچانے کے لیے اسی مضمون کا ایک شعر کہہ کر ترجمے کی کہانی کے ساتھ استاد کو بخش دیا ہو۔

بہرحال ایک قطعہ اور دو ایک شعر دیکھیے:

ہمیشہ صدقہ اُس ابرو کے ہوئے حضرت دل (ق) یہ لب پہ نالۂ جانکاہ اپنے لاتے ہو
و یا طوافِ حرم میں ہے سامنے محراب اور اُس میں نعرہ لبیک تم سناتے ہو
ہوں خاک چاٹ کے کہتا ابھی شفا ہو جائے جو شربتِ لبِ میگوں ذرا چٹاتے ہو

شربت چٹاتا؟ مزید اشعار نقل کرنا بے سود ہے۔ سب شعر ایک سے ہیں۔

اِسی کے ساتھ نسخۂ ویران میں اِس ردیف کے شعر ختم ہوئے۔ اب وہ غزلیں جو صرف نسخۂ آزاد میں ملتی ہیں
ابتدا میں نمبر شمار آزاد کے مطابق ہیں۔

۱۰۔ اشعار، ۷، مطلع:

سرد مہری سے تری گر خونِ دل یخ بستہ ہو پھر نہ ٹپکے کوزۂ دل گرچہ سب بشکستہ ہو

ڈاکٹر علوی کے مطابق بیاض میں اِس غزل کے سات شعر ہیں لیکن خود انھوں نے کلیات میں صرف پانچ شعر لیے ہیں اور دو شعر چھوڑ دینے کی کوئی وجہ نہیں بتائی۔ اس کے علاوہ مقطع پہلے درج کرکے آخری دو شعروں کو قطعہ لکھا ہے۔ ظاہر ہے اس جعلی بیاض میں ایسا ہی ہوگا [اگرچہ آزاد نے دیوان میں نہ قطعہ لکھا ہے اور نہ ترتیب ہی کلیات یا بیاض کے مطابق رکھی ہے گویا ترتیب دیوان کے وقت انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوگیا اور انھوں نے اُس کا ازالہ کردیا۔] بہرحال ہم وہی دو شعر نقل کیے دیتے ہیں جنھیں ڈاکٹر علوی نے قطعہ بتایا ہے۔ قارئین کرام انھیں پر باقی شعروں کا قیاس کرلیں:

کیا نکالے سوزنِ الماس دل سے غم کی پھانس جتنی یہ کاوش کرے اتنی ہی یہ پیوستہ ہو
منہ سے جو نکلے مزا جب ہو کے ہووے دلنشیں آہ موزوں ہے کہ نالہ مصرعۂ برجستہ ہو

۱۵۔ اشعار، ۷، مطلع:

ہاتھ سینہ پہ مرے رکھ کے کدھر دیکھتے ہو اِک نظر دل سے اِدھر دیکھ لو گر دیکھتے ہو (؟)

پروفیسر شیرانی نے اس غزل کے مشکوک قرار دیا تھا۔ اِس جعلی غزل کا مسودہ ڈاکٹر صادق کو ملنے والے مسودوں میں بھی شامل تھا۔ لہٰذا اس کا تجزیہ نظر انداز کیا جاتا ہے۔ مطلع ہی اندازِ آزاد کی شہادت دینے کو کافی ہے۔

۱۷۔ اشعار، ۱۱، مطلع:

جو کہوے قدِ یار کی تصویر دکھا دو تم لکھو الف اور وہی تحریر دکھا دو

یہ غزل بھی پروفیسر شیرانی کے ہاں مشکوک کلام میں شامل ہے اور ڈاکٹر صادق کے مسودوں میں اس کا مسودہ بھی تھا۔ لہٰذا یہ بھی جعلی ہے۔ یہاں یہ ذکر کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صادق نے ان وضعی غزلوں کا جو ایک ایک مصرع نقل کیا ہے اُس میں اور دیوان میں شامل مصرعوں میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ملتا ہے جس کا مطلب ہے کہ شاملِ دیوان کرتے وقت آزاد نے ان پر ایک بار پھر نظرِ ثانی کی تھی۔

مصرعِ اولیٰ کا مخاطب کون ہے؟ کس نے کس ماہِ تاباں کو بہانے سے نہاں رکھا؟

۱۴۔ دیوان ۰ ۱۲؛ ۱۱۔ آزاد ۰ ۱۲۔ مطلع:

ٹھہرا دیا جلوے نے ترے چشمِ صنم کو　　چکرا دیا مجزے نے ترے طوفِ حرم کو

آزاد نے اِس میں دس شعر کا اضافہ کیا ہے۔ شروع میں یہ نوٹ ہے:

ایک دن عرفیؔ کے قصیدۂ نعتیہ کے اشعار پڑھ کر طبیعت میں ذوق و شوق پیدا ہوا۔

اقبال کرم میگزد ارباب ہمم را　　ہمت نخورد نیشتر لا و نعم را

فرمایا کہ بڑے بڑے استادوں کے قصیدے اِس زمین میں ہیں۔ اس مرحوم نے بھی معرکہ میں کہا تھا [؟] اور عقیدت سے لکھا تھا [؟] ہم اپنی زبان میں عرضِ حال کریں گے۔ چنانچہ اسی دن شروع کیا اور قلم برداشتہ یہ اشعار لکھے۔ پھر فرصت نہ ہوئی کہ تمام کرتے۔ اب یہ ردیف واؤ کے ۱۲ شعر ہیں۔ اب قصائد میں لے جانا کیا ضرور ہے یہیں لکھ دیتا ہوں۔

اِس بیان کی صداقت کا کوئی ثبوت نہیں۔ ذوقؔ کے مطلع کا انداز قصیدے کا سا تھا۔ آزاد نے اِسی سے کہانی بنائی ہے۔ شروع کے دو تین شعر نعت بلکہ حمد کا دھوکا دیتے ہیں لیکن چوتھے شعر سے آزاد اپنے انداز پر اتر آئے ہیں، ملاحظہ ہو:

جائے نہ کبھی طبع جفا پیشہ سے ہرگز　　کس طرح نکالے کوئی شمشیر کے خم کو

ہیں اشک کباب اشک ترے سوختہ جاں کے　　پر کرتے ہیں خوں شبنم گلزار ارم کو

دیوانہ ترا قید سے ہستی کے جو چھوٹا　　چڑھ جائے گا اک زلزلہ صحرائے عدم کو

اس شعر کو دیکھ کر بے اختیار انشا کا ایک شعر یاد آگیا:

آج کشتے کو ترے قبر میں رکھتے ہیں لوگ　　دفن اک زلزلہ ہوتا ہے زمیں کی تہ میں

جس دن سے زمیں پر ہی فلک خاک ہی اڑاتی　　دیتے تھے یہاں راہ نہ اس سبز قدم کو [؟]

یہ اشعار اندازہ لگانے کے لیے کافی ہیں کہ یہ نہ نعت ہے نہ حمد نہ قصیدہ بلکہ غزل کے شعر ہیں اور آزاد کی تصنیف۔

۱۷۔ دیوان ۰ مطلع؛ ۱۲ آزاد ۰ ۸۔ مطلع:

منزلِ گم گشتگاں بالکل الگ نیارے ہو　　آسماں بھی ہو اگر وہاں بیضۂ عنقا سے ہو

باقی، شعر آزاد کی تصنیف ہیں۔ چند شعر دیکھیے:

گر کرے سجدہ نمائی جلوۂ رخسار پر　　وہ کفِ آئینہ سے ہو جو یدِ بیضا سے ہو [؟]

سبحۂ صد دانہ بھی پڑ جائے گر میرے گلے　　دانۂ انگور تارِ پنبۂ مینا سے ہو [؟]

ثابت اک ٹانکا نہ چھوڑے دل کا میرے اضطراب　　چاکِ سینہ گر رفو تارِ رگِ خارا سے ہو

تشنہ کامی گرمی دیوے چکھا شورابِ اشک　　ذوقِ شور العطش پیدا لب دریا سے ہو [؟]

کی صدائے پا سمجھو اور کہا عمرِ رفتہ کی صدائے پا۔

بجز بیاں یہاں بھی ظاہر ہے:

سمجھ تو کور سوادوں کو ہو جو علم نہ ہو — اگر سمجھ بھی نہ ہو کور سے عصا سمجھو [؟]

نہ سمجھو وحشت۔ شفاخانۂ جنوں ہے یہ — جو خاک سی بھی پڑے پھانکنی دوا سمجھو

خاک سی کیوں؟ ؛

نفس کی آمد و شد ہے نمازِ اہلِ حیات — جو یہ قضا ہو تو اے غافلو قضا سمجھو

اہلِ حیات؟ ؛

دعائیں دیتے ہیں ہم دل کو تیغِ قاتل کو — لبِ جراحتِ دل کو لبِ دعا سمجھو [؟]

مزید مثالوں کی ضرورت نہیں، یہی نمونے کافی ہیں۔

۹۔ ویران ۰ ۵ ؛ ۱۲۔ آزاد ۱۴۔ مطلع:

اثر ہے دو مری وحشت کا پتھر جس سے مضطر ہو — نگیں پر نام گر لکھ دوں نکل کر گھر سے باہر ہو

تحریفوں کے علاوہ ۹ شعر کا اضافہ کیا گیا ہے:

صفا میں رخ سے تیرے آئینہ کیا خاک ہمسر ہو — نگاہِ چشم سرمہ آلود سے بھی جو مکدر ہو [؟]

قیامت کو بھی کیا انصاف اپنا اے ستم گر ہو — ابھی قصہ نہ آخر ہو کہ آخر روزِ محشر ہو

مصرعِ اولیٰ میں "ہوگا" اور مصرعِ ثانی میں "ہو جائے گا" کا مقام ہے۔

کھٹکتے ہی رہیں دل میں ترے مژگانِ برگشتہ — ہجومِ نیشِ کژدم سے اگر دل گنجِ نشتر ہو

بقیہ شعر اگر ضرورت ہو تو قارئینِ کرام خود ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

۱۲۔ ویران ۲۰ ؛ ۹ آزاد ۱۵۔ مطلع:

ہجوم اور جو آنکھوں ترا شوقِ تماشا ہو — تو شاخِ ہر مژہ سے چشمِ نرگس وار پیدا ہو

آزاد نے اس غزل میں ۱۲ شعر کا اضافہ کیا ہے اور انھیں میں یہ ضرب المثل شعر بھی ہے:

اکیلا رہ گیا یاروں سے یوں ہوں ناتوانی میں — کہیں شاخِ خزاں دیدہ پہ جیسے زرد پتّا ہو

اس غزل کے باقی شعر بھی صاف ستھرے ہیں اور ان میں کئی خاصے اچھے ہیں لیکن انھیں ذوق سے منسوب کرنے کے لیے ثبوت کی ضرورت ہے۔

۱۳۔ ویران ۲۰ ؛ ۲۱ آزاد ۳۰۔

آزاد نے ایک شعر بڑھایا ہے:

تصور کس طرح بھولے ترا اس چشمِ گریاں کو — نکالے مینہ برستے میں کوئی کیا گھر سے مہماں کو

دکھا مہماں بہانے سے ترے اس ماہِ تاباں کو — بڑے ہی وقت کام آیا مرے رحمت کی باراں کو

پڑی۔ ذوق کا مقطع تھا:

اس بحر میں کیا برجستہ غزل اے ذوق یہ تم نے لکھی ہے: ہاں وزن کو جس کے سن کر شاداں روح خلیل و اخفش ہو

آزاد نے اسے یوں بنادیا:

کیا برجستہ مقطوع و مُرفّل تم نے یہ غزل لکھی ہے ذوق اس بحر کو سن کر شاداں روح خلیل و اخفش ہو

اس سے نہ صرف بحر نو ایجاد کا اشارہ نکلتا ہے بلکہ مصرع بھی بے وزن ہوگیا ہے۔ اسی چیز نے پروفیسر شیرانی جیسے عالم کو مشکوک کردیا اور انھوں نے پہلے تو آزاد کے اس دعوے کی تردید کی کہ یہ بحر ذوق کی ایجاد ہیں۔ ثبوت کے لیے انھوں نے بے شمار مثالیں شعرائے سلف کے کلام سے فراہم کیں اور یہ بھی بتایا کہ اس بحر میں قطع اور ترفیل زحافات آتے ہی نہیں، چوں کہ مصرع بھی ناموزوں تھا لہٰذا شیرانی مرحوم نے ان دونوں غزلوں کو ذوق کا کلام بھی نہیں مانا اور انھیں مشکوک غزلوں میں شمار کیا۔ یہ کلام بلاشبہ ذوق کا ہے [اگر شیرانی مرحوم ذرا غور کرتے تو یہ بات فوراً ان کی سمجھ میں آجاتی کہ آزاد نے صرف دو شعر کہنے کی کوشش کی تو بے بحرے ہوگئے لہٰذا یہ جعل ان کے بس کا نہیں تھا] آزاد نے البتہ بیشتر مصرعوں میں اپنی اصلاحیں بھی دی ہیں اور یہ شعر بڑھایا بھی ہے۔

بس چھوڑو دامن قاتل کا لو ہاتھ بہانے خوں دھوئے جب اپنا بہا خوں پاؤں پہ اس کے دل کیوں اس کا مشوش ہو

اور اس کے دونوں مصرعے باہم مربوط بھی نہیں۔

۷۔ ویران، ۲؛ آزاد، ۷۔ مطلع:

دن کٹا، جائیے اب رات کدھر کاٹنے کو جب سے تو پاس نہیں دوڑے ہے گھر کاٹنے کو

ویران میں یہ ناتمام ہے اس میں صرف تین شعر ہیں۔ بہ قول ڈاکٹر تنویر علوی بیاض میں اس کے چھے شعر تھے۔ گویا ایک مزید شعر ترتیب دیوان کے وقت بڑھایا گیا۔ ویسے آزاد نے اس میں کل ۱۴ شعر بڑھائے ہیں۔

وانت انجم سے لگائے ہوئے تجھ بن مجھ پر منہ فلک کھولے ہے لے رشک قمر کاٹنے کو

وہ شجر ہوں نہ گل و بار نہ سایہ مجھ میں باغباں نے ہے لگا رکھا مگر کاٹنے کو

سر و گردن جگر و دل ہیں یہ چاروں حاضر چاہے دل یار کا جو رنگ اگر کاٹنے کو

سر و گردن تو خیر کاٹے جاتے ہیں لیکن دل و جگر کا کاٹنا نئی بات ہے۔

شام ہی سے دل بیتاب کا ہے ذوق یہ حال ہے ابھی رات پڑی چار پہر کاٹنے کو

۸۔ ویران، ۳؛ آزاد، ۱۴۔ مطلع:

بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

ویران میں یہ غزل ناتمام ہے۔ آزاد نے اس میں تحریف کے علاوہ دس شعر کا اضافہ بھی کیا ہے:

عزیزو اس کو نہ گھڑیال کی صدا سمجھو یہ عمر رفتہ کی اپنی صدائے پا سمجھو

کس کو گھڑیال کی صدا نہ سمجھو؟ کہنا چاہتے تھے کہ گھڑیال کی صدا کو گھڑیال کی صدا نہیں اپنی عمر گذراں

مرحوم تیسری دفعہ دکن سے پھر کر آئے ہی نہیں وہیں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اگر بالفرض آئے بھی ہوتے تو اس وقت تک تو خود ذوق بھی بوڑھے ہو چکے ہوں گے۔ ان کی نوجوانی کیا جاودانی تھی کہ ابتدا سے آخر تک ان پر جوانی کا عالم رہا؟ چناں چہ ۹ والا شعر شاہ نصیر کی 'برکت' کا اشارہ ہے نہ پیرانہ سالی کا بلکہ یہ خود ذوق کے اپنے لیے بھی ہو سکتا ہے:

ہم تبرک ہیں بس اب کرے زیارت مجنوں   سر پہ پھرتا ہے لیے آبلہ پا ہم کو

یہ بھی غلط ہے کہ اس میں بعض ان لوگوں کی طرف اشارے ہیں جو دل میں خلش رکھتے تھے۔ ایسا کوئی اشارہ ان اشعار میں نہیں ہے تخیل سریع اور قوی ہو تو آدمی بہت سی باتیں فرض کر لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ واقعی ہیں۔ یہی حال آزاد کا ہے۔ انھیں یہ احساس ہی نہیں ہو پاتا کہ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ محض ان کا واہمہ ہے اور حقیقت سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ چناں چہ آخری فقرہ اسی پر منتج ہے جب معرکہ ہوا ہی نہیں تو 'برسرِ معرکہ' سے کیا مراد ہے۔

۳ دیوان، ۹؛ آزاد، ۱۰۔ مطلع:

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو   تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

ذوق نے 'اکھیڑ' کا قافیہ چھوڑ دیا تھا، آزاد نے باندھ دیا:

اُلفت کا گر ہے نخل تو سرسبز ہووےگا   سو بار جڑ سے پھینک دے اس کو اکھیڑ تو

۴ دیوان، ۸؛ آزاد، ۱۰۔ مطلع:

موت ہی سے کچھ علاجِ دردِ فرقت ہو تو ہو   غسلِ میت ہی ہمارا غسلِ صحت ہو تو ہو

اس میں آزاد نے مندرجہ ذیل دو شعر تصنیف فرمائے ہیں:

بعدِ مردن ہی ترے زخمی کو راحت ہو تو ہو   یاں کہاں راحت۔ جراحت پر جراحت ہو تو ہو

تلخ کامی ہی میں گزری زندگانی عمر بھر   جانِ شیریں کے دیے سے کچھ حلاوت ہو تو ہو

زندگانی اور عمر بھر، کیا ہوا؟ حیرت ہوتی ہے اتنی اچھی نثر لکھنے والا جب شعر پر دست درازی کرتا ہے تو الفاظ کی اہمیت اور معنویت سے بالکل غافل ہو جاتا ہے۔ اس دیوان میں آزاد کے مصنفہ اشعار کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اس میں ان کے جنوں کو خاصا دخل ہے ورنہ ایسے مہملات تصنیف کرنا کم از کم ایسے عالم کے لیے، ناممکن ہے۔

غزل ۵ اور ۶ جن کے مطلعے ہیں:

تمنا نہیں ہے کہ امدادِ دل کو تپش کا صلہ ہو کہ مزدِ قلق ہو   یہی حق ہے قاتل اگر حق دلائے یہ بسمل ترے پاؤں پر جاں بحق ہو

جس ہاتھ میں خاتمِ لعل کی ہو گر اس میں زلفِ سرکش ہو   پھر زلف بنے وہ دستِ موسیٰ جس میں اخگرِ آتش ہو

نسخۂ دیوان کے حاشیے میں جب یہ لکھا دیکھا: 'یہ غزل زمانۂ آغازِ سخن گوئی میں لکھی تھی' تو انھیں اس پر افسانہ بنانے کی سوجھی۔ ان بحروں میں ذوق کے سارے کلام میں چوں کہ اور کوئی شعر نہیں ملا، آزاد نے اس کا اطلاق پوری اردو شاعری پر کر کے ان بحروں ہی کو ذوق ہی کی ایجاد قرار دے دیا۔ اور اس کے لیے انھیں غزل ۲ کے مقطعے میں تحریف کرنی

مندرجہ بالا مطلعے سے پہلے یہ نوٹ ہے: "شعر مرقوم الذیل ایک مسدس کا ترجیع بند ہے کہ جناب سید الشہدا کے مرثیہ میں لکھا تھا کئی بند اس کے بندۂ آزاد کو یاد ہیں، اپنی جگہ پر وہ بھی درج ہوں گے۔" لیکن حافظ نباشد۔ نہ صرف یہ کہ وہ کئی بند انھیں یاد نہیں آئے بلکہ مندرجہ شعر کے نیچے خط کھینچ کر اسی شعر کی ایک دوسری قرأت بھی درج کر دی گئی ہے۔ لطف یہ ہے کہ دونوں مطلعوں کی بحر مختلف ہے۔ اب اگر یہ ترجیع بند کا شعر تھا تو اس کا دو مختلف بحروں میں ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ ممکن ہے آزاد کا ارادہ مرثیہ کہنے کا ہو تاکہ "استاد" کا کلام اس صنف سے محروم نہ رہے، لیکن یہ ان سے نہ ہو سکا البتہ ان کا مذکورہ فرضی بیان محفوظ رہ گیا۔ بہ قول ڈاکٹر علوی نظم آزاد میں یہ مسدس موجود ہے، اس کے باوجود انھوں نے اسے شامل کلیات نہیں کیا۔

۵۴ ۔ کٹا کر اپنا سر نوک سناں پر تاج کرتے ہیں ۔۔۔ حصول اس طرح عاشق رتبۂ معراج کرتے ہیں

ذیل کے دو شعر بھی آزاد کی تخلیق ہیں:

۵۶ ۔ آپ آتا ہے عیادت کو نہ تو آتی ہے ۔۔۔ یاد میں تیری اجل سے بھی فراموش ہوں میں

• "نہ وہ آتی ہے" کا مقام ہے۔

۵۷ ۔ سمجھو نہ سہل تم خفقاں کو حکیم جی ۔۔۔ حضرت اسے بھی جانئے ہمزادۂ جنوں

ردیف واؤ: نسخۂ ویراں میں اس ردیف میں تمام و ناتمام ملا کر ۲۴ غزلیں یا ۱۳۹ شعر ہیں۔ آزاد میں ۳۵ غزلیں یا ۲۴۲ شعر ہیں۔ گویا اس میں ۱۱ غزلوں یا ۱۰۳ شعر کا اضافہ ہوا ہے۔ تفصیل یہ ہے:

شروع میں آزاد اور ویراں ہر دو میں ایک دو غزلہ ہے جس کے مطلے ہیں:

۱ ۔ دانۂ خرمن ہے یہاں قطرہ ہے دریا ہم کو ۔۔۔ آ گیا ہے جز میں نظر کل کا تماشا ہم کو

آسماں اور وہ انسان بناتا ہم کو ۔۔۔ خاک میں تھا مگر اس ڈھب سے ملا ہم کو

پہلی غزل میں ۳۴، اور دوسری میں ۳۲ شعر ہیں۔ تحریفوں سے قطع نظر یہی تعداد نسخۂ آزاد میں بھی ہے۔ یہاں اس کا ذکر صرف اس لیے کیا گیا کہ غزلوں سے پہلے آزاد نے ایک نوٹ لکھا ہے جس کا جائزہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔

شاہ نصیر مرحوم جب تیسری دفعہ دکن سے پھر کر آئے تو ایک مشاعرہ قائم ہوا۔ اس میں یہی طرح تھی۔ استاد نے یہ دو غزلہ پڑھا تھا۔ جوانی کا عالم تھا۔ اور شاعری بھی جوان تھی۔ قافیہ پیمائی سے دق ہو کر مقطع دوم میں آسانی طرح کا اظہار کیا ہے [اس فقرے کا کیا مطلب ہے؟ طرح آسان ہے یا آسان ہونا چاہیے تھی؟] جس شعر پر ہے اس میں شاہ نصیر مرحوم کی برکت اور پیرانہ سالی کا اشارہ ہے۔ اور بعض وہ اشخاص بھی اس مشاعرہ میں شامل تھے جو دلوں میں خلش رکھتے تھے۔ کہیں کہیں ان کی طرف بھی اشارے ہیں ہر ایک کی طرح [؟ شرح] طولانی ہے۔ اور فائدہ کچھ نہیں۔ قلم انداز کرتا ہوں۔ بر سر معرکہ واقفان حال موجود تھے انھوں نے مزے لئے۔

اس نوٹ کی ساری باتیں صریحاً غلط ہیں۔ خط کشیدہ مکڑے خصوصاً توجہ طلب ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ شاہ نصیر

توڑیں اِک نالے سے اِس کاسۂ گردوں کو مگر — نوشش ہم اِس میں کبھی دل کا لہو کرتے ہیں [۹]

۳۹۔ تم وہ غضب کہ ہوتے بھی کم ایسے شخص ہیں — اور ہم تمہیں پہ مرتے ہیں ہم ایسے شخص ہیں

بقول ڈاکٹر تنویر احمد علوی "بیاض" میں یہ چار شعر کی غزل ظفر کے نام سے ہے۔ ہو سکتا ہے آزاد نے پہلے اِسے ظفر کے نام سے لکھا ہو۔ آخر انھیں اس کا ثبوت بھی تو فراہم کرنا تھا کہ ظفر کا سارا کلام ذوق کا کہا ہوا ہے۔ پھر جب دیوان مرتب کرنے بیٹھے تو اس خیال سے کہ ظفر کے تو چار دیوان موجود ہیں ہی، یہ ذوق کو بخش دی۔
بہرحال مطلع میں بھی کم" توجہ طلب ہے۔ روزمرہ کہیئے، محاورہ کہیئے "ایسے شخص کم ہی ہوتے ہیں" ہے۔ چوتھا شعر ہے۔

دیں کیلئے بلکہ دیکھیے ایمان بھی انہیں — زاہد یہ بت خدا کی قسم ایسے شخص ہیں

یہاں بتوں کے لیے ایسے شخص ہیں، عجیب لگتا ہے۔ یوں بھی شخص بے ضرورت ہے "ایسے ہی ہیں" سے کام چلتا ہے۔

۴۰۔ یہ دو شعر بھی آزاد ہی کی تصنیف ہیں۔ ڈاکٹر علوی نے اس کے ماخذ کا حوالہ "بیاض بلاغت" دیا ہے۔ بلاغت سے مراد غالباً صہبائی کی ترجمۂ حدائق البلاغت ہے جس کے حوالے اور بھی کئی جگہ آئے ہیں، لیکن بلاغت میں مندرجہ ذیل دونوں شعر نہیں ہیں۔ اس میں صرف سات جگہ ذوق کے اشعار کا حوالہ ملتا ہے جن میں ایک شعر مکرر ہے، ایک جگہ صرف ایک مصرع ہے اور ایک رباعی ہے۔ بیاض بہرحال جعلی ہے اس لیے اس کا بھروسا نہیں۔ بہرحال شعر ملاحظہ ہوں:

ہر تن مو سے نکلتے ہیں شرارِ آتشیں — بن گیا ہوں میں سراپا اِک انارِ آتشیں

واہ رے سوزِ جگر اُٹھتے ہیں میری خاک سے — دودِ گلخن کی طرح اب تک غبارِ آتشیں

۴۱۔ کلیات میں ڈاکٹر علوی نے یہ مطلع بحوالہ دیوان درج کیا ہے، لیکن یہ نسخۂ دیوان میں نہیں ہے:

ہوا ہے اور نہ ہووے گا کوئی پیدا خدائی میں — وفا میں کوئی مجھ سا اور تم سا بے وفائی میں

۴۲۔ کلیات میں مطلع بحوالہ بیاض درج ہوا ہے، جو جعلی ہے:

اسیری عشق کو منظور تھی میری لڑکپن میں — بہانہ کر کے منت کا پہنایا طوق گردن میں

ع بیڑیاں منت کی پنہی بھی تو میں نے بھاریاں، غالباً یہی مصرع اس شعر کا محرک ہوا ہوگا۔ آزاد اسے آب میں نقل کر چکے ہیں۔

۴۳۔ کلیات میں یہ مطلع بھی بحوالہ بیاض درج ہے:

ہیں وہ دیوانے کہ جن کو بیڑیاں درکار ہیں — ہم اسیرِ زلف ہیں کافی ہیں دو تار ہیں

ذیل کے سارے مطلعے آزاد کی تصنیف ہیں:

۴۵۔ کمندیں اور بھی یوں تو کمند انداز رکھتے ہیں — تری زلفوں کے خم کچھ اور ہی انداز رکھتے ہیں

۴۶۔ کرتے اپنے سر کو جو نوکِ سناں پر تاج ہیں — عشق میں وہ کرتے حاصل رتبۂ معراج ہیں

نسخہ ویراں میں اِس ردیف کے شعر ختم ہوئے ۔ اب وہ غزلیں جو کلیتاً آزاد کا اِضافہ ہیں ۔ اب شروع کے نمبر نسخۂ آزاد کی ترتیب کو ظاہر کرتے ہیں !

۴ آزاد ۵ ، ۷ ، مطلع :

ہے چشم تری مست ۔ قدح گیر باغ حسن
عارض پہ خط ہے طوطی تصویر باغ حسن

تحریر سرمہ ہے تری آنکھوں میں وقت خواب
اے غیرت چمن ۔ در روز نجیر باغ حسن

مقطع : سیر حیراں جو چاہے تو لے ذوق دیکھ لے
اُس نازنیں کا جلوۂ تغییرِ باغ حسن

۵ ۔ مطلع : گئیں یاروں سے وہ اگلی ملاقاتوں کی سب رسمیں
پڑا جس دن سے دل بس میں ترے اور دل کے ہم بس میں

۹ ۔ شعر کی یہ غزل کلیتاً آزاد کی کہی ہوئی ہے :

کبھی ملنا ۔ کبھی رہنا الگ مانند مژگاں کے
تماشہ کج سرشتوں کا ہے کچھ اخلاص کے بس میں

توقع کیا ہو جینے کی ترے بیمار ہجراں کی
نہ جنبش نبض میں جس کے ۔ نہ گرمی جس کے لمس میں

مقطع : جو مضمون ذوق ایوان دو عالم میں ہوئے موزوں
حواس خمسہ ہیں انساں کے وہ بند مخمس میں

ہم سے ظاہر و پنہاں جو اس غارت گر کے جھگڑے ہیں
دل سے دل کے جھگڑے ہیں نظروں سے نظر کے جھگڑے ہیں

اِس غزل میں ۹ شعر ہیں ۔ اس پر آزاد نے ایک طویل نوٹ بھی لکھا ہے ۔ ہم اِس کا تجزیہ نہیں کریں گے کیونکہ اس کا مسودہ بھی بچوں کے امتحان کی اُن اسکولی کاپیوں میں تھا جو پروفیسر شیرانی مرحوم کو آزاد کے جلے ہوئے گھر کے اسباب سے دستیاب ہوئے تھے ۔ لہذا اِس کے جعلی ہونے میں کوئی شک ہی نہیں ۔

۱۸ ۔ آفت جاں دل کو ہیں تن کے قفس کی تیلیاں
ورنہ ہیں یاں بال و پر تار نفس کی تیلیاں

اِس زمین میں مشاعرہ اور معرکہ ضرور ہوا تھا ۔ تفصیل پیچھے گزر چکی ہے ، اعادہ تکرار بے جا کے مترادف ہوگا لیکن اس میں شک نہیں کہ نسخہ آزاد میں جو ۲۷ شعر ملتے ہیں وہ سب اُن کے اپنے ذہن کی اُپج ہیں ۔ ان کو ذوق سے کوئی واسطہ نہیں ۔ تذکروں وغیرہ میں ذوق کے جس ایک آدھ شعر کا ذکر ملتا ہے یا عاصی نے جس شعر پر اعتراض کیا تھا (یا ‹ مگس کی تیلیاں ›) وہ آزاد نے شامل دیوان نہیں کیا ۔ ہم یہاں ایک شعر نقل کرنا چاہتے ہیں اور بس :

استخواں ہیں جس تن لاغر میں جس کی تیلیاں
تیلیاں بھی وہ کہ جو ستر برس کی تیلیاں

مصرع اولیٰ میں خط کشیدہ لفظ ‹ خس › ہوگا ۔ دوسرا مصرع غور طلب ہے ۔ یہ ستر برس کی تیلیاں کس تن لاغر میں ہیں ۔ ذوق نے تو کل ستر برس کی عمر نہیں پائی (۱۲۰۴ھ — ۱۲۷۱ھ) اس لیے وہ خود تو ہو نہیں سکتے ۔ یہ شعر کہتے وقت آزاد کے ذہن میں یقیناً بہادر شاہ ظفر تھے جنھیں آپ میں انھوں نے ستر برس کا مشّاق ‹ شاگرد بتایا ہے ۔ ذوق اپنے ولی نعمت کے لیے ایسے گستاخانہ شعر نہیں کہہ سکتے تھے ۔

۲۲ ۔ قصد جب تیری زیارت کا کبھو کرتے ہیں
چشم پُر آب سے آئینے وضو کرتے ہیں

پانچ شعر کی یہ غزل بھی آزاد کی تصنیف ہے ، ایک شعر اور نمونتاً پیش ہے :

..... وغیرہ شروع ہوتے ہیں۔ ۱۸ویں، ۱۹ویں غزل آزاد کی بالترتیب ۲۰ویں اور ۲۲ویں ہے اور دونوں نسخوں میں تعداد اشعار برابر ہے۔

۲۰۔ دیوان، ۱؛ مسلمہ ۳ آزاد ۔ ۳۔ یہ شعر آزاد نے کہا ہے:

خانقاہ میں بھی وہی ہے جو خرابات میں ہے — فرق یہ ہے یہاں منہ پہ ہے اور وہاں دل میں (کذا)

۲۱۔ دیوان، ۲؛ ۲۰۔ آزاد، ۱۲۔ اس غزل میں دس شعر کا اضافہ کیا گیا ہے، کچھ شعر یہ ہیں:

رسن انداز ہے چاہِ ذقنِ یار میں زلف — نہیں معلوم کہ دل کس کا گرا ہے اس میں
عشق کی تلخی حسرت کے جو ہیں کچھ مزے — بے مزہ رہتے ہیں ہم کچھ تو مزا ہے اس میں [؟]
کبھی کرتا ہوں فغاں اور کبھی ضبطِ فغاں — نہیں معلوم وہ خوش اس میں ہے یا ہے اس میں [؟]

مقطع ہے:

کیا بگولے کی طرح خاک کا پتلا اے ذوق — اڑتا پھرتا ہے بھری جیسے ہوا ہے اس میں

عام طور سے اس غزل کے شعر صاف ہیں لیکن ذوق کی تصنیف نہیں لگتے۔ ان میں عجیب پھیکا پن ہے۔

۲۲۔ دیوان ۲۰ ۳۱ آزاد ۳۔ ان دو شعروں میں مطلع نہیں تھا چناں چہ اس مطلع کا اضافہ کیا گیا ہے:

تیرے آفت زدہ جن دشتوں میں اڑ جاتے ہیں — صبر و طاقت کے وہاں پاؤں اکھڑ جاتے ہیں

۲۶۔ دیوان ۲+ ۲۴؛ علا آزاد ۔۹۔ دیوان میں اس غزل کے دو شعر متن میں اور ۳ شعر تتمے میں ہیں۔ آزاد نے تین شعر کا اضافہ کیا ہے:

گوارا تلخی کیوں نہ ہو ہم خستہ جانوں کو — کہ دارو تلخ ہی بہتر ہے، دارو اس کو کہتے ہیں [؟]
گرہ کھولی ذرا اس نے جو اپنی زلف مشکیں کی — معطر ہو گیا آفاق، خوشبو اس کو کہتے ہیں
اجل سو بار آئی ذوق پر جب تک نہ وہ آئے — نہ پایا دم نکلنے میرا قابو اس کو کہتے ہیں

آخری دو شعر غنیمت ہیں اس کے باوجود بے ثبوت ذوق سے منسوب نہیں کیے جا سکتے۔

۲۹ دیوان، مطلع؛ ۳۸ آزاد، ۲۔ آزاد نے اس میں ایک اور مطلع شامل کر دیا ہے اور مصرع اولیٰ کو دو طرح کہا ہے

ہوتے پابندِ علائق نہیں وارستے ہیں
نہ کبھی پابند نہیں ہوتے جو وارستے ہیں } — نکہتِ گل کے نکل جانے کے سو رستے ہیں (کذا)

۳۱۔ دیوان، ۱؛ ۲۹ آزاد ۲؛ آزاد کا اضافہ کردہ شعر یہ ہے:

ہے جی میں کہ غنچہ کو کروں تنگ چمن میں — پھر یار کا ذکرِ دہنِ تنگ نکالوں

۳۸۔ دیوان ۲، ۳۲۔ آزاد ۳۔ دیوان میں یہ دو شعر کا قطعہ ہے۔ آزاد نے اس پر مطلع بڑھا دیا اور دوسرے دو شعروں کو قطعہ ہی رہنے دیا۔

مر گیا ہوں بسکہ وصلِ سیم تن کی فکر میں — چادرِ مہتاب ہے میرے کفن کی فکر میں [؟]

پانی میں کون آگ لگاتے ہیں" وہی " یا "دل جلے" ؛

کہوں میں اپنی کہانی تو وہ یہ کہتے ہیں — بغیر جھوٹ نہیں اور کچھ کہانی میں
نگاہ کس کی چڑھا دل کہ خوف سے دن رات — گذرتی ہے مجھے دل کی نگاہبانی میں (؟)

باقی شعر نظر انداز کیے جاتے ہیں۔

۱۷۔ دیوان ، ۴۰ ؛ ۱۲ آزاد ، ۲۳۰۔ دیوان میں دوسرا مطلع ہے ؛

گہر کو جوہری صراف زر کو دیکھتے ہیں — بشر کے دیکھنے والے بشر کو دیکھتے ہیں

آزاد اس کی بابت لکھتے ہیں ؛ مطلع مذکور حاشیہ کو استاد مرحوم نے بیاض خاص میں سے کاٹ دیا تھا۔ میں نے پوچھا فرمایا " سودا کے ایک مطلع سے بہت ملتا ہے۔ لڑکپن میں خدا جانے کیونکر ہو گیا تھا۔ دیوان سابق میں یہ مطلع چھپ گیا۔ اہل تالیف بیچاروں کو کیا خبر۔ سب کو خدا مغفرت کرے۔

بے خبری کی تہمت بھی لگا دی اور ان کے حق میں دعائے مغفرت بھی کر دی، اور وہ بھی زندوں کے حق میں۔ لڑکپن کا فقرہ لکھتے وقت آزاد کو یہ یاد نہیں تھا کہ غزل طرحی ہے۔ غالب کے ایک مشہور شعر کا مصرع ہے : یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں۔ آزاد نے اس سے استفادہ بھی کیا ہے۔ مزید حیرت اس امر پر ہے کہ خود میر و سودا کے اشعار سے ملتے جلتے کتنے ہی شعر خود ہضم کر بلکہ جہاں تدار، انشا وغیرہ کے شعر بھی آزاد نے ذوق کو بخش دیے۔ " استاد نے وہ کیوں نہ کٹوائے ؟ یہاں مقصد سوائے مولفین دیوان کو بدنام کرنے اور اپنی استنادی حیثیت کے اظہار کے کیا ہو سکتا ہے ؟ " بیاض خاص " کا فقرہ اس پر دال ہے۔ بہر حال اس غزل کے ۲۲ شعر (جن میں تین شعر ذوق کے ہیں) اور ایک مطلع حاشیے میں درج کیا ہے۔ اس طرح غزل میں ۱۳ شعر کا اضافہ ہوا ہے، کچھ شعر پیش ہیں :۔

پہلا ہی مطلع جعلی ہے :

سلام کرتے ہیں ان کو جدھر کو دیکھتے ہیں — اور ان کو دیکھو ذرا وہ کدھر کو دیکھتے ہیں

سلام کون کرتے ہیں اور " جدھر " کو کون دیکھتے ہیں ؟ اس کے بعد ذوق کا مطلع درج کیا ہے لیکن بالکل بدل کر۔ بہر حال اگلا مطلع ہے :

یہ لوگ کیوں مرے عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں — انھیں تو دیکھیں ذرا وہ کدھر کو دیکھتے ہیں (؟)

غالب کے محولہ بالا شعر کا عکس ذیل کے مطلع میں دیکھیے :

وہ اپنی برش تیغ نظر کو دیکھتے ہیں — ہم ان کو دیکھتے ہیں اور جگر کو دیکھتے ہیں
نہ خیر و شر کو نہ عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں — جدھر کو آپ نہ ہوں ہم ادھر کو دیکھتے ہیں (؟)
ہماری وصل کی شب ہے و یا شب محشر — کہ اُٹھ کے صبح قیامت سحر کو دیکھتے ہیں (؟)

غرض سب جعلی شعر اسی قسم کے ہیں۔ مزید مثالیں دینے کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد دیوان میں " اشعار متفرقات

یا کیوں ہیں؟ کیا مر چکے ہیں؟ ورنہ زیرِ آسماں کہتے۔

بے شورِ الغیاث صریرِ قلم نہیں

دیوان ۹۰؛ عا ۱۶۷؛ آزاد ۲۸۰۔ مطلع:

نغمہ اپنا صفحۂ محشر سے کم نہیں

دیوان میں یہ غزل ناتمام ہے چناں چہ آزاد نے اس پر ایک نوٹ لگا کر ۲۲ شعر بڑھا دیے ہیں:
طرح مشاعرہ کی غزل ہے جس کاغذ سے میں نے نقل کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مشاعرہ کو چلتے وقت صاف کیا تھا بڑی مشکل سے پڑھا گیا۔ پوری ایک رات کی نشست اس پر صرف ہوئی [گویا رات بھر میں ۲۲ شعر کہہ لیے] اب تک تو نظرِ ثانی سے محروم کلام لگتا تھا۔ اب پہلی بار صاف شدہ کلام کے بھی کچھ نمونے بھی دیکھ لیجیے:

مضمون کے پیچ و تاب سے تابِ رقم نہیں — بے زلفِ یار ہاتھوں میں میرے قلم نہیں [؟]
بعد از فنا بھی جوشِ جنوں میرا کم نہیں — کس وقت زلزلہ سرِ دشتِ عدم نہیں [؟]
جوشِ شگفتگی ہے محبت کا غم نہیں — یہ خونِ خراشِ دل میں تبسم سے کم نہیں [؟]
یہ دل مجھے ڈبو کے رہے گا کہ سینہ میں — وہ کون سا ہے داغ جو گردابِ غم نہیں [؟]
ہیں آمدِ بہار سے بھر لائے منہ میں خوں — یہ زخمِ دل تبسمِ غنچہ سے کم نہیں

یہ مندرجہ بالا تیسرے شعر کی دوسری صورت ہے:

ہم کافرانِ عشق کو ہے یہ بڑا عذاب — دوزخ میں آتش آتشِ سنگِ صنم نہیں

کون سا سنگِ صنم؟

مجھ روسیہ سے کب نہ ہوا سجدہ سرِ فرو — کب گردنِ خجالت محرابِ خم نہیں
اہلِ صفا کا دیکھا نہ دامن کسی نے تر — گوہر ہے اپنی آب میں غرق اور نم نہیں

پیچھے ہم گوہرِ تر، کی ترکیب پر اظہارِ خیال کر چکے ہیں۔ اِس بار آزاد، ذوق کے شعر کو دوسرے الفاظ میں ڈھالنے میں بڑی حد تک کامیاب ہو گئے ہیں لیکن قافیے کی مجبوری سے تر کو نم کہنا پڑا۔ ؎ غرق ہے آب میں پر تر نہیں اصلا گوہر (ذوق)
مزید مثالیں فضول ہوں گی۔ مقطع نقل کر کے اِس غزل پر تبصرہ ختم کیا جاتا ہے:

پاک دنیا سے ہیں دنیا میں ہیں گو پاک سرشت — یہ راہ کوے یار ہے راہِ عدم نہیں [؟]

جاتا ہے آنکھیں بند کیے ذوق تو کہاں

۱۴۔ دیوان ۹۰؛ لا آزاد ۱۴۰۔ اس غزل کا مقطع ہے

تری زبان کا مزا تیری شعر خوانی میں — بجز نثار علی شاہ کون جانے ذوق

یہی مقطع دیکھ کر آزاد کو نثار علی شاہ سے تعلق کہانیاں بنانے کا خیال آیا ہوگا۔ دیوان میں یہ غزل ناتمام نہیں ہے اس کے باوجود آزاد نے اس میں ۵ شعر کا اضافہ کیا ہے:

لگاتے تہمت گریہ ہیں دل جلوں کو ترے — یہ ہیں وہی جو لگاتے ہیں آگ پانی میں

ایک مطلع اور ایک شعر مصنفہ آزاد پیش ہے:

دنیا سے میں اگر دلِ مضطر کو توڑ دوں ۔ سارے طلسم وہم مکدر کو توڑ دوں
لے آشنا، پوچھ گرانباری گناہ ۔ کشتی میں ہوں تو بوجھ سے لنگر کو توڑ دوں

۱۱- ویران ۵۰؛ ۱۸- آزاد = ۱۹ مطلع:

آج اُن سے مدعی کچھ مدعا کہنے کو ہیں ۔ پر نہیں معلوم کیا کہیں گے کیا کہنے کو ہیں

نسخۂ ویران کی اس "ناتمام" غزل کو آزاد نے تمام کرنے کی کوشش میں ۱۴ شعر کا اضافہ کیا ہے کچھ شعر ملاحظہ ہوں:

کہہ رہے شبنم سے نہ بھر سیماب گُل کے کان میں ۔ بلبلیں احوالِ دل کھل کے صبا کہنے کو ہیں

شبنم کو سیماب سے تشبیہ دی گئی ہے لیکن کان بہرے کرنے کے لیے سیماب نہیں سیسا بھرایا انڈیلا جاتا ہے پارے سے تو ہم کان کے درد کا علاج کرتے ہیں۔

دیکھے آئینہ بہت، بن خاک ہیں ناصاف سب ۔ ہیں کہاں اہلِ صفا اہلِ صفا کہنے کو ہیں (؟)
دمبدم رک رک کے ہے منہ سے نکل پڑتی زباں ۔ وصف اس کا کچھ فوارے یا کہنے کو ہیں

فواروں کی زبان کس نے دیکھی ہے؟

میرے دل کے آبلے دیکھے تو منہ فق ہو گئے ۔ زردیوں ہی دانہائے کہربا کہنے کو ہیں

کیا دل کے آبلے زرد ہوتے ہیں؟

دیکھ لوے پہنچے کس عالم میں کس عالم میں ہیں ۔ نالہائے دل ہمارے نارسا کہنے کو ہیں (؟)
گاہ دامن گیر باد و گہہ بیاباں گرد خاک ۔ اب تو تیرے عاشقوں کے دست و پا کہنے کو ہیں
ہے جہاں مانندِ مجمر اور ہم مثلِ سپند ۔ اب چلے جائیں گے آ کے اک صدا کہنے کو ہیں

• صدا کہنا؟ غرض ۱۹ میں سے ۱۴ شعر اسی طرح کے ہیں اور آزاد کے ذہن کی اُپج ہیں۔

۱۲- ویران ۵۰؛ ۲۳- آزاد = ۶ مطلع:

عنقا کی طرح خاک سے عزلت گزیں ہوں میں ۔ ہوں اس طرح جہاں میں کہ گویا نہیں ہوں میں

۵ شعر کی اس "ناتمام" غزل میں آزاد نے صرف ایک شعر کا اضافہ کیا ہے اور وہ بھی ذوق کے ایک مطلعے کو بگاڑ کر!

نام یوں پستی میں بالاتر ہمارا ہو گیا ۔ جس طرح پانی کنویں کی تہ میں تارا ہو گیا (ذوق)

آزاد کا شعر ہے:

یارب کنویں کا تارا ہوں یا آسماں کا ہوں ۔ نام آسماں پہ میرا ہے زیرِ زمیں ہوں میں

حاشیے میں آزاد نے ۵۵ صفحہ دیکھنے کی تلقین کی ہے جہاں مندرجہ بالا مطلعے کی غزل درج ہے۔ بہرحال اخذ و استفادے کے باوجود ان سے مضمون بندھ نہیں سکا۔ آسمان پر نام شہرت کے سبب مانا جا سکتا ہے لیکن آپ

ے لو اپنے رونے سے ہمیں پرزدرا آبی تعاب

نیلوفر دکھلا رہا ہے اپنا جوبن آب میں (۹)
لطف سے گر ہوئے فیضِ ربّ دوالمن آب میں

کیا ہوا کیا سبزہ ہے کیا گل ہے کیا ابرِ بہار
بِ کچھ تو موجود ہے پھر پانی میں اور کیا فیض ہو؟

لعل و گوہر ہے بہاتا وقتِ گفتن آب میں

درح کر اس شاہِ دریادل کی لے دل جس کا فیض
بھی ایسی بے تکی: وقتِ گفتن، یہ وقت
ب نامعقول قصیدہ ہے۔ نہ ڈھنگ کی تشبیب نہ گریز۔ پھر مدح بھی ایسی بے تکی: وقتِ گفتن، یہ وقت
گفتگو باتوں سے یا منہ سے پھول جھڑتے ہیں کا ترجمہ کیا ہے، پھر وقتِ گفتن ممدوح لعل و گوہر آب ہی میں بہاتا
ہے یا زمین کو بھی کچھ فیض پہنچاتا ہے؟ ہمیں یقین ہے کہ ذوق ایسے نامعقول اشعار شہنشاہِ وقت کے حضور پڑھنے
کی جرات کبھی نہ کرتے۔ ان لغویات کو نقل کرنا وقت اور کاغذ کی بربادی ہے تاہم مطلع ثانی اور دو ایک شعر مدح کے
اور دیکھ لیجیے:

جوں شناور پھر ہوا میں دست و پا زن آب میں (۹)

پڑھ کے بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا دلا
صورتِ اختر دُرِ معنی ہیں روشن آب میں

مطلع روشن لکھا جس سے کہ بحرِ نظم میں
نورِ حق ہوا بل برہاں پر مبرہن آب میں

ملا ہے جوں روح القدس تو جب کہ توسن آب میں

دو متفرق شعر دیکھیے:
بھلا روح القدس کو آب میں توسن ڈالتے کس نے دیکھا ہے؟ اب مدح کے یہ دو متفرق شعر دیکھیے:

توشہ دیا نوال۔ اور دل ترا موجِ کرم
ہے سخاوت سے تری دستِ قلم زن آب میں

کیا شرمندگی سے کہ ہاتھ کچھ نہیں آیا؟
دستِ قلم زن کیا ہوتا ہے اور وہ آب میں کیوں ہے؟ کیا شرمندگی سے کہ ہاتھ کچھ نہیں آیا؟

تیرا نیسانِ عطا جدم گہرباری کرے
گوہرِ تر سے بھریں موجوں کے دامن آب میں

یہ گوہرِ تر، کوئی دیدۂ تر قسم کی چیز ہے؟ ذوق کے ایک قصیدے کا مصرع ہے: غرق ہے آب میں پر تر نہیں اصلا
گوہر۔ اسی سے کچھ سبق سیکھ لیتے۔

۸۔ دیوان ۰، ۱۲؛ آزاد ۰، ۱۵۔ مطلع:

اس گلستانِ جہاں میں کیا گل عشرت نہیں
سیر کے قابل ہے یہ پر سیر کی فرصت نہیں

اس میں آزاد نے تین شعر بڑھائے ہیں:

دل وہ کیا جس کو نہیں تیری تمنائے وصال
چشم وہ کیا جس کو تیری دید کی حسرت نہیں

کہتے ہیں مر جائیں گر چھٹ جائیں غم کے ہاتھ سے
پر ترے غم سے ہمیں مرنے کی بھی فرصت نہیں

ایک حسرت تو رستی ہے کبھی برسی کے دن
ورنہ روتا ابر بھی اپنے سرِ تربت نہیں

۱۰۔ دیوان ۰، ۱۰؛ آزاد ۰، ۱۲۔ مطلع:

ہے جی میں اپنے غرۂ جوہر کو توڑ دوں
آئینۂ خیالِ مکدر کو توڑ دوں

آزاد نے اس غزل کے ساتھ ایک سرو یا داستان بھی وابستہ کی ہے جسے نظر انداز کیا جاتا ہے۔ البتہ

ہوتا، تنزل ضرور واقع ہوا ہے، مثلاً

ہوں وہ شگفتہ دل کہ دوزخ سی تنگ میں　　　آہن تو آگ میں ہوں مگر لالہ رنگ ہوں

[اصلاً خط کشیدہ ٹکڑے " میں " اور آہن کی طرح آگ میں بھی " ہیں]

ہیں سب سے پہلے میرے اٹھلنے کی فکر میں　　　محفل میں ان کی میں کسی چوسر کا نگ ہوں

[اصل : جو ہے سو پہلے میرے ....　　　.... اس کی میں کوئی ....]

دل بیٹھا محوِ ضبط ہے اور مجھ کو اضطراب　　　دل میرا مجھ سے تنگ ہے میں دل سے تنگ ہوں

[اصل : منظور مجھ کو ضبط میرے دل کو اضطراب　　　....................] "

۷ دیوان ، ۱۲۰ ، ۱۴۳ آزاد ، ۳۱۰ - دیوان میں یہ غزل " ناتمام " ہے اور اس میں ۱۲ شعر ہیں ۔ آزاد نے اس میں یہ کہہ کر (۲۴ شعر بڑھائے ہیں ؛ " کسی دوست نے فرمائش کی کہ زمین مرقومۃ الذیل آج کل طرح ہوئی ہے ۔ آپ بھی غزل کہیے ۔ آغازِ شباب تھا اور طبیعت میں ذوق و شوق ۔ غزل کہی ۔ اس کا جا بجا چرچا ہوا ۔ یہاں تک کہ اکبر شاہ جنت آرامگاہ ان دنوں بادشاہ تھے ۔ انھوں نے فرمائش کی کہ میاں ابراہیم سے کہو ہمیں خود آ کر وہ غزل سنائیں ۔ یہ ولی عہد یعنی مرزا ابوظفر کے ملازمِ خدمت تھے لیکن حضور بھی ان کے کلام کو سنتے تھے اور خوش ہوتے تھے ۔ ایک قصیدہ ان کی مدح میں کہہ کر شامل کر دیا ۔

دیوان میں غزل کا مقطع نہیں تھا ۔ آزاد نے یہ مقطع شامل کر دیا :

ذوقؔ تو اس بحر میں ایسے گُلِ مضمون بہا　　　جا بجا لگ جائے اک پھولوں کا خرمن آب میں

جب گُلِ مضمون بہا ہی دیے جائیں گے تو جا بجا خرمن کیوں کر لگیں گے اور وہ بھی بحر میں ؟ اس کے بعد ۱۴ شعر اد کہہ کر شامل کر دیے ہیں ، کچھ قصیدے کے اور کچھ غزل کے ۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :

ہووے تو لے مہروش جب پرتوِ انگشت آب میں　　　ہو سراپا فلسِ ماہی ماہ روشن آب میں

کیا اس " آب " میں صرف ایک ہی " ماہی " ہوگی اور اس کا بھی صرف ایک ہی " فلس " جو سراپا روشن ہو جائے گا ؟ پھر روشن ہو جانے سے کیا ملے گا ؟

تو جو دریا میں لڑا چھینٹے تو نمیاں شرم سے　　　پانی پانی ہو گیا سلہ سوخ پُر فن آب میں [؟]

مردم دیدہ ہیں اپنے زندہ آبِ اشک سے　　　مردم آبی ہیں ان کا ہے نشیمن آب میں [؟]

بھول مت علم کتابی پر کہ آخر کب تلک　　　ناؤ کاغذ کی بہے اے طفل کودن آب میں [؟]

اب یہ طفل کودن کہاں سے آ گیا پھر کودن کے پاس علم کہاں ؟ اور یہ کاغذ کی " ناؤ " کیا ہے ۔

تو لبِ دریا بنے آ کر جو اے رشکِ بہار　　　ڈالے بھر بھر کر صبا پھولوں کے دامن آب میں

یہ طفل کودن پھر کیا ایک رشکِ بہار بن گیا ہے ۔ بہر حال صبا پھولوں کے دامن کا ہے سے بھر بھر کر آب میں ڈالے گی ۔ ۔ کے ۔ اگر سے ہوتا تو کچھ بات ہوتی ۔

اس میں ایک شعر آزاد نے اضافہ کیا ہے :

'ہم اُن کی زلف سے سودا جو دام لیتے ہیں — تو اصل وسود وہ سب دام دام لیتے ہیں

ممکن ہے مصرعِ اولیٰ میں دام "کی جگہ" وام "ہو۔" دام "کبھی ایک سکہ تھا لیکن عہدِ ذوق میں تو یہ محض قیمت کے معنی میں مستعمل تھا۔ اسلیے مصرعِ ثانی کا دام دام غور طلب ہے۔ اس کے علاوہ دیگر اشعار میں معمولی ترامیم کے علاوہ ایک شعر کو ترمیم سے بالکل مہمل کر دیا ہے، اور یہی آزاد کا انداز ہے :

فقط قمری نہ داغی غلام ہے اُن کا — وہ مول ایسے ہزاروں غلام لیتے ہیں

آزاد نے پہلا مصرع یوں بنا دیا : قمری کا داغ بھلا آئے کس حساب میں واں۔

۵ دیوان ۸، آزاد ۱۰، مطلع :

دودِ دل سے ہے یہ تاریکی مرے غم خانہ میں — شمع ہے اک سوزنِ گم گشتہ اِس کاشانہ میں

آزاد نے اس میں دو شعر بڑھائے ہیں :

ہوش کا دعویٰ ہے بے ہوشوں کو زیرِ آسماں — خم نشیں ہیں مثلِ افلاطوں سب میں خم خانہ میں۔ [۹]

پتھروں میں ٹھوکریں کھاتی ہے ناحق سیلِ آب — پوچھو کیا ہے جائے گی آکر مرے خم خانہ میں [۹]

ہم نے "سیلِ آب" کو پہلی بار مونث بندھا دیکھا ہے۔ خدا جانے آزاد نے کیا سوچ کر اسے مونث کر دیا ہے ؟

نسخہ دیوان غزل ۳۰ آزاد میں ۴۲ ویں ہے۔ تعدادِ اشعار دونوں میں برابر ہے اِس کے باوجود یہاں بوجوہ اس اِس کا ذکر کرنا پڑا۔ آزاد کے مزاج کا بھی کچھ پتا نہیں چلتا۔ خود عجیب و غریب زمینیں نکالتے ہیں، ناقابلِ فہم تشبیہیں اور استعارے باندھتے ہیں، اور ہر قسم کے مہمل شعر کہہ کر ذوق کو بخش دیتے ہیں لیکن جہاں ذوق کے ہاں کوئی غرابت یا دقت دیکھتے ہیں، یا تو اسے اصلاح سے مجروح کر دیتے ہیں یا اُس کی تاویل ضروری سمجھتے ہیں۔ چناں چہ اِس غزل کے ضمن میں بھی یہی کیا ہے۔ اپنی اُلٹی سیدھی اصلاح سے مزین کر کے غزل سے پہلے یہ کہانی درج کی ہے :

"ایک دن حافظ ویران اور میں اُستاد کے ہاں بیٹھے تھے اور بعض شعرائے عصر کے بندی مضمونوں کے باب میں گفتگو کر رہے تھے ع

ــــــ ہے کانٹے کو دوڑتا کتا تفنگ کا

اور ع — میڈ حاحلال کرتے ہیں دریائے تیل کا [؟ نیل]

اُستاد نے فرمایا ایسے مضامین کو استعارہ و تشبیہ میں اتنا زیادہ زور دینے سے کلام بدمزہ ہو جاتا ہے بعد اس کے غزل مرقومۃ الذیل کے اشعار سنائے :

رکھتا زبسکہ جیفۂ دنیا سے ننگ ہوں — پارس بھی ہو تو جانتا مردار سنگ ہوں

اس کے بعد کے چاروں شعروں میں کچھ نہ کچھ ترمیم ضرور کی ہے جس سے اشعار کے حسن میں اضافہ تو کیا

اس کمی سے معلوم ہوا کہ آزاد نے اس ردیف میں ۱۸۱ نہیں ۱۸۲ شعر تصنیف کیے۔ یہاں اُس کہانی کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے جو آزاد نے یہ غزل درج کرنے سے پہلے بیان کی ہے۔ اس میں بتایا ہے کہ ۱۸۵۲ء میں مرزا خدا بخش نے مشاعرہ جاری کیا تھا۔ ذوق مشاعرے میں نہیں جاتے تھے لیکن شہزادے نے بڑی منت سماجت سے بلایا کہ ان کے آنے سے سینکڑوں آدمی سننے کو آئیں گے۔ مشاعرہ کو رونق ہو جائے گی" [جیسے شہزادے یا بادشاہ کو بڑی پروا تھی یا دوسرے شعرا سننے کے قابل ہی نہ تھے [شہزادہ مذکور مومن خاں کے شاگرد تھے مگر استاد کو مانتے تھے۔ غرض مشاعرہ میں گئے۔ غالب مرحوم، مولوی امام بخش صہبائی وغیرہ وغیرہ اچھے اچھے اشخاص آئے " [غنیمت ہے آزاد نے مومن کو مشاعرے میں موجود نہیں دکھایا۔ مومن کا انتقال ۱۸۵۲ء ہی میں ہوا تھا۔ غالب کو اگرچہ مرحوم کہا اور مومن کو اس طرح یاد کیا ہے جیسے زندہ ہوں] آگے یہ بتایا ہے کہ ذوق نے طرح میں غزل نہیں کہی اس لیے کہ "استاد جب حضور کی غزل مشاعرہ کے لیے کہتے تو اپنی غزل اُس طرح میں نہ کہتے تھے " چنانچہ جب شمع سامنے آئی " غالب، صہبائی اور اشخاص نے فرمائش کی کہ کوئی غیر طرح کی غزل ہی پڑھیے سب نے کہا تو میں ایک بیاض لیتا گیا تھا۔ وہ لے کر غزل مرقومۃ الذیل پڑھی " اس ایک تیر سے آزاد کئی شکار کرنا چاہتے ہیں۔ مثلاً (۱) مومن، غالب، صہبائی وغیرہ سب ذوق کے مقابلے میں ہیچ اور بے وقعت شاعر تھے (۲) مشاعرے میں بادشاہ کی غزل اکثر خلیفہ اسماعیل پڑھا کرتے تھے (۳) جس طرح میں ذوق بادشاہ کے لیے غزل کہتے اپنی غزل نہ کہتے، وغیرہ وغیرہ۔ مگر اس دروغ بافی کی پول صرف اس بات سے کھل جاتی ہے " حضور کی غزل جو اس مشاعرہ میں پڑھی گئی تھی۔ ایک شعر اس کا مجھے اب تک نہیں بھولا اور نہ بھولے گا:

شاہوں کے مقبروں سے الگ دفن کیجیو ہم بے کسوں کو گورِ غریباں پسند ہے

شاہوں پر حاشیہ لکھا جس کے دو فقرے یہ ہیں " غزل مذکور بادشاہ کے کسی دیوان میں نہیں لکھی گئی [کیوں] مذکورہ بالا شعر جب اس کا مجھے یاد آتا ہے تو دیدۂ عبرت سے لہو ٹپک پڑتا ہے۔ دیکھو خانہ برباد کا واقعہ بھی اسی پسند پر ہوا " [رنگون میں دفن ہونے کی طرف اشارہ ہے] آزاد کو علم تھا کہ بادشاہ کے دواوین میں غزل نہ ملی تو لوگ مشکوک ہوں گے چناں چہ راستا بند کر دیا۔ لیکن غالب وغیرہ کو مشاعرہ میں موجود دکھایا اور شعر پڑھنے سے بھی معذرت بھی نہیں کروائی۔ غالب کا ایک ایک شعر مل چکا ہے لیکن اس میں میں غالب کی کوئی غزل نہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ دمِ تحریر آزاد کو جو کچھ سوجھ گیا وہی لکھ دیا۔ اس میں حقیقت کا شائبہ تک نہیں۔ اسی سلسلے میں ذوق سے دو شعر اور منسوب ہو گئے ہیں۔ ایک تو وہی جسے بادشاہ کی غزل میں موجود دکھایا ہے اور دوسرا حاشیے کے آخر میں یہ کہہ کر درج کیا ہے " خدا مغفرت کرے استاد مرحوم نے کیا خوب کہا تھا:

لاشے کو دفن کیجیے میرے کہ پھینک دیجیے مردہ بدست زندہ جو چاہیے سو کیجیے

۴۔ دیوان، ۹۰: ۲۔ آزاد، ۱۰۔ مطلع:

بلائیں آنکھوں سے ان کی مدام لیتے ہیں ہم اپنے ہاتھوں کا مژگاں سے کام لیتے ہیں

عالم نوجوانی کی غزل ہے۔ فرماتے تھے کہ ایک مشاعرہ میں زمین مرقومۃ الذیل طرح ہوئی۔ آغاز شباب تھا۔ ہم نے کہا زمین تو گرم ہے مگر تاثیر ٹھنڈی ہے۔ میر مشاعرہ نے کہا خیر اب تو ہوگئی ہم نے کہا اچھا تو دو غزلیں کہہ دیں گے۔ مگر دیکھنا سب کیا کہیں گے۔ جب مشاعرہ ہوا تو جو جلسہ میں آیا نالاں آیا۔

یہ گویا آزاد نے خود ایک غزل کہنے کا راستا نکالا ہے۔ چناں چہ دوسرا ہی شعر ہے:

اے جنوں! بے خبر موسم گل ہر سو گرم
دم تو لے لینے دے مجھ کو۔ نہ کر اتنا تو گرم

یہ کہنا مشکل ہے کہ آزاد کے ذہن میں "تو" کا قافیہ تھا۔ سہو کتابت سے یہاں شعر بے قافیہ گیا ہے بہرحال مصرعے مربوط نہیں لگتے۔

آبلے سینۂ دریا میں ہوئے جل کے حباب
دیدۂ تر نے بہائے یہ غضب آنسو گرم

دونوں مصرعوں میں بڑا بعد ہے۔ آنسو دیدۂ تر نے بہائے اور سینۂ دریا میں، (پر نہیں) حباب جل کر آبلے بن گئے

اے صبا نکہت گل لے کے چمن کو پھر جا
کیا کروں سر کو مرے کرتی ہے یہ خوشبو گرم

خوشبو سر گرم کرتی ہے سے کیا مراد ہے؟

آتش حسن کا پتلا ہے تو اے رشک پری
تاب رخ تیری بھبھوکا ہے بلا ہے تو گرم

اس کا ماخذ ذوق کا یہ شعر ہے:

دل عاشق کے جلانے کا ہے سارا ساماں
بینی شعلہ ہے تری، رنگ بھبھوکا رُو گرم

اور زیادہ شعر نقل کرنا بے سود ہے۔ مقطع ہے:

ذوق دل میں یہ تپ عشق، کلام ایسا خنک
عاشقانہ سی غزل اور کوئی پڑھ تو گرم

گویا آزاد کو اپنی غزل کے خنک ہونے کا احساس تھا ورنہ مقطع میں یہ اعتراف کیوں؟ بہرحال دوسری غزل کا ایک مطلع تو پہلے لکھ چکے تھے باقی ۱۲ شعر غزل ۲۲ میں درج کر دیے۔

ردیف نون: نسخۂ ویراں میں تمام و ناتمام، کل ملا کر ۳۸ غزلیں اور ۱۷۵ اشعار ہیں اور آزاد میں ۵۵ غزلیں اور ۲۵۶ شعر گویا جتنے شعر ذوق نے کہے اس سے بھی چھ زیادہ آزاد نے تصنیف کر دیے۔ تفصیل ذیل میں پیش کی جاتی ہے:

ویراں = ۱۴، آزاد = ۱۳ مطلع:-

ہفتاد و دو فریق حسد کے عدد سے ہیں
اپنا ہے یہ طریق کہ باہر حسد سے ہیں

اس غزل میں آزاد نے کسی شعر کا اضافہ نہیں بلکہ کمی کی ہے۔ ۱۲واں شعر ہے:

محفوظ ہیں جو رکھتے درِ عزّ و قدر پہ
ابجد کا قفل قاعدۂ اب وجد سے ہیں

حیرت ہے یہ شعر آزاد نے کیوں چھوڑ دیا حالاں کہ اس میں خود انھیں کے انداز کی سی نازک خیالی موجود ہے۔

آزاد نے "جیسے" کو "جیسا" سے بدل دیا اور اسی شعر سے یہ شعر نکالا :

خدا بچائے مجھے اس بغل کے دشمن سے — کہ میرا دشمن جاں ہے مری کنار میں دل (کذا)

دوسرے دو شعر یہ ہیں :

بغیر یار سے نہ چھوڑے گی دل کو کافر زلف — کبھو یہ دل سے کہ جائے نہ مار مار میں دل (؟)

اگر نہ جبر کروں اختیار ہے ناصح — تو کیا کروں کہ نہیں میرے اختیار میں دل

آزاد نے ذوق کے مقطعے کا مصرع اولیٰ بدل دیا ہے "البتہ" کے تحت ذوق کا اصل مصرع بھی درج کر دیا ہے۔

۳۔ دیوان ، ۵ ؛ آزاد ، ۸۔ مطلع : دیوانہ ہوں تیرا مجھے کیا کام کہ لوں گل

زیبائش سر کو ہے مرے داغ جنوں گل

آزاد نے اس میں تین شعر بڑھائے ہیں :

ہوں زیر قدم خار و بہ سر داغ جنوں گل — چاہئے ہے جنوں بوؤں سدا خار چنوں گل

"بہ سر داغ جنوں گل" کا کیا مطلب ہے ؟

میں کشتہ ہوں لعل لب پاں خوردہ کا کس کے — نکلے ہے مری خاک سے آغشتہ بخوں گل

اے ذوق محبت میں کسی غنچہ دہن کے — گلدستے بھی ہیں مرے ہاتھوں پہ فزوں گل

اس غزل کے بعد آزاد نے یہ مطلع درج کیا ہے :

آئینہ فلک میں ہے عکس چراغ دل — خورشید ہو نمود ہوا بل بے داغ دل

یہ مطلع آتش کا ہے اور اُس دیوان میں موجود ہے جو دہلی اردو اخبار پریس سے شائع ہوا تھا۔

ردیف میم : دیوان میں دو غزلیں ہیں اور تعداد اشعار ۳۱۔ آزاد نے دوسری غزل کو دو غزلہ کر دیا ہے اور پہلی غزل میں بھی، جو آزاد کے ہاں تیسری ہے، ایک شعر بڑھا دیا ہے :

۱۔ دیوان ، ۱۰ ؛ آزاد ، ۱۸ ؛ مطلع :

پابند جوں دُخاں ہیں پریشانیوں میں ہم — یارب ہیں کس کی زلف کے زندانیوں میں ہم

آزاد کے یہاں یہ غزل تیسری ہے ، اس میں یہ عجیب و غریب شعر اضافہ کیا ہے جس کا ماخذ یقیناً ذوق کا "بند و زنداں" والا مصرع ہے :

اس خال رخ پہ جمع ہوئے قطرۂ عرق — بند و اسیر دیکھیں [ہیں] زندانیوں میں ہم

"خال پر جمع ہوئے" ہیں یا خال کے گرد جمع ہوئے ہیں ؟

۲۔ دیوان ، ۱۴ ؛ آزاد ، ۱۴ ، مطلع :

شمع نازاں نہ ہو اک رات بہا آنسو گرم — برسوں یہاں آنکھ سے ٹپکا ہے مری لو ہو گرم

اس غزل میں سوائے مندرجہ بالا مطلعے کے باقی سب شعر آزاد کے مصنفہ ہیں ۔ اس پر یہ نوٹ ہے :

۵۔ لڑکپن کی غزل ہے۔ والد مرحوم کی اس عہد کی بیاض میں لکھی تھی۔ دو شعر مجھے یاد رہ گئے:

لب شیریں کو تکے جان کے رس چشم مگس
بیٹھی تلووں میں پڑے جاگے ہے بس چشم مگس

لب شیریں سے ہے رس پر مگس نہیں چشم مگس "بیٹھی ہے"، خوب!

بوالہوس جیفۂ دنیا سے بھرا لیکن نہ ترا
تو مگس اور تری چشم ہوش (ہوس) چشم مگس

معلوم ہوتا ہے یہ شعر ذوق کو شاہ نصیر کے برابر ثابت کرنے کی غرض سے کہے گئے ہیں۔ آزاد کے ذہن میں یقیناً شاہ نصیر کی "عسل کی مکھی" والی غزل تھی۔

ردیف صاد مہملہ کی ہر دو نسخوں میں ایک ایک غزل ہے اور ردیف ضاد میں بھی۔ البتہ موخرالذکر میں آزاد نے ایک مہمل شعر کہا بھی اور درج دیوان بھی کیا:

ہوتا حق میں ہے مرے مطلع آہی متعارض
اُلٹے پڑتے ہیں جگر کے کبھی پڑھتا ہوں جو آہ

پھر خود ذوق کی زبانی یہ کہہ کر کاٹ دیا: "فرمایا آہی سپرداری بڑا شاعر ہوا ہے پھر آپ ہی کہا کاٹ دو۔ شاید اور لوگ بھی نہ سمجھیں۔ ہم تو سب کے لیے کہتے ہیں۔" اس "آہی سپرداری" پر پروفیسر شیرانی نے اپنے مضمون میں خاصی روشنی ڈالی ہے ہمیں دہرانے کی ضرورت نہیں۔

ردیف عین و قاف میں ہر دو نسخوں میں ایک ایک شعر ہے۔ البتہ ردیف کاف میں ویران میں ایک غزل اور ایک شعر ہے۔ آزاد نے ایک مطلع خود کہہ کر دیوان میں شامل کر دیا ہے:

پھر تو آئے نہ جیسے ہم جا کے اس مغرور تک
پر اُچھلتا ہی رہا اپنا کلیجہ دور تک

پھر آئے تھے، اس لیے کلیجہ دیر تک اُچھلتا یا دھڑکتا تو شعر میں کچھ معنی پیدا ہو جاتے۔

ویران میں ردیف گاف سرے سے ہے ہی نہیں۔ آزاد نے دو شعر کو کر اس نوٹ کے ساتھ درج کیے ہیں:

"پرانی غزل ہے۔ سات شعر تھے۔ دو یاد رہ گئے۔ وہی لکھ دیتا ہوں": وہ دو شعر یہ ہیں:

بینی و عارض و ابرو سے ہیں شاخ و گل و برگ
یوں عیاں اس چمن رو سے ہیں شاخ و گل و برگ

بینی شاخ ہے، عارض گل ہیں لیکن ابرو کا برگ ہونا مشکوک ہے بشرطیکہ نیم کی پتیاں نہ ہوں۔ (؟)

بینی اور وہ دہن خندہ زن اور تارک لب
کیجیے گویا قلم موسے ہیں شاخ و گل و برگ

خندہ لب کو خندہ زن، کتنا عبرت ناک ہے۔

ردیف لام: نسخۂ ویران میں تین غزلیں اور تیس شعر ہیں۔ آزاد میں چار غزلیں اور ۲۶ شعر ہیں۔ ملاحظہ ہو

۱۔ ویران ۰ ۱۳۰؛ آزاد ۰ ۱۲۔ مطلع: پھنسے نہ حلقۂ گیسوئے تابدار میں دل
بلا سے گر ہو نوالہ دہان یار میں دل

ذوق کا دوسرا شعر تھا: بغل میں جیسے مرا دل بغل کا دشمن ہے تو
نہ ایسا ہو کسی دشمن کے بھی کنار میں دل

۱۔ اشعار ۱۲ ۔ کون سا ہمدم ہے تیرے عاشقِ بے دم کے پاس
غم ہے اس کے پاس ہمدم اور وہ بے دم کے پاس

مصرعے بے ربط، زبان غلط اور شعر مہمل ہے۔

ہم کو کیا ساقی جو تھا جام جہاں میں جم کے پاس
تیرا جام بادہ ہو۔ اور تو آ اس پُرغم کے پاس

مصرع اولیٰ آزاد کو نہیں جچا، چناں چہ اس کے لیے یہ زن "تجویز کیا ع ہم کو کیا ساقی جو تھا جام جہاں میں جم کے پاس
دونوں مصرعوں میں "ہیں" کی جگہ "میں" چھپ گیا ہے جو دیوان ہی شعر کے جعلی ہونے کا کافی ثبوت ہے۔ دوسرے مصرعے کا "تیرا جام بادہ"
بھی توجہ طلب ہے؛

پشت لب پر سبزہ گویا خضر ہے اور لب عیسیٰ
بڑی دوڑ از کار نازک خیالی ہی جو ذوق کا مزاج نہیں

روح اس آتش بجاں کی بعد مُردن جوں پتنگ
آئے گی اڑ کر چراغِ خانۂ ماتم کے پاس

کس آتش بجاں کی؟ اگر یہ "اس" ہو تو شاعر یا عاشق کے لیے ہو سکتا ہے لیکن محبوب کا گھر کیا ماتم خانہ ہے جس کے
چراغ کے پاس روح آئے گی!

واہ صیادِ اجل۔ اور واہ صیادی کا پیچ   کھچ کے ہے اسفندیار آیا کہاں رستم کے پاس

مطلب کیا ہے؟ اگر اسے رستم سہراب کی داستان کی طرف اشارہ بھی فرض کر لیا جائے تو بھی رستم اسفندیار کے
پاس گیا تھا یا اسفندیار رستم کے پاس آیا تھا؟ غرض سب اسی قبیل کے شعر ہیں۔ مقطع ہے؛

کرکے بحر و قافیہ تبدیل لکھ اور اک غزل
بیٹھ کوئی دم تو لے ذوق اور اس پرغم کے پاس

کس پُرغم کے پاس بیٹھ؟

۲۔ اشعار ۱۰۔ تیر و کماں ہے گریبت ناوک فگن کے پاس
آہ و قد خمیدہ ہے اس خستہ تن کے پاس

• اس کی جگہ بیشتر مقامات پر "اس" چھپا ہے۔ بہر حال شعر کا مطلب کیا ہے؟

شب جانِ زار رک گئی لب پر دہن کے پاس   پھر اٹھ کے رہ گیا یہ مسافر وطن کے پاس [؟]

لب کو دہن کے پاس کہنا عجیب ہے۔

یہ جوئے خوں رواں نہیں۔ دیکھو ہے رو دیا   تیشہ سر اپنا رکھ کے سرِ کوہکن کے پاس [؟]

غرض سارے شعر مہمل ہیں، کہاں تک نقل کیے جائیں! مقطع اور دیکھ لیجیے:

اے ذوق صدقے جائیے پیکِ خیال کے   کیا لے گیا اڑا کے بت سیم تن کے پاس [؟]

غزل نمبر ۱۲ کے دو شعروں پر آزاد نے یہ نوٹ لکھا ہے:

ایک غزل کے دو مطلعے مجھے ایک مجہول آدمی نے سنائے [اور مجہول آدمی کی بات کا کیا بھروسا!] اور کہا کہ اُستاد کے ہیں۔ میں نے یاد کر لیے۔ اور اُستاد سے جا کر پوچھے۔ فرمایا، اہو۔ لڑکپن کے ہیں بھی بلکہ بچپن کے [حالاں کہ بچپن بلکہ لڑکپن میں اُستاد کے آغازِ شعرگوئی کا بھی کوئی ثبوت نہیں] اب تو سنتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ لکھ لو۔ کبھی درست کریں گے [جب سنتے شرم آتی تھی تو لکھ لینے کی تلقین کیوں؟] وہ بھی عجب [دن] تھے۔ ہم مشاعرہ میں گئے۔ یہ غزل پڑھی۔ بڑی تعریفیں ہوئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد حکیم ثناء اللہ خاں فراق۔ برہان الدین خاں زار۔ میر غالب علی سید تشریف لائے۔ یہ بزرگ اس زمانہ میں اراکینِ مشاعرہ بلکہ اراکینِ شہر شمار ہوتے تھے [خود آزاد کے مختلف بیانوں سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ جب تک اراکینِ مشاعرہ یا اراکینِ شہر تشریف نہ لائیں، مشاعرہ شروع ہی نہیں ہوتا تھا] لوگوں نے اُن سے کہا۔ انھوں نے پھر ہمیں پاس بلایا [کیا پہلے بھی پاس بلا چکے تھے؟] دل بڑھایا اور فرمائش کر کے دوبارہ غزل پڑھوائی۔ کیا لوگ تھے۔ اللہ مغفرت کرے۔

اس ساری داستان طرازی کے باوجود شعر قابلِ تعریف نہیں ہوسکے، مہمل کے مہمل ہی رہے۔ ملاحظہ ہو

نامۂ شوق کو مرے باندھے جو بال و پر لگا — کیوں ارے مرغِ نامہ بر کچھ کو ہوئے وبال پر

مصحفِ روئے یار میں دیکھا ہے موجِ خال پر — لکھتے ہیں قل ہو اللہ ہم ایک چنے کی دال پر

دال کے ایک دانے پر یا ایک چنے کی دال پر قل ہو اللہ لکھتے ہیں۔ چنے کی دال کیا کالی ہوتی ہے جو اسے خال بنایا؟ پھر آپ نے تو صرف خال میں بال دیکھا تھا، بنایا ہوتا تو چنے کی دال پر قل ہو اللہ لکھنے کے مترادف ہو سکتا تھا، دیکھنے میں کیا کمال ہے؟ ڈاکٹر علوی نے ان اشعار کا ماخذ بھی تذکروں کو بتایا ہے۔ ہم نے عیار سے تصدیق کے لیے لکھ دیا ہے۔ انشاء اللہ تردید ہو جائے گی۔ یہاں ایک بار پھر یہ عرض کر دیں کہ اس بحر میں ابھی تک ذوق کا کوئی شعر ہماری نظر سے نہیں گزرا۔

۱۷ویں اور ۱۸ویں نمبر پر آزاد نے مندرجہ ذیل دو شعر درج کیے ہیں جو کہیں اور نہیں ملے۔ چنانچہ انھیں بھی آزاد کی تصنیف کہیے۔

دلِ شوریدہ سر نے خاک اُڑا کر — بیاباں رکھ لیا سر پر اُٹھا کر

خفا تو ہو نہ وقتِ ذبح میرے تلملانے پر — کہوں کیا لوٹتا ہوں میں ترے بانکپنے پر

دیوان میں بے تصریحِ ردیف سین مہملہ کے صرف دو مطلعے ملتے ہیں جو آزاد میں بھی موجود ہیں۔ البتہ آزاد میں کل پانچ غزلیں اور ۲۶ شعر ملتے ہیں، تفصیل حسبِ ذیل ہے۔ یہ نوٹ آزاد نے اس ردیف کے آغاز میں لکھا ہے: "یہ دو غزلیں انھیں مسودوں سے نقل ہوا ہے جن پر نظرِ ثانی نہیں ہوئی تھی" لیکن مسودے تھے کہاں؟ وہ تو غدر میں ضائع ہو گئے تھے۔ بہرحال پہلی غزل یہ ہے۔

نامہ نکالنے پر آزاد نے حاشیہ لکھا ہے :

لہ نامہ نکالنا : وہی مشہور عمل ہے جسے اب عوام ناداں نکالنا کہتے ہیں۔ پہلے جب کوئی چیز کھوئی جاتی تھی کسی عامل سے چور کا نام کبھی صورت کبھی اور آنا پتا معلوم کر لیا کرتے تھے۔ پھر کبھی کاغذ کے پرزوں پر نام لکھ کر کبھی پانی میں اور کبھی آئینہ میں صورت دیکھ کر کبھی تیر کے ذریعے ہوتا تھا۔ وغیرہ وغیرہ (!) تیر میں یہ اشارہ ہوتا تھا کہ یہی چور کے کلیجے میں لگے گا۔ مطلب یہ ہے کہ لے یار۔ دل سینہ میں کہاں ہے۔ دیکھ بھال نہ کر۔ ہاں لے آ، دل تو تیر کا ناداں نکال کر بتادے کہ تیرے ہی تو پاس ہے (لے یار)

شعر کی اس شرح سے قارئین کو اندازا ہو گیا مزید کچھ کہنا فضول ہے۔

آزاد نے ۱۱ویں نمبر پہ ایک مطلع :

اے دل وہ ستر غمزۂ پنہاں عیاں نہ کر　　آنکھوں سے دیکھ اور زباں سے بیاں نہ کر

اور ایک شعر درج کیا ہے۔ یہ دونوں شعر دیوان میں تتمہ اشعار غیر مرقومہ کے تحت موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ہی دیوان میں ردائے مہملہ کے اشعار ختم ہوئے البتہ آزاد میں ۹ ویں نمبر پر ۱۱ شعر کی ایک غزل ملتی ہے :

مزا چکھایا ہے کوہکن کو۔ جو عشق آیا ہے امتحاں پر　　کہ لایا تو جوئے شیر لیکن چٹی کا دودھ آگیا زباں پر (کذا)

اس مطلع اور ایک شعر کی بابت ڈاکٹر علوی صاحب نے اپنے مرتبہ کلیات میں بتایا ہے کہ دیوآن، نغز اور عیار وغیرہ میں موجود ہیں۔ دیوآن اور مجموعۂ نغز میں تو بہر حال مذکورہ اشعار نہیں ہیں۔ عیار الشعرا فی الوقت ہماری دسترس میں نہیں۔ ہم نے ڈاکٹر نورالحسن نقوی کو علی گڑھ لکھ دیا ہے کہ وہ عیار الشعرا میں دیکھ کر تصدیق یا تردید کر دیں۔ ان کا جواب آنے پر حواشی یا استدراک میں اس کا ذکر کر دیا جائے گا۔ فی الوقت بقیہ اشعار میں سے کچھ پیش ہیں :

خدنگِ دنبالہ کھایا لیکن نہ لایا شکوہ کبھی زباں پر　　کہ بوسہ اس چشم سرمہ سا کا ہے مہر گویا مری زباں پر

قافیہ ندارد ! ؎

لگا کے باتوں میں ان کو لائیں جو حرف مطلب کا کچھ زباں پر　　تو ایسی کہدیں ٹھکانہ جس کا لگے زمیں پر نہ آسماں پر

"تو ایسی کہدیں" کون ؟ ؎

تپ محبت میں سخت جانی کا یا اثر ہے دل طپاں پر　　کہ شکل سوہاں پڑ گئے ہیں ہزاروں کانٹے مری زباں پر

معلوم ہوتا ہے آزاد کے ذہن میں ذوق کا یہ شعر جس میں "سوہاں" کا مضمون بندھا ہے، ضرور تھا

جس کی آواز سے ہوں رونگٹے سوہاں کے کھڑے　　وہ محبت نے دیا سلسلہ یا ہم کو

لیکن آزاد کے مصنفہ مصرعوں میں کوئی ربط نہیں۔ بقیہ شعر اسی طرح بے ربط ہیں۔ لہٰذا ہم مقطع نقل کر کے اسے یہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ غزل میں تکرار قوافی بھی غور طلب ہے ؎

کہاں رہی مجھ میں جاں ہے باقی کہ ہے دھواں ہو کے لب پہ آتی

جو ذوق آنسو کی بوند ٹپکی ہمارے داغِ دلِ طپاں پر [؟]

۹۔ ویران ۹، آزاد ۱۱۔ مطلع: جاں ہوا یوں ہوئی اس غال کا بوسہ لے کر — جیسے اُڑ جائے دہن میں کوئی گُلکا لے کر

آزاد میں یہ دو شعر فاضل ہیں: تیرے پرزے نہ کیے خط کی طرح لے قاصد — شکر کر چھوڑ دیا اس نے تو شانے کر

میرے قدموں ہی میں رہ جائیں گے جائیں گے کہاں — دشت میں میرے قدم آبلۂ پا لے کر

میرے قدم میری ہی قدموں میں رہ جائیں گے، کیا مطلب؟

پانچویں، چھٹی اور ساتویں غزل دونوں نسخوں میں یکساں ہے۔ البتہ چھٹی اور ساتویں غزلوں پر بہ طور نوٹ آزاد نے جو افسانے لکھے ہیں، ان میں کوئی صداقت نہیں۔ ۸ویں اور ۹ویں غزل ویران میں ایک ایک شعر کی ہے۔ یہی تعداد آزاد میں بھی ہے لیکن وہاں ترتیب میں یہ ۱۴ویں اور ۱۵ویں ہیں۔

۱۰۔ ویران ۱۲، آزاد ۲۳۔ مطلع: وہ کہے کون ہے قرباں مری اس چتون پر — میں کہوں میں تو کہے میں کے چھری گردن پر

آزاد نے پہلا مصرع یوں بنا دیا ہے:

جب وہ پوچھے کہ ہے غش کون مرے چتون پر (کذا) — اس کے علاوہ ایک شعر کا اضافہ ہے

جو ترے دوست پہ بیتی ہے ارے ظالم — وہ مصیبت نہ ہو دنیا میں کسی دشمن پر

۱۲۔ ویران، مطلع ۸، آزاد ۱۴۔ اس پر نوٹ ہے "غزل مرقومۃ الذیل کے مطلع کے باب میں بعض اشخاص سے میں نے سنا کر اس میں شاہ نصیر مرحوم کی اصلاح ہے۔ اُستاد مرحوم سے پوچھا۔ انھوں نے فرمایا عالم شباب میں میں نے فقط مطلع کہا تھا:

نرگس کے پھول بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کر — ایما ہے یہ کہ بھیج دے آنکھیں نکال کر

یہ رفتہ رفتہ مشہور ہو گیا۔ تم دیکھتے ہو کہ میں ہمیشہ اپنے کلام کو زیر نظر رکھتا ہوں۔ میں نے خود اس میں اصلاح کی۔ کہنے والوں نے کہہ دیا کہ شاہ صاحب نے اصلاح کی۔ دل کو سخت رنج ہوا۔ مگر ضبط کیا۔ اور تدارک یہی سمجھ میں آیا کہ غزل پوری کی۔ اللہ نے داد یہ دی کہ وہ اس سے بھی زیادہ مقبول خلائق ہوئی۔" پھر سب چُپ چاپ ہو کر بیٹھ گئے۔ دل کو سخت رنج کیوں ہوا؟ آخر شاہ نصیر کے شاگرد تھے اور استاد نے اصلاح دی یا لوگوں کے بہ قول ایسا ہوا تو اس میں رنجیدہ ہونے کی کیا بات تھی۔ آخر استاد ہوتے کس لیے ہیں؟ وہ تو سارے کلام پر حسب ضرورت اصلاح بھی دیتے ہیں اور اصلاح کی ضرورت نہیں رہتی تو شاگرد کو فارغ الاصلاح کر دیتے ہیں۔ اس کے باوجود شاگردی برقرار رہتی ہے دروغ گو را حافظہ نباشد۔ یہ افسانہ تراشتے وقت آزاد معرکے کی وہ ساری اُلٹ پھیر بھول گئے جو اس مطلع کے ذیل میں وہ آب حیات میں درج کر چکے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا تھا اس شعر پر شاہ نصیر کی نہیں ان کے بیٹے منیر کی اصلاح ہے اور موجودہ صورت میں مطلع اصلاح منیر کے مطابق ہے۔ آزاد نے "تدارک" کی کہانی اس لیے بنائی کہ انھیں خود اس غزل کو پورا کرنا مقصود تھا۔ چناں چہ مطلعے کے سوا ۱۲ کے ۱۲ شعر آزاد کے ذہن کی اُپج ہیں۔ اس کے "مقبول خلائق" ہونے کی بات ہمیں کچھ نہیں کہنا۔ ہم صرف ایک شعر کا تجزیہ کر کے آگے بڑھتے ہیں:

دل سینہ میں کہاں ہے نہ تو دیکھ بھال کر — لے آہ کہہ رہے تیر کا ناشہ نکال کر

دیتے کیوں کر کر طرح ہوئی ہی نہیں تھی) شاگرد آئے اصلاحیں لے گئے [دو چار کے نام لکھ دیتے تو کیا ہوتا]
مشاعرہ کے بعد اور غزلیں بھی آئیں (۹) دیکھ کر فرمایا۔ دیکھو قافیہ کا پہلو نہیں بٹھا سکتے زمین ملتے چلے
جاتے ہیں۔ ہم بھی غزل لکھ دیں بھلا یا اور بے کر یوں نشست دیتے ہیں [سب کی غزلیں دیکھنے
کے بعد غزل کا کہنا کمال کی نہیں مزاج کی پستی اور عجز طبع کی علامت ہے۔] زمین ٹھنڈی ہے تو ہو۔ کلام
تو بے اصول نہ ہو [آزاد نے مصرع طرح دیا نہیں تو یہ کیونکر معلوم ہو کر زمین ٹھنڈی ہے۔ دراصل ٹھنڈی
زمین کا خیال آزاد کو یہ مقطع دیکھ کر آیا:

ذوق دل سوختہ دیواں کیسے اپنا کیا خاک   متحمل نہیں گرمیٔ سخن کا کاغذ

باقی رہی بات کلام کے بے اصول ہونے کی، تو جب تک شاگردوں کے بے اصول کلام کے نمونے نہ
ہوں، نہ تو استاد کے پابند اصول کلام کا ان سے موازنہ ہو سکتا ہے اور نہ آزاد کی کہانی پر یقین کیا جا
سکتا ہے۔]

بہرحال، چونکہ ویران میں بھی اس غزل کے ۱۳ ہی شعر ہیں، اس لیے اس پر کسی بحث کی ضرورت نہیں۔ البتہ اس
کے بعد آزاد نے ۵ شعر کی ایک اور غزل درج کی ہے جسے تب تک ذوق کا کلام نہیں انا جا سکتا جب تک اس کا کوئی ٹھوس
ثبوت نہ ہو۔ مطلع ہے:

حولِ دل کا مجھے کیا دیتے ہو لا کر تعویذ   اس کا خط لاؤ کہ رکھوں میں بنا کر تعویذ

اگرچہ مخاطب غائب ہے، پھر بھی شعر غنیمت ہے۔ اگلا شعر ہے۔

جو تری چشم کے دیوانوں کا کرتے ہیں علاج   لکھتے ہیں پوست کا آہو کے بنا کر تعویذ

مصرع اولیٰ تقریباً نثر ہے۔ دوسرے مصرعے کی نثر کچھ اس طرح ہوگی [وہ] آہو کے پوست کا تعویذ بنا کر لکھتے ہیں۔
یہ انداز بیان ذوق کی برجستگی سے میل نہیں کھاتا جس کی صہبائی نے اتنی تعریف کی ہے [تفصیل کے
لیے ملاحظہ ہو ترجمۂ حدائق البلاغت)۔ بہرحال، باقی شعر درج کرنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ردیف رائے مہملہ: ویران میں سات مکمل اور سات متفرق کے تحت ایک ایک دو دو شعر کی ہیں
لیکن آزاد میں نو غزلیں مکمل اور نو متفرقات۔ ویران میں کل ستر شعر ہیں لیکن آزاد میں ۱۱۲۔ تفصیل حسب ذیل ہے

پہلی غزل دونوں میں ۹-۹ شعر کی ہے، دوسری غزل میں البتہ ایک شعر کا فرق ہے:

۲۔ ویران - ۸ ؛ آزاد - ۹ - مطلع: خوب روئے آج ہم سنسان ہاموں دیکھ کر
یاد آیا ہم کو مجنوں۔ بید مجنوں دیکھ کر

آزاد میں یہ شعر فاضل ہے: جو ہے نالہ اپنا۔ وہ اک مصرع برجستہ ہے
ہم جو نالاں ہیں کسی کا قدِ موزوں دیکھ کر

تیسری غزل دونوں نسخوں میں برابر ہے۔

صبح کی مژگاں کون سی ہیں کیا شعاعِ مہر؟ اگر ایسا ہے تو یہ شعر سے ظاہر نہیں ہوتا: تارہ کا اتم میں ہونا بھی خوب ہے۔

مسجد میں مدتوں رہے تسبیح خوان صبح
اب میکدہ میں شام کو ناقوس پھونکیے

میکدہ؟ غالباً سہو کتابت ہے۔ مسجد میں وقتِ صبح تسبیح خواں رہے یا تسبیح خوانِ صبح رہے، اور یہ عمل کس کا ہے؟

انجم کے دانت جتنے تھے زیبِ دہانِ صبح
پیسے یہ دانت رات نے مجھ پر کہ گھس گئے

دانت رات نے پیسے اور گھس گئے صبح کے منہ میں انجم کیسے دانت؟

گم کردہ رہ ازل سے بھٹکتے ہیں رات دن
یہ میرے نالہ شب و آہ و فغانِ صبح [؟]

یوں پہنچے اس کی زلف میں عارض کو جان و دل
منزل پہ پہنچیں رات کو جوں رہروانِ صبح

کیا جان اور دل کا قیام عارض میں ہے ورنہ عارض سے زلف میں پہنچنے کا کیا مطلب ہے؟

اے ذوق کچھ نہ پایا شبِ وصل کا مزہ
یا آج صبح ہم نہیں یا طائرانِ صبح

مصرعِ ثانی میں پہلا صبح، حشو۔ طائرانِ صبح کیوں معتوب ہیں، اگر کوئی طائرانِ شب ہوتے جو شبِ وصل کے نغمے میں مانع آتے اور کشتنی قرار پاتے تو اک بات بھی تھی۔

ردیف دال کی دونوں نسخوں میں ایک ایک غزل ہے البتہ آزاد نے محمد بخش کی داستان کے ذیل چند ھا چاند والا مطلع درج کیا ہے۔ داستان فرضی لیکن مطلع اصلی ہے۔ اس کے علاوہ دیوان میں ایک فرد ہے:

دیکھا نہ کبھی ہم نے دو اہلِ صفا بند
ہے آئنہ خانہ بھی گزرگاہ و بد و نیک

اس فرد پر آزاد نے یہ شعر بڑھایا ہے:

دم گھٹتا ہے سینہ میں دم شدتِ گریہ
باراں کی علامت ہے جو ہو جائے ہوا بند

شال برعکس ہے۔ اس کے بعد یہ عبارت ملتی ہے: "ایک دن والد مرحوم کے پاس آئے [ذوق] (ترتیب دیوان کی تجویز ہونے لگی۔ ایک ان میں سے یہ کہ ہر ردیف میں کچھ غزلیں ہونی چاہئیں۔ جن میں نہیں ان کے لیے طرحیں مجوزہ ہوں، ردیف دال کے لیے یہ مصرع بھی طرح ہوا تھا: پنبہ داغِ دل پہ اندک سرخ ہے اندک سفید" یہ قصہ اس لیے بھی غلط ہے کہ ردیف دال میں تو پہلے سے شعر موجود تھے پھر طرح تجویز کرنے کی ضرورت؟ چوں کہ یہ معلوم نہیں مجوزہ مصرعِ طرح کس کا ہے، اسے ذوق کے کلام میں شامل نہیں کیا جا سکتا، آزاد کے اضافوں میں بھی شمار کرنا مناسب نہیں۔

دال مہملہ کی ردیف میں آزاد نے دو اور دیوان نے صرف ایک غزل درج کی ہے۔ آزاد نے پہلی غزل کے ساتھ نوٹ لکھا ہے:

۱۸۵۲ء میں ایک مشاعرہ ہوا۔ اس میں یہی طرح ہوئی طرح ہوئی تھی [آزاد نے مصرعِ طرح نہیں دیا]

کبھی کرتی ہے قدم رنجہ جو گلشن سے صبا ٭ اور ہوتا ہے سوا مرغِ گرفتار کو رنج

یہ نہیں بتایا کہ صبا گلشن سے کہاں قدم رنجہ کرتی ہے ؟ غالباً قفس میں جس کا شعر میں کہیں پتا نہیں۔ اس کے علاوہ صبا کا قدم رنجہ کرنا کیا ہوا ؟ محض رنجہ اور رنج کی تجنیس مقصودِ شعر ہے ؛

شربتِ خضر بھی دے ہے روشِ تلخیِ مرگ کرنا ٭ تیری اس زہر بھری آنکھ کے بیمار کو رنج (؟)

سخت جانی سے ہوں لاچار وگرنہ مجھ سے ٭ نہ تو خنجر کو ہے آزار نہ تلوار کو رنج

گو معنی ہماری سمجھ میں آتے ہوں، پھر بھی شعر جہل ہے۔

سن کے فریاد قفس میں مری خوش ہوں یہ درد ٭ یہ نہ پوچھیں کہ ہے کیا مرغِ گرفتار کو رنج (؟)

۲ ؛ اشعار ۱ مرتا ہوں انتظار میں کوئی لبشر تو بھیج ٭ خط بھیج یا نہ بھیج زبانی خبر تو بھیج

کسی آدمی کو بھیج یا اپنا کوئی آدمی بھیج کی جگہ کوئی لبشر تو بھیج کہنا عجیب ہے۔

ردیف جیم فارسی کی دونوں نسخوں میں ایک غزل ہے لیکن ویران میں شعر بھی ایک ہی ہے اور آزاد میں چار۔ فاضل شعر یہ ہیں ؛

اس پری کو تو نہ ہے حیف دلے دلِ بیتاب کھینچ ٭ اور لو ہے آدمی کو چاہ میں سیماب کھینچ

ذوقِ محبوب کے لیے "پری" نہیں باندھتے۔ دوسرا مصرع سمجھ میں نہیں آتا۔ آخر آدمی کو چاہ میں سیماب کیونکر کھینچ لیتا ہے ؟

عاشقِ رسوا کے خط میں کیا تکلف چاہیے ٭ چار حرف اک پرچہ پہ دو دو نہیں بے القاب کھینچ

"رسوا" حشو ہے۔ "گھسیٹنا تو سنا تھا، حرف کھینچنا آج ہی سنا؛ "چار حرف" بھی خوب ہے۔ اگر دو حرف کا محاورہ پسند نہیں تھا تو تین حرف کھینچتے۔

ردیف حائے حطّی ، دونوں نسخوں میں دو غزلیں ہیں ، تعدادِ اشعار مختلف ہے تفصیل ملاحظہ ہو ؛

۱ ۔ ویران ۴ ، آزاد ۹ ۔ فرقت کی رات جی چکے ہم تا زمانِ صبح ٭ ہوگی اذانِ گور ہماری اذانِ صبح

یہ "اذانِ گور" کون سی اذان ہوتی ہے ؟ ہم تو یہ جانتے تھے کہ نمازِ جنازہ کے لیے بھی کوئی اذان نہیں ہوتی پھر یہ نئی اذان کہاں سے نکل آئی ؛

پُر نور ہے ترا رخِ سیمیں بسانِ صبح ٭ آنکھیں ہیں تیری مست صبوحی نشانِ صبح

"مستِ صبوحی نشانِ صبح" کیا ہوا ؟ رخ سفید، صبح بھی سفید اور آنکھیں صبح کی صبوحی کش (مست کو مشل ان لیجیے) ہیں ، تو کیا سفید ہیں ؟

تارِ شعاعِ مہر بھی رنگِ شفق میں روز ٭ ماتم میں ہیں مرے مژۂ خونچکانِ صبح

"تارِ شعاعِ مہر" واحد ہے، ماتم میں ہیں" کیوں ؟ پھر تارِ شعاعِ مہر ماتم میں ہے یا مژۂ خونچکانِ صبح"

ہوگیا نامۂ شوق ان کو سب ازبر میرا ؎ کھا گئے ذبح جو کر کے وہ کبوتر میرا

آزاد نے یہ نہیں بتایا کہ کبوتر کو ذبح کر کے کھانے سے پہلے نامہ پڑھ لیا تھا یا بغیر پڑھے ہی ازبر ہوگیا۔

۱۔ کچھ رازِ نہاں دل کا بیاں ہو نہیں سکتا ؎ گونگے کا سا ہے خواب بیاں ہو نہیں سکتا

گونگے کا خواب اس راز کے لیے کہتے ہیں جس کا علم نہ ہو یا نہ ہو سکتا ہو۔ دل کا راز رازِ قدرت ہے نہ رازِ حیات۔

۱۰۔ سبزۂ خط سے خضرِ طریقت رکھتا رسم الخط ہے جدا
خطِ بیتاں ہے خطِ الٰہی لکھے موسیٰ پڑھے خدا

اس وقت یاد نہیں آتا غالباً "لکھے موسیٰ پڑھے خدا" کا ذوق کے کسی شعر میں آیا ہے۔ البتہ یہ شعر ذوق کا نہیں۔ خضرِ طریقت محض سبزہ کی رعایت سے لائے ہیں ورنہ ممکن ہے پیرِ طریقت کہتے۔ "لکھے موسیٰ پڑھے خدا" کی مثل کا استعمال بھی غلط ہوا ہے۔ خود کہہ چکے ہیں خطِ بیتاں ہے خطِ الٰہی۔ پھر یہ خدا ہی کا لکھا ہوا ہے لہٰذا "لکھے خدا اور پڑھے خدا" کہتے تو شاید کچھ بات بن جاتی لیکن اس صورت میں مثل ہاتھ سے جاتی رہتی۔

ردیف الف کا جائزہ ختم ہوا۔ ردیف ب میں دیوان اور آزاد دونوں میں پانچ پانچ غزلیں ہیں اور اشعار کی تعداد بھی برابر ہے۔ لفظی ترامیم سے ہمیں فی الوقت واسطہ نہیں۔ اس کے بعد ردیف ت کی دونوں میں دو دو غزلیں ہیں البتہ آزاد میں ایک شعر فاضل ہے:

پوچھے کوئی مجھ سے اگر انجامِ محبت ؎ خاکسترِ پروانہ دکھا دوں میں اڑا کر

معلوم ہوتا ہے یہ شعر کہتے وقت آزاد کے ذہن میں میر کا شعر تھا ؎
مشتِ غبار رہ کے صبا نے اڑا دیا

ردیف جیم عربی کا دیوان میں صرف ایک شعر ملتا ہے، اور وہ فرد ہے۔ آزاد نے بھی اسے نقل کیا ہے۔ البتہ پہلی غزل جس کے آزاد میں نو شعر ہیں، دیوان کے تتے میں اس کے تین شعر ملتے ہیں۔ اس غزل کے علاوہ بھی آزاد نے ایک شعر اور درج کیا ہے۔ پہلے پہلی غزل:

مطلع، پہلا شعر اور مقطع دیوان میں بھی ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار ذوق کے نہیں لگتے:

جا بجا کوہ کے چشموں سے رواں ہیں آنسو ؎ ہے جو ناکامیٔ فرہاد کا کہسار کو رنج

یہ وہی "کوہ کے چشموں سے اشکوں کو نکلتے دیکھا" اور "خونِ فرہاد" والے اشعار کا عکس ہے جو پیچھے نقل ہو چکے ہیں۔

دوسرے یہ کہ روئے کتابی کا قائل نہ ہونا کیا؟ روئے کتابی کے حسن کا کہنا تھا چہرہ تو بہرحال موجود رہے گا، تصدیق حسن کی چاہیے تھی جو مذکور نہیں۔

۷۴: اشعار، ا۔ بعد فراق کوئی دن ایسا نہ وصل کا ہوا
وہ کہیں تم کو کیا ہوا۔ ہم کہیں تم کو کیا ہوا

۷۵: اشعار، ا۔ آدمی گر ہو مکدر کیا تصور اور آگ کا
خاک کا پتلا ہے یہ کچھ تو اثر ہو خاک کا [؟]

۷۸: اشعار، ا۔ جب قیامت قد ترا اے رشک گلشن بن گیا
اختر صبح قیامت خال گردن بن گیا [؟]

۷۹: اشعار، ا۔ نشۂ پندار سے ابلیس رہ گم کردہ تھا
ورنہ آدم میں دھرا کیا تھا، وہی در پردہ تھا

دوسرا مصرع ناقص ہے۔ "آدم میں دھرا کیا تھا" تو آدم کی تحقیر ہوئی۔ "وہی در پردہ تھا" سے آزاد کی مراد خدا سے ہے جسے سجدہ کرنے میں ابلیس کو عذر نہیں ہو سکتا تھا لیکن شعر میں "وہی" خود ابلیس کی طرف انگشت نما ہے۔

۸۰: اشعار، ا۔ بعد قاف عشق تھا جو درس مکتب خانہ تھا کاف کن کے ماسبق کیا جانے کیا تھا کیا نہ تھا
"قاف عشق" اور "کاف کن" پر شعر کی بنیاد رکھی ہے لیکن المعنی شعر فی بطن الشاعر

۸۴: اشعار، ا۔ دل کی طپش سے زخم جگر کا رات جو ٹانکا ٹوٹ گیا
طائر جاں جو رشتہ بپا تھا فرصت پاکر چھوٹ گیا

اول تو دل کی تپش سے ٹانکا ٹوٹنے کا کوئی جواز نہیں۔ بالفرض یہ مان لیا جائے کہ دل کی تپش ٹانکا توڑنے کا سبب بن سکتی ہے تو ٹانکا زخم جگر کا کیوں ٹوٹا؟ طائر جاں کی رشتہ بپائی، دل سے تو ہو سکتی ہے، جگر سے اُسے کیا واسطہ؟

۹۱: اشعار، ا۔ ہوئے انساں ہم درد(د) محبت کے لیے پیدا؛ فرشتے ہوتے گر ہوتے عبادت کے لیے پیدا
یہ میر درد کا شعر بگاڑا ہے:
دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو ؛ ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

۹۲: اشعار، ا۔ یارب یہ اس زمانے کے لوگوں کو کیا ہوا ؛ جس کا بُرا ہو۔ اُن کو یہ کہنا بھلا ہوا
دوسرے مصرعے کی بندش درست نہیں۔ "ان" دھوکا دیتا ہے

۹۴: اشعار، ا۔ آخر گِل اپنی خاک در میکدہ ہوئی ؛ پہنچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا
بہ ادنیٰ تغیر یہ شعر غالبؔ کا جانِ دار کا ہے۔ آزاد نے ذوق کو بخش دیا۔

...با، کہنا پڑا۔ خیر اگر یہی کہنا تھا تو "ایمان و دیں گئے" کہتے۔

خورشید وار چرخ پہ چمکا کوئی تو کیا
آخر کو سپہر جو دیکھا تو زیرِ زمیں گیا

کوئی خورشید وار جہاں میں چمکا یا چرخ پر؟ اگر اس سے مراد خورشید ہی ہو تو وہ آخر کو زیرِ زمیں نہیں جاتا۔

۱۱؛ اشعار ۲، مطلع:

اے دل نہ راہِ عشق کشادہ سمجھ کے جا
یاں اژدہا ہے پُرخطر جادہ سمجھ کے جا

ہاں جا؟ کہنا چاہتے ہیں کہ راہِ عشق کو کشادہ سمجھ کر اس پر بے سوچے سمجھے مت چل۔ "خطِ جادہ" آزاد کی پسندیدہ ترکیب ہے، کئی اشعار میں لائے ہیں۔ خیر عشق جب ایک راہ ہے تو ہر خطِ جادہ سے کیا مراد ہے؟

عیاریوں سے یار کی نالاں ہے کیوں دلا
اور اس کو اپنا دوست زیادہ سمجھ کے جا

پہلا مصرع ناقص ہے: "اب اس کی عیاریوں سے کیوں نالاں ہے" کا مقام تھا۔ "اب" کے بغیر مصرعے مربوط نہیں ہوں گے۔ "دلا" بھی آزاد کا پسندیدہ لغت ہے، بار بار باندھتے ہیں۔

۱۲؛ اشعار ۱۲

اگر رقصاں نہ سر اپنا سنانِ یار پر دیکھا
تو سر بازی کا اپنے کیا تماشہ اپنا سر دیکھا

جب اپنا سر کسی کی نوکِ سناں پر ہو تو تماشا دیکھنا ممکن ہی نہیں۔ بالفرض شعرا اس معجزے کے حامل ہو بھی سکتے ہوں تو بھی دوسرا مصرع ناقص ہے۔ اس کی زبان عامیانہ ہے: "پھر سر بازی کا اپنی" کا مقام ہے، "اپنے" کا نہیں۔ اسے سہوِ کتابت کے کھاتے میں نہیں ڈالا جا سکتا۔ آزاد کے ہاں ایسی مثالیں بکثرت ہیں۔

جہاں باریک بیں و ناتواں میں اس قدر دیکھا
ہلالِ انتیسویں کا سب کو منظورِ نظر دیکھا

پہلے مصرعے میں "ناتواں میں" تو خیر "ناتواں ہیں" ہوگا۔ جہاں کی باریک بینی میں تو خیر ایک بات ہے، "ناتواں ہیں" محض حشو ہے اور برائے بیت لایا گیا ہے۔ دوسرا مصرع لغو ہے۔ بھلا انتیسویں کے ہلال میں کیا خاص بات ہے۔ وہ ہر ایک کا منظورِ نظر بھی نہیں ہوتا تا وقتے کہ "ہلالِ عید" نہ ہو، اور یہی کہنا تھا۔

۱۳؛ اشعار ۲ -

رہے گا تشنہ لب سیراب یہ بسمل نہ ہووے گا
میسر جب تک آبِ خنجرِ قاتل نہ ہووے گا

بظاہر اس شعر میں کوئی خاص بات نہیں اگرچہ "رہے گا تشنہ لب" کھٹکتا ہے۔ دوسرے شعر میں آزاد نے حسبِ عادت ایک لغو تجویز کر دیا ہے

اگر مہرِ گواہی میرا داغِ دل نہ ہووے گا
کوئی اے لالہ رو اس حسن کا قائل نہ ہووے گا

داغِ دل کی مہر کہاں لگائیں کہ لوگ اس کے حسن کے قائل ہو جائیں۔ غالباً یہ کمی آزاد کو بھی کھٹکی ہوگی لہٰذا انھوں نے پہلے مصرعے کا بدلہ تجویز کر دیا: "کوئی رخ سے کتابی ۲ ترے قائل نہ ہووے گا"، لیکن اس سے بجائے ایک کے دو خامیاں پیدا ہو گئیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ رخِ کتابی پہ "داغِ دل" کی مہر کیونکر لگے گی

ہے۔ دوسرا مصرع بیان کے لحاظ سے غلط بھی ہے مبہم بھی۔ غلط اس لیے کہ "اگر ابھی سے حال دل کہوں گا" کا مقام ہے اور "نہ ٹھہرے" سے پہلے ضمیر "وہ" چاہیے ورنہ "ٹھہرے گا" کا مرجع "دل" اور "حال دل" لگتا ہے، حالانکہ آزاد کی مراد معشوق سے ہے۔

بتاتے ہو علاج اشک جو اس خال کا بوسہ　　طبیبو آب نزلہ ہے کہ بے افیوں نہ ٹھہرے گا [۹]

یہی ہے دل کی بیتابی تو بعد از مرگ بھی قاتل　　نہ ٹھیرا ہے زمیں پر عاشق محزوں نہ ٹھیرے گا

"نہ ٹھیرا ہے" کا تعلق بعد از مرگ سے نہیں قبل از مرگ یعنی زندگی ہی سے ہے۔ بعد از مرگ "زمین پر" نہیں "زیر زمیں" ہوتا ہے۔ بہرحال، ان اشعار کو ذوق سے کوئی تعلق نہیں، یہ آزاد کی تصنیف ہیں۔ اس سے پہلے کسی نے انھیں بنظرِ غائر دیکھا ہی نہیں۔ شیرانی مرحوم نے کچھ کلام پر شبہ ضرور کیا تھا لیکن انھوں نے ذوق کے انداز کا تجزیہ کیا اور نہ آزاد کے انداز سے ان کے رنگ کا موازنہ کرکے دکھایا۔ ہم نے نگارستان کی بحث میں اس امر پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے، قارئین ضمیمے میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

۶۴: اشعار ۴، مطلع :　نالۂ بلبل میں گر پیدا اثر ہو جائے گا
خندۂ گل، خندۂ زخم جگر ہو جائے گا

یہ چاروں شعر بھی آزاد ہی کے ذہن کی پیداوار ہیں۔ مطلع کا مصرع ثانی کچھ موزوں معلوم نہیں ہوتا۔ "خندۂ زخم جگر" بلبل کے لیے ہے یا عاشق کے؟

کشتی بحرِ شہادت ہے ترے بسمل کو تیغ　　اب ادھر سے دیکھنا دم میں اُدھر ہو جائے گا [؟]

ہم نے جانا تھا کہ قاصد جلد لائے گا خبر　　کیا خبر تھی جا کے واں خود بے خبر ہو جائے گا

"بے خبر" یا "مفقود الخبر"؟!

شکل تو دیکھو مصوّر کھینچے گا تصویر یار　　آپ ہی تصویر اس کو دیکھ کر ہو جائے گا

دونوں مصرعے برابر کے نہیں۔ تصویر ہو جائے گا اور تصویر بن جائے گا میں فرق ہوتا ہے۔ ع

اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے (مومن)

۶۵: اشعار ۴، مطلع :　آدم دوبارہ سوئے بہشت بریں گیا
دیکھو جہاں خراب ہوا پھر وہیں گیا

پہلے مصرعے میں چوں کہ "سوئے بہشت بریں گیا" کہا ہے اس لیے دوسرے مصرعے میں "پھر اُدھر گیا" ہونا چاہیے تھا۔ پھر آدم وہاں خراب نہیں ہوا۔ وہاں سے نکالا گیا تھا۔ (آپ اسی کو خراب ہونا کہہ لیجیے) لہٰذا کہنا یہ تھا جہاں سے نکالا گیا تھا پھر وہیں گیا۔

دنیا گئی کہ عشق میں ایمان و دیں گیا　　وہ مل گیا تو جانئے کچھ بھی نہیں گیا

شعر اچھا تھا مگر پہلے مصرعے میں ذرا کسر رہ گئی۔ "دنیا گئی کہ دیں گیا" کہتے لیکن وزن کی مجبوری سے "ایمان"

کوئی ثبوت نہیں۔ کہانی یہاں نقل کرنا غیر ضروری ہے، آبِ حیات میں موجود ہے اور بآسانی دیکھی جا سکتی ہے۔ ہمیں تو صرف یہ کہنا ہے کہ اس غزل کو ذوقؔ سے کوئی تعلق نہیں۔ آزادؔ نے خود ذوقؔ کے نام سے کہی ہے۔ ثبوت خود اسی مطلع میں موجود ہے، لیکن اس سے پہلے کہ اس کا تجزیہ کیا جائے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ پروفیسر شیرانی نے اس غزل کو بھی مشکوک کلام میں شامل کیا ہے۔ آزادؔ نے جب ۱۸۸۰ء بلکہ ۱۸۸۲ء میں اس شعر پر کہانی بنائی تھی، اس وقت اس مطلع کا مصرعِ اولیٰ تھا:

ترے نیچے کوئی آوارہ اے گردوں نہ ٹھیرے گا"

اور یہ اس لحاظ سے ٹھیک تھا کہ ہم سب فلک کے نیچے اور زمیں کے اوپر ہیں۔ لیکن "آوارہ" کی موجودگی اس میں ذم پیدا کرتی ہے۔ چناں چہ آزادؔ جب دیوان مرتب کرنے بیٹھے تو "نیچے" کو "ہاتھوں" سے بدل دیا۔ اب آوارگی اور ٹھیرنے میں تعلق پیدا ہو گیا لیکن دوسرا مصرع، جس کی تعریف میں آزادؔ، میر انیس کی زبانی رطب اللساں ہیں، بظاہر بڑا کسا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن ہے بہت بے تکا۔ پہلے مصرع میں "نیچے" ہو تو، اور اگر "ہاتھوں" ہو تو۔ "نیچے" اس لیے غلط کہ پہلے "گردوں" کی آوارگی کا ثبوت چاہیے، دوسرے خود "گردوں"، "گردوں کے" یعنی اپنے نیچے نہیں ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے مصرعے کا خیال بھی ناممکنات سے ہے یعنی خود اپنے "ہاتھوں گردوں" کا آوارہ ہونا ممکن نہیں، اس لیے "ولیکن تو بھی گر چاہے کہ میں ٹھیروں" کا کوئی جواز نہیں ہے یوں کہ یہ مطلع آپ کی تصنیف کے وقت کہا گیا اور بقیہ اشعار ترتیبِ دیوان کے وقت ثبوت اس کا دوسرے شعر میں موجود ہے۔ ہم یہ ذکر کئی بار کر چکے ہیں کہ آزادؔ جب یہ فیصلہ نہیں کر پاتے کہ کوئی مصرع مناسب ہے یا نہیں تو وہ ایک متبادل مصرع بہ طورِ نسخہ تجویز کر دیتے ہیں۔ نسخۂ مویران میں ایسا ایک شعر بھی نہیں جس کے کسی مصرعے کا "نسخہ" تجویز کیا گیا ہو، لیکن آزادؔ میں ایسے بے شمار مصرعے ہیں۔ ڈاکٹر صادق نے جن دو مسودوں کا عکس شائع کیا ہے ان میں اس کی انتہائی صورت دیکھی جا سکتی ہے چناں چہ یہاں بھی دوسرے شعر میں آزادؔ پہلے مصرعے کی بابت کش مکش میں تھے، لہٰذا انھوں نے ایک نسخہ تجویز فرما دیا، ملاحظہ ہو:

جو تنگ کر ناقہ ترے لیلیٰ سرہانوں نہ ٹھیرے گا   اگر سو کوس ہو گا نجد تو مجنوں نہ ٹھیرے گا

"ن" جنوں! گر ناقہ لیلیٰ سرہانوں نہ ٹھیرے گا۔

ہر دو صورت شعر، شعر نہیں بن پایا:

گرا ہوں چشمِ ساقی سے، مری تصویر میں بھی گر   بنا دے گا کوئی جامِ مئے گلگوں نہ ٹھیرے گا

"مری تصویر میں بھی گر" مصرعِ ثانی کا حصہ ہے۔ "نگارستانِ سخن" کی بحث میں (ضمیمہ ۱) یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ ذوقؔ کے ہاں ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے آزادؔ کے ہاں یہ عیب بہت ہے:

سرِ بالیں مرے ہمدم کوئی دم تو ٹھہر نے دے   ابھی سے کیا کہوں حالِ دلِ محزوں نہ ٹھیرے گا

ردیف میں "ٹھہرے" بر وزنِ فعلن ہے اور دیگر مقامات پر بھی ایسا ہی ہے لیکن یہاں یہ فعلن سے فعولن ہو گیا

اے ذوقؔ کیوں چمن میں وہ گل جا کے بیٹھ ہوں   رنگِ حنا ہے غیرتِ صد پائیں باغ پا

کیا "رنگِ حنا" صرف "پائیں باغوں" کے لیے باعثِ غیرت ہے، دوسرے باغ اس زمرے میں نہیں آتے! ایسی لغویات کو اُستاد کا کلام کیونکر کہیے؟

۶۱: اشعار ۱۲، مطلع: تجھ کو یوسف سے کیا حُسن میں برتر پیدا
گر کیا اس کو پیمبر تجھے کافر پیدا

ڈاکٹر صادق کے مسودوں میں یہ مطلع اسی طرح ہے، پروفیسر شیرانی کے یہاں "برتر" کی جگہ "بہتر" ہے (ممکن ہے ڈاکٹر تنویر علوی نے ایسے اس مسودے سے نقل کیا ہو جسے وہ اس غزل کا ماخذ بتاتے ہیں، بہرحال "برتر" بعد کی ترمیم ہے) چند اشعار کا تجزیہ پیش ہے:

پہلے مطلع ہی کو لیجیے۔ مصرعِ ثانی یہ مفہوم دیتا ہے کہ کافر کو پیمبر پر برتری ہے، جو گستاخی ہے مگر یہ آزادؔ کا اپنا معاملہ ہے۔ ہمیں صرف ادبی پہلو سے واسطہ ہے اور اس لحاظ سے ردیف بے کار ہے۔ یہاں پیدا کے بغیر بھی مصرع مکمل ہے۔

قصدِ پرواز کرے کیوں نہ مرا طائرِ روح   تیرے خنجر سے جو پہلو میں ہو نشتر پیدا

"طائر" کو نشتر سے کیا تعلق؟ "خنجر" میں تو ایک حد تک ذبح کرنے کی مناسبت موجود ہے۔ پھر "خنجر" سے پہلو میں نشتر کیونکر پیدا ہوتا ہے؟

خط ترے شعلۂ رخسار پہ ہے بجز حُسن (ذکنا)   ورنہ ہو سبزہ بھلا آگ پہ کیوں کر پیدا

"آگ میں" یا "آگ پر"؟ خط رخسار پر ہے یا "شعلۂ رخسار پر"

خاکِ دل سوختہ یک مشت ہو گر صرفِ چمن   ہو دیں غنچوں کی جگہ باغ میں اخگر پیدا

"یک مشت" سے مراد ایک مٹھی ہے یا ساری کی ساری۔ اگر ایک مُٹھی ہے تو کیا اگر دو مٹھی صرف ہو تو اخگر کی جگہ چنگاریاں پیدا ہوں گی، اور یہ خاک کس دل سوختہ کی ہو!

بے مکیں ہوتی نہیں زیبِ مکاں کی اے ذوقؔ   خانۂ دل ہے تو کر لو رخِ دلبر پیدا

خانۂ دل میں کسی دلبر کو بساتے، گھر آباد ہو جاتا، لیکن کیا صرف "رخ" سے گھر بس جاتا ہے؟ پھر "رخِ دلبر پیدا" کیونکر کریں گے؟ کوئی طریقہ بتایا ہوتا۔ "کر لو" کی جگہ "کرے" مناسب ہوتا۔

۶۲: اشعار ۷، مطلع: ترے ہاتھوں کوئی آوارہ لے گردوں نہ ٹھیرے گا
ولیکن تو بھی گر چاہے کہ میں ٹھیروں نہ ٹھیرے گا

معلوم ہوتا ہے آزادؔ کو اپنی مصنفہ اس غزل کا یہ مطلع بہت پسند تھا اسی لیے تو انھوں نے میر انیسؔ سے ملاقات کا افسانہ تراشا اور اُن سے اس مطلع پر تین بار داد لی۔ آزادؔ لکھنؤ گئے ضرور تھے لیکن میر انیسؔ سے ان کی ملاقات کا

مجھ کو کیا کیا کچھ تعلق لے سنگ دل پیدا ہوا

بعد میں آزاد کو خیال آیا ہوگا کہ مصرع ثانی تو فعل کی بجائے امراض کی تفصیل ہے لہٰذا انھوں نے مصرع بدل دیا۔ لیکن اب یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ کیا کیا مرض "کس کو پیدا ہوئے" فعل بھی جمع چاہیے۔ یعنی "پیدا ہوئے" لیکن شاید آزاد کو یہ نہیں سوجھا۔ بہر حال دو شعر دیکھیے:

تیرہ بختی تھی اُسی دن اپنی روشن ہو گئی　　　روئے تاباں پر تمھارے جب تحمّل پیدا ہوا

یہاں روشن ہونا، ظاہر ہونے کے معنی نہیں دیتا اگرچہ آزاد کا مقصود یہی ہے:

اُس لب لعلیں پہ ہے یہ جلوۂ رنگ مسی　　　یا کہ نافرمان ولالہ مشتق پیدا ہوا

"یہ مشتق پیدا ہوا" کیا ہے؟ یہاں بھی ردیف میں فعل جمع چاہیے ورنہ واؤ عاطفہ بے کار ہے۔

۱۹؛ اشعار ۱۱ : مطلع : رکھ دل جنوں کی خاک پہ تو با فراغ پا　　　سوز دروں وہی ہر پہ ہوں گے نہ داغ پا

پروفیسر شیرانی نے اسے مشکوک میں شمار کیا ہے۔ ڈاکٹر صادق کے مسودوں میں یہ نہیں ہے۔ بہر حال چند اشعار کے تجزیے سے اس کا جعلی ہونا واضح ہو جائے گا:

تو باغ میں سے کے اگر اے رشک باغ پا　　　پھر آئے واں خزاں تو ہیں ہوویں داغ پا

کس کے "داغ ہوویں" کیا خزاں کے؟ خزاں کے پانو تو آزاد ہی جلا سکتے ہیں۔ ہم تو ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ایسے مضامین باندھنے کے سلیقہ شرط ہے۔

گر کوئے یار میں نہیں ملتا پتا تو پھر　　　کوئے زلف یار میں دل کا سراغ پا

اوّل تو یہ کون ہے جس سے خطاب کیا جا رہا ہے؟ دوسرے سراغ لگایا ڈھونڈھ تک تو چل سکتا تھا لیکن سراغ پانے کے وہ معنی نہیں جو مطلوب ہیں تیسرے کوئے یار میں اگر دل کا پتا نہیں ملتا تو کوئے زلف یار میں سراغ لگانے کی تلقین کی جا رہی ہے لیکن کیا یار تو اپنے کوچے میں رہتا ہے اور اس کی زلفوں کا کوچہ و قیام کہیں اور ہے؟

ہم دل جلوں کی خاک پہ رکھیو نہ تو قدم　　　ان سے تو ڈال دیکھو میاں ایاغ پا

پانو جوتے میں ڈالنے کی یہ تلقین کتنی غیر شاعرانہ ہے!

اُچھلے ہے شیخ وجد میں اس طرح بار بار　　　جس طرح بد لگام ہو گھوڑا چراغ پا

وجد میں اچھلنا کیا اور گھوڑے کا چراغ پا ہونا۔ یعنی چہ؟ بے اختیار انشا کا ایک مصرع یاد آ گیا۔ "خدا بے شیخ سے چہرہ جو محفل میں پھدکتا"۔ غالباً آزاد کا ذہن میں بھی یہ مصرع تھا۔

ساقی کا دورِ چشم ہو گر برکنار آب　　　پاے حباب آب رواں سے ایاغ پا [؟]

بے جی میں آپ جو ٹہلے سرو خوش خرام　　　دھو دھو پیا کریں ترے سب بے دماغ پا

آپ کے جی میں ہے تو شوق سے اس کے پانو دھو دھو کر پئیں لیکن "بے دماغوں" کو یہ تلقین کیوں؟ کیا اس طرح وہ "با دماغ" ہو جائیں گے؟

اپنی غزلوں میں "کبھی کبھی ایک قطعہ بھی کہہ دیتے تھے"؛ لہٰذا ان دنوں کی غزلوں میں انھوں (ذوق) نے بھی ایک ایک قطعہ لگا دیا ہے"۔ یہ تمہید اس لیے ہے کہ اس غزل میں آزاد نے یہ خیالِ خویش ایک قطعہ لگا دیا ہے۔ یہ امر واقعی تعجب خیز ہے کہ آزاد و ربط و بے ربطی میں قطعی تمیز نہیں کر پاتے۔ بعض اوقات وہ ایسے اشعار پر "ق" لکھ دیتے ہیں جن کو آپس میں کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ "صغیر و کبیر" والے قطعے کا حال آپ منبۂ ۵۵ میں پڑھ چکے ہیں۔ یہاں ہم اس غزل کے باقی اشعار کو نظر انداز کرتے ہیں اور جسے آزاد قطعہ کہتے ہیں، نقل کیے دیتے ہیں۔ قارئین خود دیکھ کر فیصلہ فرمالیں۔ مقطعے سے پہلے تیسرے شعر پر مصرعوں کے درمیان بار کیے میں "ق" لکھا ہے۔ اب یہ معلوم نہیں کہ سارے شعر قطعہ بند ہیں۔ یا دو، یا تین۔ عموماً قطعہ دو شعروں کے لیے آتا ہے، تاہم یہاں آخری چاروں شعر نقل کیے جاتے ہیں، ان میں ربط آپ خود تلاش کرلیں:

ساقیا ابر ہے آیا تو بڑھا خم پر ہاتھ (ق) سر گھٹا میں نہیں ہمت کا گھٹانا اچھا
جل کے گر قطرۂ خوں دل کا ہوا اشک آلود تو نہیں نیچہ مژگاں سے گرانا اچھا
گردشِ عمر میں تسبیحِ سلیمانی کا آج اک ہاتھ لگا ہے مرے دانا اچھا
سامنے یار کے اے ذوق بہانا آنسو ہے تو چاہت کے جتانے کا بہانا اچھا

۱۵۷: اشعار ۵؛ مطلع: لختِ دل اور اشک تر، دو تو بہم، دو تو جدا ہیں رواں دو ہم سفر، دو تو بہم، دو تو جدا
پروفیسر شیرانی اور ڈاکٹر صادق دونوں کے یہاں یہ غزل بھی مشکوک ہے۔ ایک شعر دیکھیے:
شکلِ عکس و آئینہ تیرا خیال اور میرا دل آئینے میں یہ بسر، دونوں بہم، دونوں جدا
جب عکس اور آئینے کی طرح محبوب کا خیال اور عاشق کا دل دونوں بہم اور دونوں جدا ہو گئے۔

۱۵۸: اشعار ۹؛ مطلع: لعلِ لب و دندانِ صنم کا دل نے جب خیال کیا ختم تجھ کہکے ہے گوہم نے زباں کو لال کیا
یہ غزل بھی ڈاکٹر صادق اور پروفیسر شیرانی کے مطابق جعلی ہے۔ آزاد نے میر کی زمین میں غزل کہہ کر ذوق کو بخشی ہے۔ اس کی مہملیت، مطلع ہی سے ظاہر ہے مزید بحث کی ضرورت نہیں اس پر یہ مختصر نوٹ لکھا ہے "اسی عالم کا کلام ہے"۔

۱۵۹: اشعار ۷؛ مطلع: ہجر میں کیا کیا مرض ہر سنگِ دل پیدا ہوا حولِ دل پیدا ہوا۔ آزارِ سل پیدا ہوا
اس پر نوٹ ہے: "ایضاً از عالم بالا"۔ ایضاً سے مراد تو غیر اسی عالم یعنی عالم شباب کے کلام سے ہے لیکن یہ "عالم بالا"؟ بہرحال، پروفیسر شیرانی نے یہ مطلع اسی طرح نقل کیا ہے لیکن ڈاکٹر صادق کو ملنے والے مسودے میں مصرعِ اولیٰ اس طرح ہے۔

اِس غزل کا مسودہ بھی شامل تھا۔ اس پر زیادہ بحث فضول ہے۔ صرف دو شعر دیکھیے:

جو چڑھا اوجِ فنا پردہ گرا سایہ نمط — پاؤں اس کوٹھے پہ ہے سب کا پھسلتے دیکھا

یہ اوجِ فنا پر چڑھنا کیا ہوتا ہے!

کوے جاناں سے ہم اور خلد سے آدم نکلے — ان کو دیکھا نہیں پر ہم کو نکلتے دیکھا

[کس نے؟]

۱۴۔ اشعار، ۱۱؛ مطلع: برنگِ گل صبا سے کب کھلا دلگیر دل میرا — کہ ہے باغِ جہاں میں غنچۂ تصویر دل میرا

ڈاکٹر صادق کو ملنے والے مسودوں میں اِس غزل کا مسودہ بھی شامل تھا نیز پروفیسر شیرانی نے بھی اِسے مشکوک کلام کے ذیل میں رکھا ہے۔ بہ طور نمونہ دو شعر پیش ہیں:

ورق پر سینہ کے کھینچا ہے تارِ اشک سے مسطر — کرے گا شرحِ دردِ عشق کچھ تحریر دل میرا

اشکوں کے تار سے چہرے پر تو مسطر کھینچ سکتا ہے لیکن سینے کے ورق پر کیونکر کھینچے گا۔ البتہ اگر داڑھی لمبی ہو اور اشک کے قطرے اس پر سے سینے پر ٹپکیں تو ہو سکتا ہے:

سنبھالے رکھ ذرا اے آسماں دیکھ اپنے دامن کو — زمیں پر کھینچتا ہے نالۂ شب گیر دل میرا

"نالۂ شب گیر کھینچتا ہے"، "نالۂ آسماں گیر" تو نہیں کھینچتا۔ پھر آسماں کو اپنا دامن سنبھالنے کی تنبیہ کی ہے حالاں کہ نالے کے اثر سے خود آسمان کے گر پڑنے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ دامنِ آسماں کے نہیں۔

۱ اشعار، ۱۵؛ مطلع: اُن سے کچھ وصل کا ذکر اب نہیں لانا اچھا — وہ جو کچھ کہویں تو تم بھی کہے جانا اچھا

شیرانی مرحوم اور ڈاکٹر صادق دونوں کے یہاں یہ غزل مشکوک اور جعلی کلام کے ذیل میں آئی ہے۔ موجودہ صورت میں اس مطلع سے یہ نہیں کھلتا کہ مخاطب کون ہے؟ آزاد چوں کہ یہ فیصلہ نہیں کر پاتے کہ کون سی قرأت بہتر ہے اس لیے ایک ایک مصرعے کو کئی کئی طرح کہنے کے باوجود بے جوڑ مصرعوں کا انتخاب کر جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صادق کو ملنے والے مسودوں میں پہلا مصرع اِس طرح تھا: ان سے کچھ ذکر دلا اب نہیں لانا اچھا۔ اِس میں مخاطب تو تھا لیکن ذکر مبہم ہو گیا یعنی یہ نہیں کھلتا کہ کس کا ذکر یا کاہے کا ذکر۔ اور شاعری میں یہ عجزِ بیان آزادی ہی کا حصہ ہے۔ ذوق اِتنے عاجز بیان نہیں۔ اِس غزل پر ایک نوٹ بھی ہے جس میں آزاد نے بتایا ہے کہ شاہ نصیر کی عادت تھی وہ

اور باتوں سے قطع نظر، آخری فقرے توجہ طلب ہیں۔ اس کا مطلب اب تک جو کچھ درج ہوا وہ انتہائے عمر کا کلام تھا، مطلع دیوان یعنی ابتدائی غزل بھی اور وہ بھی جنھیں آغازِ شباب کا کلام بتایا ہے۔ اس سے ایک اور بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اس سے پہلے جو کچھ تھا اس میں تو کسی حد تک ذوق کا حصّہ بھی تھا۔ اب خالصتاً وہ کلام درج ہوگا جس کا علم نہ کسی اور کو ہے اور نہ ذوق کو تھا۔ بہرحال، اب غزلیں ملاحظہ ہوں۔

۵۰۔ ۱۰ اشعار ۔ مطلع ؛ جل اٹھا شمع نمط تارِ رگ جاں میرا — آہ روشن نہ ہوا کلبۂ احزاں میرا

یہ غزل آزاد نے حکیم آغا جان عیش کی زمین میں کہی ہے (آغا جان عیش سے متعلق تمام معلومات فرحت اللہ بیگ کے مضمون سے ماخوذ ہیں جو مضامین فرحت میں شامل ہے)، مصرع ثانی میں "آہ" سے شعر ربوط نہیں ہوتا؛ پھر بھی "کہتے" تو بات بن جاتی لیکن پھر آہ اور شمع کی رعایت کہاں ہوتی!

ملتے دیکھے جو لبِ زخم تو بولا قاتل — آج تیرا ہے دہن اور نمکداں میرا

لبِ زخم کیا آدمی کے لب ہیں کہ ملتے نظر آجائیں گے جنھیں دیکھ کر قاتل انھیں خطاب کرے گا!

اے جنوں! دن سے سوارات کو روشن کردے — مہرِ گردوں ہو جو داغِ دلِ سوزاں میرا!!

اے جنوں تو بھی گیا میں یونہی خانہ خراب — خاک در خاک کیا خانۂ ویراں میرا

نظمِ معنی کا بکھر جائے ابھی حرف بحرف — باندھیں گر اہلِ سخن حالِ پریشاں میرا

اہلِ سخن باندھیں یا نہ باندھیں "نظمِ معنی" کا شیرازہ تو بکھرا ہی ہوا ہے۔

خندۂ جام کو مینا کے لبوں پر رکھ دو — دیکھو پھر ہنستا ہے کیا کیا لبِ خنداں میرا

جام کو تو خیر کسی طرح مینا کے لبوں پر رکھا جا سکتا ہے "خندۂ جام" کو کیونکر رکھا جائے گا!

۵۲۔ اشعار ۱۶، مطلع ؛ دشمنِ جاں یک بہ یک سارا زمانہ ہوگیا — ہائے تاثیرِ محبت یہ ستم کیا ہوگیا

اس پر یہ نوٹ ہے: "اسی عالم میں [غالباً آغازِ شباب سے مراد ہے] ایک مرشدزادہ کی فرمائش سے کہی تھی۔ انھیں گانے بجانے کا بہت شوق تھا۔ اسی کے لئے غزل کہوائی تھی۔

نظرِ ثانی اس پر بھی نہیں ہوئی۔"

اس غزل کا تجزیہ کرنا، وقت ضائع کرنا ہے۔ یہ وہی غزل ہے جسے شیرانی مرحوم نے مشکوک قرار دیا تھا اور جس کے دو مسوّدوں کا عکس ڈاکٹر محمد صادق نے اپنی انگریزی کتاب کے آخر میں دیا ہے۔ ان میں ایک ایک مصرع کو ہم ۴-۵ بار کہنے کے باوجود آزاد مطمئن نہیں ہوئے۔ ان مسوّدوں کو دیکھنے کے بعد جعل میں شبہے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

۵۳۔ اشعار ۱۳، مطلع ؛ کوہ کے چشموں سے اشکوں کو نکلتے دیکھا — اے صنم پر ترا پتھر نہ پگھلتے دیکھا

شیرانی مرحوم کے مضمون میں یہ مشکوک کلام ہے اور ڈاکٹر صادق کو ملنے والے مسوّدوں میں

اس غزل کا مسودہ بھی شامل تھا۔ اس پر زیادہ بحث فضول ہے۔
صرف دو شعر دیکھیے:

جو چڑھا اوجِ فنا پر وہ گرا سایہ نمط
پاؤں اس کوٹھے پہ ہے سب کا پھسلتے دیکھا

یہ اوجِ فنا پر چڑھنا کیا ہوتا ہے؟

کوے جاناں سے ہم اور خلد سے آدم نکلے
ان کو دیکھا نہیں پر ہم کو نکلتے دیکھا

[کس نے؟]

۱۵۴ اشعار، ۱۱: مطلع: برنگِ گل صبا سے کب کھلا دلگیر دل میرا
کہ ہے باغِ جہاں میں غنچۂ تصویر دل میرا

ڈاکٹر صادق کو ملنے والے مسودوں میں اس غزل کا مسودہ بھی شامل تھا نیز پروفیسر شیرانی نے بھی اسے مشکوک کلام کے ذیل میں رکھا ہے۔ بہ طور نمونہ دو شعر پیش ہیں:

ورق پر سینہ کے کھینچا ہے تارِ اشک کی مسطر
کرے گا شرحِ دردِ عشق کچھ تحریر دل میرا

اشکوں کے تار سے چہرے پر تو مسطر کھینچ سکتا ہے لیکن سینے کے ورق پر کیونکر کھینچے گا۔ البتہ اگر ڈاڑھی لمبی ہو اور اشک کے قطرے اس پر سے سینے پر ٹپکیں تو ہو سکتا ہے:

سنبھالے رکھ ذرا اے آسماں دیکھ اپنے دامن کو
زمیں پر کھینچتا ہے نالۂ شب گیر دل میرا

"نالۂ شب گیر کھینچتا ہے،" نالۂ آسماں گیر، تو نہیں کھینچتا۔ پھر آسماں کو اپنا دامن سنبھالنے کی تنبیہ کی ہے حالاں کہ نالے کے اثر سے خود آسمان کے گر پڑنے کا اندیشہ ہو سکتا ہے، دامنِ آسماں کے نہیں۔

۱۵۵ اشعار، ۱۵: مطلع: اُن سے کچھ وصل کا ذکر اب نہیں لانا اچھا
وہ جو کچھ کہوں تو تم بھی کہے جانا اچھا

شیرانی مرحوم اور ڈاکٹر صادق دونوں کے یہاں یہ غزل مشکوک اور جعلی کلام کے ذیل میں آئی ہے۔ موجودہ صورت میں اس مطلع سے یہ نہیں کھلتا کہ مخاطب کون ہے؟ آزاد چوں کہ یہ فیصلہ نہیں کر پاتے کہ کون سی قرأت بہتر ہے اس لیے ایک ایک مصرعے کو کئی کئی طرح کہنے کے باوجود بے جوڑ مصرعوں کا انتخاب کر جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صادق کو ملنے والے مسودوں میں پہلا مصرع اس طرح تھا: ان سے کچھ ذکر دلا اب نہیں لانا اچھا۔ اس میں مخاطب تو تھا لیکن ذکر مبہم ہو گیا یعنی یہ نہیں کھلتا کہ کس کا ذکر کیا گیا ہے۔ ذکر اور شاعری میں یہ عجزِ بیان آزاد ہی کا حصہ ہے۔ ذوق اتنے عاجز بیان نہیں۔
اس غزل پر ایک نوٹ بھی ہے جس میں آزاد نے بتایا ہے کہ شاہ نصیر کی عادت تھی وہ

اور باتوں سے قطع نظر، آخری فقرے توجہ طلب ہیں۔ اس کا مطلب اب تک جو کچھ درج ہوا وہ انہلے عمر کا کلام تھا، مطلع دیوان یعنی ابتدائی غزل بھی اور وہ بھی جنھیں آغازِ شباب کا کلام بتایا ہے۔ اس سے ایک اور بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اس سے پہلے جو کچھ تھا، اس میں تو کسی حد تک ذوق کا حصہ بھی تھا۔ اب خالصتاً وہ کلام درج ہوگا جس کا علم نہ کسی اور کو ہے اور نہ ذوق کو تھا۔ بہرحال، اب غزلیں ملاحظہ ہوں۔

۵۰۔ ۱۰ اشعار۔ مطلع : جل اٹھا شمع نمط تاربگ جاں میرا — آہ روشن نہ ہوا کلبۂ احزاں میرا

یہ غزل آزاد نے حکیم آغا جان عیش کی زمین میں کہی ہے (آغا جان عیش سے متعلق تمام معلومات فرحت اللہ بیگ کے مضمون سے ماخوذ ہیں جو مضامین فرحت میں شامل ہے)۔
مصرع ثانی میں آہ سے شعر مربوط نہیں ہوتا؛ پھر بھی وہ کہتے تو بات بن جاتی لیکن پھر آہ اور شمع کی رعایت کہاں ہوتی!

ملتے دیکھے جو لب زخم تو بولا قاتل — آج تیرا ہے دہن اور نمکداں میرا
لب زخم کیا آدمی کے لب ہیں کہ ملتے نظر آجائیں گے جنھیں دیکھ کر قاتل انھیں خطاب کرے گا!

اے جنوں! دل سے سوارات کو روشن کردے — مہر گردوں ہو جو داغ دل سوزاں میرا!!
اے جنوں تو بھی گیا میں یوں ہی خانہ خراب — خاک در خاک کیا خانۂ ویراں میرا
نظم معنی کا بکھر جائے ابھی حرف بہ حرف — باندھیں گر اہل سخن حال پریشاں میرا

اہل سخن باندھیں یا نہ باندھیں، "نظم معنی" کا شیرازہ تو بکھرا ہی ہوا ہے۔

خندۂ جام کو مینا کے لبوں پر رکھ دو — دیکھو پھر ہنستا ہے کیا کیا لب خنداں میرا
جام کو تو خیر کسی طرح مینا کے لبوں پر رکھا جاسکتا ہے۔ "خندۂ جام" کو کیونکر رکھا جائے گا!

۵۲۔ اشعار۔ ۱۲، مطلع : دشمن جاں یک بہ یک سارا زمانہ ہو گیا — ہائے تاثیر محبت یہ ستم کیا ہو گیا
اس پر یہ نوٹ ہے: "اسی عالم میں [غالباً آغازِ شباب سے مراد ہے] ایک مرشد زادہ کی فرمائش سے کہی تھی۔ انھیں گانے بجانے کا بہت شوق تھا۔ اسی کے لئے غزل کہوائی تھی۔ نظرِ ثانی اس پر بھی نہیں ہوئی۔"

اس غزل کا تجزیہ کرنا، وقت ضائع کرنا ہے۔ یہ وہی غزل ہے جسے شیرانی مرحوم نے مشکوک قرار دیا تھا اور جس کے دو مسودوں کا عکس ڈاکٹر محمد صادق نے اپنی انگریزی کتاب کے آخر میں دیا ہے۔ ان میں ایک ایک مصرع کو ۴،۴ ،۵،۵ بار کہنے کے باوجود آزاد مطمئن نہیں ہوئے۔ ان مسودوں کو دیکھنے کے بعد جعل میں شبہے کی کوئی گنجایش باقی نہیں رہتی۔

۵۳: اشعار۔ ۱۳، مطلع : کوہ کے چشموں سے اشکوں کو نکلتے دیکھا — اے صنم پر ترا پتھر نہ پگھلتے دیکھا
شیرانی مرحوم کے مضمون میں یہ مشکوک کلام ہے اور ڈاکٹر صادق کو ملنے والے مسودوں میں

۱۷ تا ۹۱ تک کی غزلیں سب آزاد کی کہی ہوئی ہیں۔ ذیل میں ان کا تجزیہ پیش کیا جائے گا تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ یہ ذوق کا نہیں آزاد کا کلام ہے۔ البتہ بہ سبب طوالت پوری پوری غزلیں نقل کرنا ممکن نہیں۔ ہم چند مہمل اشعار بطور نمونہ پیش کر دیں گے اور اشعار کی تعداد لکھ دیں گے یہاں کا نمبر شمار نسخۂ آزاد کے مطابق ہے۔

نمبر شمار تعدادِ اشعار مطلع

۱۹ ۹ مطلع : مرے سینے سے تیرا تیر جب اے جنگجو نکلا دہانِ زخم سے خوں ہو کے حرفِ آرزو نکلا

عام طور سے اس غزل کے اشعار صاف ہیں لیکن زبان و محاورے میں تصرف کے علاوہ کہیں کہیں ردیف مہمل ہو جاتی ہے۔ دو تین شعر دیکھیے :

مرا گھر تیرا منزل گاہ ہو ایسے کہاں طالع خدا جانے کدھر کا چاند آج اے ماہرو نکلا

محاورہ : یہ چاند کدھر سے نکلا ہے، کدھر کا چاند نکلا نہیں۔

پھرا گر آسماں تو شوق میں تیرے ہے سرگرداں اگر خورشید نکلا تیرا گرم جستجو نکلا

اگر آسماں پھرتا ہے، اور، خورشید نکلتا ہے کا مقام ہے۔

مجھے سب ناخنِ تدبیر اور ٹوٹی سرِ سوزن مگر تھا دل میں جو کانٹا نہ ہرگز وہ کبھو نکلا

چلیے ناخن تو تدبیر کے تھے لیکن سرِ سوزن "ٹوٹا" نہ کہ "ٹوٹی" صرف سوزن ہوتی تو ٹوٹی درست ہوتا۔ ان کے علاوہ اور شعر بھی نادرست ہیں۔

۴۹ ۔ ۷ ۔ مطلع : ہر گام پہ رکھے ہے وہ یہ ہوشِ نقشِ پا ہو خاکِ عاشقاں نہ ہم آغوشِ نقشِ پا

اس غزل پر یہ نوٹ ہے : "یہ غزل ہے جس پر شاہ نصیر مرحوم سے قطع تعلق ہو گیا تھا۔" حصہ اول میں اس غزل پر خاصی بحث ہو چکی ہے، تکرار بے ضرورت ہے۔ اس غزل کے بعد آزاد نے یہ طویل نوٹ دیا ہے۔ اب ردیف الف کی وہ غزلیں لکھتا ہوں جن کا حال دیباچے کے صفحہ ۲۶ میں لکھ چکا ہوں۔ ایسے اشعار اپنے کبھی کسی سے سنتے یا خود یاد آ جاتے تو سناتے اور عجب محبت سے فرماتے۔ یہ ہمارا بچپن کا کلام ہے۔ نظر ثانی کریں گے۔ پھر دیوان میں داخل کریں گے اور کچھ کچھ اصلاح کرتے بھی جاتے تھے۔ والد مرحوم کے تقاضوں سے۔ اور میری حاضر باشی سے (کذا) جن مسودے کو درست کر دیتے تھے۔ نئی غزل مرتب ہو جاتی تھی۔ ا ے۔ وقت تھا کہ گزر گیا۔ یاد کرتا ہوں اور روتا ہوں اور نہیں پاتا۔ اب جو کچھ ہے یہی غنیمت ہے جیسے ہیں نقل کر دیتا ہوں۔ ضائع ہو تو یہ یادگار بھی نہ رہے گی۔ موئی مٹی کی نشانی اسے کہتے ہیں۔ ابتدائے کلام تو سب سن چکے۔ ابتدائے کلام آزاد سے سنو۔

سر ترے کشتہ کا دیکھے گا نہ ہرگز گرد خاک — لے اڑے گا شوق پابوسی اے جلاد کا

سلسلے میں لفظ و معنی کے نہ آیا دل کبھی — ابجد عالم میں گویا تھا الف آزاد کا

مطلب کیا ہے ؟ لفظ و معنی کے سلسلے میں نہیں آیا تو گویا مہمل تھا۔ الف آزاد کا ہوا اجل کا، ابجد سے باہر نہیں ہو سکتا۔ ویسے یہاں "ابجد عالم" سے کیا مراد ہے، اور یہ کون سی ابجد ہوتی ہے ؟

یوں تو ہے اُستاد شیطاں پر کہوں کیا تجھ کو دل
تو تو شاگردی میں بھی اُستاد ہے اُستاد کا [؟]

ذوق حیراں ہے بہت فکر کشادِ کار میں — یا علی مشکل کشا یہ وقت ہے امداد کا

مصرع اولیٰ برابر کا نہیں۔ اس میں براہ راست مشکل کا ذکر ہوتا تو بات کچھ بن جاتی۔

۶۰۔ دیوان، ۱۷۶، ۵۔ آزاد، ۹۔ دیوان میں صرف مقطع ہے۔ آزاد نے اس پر ۸ شعر بڑھا کر غزل پوری کر دی۔

چاہے عالم میں فروغ اپنا تو ہو گھر سے جدا — دیکھ چمکے ہے شرر ہوتے ہی پتھر سے جدا

بات برعکس ہے شرر چمکتے ہی پتھر سے جدا ہو جاتا ہے۔ گویا فروغ پہلے اور جدائی بعد میں ہے۔

کیجو مشاطہ نہ سبزہ گوش دلبر سے جدا — بدنما ہے گر کہیں مینا کو ساغر سے جدا

اوّل تو گوش کے ساتھ سبزہ مہمل ہے، لیکن بالفرض ہو بھی تو اُسے جدا کیونکر کیا جائے گا اور کہ سبزے کو مینا سے کیا مناسبت ہے ؟ پھر ساغر و مینا تو جدا رکھے ہی جاتے ہیں۔ اس میں بدنمائی کی کیا بات ہے ؟

دل مرا یارب نہ ہو زلف معنبر سے جدا — سر جدا ہو تن سے یہ سودا نہ ہو سر سے جدا [!؟]

کون سا سودا ؟ پہلے مصرعے میں تو دل کے زلف سے جدا نہ ہونے کی دعا مانگی ہے۔ کیا دل سودا ہے ؟

لکھے شرح سوزش ہجراں جو تیرا بے قرار — ہو تڑپ کر جوں شرر ہر نکتہ دفتر سے جدا [!؟]

فندق پائے نگاریں کا ہوں میں سودا زدہ — قطرۂ خوں بھی نہ ہوگا نوک نشتر سے جدا [!؟]

شیشۂ دل میں مرے کیا چمکا شرار عشق یار — شیشہ گر رکھ تو بھی شیشے کو نہ اخگر سے جدا [!؟]

خط شرح ناتوانی ہو گیا اڑتے ہی آہ — جوں پر کمزور بازوئے اکبوتر سے جدا

حضرت آدم کو شیطاں نے نکالا خلد سے — غیر نے ہم کو کیا ہے کوئے دلبر سے جدا

دیوان میں ۶۱۔۶۵ سب ایک مطلعے پر مشتمل ہیں اور وہی آزاد میں ہیں۔ اس کے ساتھ ردیف الف کی وہ غزلیں ختم ہو جاتی ہیں جن کا کوئی ایک شعر بھی دیوان میں ملتا ہے اور ان پر آزاد نے اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ اضافہ کیا ہے۔ اس کے بعد

جب ہاتھ الگ ہی گیا تھا تو مرے کیسے؟ ویسے یہ تلوار کا ہاتھ چھوڑنا بھی عجیب ہے۔
۱۱۔ دیوان ۲،۱۲ ا۔ آزاد، ۱۵ دیوان میں نا تمام ء کے تحت صرف دو شعر ہیں، آزاد کے ہاں ۱۵ لیکن اُن میں ایک مطلع ناسخ کا ہے۔ آزاد نے غزل پر یہ نوٹ لکھا ہے: "یہ غزل شیخ ناسخ کی غزل پر کہی تھی، مطلع"۔ اس نوٹ میں مطلع سے مراد غالباً یہ ہے کہ اس کے بعد ناسخ کا مطلع درج ہے تاکہ قارئین کو پتا چل جائے کہ ناسخ کی کس غزل پر غزل کہی تھی۔ لیکن گڑبڑ یہ ہوئی کہ ناسخ کے مطلعے کو غزل کے باقی شعروں سے الگ نہیں کیا گیا۔ جہاں "مطلع" لکھا گیا تھا اُسی کے ساتھ ناسخ کا مطلع درج کر دیا جاتا تو یہ گڑبڑ نہ ہوتی۔ بہرحال اس غزل کا مطلع ذوق ہی کا کہا ہوا ہے۔ اُس کے بعد کا شعر آزاد نے کہا ہے اور اس میں ناسخ کا مُنہ چڑایا ہے۔ ناسخ کے مطلعے کا مصرعِ ثانی تھا:
غل مچایا قریوں نے ہے مبارکباد کا [اس میں بھی غالباً آزاد نے کچھ الٹ پھیر کر دیا ہے]
آزاد کا شعر یہ ہے:

روزِ مرگِ عاشقِ ناشاد ہے شادی کا دن ۔ ہے بجائے شورِ ماتم غل مبارکباد کا

بقیہ اشعار:

آنچ سے تلوار کی ڈرتا نہیں ہے سخت جاں ۔ کشتہ کرنا سخت ہی مشکل ہے اس فولاد کا [؟]

کچھ گدازِ عشق میں ہوتا اثر تو دیکھتے ۔ کوہ کے چشموں سے ہوتا خوں رواں فرہاد کا

مصرعِ ثانی کا مضمون آزاد نے ایک اور غزل میں بھی باندھا ہے جو مناسب مقام پر درج ہوگا۔

ہو سبق آموز شوخی گر پری کو چشمِ شوخ ۔ کام ہے موجِ نگہ سے سیلیِ اُستاد کا

پہلا مصرع کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ دوسرے مصرعے میں غالب کے اس مصرعے کا عکس جھلکتا ہے: "نگہِ موج کم از سیلیِ اُستاد نہیں"۔

سوزشِ غم سے ہزاروں داغ جل جل کر پڑے ۔ ہوگیا میرا کفن جامہ گل ایجاد کا [؟]

سرو موجِ آب جو سے پائے در زنجیر ہے ۔ دیکھ لو آزاد کو یہ حال ہے آزاد کا

دوسرا مصرع اچھا ہے لیکن پہلا مصرع برابر کا نہیں۔ اس لیے شعر پھسپھسا معلوم ہوتا ہے۔ اسے عجزِ بیان کہیے۔

آبیاری ہے تری تلوار میں پایا ہوگیا ۔ آبِ زہرہ سخت جانی سے مری فولاد کا

یہ دو دازِ کار نازک خیالی اور تعقید توجہ طلب ہے!

یاد کرتا ہے مجھی کو پہلے وقتِ قتلِ عام ۔ کیوں نہ میں کشتہ ہوں اے قاتل تری اس یاد کا [؟]

ذوق کے دو شعروں سے ماخوذ ہے۔

جس گھر میں ہو لڑائی وہاں آدمی نہیں — کانٹا سمجھئے سیہ کا یا گل کنیر کا

لیکن اِس صورت میں کانٹے " اور کنیر کے " چاہیے ورنہ شعر غلط ہوجائے گا۔
ذوق کے شعر کی بنیاد اِس روایت پر تھی کہ اگر کسی گھر میں سیہی کا کانٹا یا کنیر کا پھول ڈال دیا جائے تو وہاں لڑائی جھگڑا شروع ہوجاتا ہے۔ اِسی لیے انھوں نے جس کے سبب لڑائی ہو، کہا تھا۔ آزاد نے نہ صرف اس روایت کا لحاظ نہیں رکھا بلکہ دوسرا مصرع بھی نامکمل کہا لہٰذا شعر مربوط نہیں ہوا۔ بہرحال اب اُن کے مصنفہ اشعار دیکھیے:

مجنوں کی روح دشت میں مانند گرد باد — کرتی طواف تھی ترے مجنوں کے ڈیر کا!!
ہیں اُس صنم کے ملنے کے رستے تو سیکڑوں — پر کوئی راست ہے کوئی رستہ ہے پھیر کا

[اس میں کیا بات ہوئی ؟]

دم آچکا لبوں پہ ہے آنکھوں میں انتظار — بے دید جلد آ کہ نہیں وقت دیر کا

یہ خود آزاد کے ایک شعر کا چربا ہے جو انھوں نے ذوق کے نام سے کہا تھا۔ ایک مصرع ہے: آنکھوں میں آکے ٹھہرا ہے دم انتظار کا

چھوٹا نہ ایک دانۂ اختر سحر تلک — گردوں کو لگ گیا جو مزہ شب بٹیر کا

گردوں کو نہ کبوتر ثابت کیا، نہ مرغ نہ بٹیر، پھر بٹیر سے دانۂ اختر کیونکر چگ لیے۔

کوٹھے پہ اُن کے خوب پئے آج رات کو — تھا ہاتھ آگیا جو سہارا منڈیر کا

کیا اُنھوں نے دھکا دیا تھا؟

ہوتے زبان حال سے مضمون ہیں واہ وا — جس میں نہ اختلاف زبر کا نہ زیر کا

زبانِ حال سے مضمون واہ وا ہوتے ہیں! یعنی چہ؟

زیبا ہے ذوق خرقۂ درویش مردکو — برقع کبھی نہ پائے گا نامرد شیر کا

یہاں نامرد کون ہے اور شیر کون؟

۵۱۔ ویران ۱: ۲۲، آزاد ۵۔ ویران میں صرف مطلع ہے۔ آزاد نے اس کے ساتھ چار شعر اور جوڑ دیے ہیں:

جلد آ وعدۂ دیدار پہ اے وعدہ خلاف — کب تک انکار ہے دم آنکھوں میں ٹھہرا اُنکا

یہ بھی ٹکڑا آنکھوں میں آکے ٹھہرا ہے دم انتظار کا، ہی کا چربا معلوم ہوتا ہے۔

توسنِ عمرِ رواں ہر نفس اڑتا ہی رہا — کبھی میدانِ فنا میں نہ یہ گھوڑا اُٹکا
بھاگا مجنوں مری وحشت سے بگولے کی طرح — سامنے میرے ذرا بھی نہ بھگوڑا اُٹکا

دوسرے مصرعے میں "یہ بھگوڑا" کا مقام تھا۔ بگولے کا بھاگنا بھی توجہ طلب ہے۔

لے گئے مر کے بھی اے ذوق کاوش دل میں — ہاتھ تلوار کا جو یار نے چھوڑا اُٹکا

ملتان" پر آزاد نے حاشیہ لکھا ہے: "ہندوستان میں محاورہ تھا کہ جب کوئی موقع ہاتھ سے جاتا رہتا۔ یا کسی کام کا وقت
گزر جاتا تو کہتے تھے اب وہ پانی ملتان بہ گیا یعنی اب نہ ہوگا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ دریائے
راوی جو لاہور کے نیچے بہتا ہے ملتان کی جانب سے چل کر پنجاب کے اور دریاؤں سے
ملتا ہوا دریائے شور میں جا پڑتا ہے۔ پھر اسے ادھر آنے کا موقع نہیں۔ پس جب کسی
امر فوت شدہ کے باب میں کہیں کہ اب وہ پانی ملتان بہ گیا تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ
دریا کے بہاؤ کی طرح اس کا موقع گذر گیا۔ اب نہ ہو سکے گا"۔

اس نوٹ پر زیادہ تبصرے کی ضرورت نہیں سوائے اس کے کہ راوی جموں کشمیر سے نکلتا ہے، مادھوپور کے مقام پر پنجاب
میں داخل ہوتا ہے اور وہاں سے لاہور پہنچتا ہے اور آگے غالباً ملتان کی طرف چلا جاتا ہے۔ لہٰذا آزاد نے الٹی گنگا بہائی ہے
اس پر پروفیسر شیرانی نے اپنے مضمون میں خاصی روشنی ڈالی تھی۔ ہمیں تو شعر کے متعلق اتنا عرض کرنا ہے کہ یہ مبہم ہے۔
ملک میں پنجاب کا سا حسن ہے سے کیا مراد ہے؟ کیا یہ شہر پنجاب کی طرح خوب صورت تھا یا اس میں پنجاب کے حسن
نے ان سے یہ شعر کہلوایا۔

۱۸۔ دیوان، ۲۰، ۹۶۔ آزاد، ۴۴۔ آزاد نے اس "ناتمام" غزل میں نہ صرف دو شعر کا اضافہ کیا ہے بلکہ ذوق کا ایک
مصرع جس میں ایک قدیم محاورہ تھا، اس طرح بدلا کر ساری رعایت اور مناسبت
جاتی رہی:

کیوں تکبر بولتا یہ بندہ محکوم القضا — گر بڑا بول اپنا قاضی کا پیادہ جانتا

آزاد نے پہلا مصرع اس طرح بنا دیا: بولتا بڑھ بڑھ کے اتنا کیوں بشر مستِ غرور۔
دوسرے دو شعر یہ ہیں:

کرتا ہے جب نالہ اپنا عالم بالا کی سیر — ہے فلک پر کہکشاں کو خطِ جادہ جانتا

آفتابِ حسن کو کیا خاکساروں کا ہو درد — پا فتادہ کا ہے درد از پا فتادہ جانتا

آزاد کو پہلے مصرعے کی مناسبت میں شبہ تھا بہ طورِ نسخہ (۱) یہ مصرع تجویز کر دیا:

پرتوِ خورشید نے گر کر اٹھایا ذرہ کو

لیکن مصرعے بہر دو صورت نامربوط ہیں۔

۱۹۔ ن، ۲، ۱۱۔ آزاد، ۹: دو شعروں میں سے ایک میں یک لفظی ترمیم اور دوسرے کے ہر دو مصرعوں میں اس
طرح ترمیم کی ہے کہ شعر مہمل ہو گیا ہے۔ سات شعر خود کہے ہیں۔ ذوق کا شعر تھا:

جس کے سبب لڑائی ہو وہ آدمی نہیں — کانٹا ہے گھر میں سیب کا یا گل کنیر کا

آزاد کو "گھر" دوسرے مصرعے میں اچھا نہیں لگا لہٰذا اُسے پہلے مصرعے میں لانے
کے لیے انھوں نے شعر کا حلیہ بگاڑ دیا:

فاتحہ عاشق کا دیتا ہی تو واجب ادب — اپنے کفش پا کو رکھے پاسے باہر زیر پا

[مصرعِ ثانی کی بندش توجہ طلب ہے]

میں ہوں وہ کشتی شکستہ بحرِ الفت میں صبا — ایک تختہ رہ گیا ہے جس کے زیر کز زیر پا

[کون سا تختہ؟]

قصرِ تن کو ذوق سب غارت کرے گا ایک دن — چونٹیوں کا پھر رہا ہے یہ جو لشکر زیر پا

[زمین پر یا زیرِ پا پھر رہا ہے؟]

۱۵۔ ویران ۱۰، ۱۱، ۱۷۔ آزاد ۹ ۔ ویران میں ایک شعر بعنوان فرد ہے جس کا مطلب ہے اس زمین میں اور کوئی شعر نہیں کہا گیا۔ آزاد نے "یہ غزل بھی وہیں لکھی" کا نوٹ لگا کر اپنے چشم دید گواہ ہونے کی گنجائش نکال لی۔ سوائے مطلع باقی اشعار بے تکی تک بندی ہیں:

دریائے اشک چشم سے جس آن بہہ گیا — سُن لیجیو کہ عرش کا ایوان بہہ گیا

بل بے گدازِ عشق کہ خوں ہوکے دل کے ساتھ — سینہ سے تیرے تیر کا پیکان بہہ گیا

پیکان لوہے کا ہوتا ہے "گداز" سے وہ پانی ہوکے بہہ جاتا تو اک بات تھی۔ لوہے کا خون ہو کے بہہ جانا ممکن نہیں۔

ہے موجِ بحرِ عشق وہ طوفاں کہ الحفیظ — بیچارہ مشتِ خاک تھا انسان بہہ گیا

انسان بیچارہ تو خیر مشتِ خاک ہے بہہ سکتا ہے لیکن یہ معلوم نہیں کہ طوفان عشق ہے، بحرِ عشق ہے یا موج ہے۔

دریائے اشک سے دمِ تحریر حالِ دل — کشتی کی طرح میرا قلمدان بہہ گیا

شکر ہے قلم دان بہہ گیا، وہ کاغذ تو بچ گیا جس پر حالِ دل تحریر ہوا تھا!

یہ روئے پھوٹ پھوٹ کے پاؤں کے آبلے — نالہ سا ایک سوئے بیاباں بہہ گیا [کذا]

کیا کہ آبلے شہر میں پھوٹ پھوٹ کے روئے تھے کہ "نالہ سا" سوئے بیابان بہہ گیا۔

تھا تو بہا میں بیش پر اس لب کے سامنے — سب مول تیرا لعلِ بدخشاں بہہ گیا

"بہا" اور "بہہ گیا" کی رعایت کے لیے یہ شعر کہا گیا لیکن بات بنی نہیں۔

کشتی سوارِ عمر ہیں بحرِ فنا میں ہم — جس دم بہا کے لے گیا طوفان بہہ گیا

کشتی سوارِ عمر تو آپ یعنی "ہم" ہیں پھر یہ بہہ کون گیا؟ یہ ذوق کے اس مشہور شعر کی ہیئت کذائی ہے:

ذوق اس بحرِ فنا میں کشتیِ عمرِ رواں — جس جگہ پر جا لگی وہی کنارا ہو گیا

تھا ذوق پہلے دلی میں پنجاب کا سا حسن — پر اب وہ پانی کہتے ہیں ملتان بہہ گیا

ذوق کے زمانے میں آدھے گھڑے سے گلے کا کام لیا جاتا تھا۔ آزاد نے کاسۂ سر اور نصف سبو کی مشابہت پر بھی غور نہیں کیا۔ گلے کی شکل کو کاسۂ سر سے کوئی مناسبت نہیں۔ ؎

رکھتے تھے جو کشورِ کسریٰ و قیصر زیرِ پا — ہے انھی کا آج سر یا تاج و افسر زیرِ پا

جب کشور زیرِ نگیں رکھے جا سکتے ہیں تو مان لیجے کہ زیرِ پا بھی رکھے جا سکتے ہوں گے لیکن آج تک بادشاہوں کے سر یا تاج و افسر (تاج اور افسر دونوں ایک ہی ہیں) زیرِ پا نہیں ہوتے بشرطیکہ میدانِ جنگ میں کٹ کر نہ گر جائیں۔ اگر تاج و افسر کا ذکر کرنا ہی تھا تو شبے تاج و افسر کہتے، بات بن جاتی۔

تم چلو رکھ کر جو میرا دیدۂ تر زیرِ پا — پل ہوں بحرِ اشک پر مژگاں سراسر زیرِ پا [؟]

خاکساری کو ہماری مل گئی اکسیرِ عشق — اب تو پارس ہوگا جو آئے گا پتھر زیرِ پا

بات کچھ الٹ گئی ہے۔ اکسیر کا کام سونا بنانا ہے نہ کہ پتھر۔ پارس بہرحال پتھر ہی ہے اگرچہ اس میں سونا بنانے کی خاصیت بتائی جاتی ہے۔

میری آنکھوں کو ملو تم رکھ کے تلووں کے تلے — کیوں نشے میں توڑتے ہو رکھ کے ساغر زیرِ پا

ہے نمازِ کشتۂ قامت بجائے جانماز — اے قیامت لا بچھا دامانِ محشر زیرِ پا

ممکن ہے ان شعروں کی نازک خیالی کسی کو متاثر کرے، ہمیں ان شعروں میں ذوق کی سادگی کی کمی نظر آتی ہے۔

زیر دستی پر بھی ہے موذی کو لازم احتراز — جب دبے گا سانپ کاٹے گا مقرر زیرِ پا

مصرعِ ثانی کی تنقید سے قطعِ نظر، یہاں "زیر دستی" کے کیا معنی ہیں؟

ہیں ترے مجنوں کے مژگاں وادیِ وحشت کے خار — راہ آنکھوں سے نکل آئے ہیں چبھ کر زیرِ پا

ہماری سمجھ میں تو اس شعر کے کوئی معنی نہیں۔ البتہ شاہ نصیر کے ایک قطعے میں کچھ اس قسم کا مضمون بندھا ہے، جس پر آب میں آزاد نے انھیں بہت فخر کرتے بتایا ہے اور یہ شعر اسی سے اخذ کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو،

یہ مجنوں ہے نہیں آ جو سے لیلیٰ — نکل کر پوستیں نکلا ہے گھر سے

جسے تو سینگ سمجھے ہے وہ ہیں خار — چبھے ہیں پاؤں میں نکلے ہیں سر سے

ظاہر ہے یہ دراز دستی۔ ذوق کا کارنامہ نہیں ہو سکتی۔ یہ آزاد کی عقیدت ہے جو بہر "اتنا نادر مضمون" استاد کو بخش دینا چاہتی ہے۔

۴۹۔ ویران ۱۰؛ ۱۱۔ آزاد ۹۔ ڈاکٹر علوی کے مطابق بیاض میں اس غزل کے ۸ شعر ہیں۔ گویا ایک شعر عین ترتیبِ طباعتِ دیوان کے وقت کہا گیا۔ آزاد نے ویران والے شعر کو بھی بالکل بدل دیا ہے۔
اس لحاظ سے یہ نو کے نو شعر جعلی ہیں۔ غزل سے پہلے آزاد نے یہ نوٹ چپکا دیا: یہ غزل ناتمام ہے۔ عین عالمِ شباب کے شعر ہیں۔ کہا کرتے تھے کہ قافیے اور مضمون ہمارے خیال میں ہیں، کبھی کہیں گے۔ لیکن نسخۂ ویران میں جو مطلع ہے وہ اس بیان کی نفی کرتا نکلتا ہے:

جنت ہے زندگی میں زمانہ شباب کا   پیری ہے، پہلے مرگ سے آنا عذاب کا

بہرحال اب آزاد کے مصنفہ کچھ شعر دیکھیے:

[۱]
عالم ہے زندگی میں زمانہ شباب کا   گلشن میں برگ برگ ہے پھول آفتاب کا
جلوہ ہو کیونکہ خاک پہ تاب عتاب کا   جلتا نہیں ہے برق سے دامن سحاب کا [۱]
اے گل رخو نہ چھیڑنا دامن سحاب کا   دیکھو چھلک رہا ہے کٹورا گلاب کا [۱]
اس گل بغیر طوطی و بلبل سے کم نہیں   سبزہ مزارِ عاشقِ پر اضطراب کا
(ن۔ وہ گل نہیں تو ...... الخ)

[۲]
صد پارہ دل ہے گنجفۂ عشق ہو گیا   اور ہر ورق پہ نقش ہے حکم آفتاب کا
ہے دل جلوں کے واسطے یہ نامہ بر تو خوب   اڑنا مگر محال ہے مرغ کباب کا [۱]
ٹپکے اگر عرق گل رخسار سے ترے   دریا میں ہر حباب ہو شیشہ گلاب کا [۱]
اے آفتاب تیرے رخ تابناک سے   کیا کیا چمک رہا ہے ستارہ حباب کا [۱]
ہوتا ہے دل جلوں سے کہیں ذوقِ ضبط آہ   موجِ دخاں سے ضبط نہ ہو پیچ و تاب کا [۱]

زیادہ لکھنا طولِ عمل سمجھ کر ہم نے سوالیہ نشان لگا دیے ہیں۔ قارئین کرام ان اشعار پر غور کر کے خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ یہ مہملات کس کا کلام ہو سکتا ہے؟

۵۰۔ ویران ۲؛ آزاد ۱۲۰۔ آزاد نے نسخۂ ویران میں شامل شعروں میں اصلاح کی کوشش کی ہے جس سے ایک شعر بالکل مہمل ہو گیا ہے۔ ذوق کا شعر تھا:

نخلِ گل حنبدی نہ ہو نصف سبوئیں گلنار   تو کھڑا ہو رکھ کے میکدہ سر زیرِ پا

آزاد نے اسے یوں بنا دیا:

بو نہ گل میں ہی کے گلبن رشک گل گھلوں میں تو   آ کھڑا ہو رکھ کے میکدہ سر زیرِ پا

پہلے مصرعے کی عجیب و غریب بندش سے قطع نظر، گملے آزاد کے دور کی چیز ہیں۔

دیتا ہے کعبے کو آرائش سیہ جانے کی طرح ۔ زاہد و سایہ مرے بت خانے کی دیوار کا

آزاد نے یوں بنا دیا :

کعبے کے دیوار و در سے نور کے جلوے اٹھیں گر پڑے سایہ مرے بت خانے کی دیوار کا

۴۵۔ دیوان، ۱: ۴۰۔ آزاد، ۲ ۔ دیوان میں "مطلع" کے تحت ایک مطلع ہے۔ آزاد نے ایک شعر اور کہہ دیا :

ملک سجدہ کریں آدم کو کیا ذرہ نوازی ہے دیا بندہ کو اپنے اس نے خود آداب اپنا سا

"ن" کے تحت حاشیے میں آزاد نے "ذرہ" کا بدل "بندہ" تجویز کیا ہے ۔

۴۶۔ دیوان، ۱: ۲۲۔ آزاد، ۴ ۔ دیوان میں یہ فرد ہے۔ آزاد نے چار شعر درج کیے ہیں۔ ڈاکٹر علوی کے مطابق بیاض میں اس کے ڈھائی شعر ہیں۔ گویا دیوان میں درج کرتے وقت ڈیڑھ شعر مزید کہا گیا۔ اس کے علاوہ دیوان میں جو شعر ہے اس کے مصرع اولیٰ میں "دل صد پارہ" تھا، آزاد نے "دل سی پارہ" کر دیا ہے۔ بقیہ تین شعر یہ ہیں :

کیا کیا مزہ نہ تیرے ستم کا اٹھا لیا ہم نے بھی لطفِ زندگی اچھا اٹھا لیا

جو بار آسمان و زمین سے نہ اٹھ سکا تو نے غضب کیا دلِ شیدا اٹھا لیا

[میر کے مشہور شعر کا عکس ہے]

سر ہم نے جب پائے صنم پر جو رکھ دیا دونوں جہاں سے دستِ تمنا اٹھا لیا

خود آزاد کے محاورے میں کہا جا سکتا ہے کہ محاورہ ہاتھ اٹھانا ہے نہ کہ دستِ تمنا اٹھانا اور ذوق سے اس "نادانی" کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

۴۷۔ دیوان، ۲: ۲۰۔ آزاد، ۹ ۔ دیوان میں "ناتمام" کے تحت دو شعر ہیں۔ آزاد نے ان میں ترمیم کر کے انھیں مسخ بھی کیا ہے اور سات شعر کا اضافہ بھی؛ لیکن کوئی شعر درست معلوم نہیں ہوتا۔

جب نیم جاں ہوں کوچۂ قاتل میں لوٹتا قاتل ہے لوٹنے پہ مرے دل میں لوٹتا

لیلیٰ کے شوقِ وصل میں مجنوں کو دیکھنا کیا کیا ہے راہِ ناقۂ محمل میں لوٹتا

غیروں سے دیکھ دیکھ تری گرم جوشیاں میں آگ پر ہوں رشک سے محفل میں لوٹتا

اگر آزاد کا اندازِ بیان مستعار لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ محاورہ انگاروں پر لوٹنا ہے، آگ پر لوٹنا نہیں۔

سودائیوں کے دل پہ تری یادِ زلف میں اک سانپ سا ہے قید سلاسل میں لوٹتا

محاورہ سینے پر سانپ لوٹنا یا لوٹ جانا ہے، دل پر سانپ سا لوٹنا نہیں

کس کس مزے سے لوٹتے ہیں میکدہ میں مست ہے ایک کے جو ایک مقابل میں لوٹتا

لیکن عنوان کا مطلع " بدلا اور نہ مٹایا۔ آزاد نے اس غزل کے دس شعر درج کیے ہیں۔
(تنویر علوی نے ان کا ماخذ "بیاض" کو بتایا ہے جو ظاہر ہے جعلی ہے) اور دو تین
اشعار میں کچھ ایسی تبدیلیاں کی ہیں کہ اب یہ شعر ذوق کے نہیں آزاد کی تصنیف
لگتے ہیں، مثلاً :

ہوا بخت دامن سے جب اُن کے سچا ۔ ہوا ہاتھ اپنی رسائی کا جھوٹا

ذوق نے مصرع اولیٰ اس طرح کہا تھا : ع رسائی ہوئی جب کہ دامن تک اس کے
اور یہ بامعنی تھا۔ "

نہ منہ ڈال خار آبلے میں کہ ہوگا ۔ یہ ساغر ہے کہہ رُبائی کا جھوٹا

آزاد نے پہلا مصرع اس طرح بنا دیا : ع اُٹھا کر کیا رنگ الفت کو رُخ نے
بہرحال، کلیتاً آزاد کے کہے ہوئے اشعار یہ ہیں :

نہ کیوں تیرے دانتوں سی جھوٹا ہو موتی ۔ کہ دعویٰ کیا تھا صفائی کا جھوٹا
بنا ملبے آئینِ الفت میں تجھ کو ۔ یہ شیوہ تری بے وفائی کا جھوٹا
ترا قول ہاتھوں میں چمکا رہا ہے ۔ نگیں خاتم دل رُبائی کا جھوٹا[؟]
مزے کے پیے اگر موت پاوے [کذا] ۔ یہ پانی مریضِ جدائی کا جھوٹا
[کون سا پانی]
گئے طاقِ ابرو میں تھے حضرتِ دل ۔ سو دعویٰ ہوا پارسائی کا جھوٹا

یہاں آکر نسخۂ دیوان کی مکمل غزلیں ختم ہو گئی ہیں۔ اس کے بعد عنوان ہے : " اشعارِ متفرقاتِ غزلیاتِ
ناتمام، ردیف الف " اور اس کے تحت ایک ایک دو دو متفرق اشعار درج ہیں۔ آزاد کے اِضافے اسی حصے
میں زیادہ ہیں، ملاحظہ ہو :

(۴) ۔ دیوان = ۶۲، ۶۳۔ آزاد = ۶ ۔ دیوان میں ۲ شعر متن اور تین شعر تتمہ مرقومہ بالا کے تحت آخر میں درج ہیں۔
آزاد کے یہاں نہ صرف یہ شعر فاضل ہے :

آنسوؤں میں شمع بالیں سی بہتے ہیں پھول ۔ میں شہیدِ ناز ہوں کس آتشیں رخسار کا

بلکہ ترمیم سے اکثر اشعار یا تو مہمل کر دیے ہیں یا اس طرح بدلے ہیں کہ اب وہ ذوق
کے شعر معلوم ہی نہیں ہوتے۔ ذوق کا مطلع تھا :

سُرمہ ہے سفاک شہرہ ہے نگاہ یار کا ۔ سچ کہا ہے باڑ کاٹے نام ہو تلوار کا

آزاد نے مصرع اولیٰ کو ترمیم سے مہمل بنا دیا :
قتل کرتی ہے نگہ شہرہ نگاہ یار کا ۔ ذوق کا شعر تھا :

ذوق ایسے کون سے شاہ صاحب تھے کہ ان کا عرس ہوتا!

۲۸۔ دیوان ۱۱۰؛ ۱۲۔ آزاد ۱۹۔ پہلے اور دوسرے مطلع کو موخر و مقدم کرنے اور دو تین جگہ لفظی ترمیم کرنے کے علاوہ
آزاد نے ۸ شعر کا اضافہ کیا ہے، مثلاً:

آیا ہے دم آنکھوں میں دم حسرت دیدار
پر لب پہ کبھی حرف تمنا نہیں آتا [ردیف غلط ہوگئی ہے ”آیا“ کا مقام تھا]

دنیا ہے وہ صیاد کہ سب دام میں اس کے
آجاتے ہیں لیکن کوئی جانا نہیں آتا

میں جاتا جہاں سے ہوں تو آتا نہیں اب تک
کافر تجھے کچھ خوف خدا کا نہیں آتا

ہستی سے زیادہ ہے کچھ آرام عدم میں
جو جاتا ہے یاں سے وہ دوبارہ نہیں آتا

غافل ہے بہار چمن عمر جوانی [کتنا]
کر سیر کہ موسم یہ دوبارہ نہیں آتا

[یہ غزل ذوق کے عہد پختگی کی یادگار ہے۔ یہ شعر اگر آزاد کسی ایسی غزل میں شامل کرتے جس کے ساتھ آغاز شباب کا
تتمہ لگا ہوتا تو مناسب تھا]

بے جا ہے دلا اس کے نہ آنے کی شکایت
کیا کیجیے کا فرلیئے اچھا نہیں آتا [کتنا]

جو کوچۂ قاتل میں گیا پھر وہ نہ آیا
کیا جانے وہ کیا ہے کہ جیتا نہیں آتا

[دوسرا مصرع حشو لگتا ہے۔ بات پہلے مصرعے میں پوری ہوگئی ہے۔]

۲۹۔ دیوان ۴۰؛ ۱۴۔ آزاد ۹۰۔ دو جگہ لفظی ترمیم کے علاوہ ۵ شعر کا اضافہ ہے، ملاحظہ ہو:

تنگ آکے جو دم تن سے نکل جائے تو جانو
زنداں سے کوئی قیدی زنداں نکل آیا

[مصرع اولیٰ میں ”جائے“ کی جگہ ”آئے“ کا
مقام ہے ورنہ ردیف نکل گیا ہو، جو یہاں
ممکن نہیں۔]

ہاتھ آئے نہ قسمت کے سوا گوہر مقصود
دریاے تہی پنجۂ مرجان نکل آیا [؟]

رات آہ میں یوں سینہ سے اک شعلہ سا چمکا
میں نے تو یہ جانا۔ دل سوزاں نکل

دل رکھ کے کہیں ذوق کا ہم بھول گئے تھے
تھا گم وہ کئی دن سے گریباں نکل

[ذوق کا دل رکھ کر کون بھول گیا تھا۔ دوسرا مصرع بھی کچھ چسپاں نہیں ہوتا، دل گ
تو شاید کچھ بات بن جاتی]

۳۰۔ دیوان ۵۰، ۱۵۔ آزاد ۱۰۔ دیوان میں یہ غزل مطلع ۵ کے تحت درج ہے۔ غالباً حافظ ویران کو پہلے
مطلع یاد آیا اور انھوں نے انور کو لکھوانا شروع کیا، لیکن لکھوانے تک
باقی شعر بھی یاد آگئے اور انھوں نے پانچوں شعر لکھوا دیے۔ آزاد نے شعر

نئی ہوئی : اضافہ نہیں ہوا ۔

۲۷۔ دیوان ، ، ۲۴۴ ۔ آزاد ، ۱۱ ۔ حاشیے میں ۱۲۶۰ھ لکھا ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں ۔ اس کے برعکس اس میں ایک جگہ قافیہ "کبھو" بندھا ہے ۔ اگر غزل ۱۲۶۰ھ میں کہی جاتی تو ذوق غالباً اس سے پرہیز کرتے ۔ ترامیم کے علاوہ چار شعر ، ۲ ، ۴ ، ۸ ، ۹ کا اضافہ کیا گیا ہے ۔ البتہ یہ اشعار مہمل نہیں ہیں ان کا درج کرنا ضروری نہیں ۔ پہچان کے لیے مطلع درج ہے :

کب ہے خنجر قاتل سے یہ گلو میرا　　　کی جو مجھ سے کرے تو بچے لہو میرا

۲۹۔ دیوان ، ۱۵ ؛ ۴۴ ۔ آزاد ، ۱۶۰ ۔ چند ترامیم کے علاوہ غزل کا مطلع اول آزاد کا مصنفہ ہے :

جان سے دل میں سما جینے کا ارماں بن گیا　　　دل کو بھی دیکھا کیے یہ بھی پریشاں ہو گیا

۳۴۔ دیوان ، ، ۹ ۔ آزاد ، " یہ غزل بھی میں نے ہزاری باغ میں کہی تھی ۱۲۶۰ھ ہجری" ۔ اس نوٹ کے علاوہ ایک شعر میں لفظی ترمیم کی ہے جس سے شعر بے معنی ہو گیا ہے :

آئی تہی دروں کی نہ ہرگز سمجھ میں بات　　　آوازہ گو بلند مثال دہل ہوا (ذوق)

آزاد نے "تہی دروں" کو "تہی اندروں" کر دیا ہے ۔

۳۶ دیوان ، ۹ ، ۱۱ ۔ آزاد ، ۱۲ ۔ لفظی ترامیم کے علاوہ تین شعر کا اضافہ کیا ہے ۔ ذوق کا ایک شعر تھا :

وہ ہیں کیا جو زر بکف ہیں یہ پھیرے سر بکف　　　ترے جاں نثار کا سا نہیں دست جود ہوتا

آزاد نے اسے یوں بدل دیا :

جو رقیب سر بکف میں کبھی ہوتے سر بکف ہیں　　　ترے جاں نثار کا گر انہیں دست جود ہوتا

پہلا "سر بکف" غالباً سہو کتابت ہے ، "زر بکف" ہوگا ۔ اس تصحیف کے باوجود آزاد نے اس سے یہ مہمل شعر نکالا :

جو ہے سرگذشتہ اس کو نہیں دینا سر کا مشکل　　　کہ وہ سر بکف نہ ہوتا جو نہ دست جود ہوتا ۔

(مقطع سے آزاد نے یہ شعر نکالا :

تہ خاک ہوتا ظاہر جو سلگتا اپنے سر کا　　　تو شرار سنگ تربت میں کبھی اپنے دود ہوتا

تیسرا شعر یہ ہے :

جو نہ ہو امید واشد نہ ہو دل گرفتہ غنچہ　　　کہ قبول تنگ رہنا نہیں بے کشود ہوتا

۳۷ دیوان ، ۹ ، ۱۲ ۔ آزاد ، ۱۳ ۔ دیوان میں ۵ شعر تتمے میں بھی ہیں ۔ اس طرح کل ۱۱ شعر ہوئے ۔ آزاد نے ایک آدھ جگہ لفظی ترمیم کے علاوہ دو شعر اضافے کیے ہیں :

کون سنتا ہے تری زلف میں دل کی فریاد　　　کہ مسلماں کو ہے کافر کے عمل میں مارا

عرس کی شب بھی مری گور پہ دو پھول نہ لائے　　　پھر اک گنبد تربت کے کنول میں مارا

۱۸۔ دیوان، ۱۳۱؛ ۲۲۔ آزاد، ۱۳۔ یہ بھی تیس ہزاری باغ کی غزل ہے: سوائے اس نوٹ کے غزل میں کوئی اضافہ نہیں، صرف ایک شعر میں ترمیم کی ہے

۱۹۔ دیوان، ۱۳۱؛ ۲۲۔ آزاد، ۱۳۔ ڈاکٹر تنویر علوی نے اسے بیاض کے حوالے سے نقل کیا ہے جہاں اس کے ۱۲ شعر ہیں۔ گویا ایک شعر ترتیب دیوان کے وقت کہا گیا۔ لفظی تبدیلیاں خاصی ہیں۔ اضافہ شدہ شعروں میں ایک مہمل ہے: سنگ سرمہ میں یہ تاب تھی وہ تیغ نگاہ

گردش چشم نے پردی بے لقب سان چڑھا

۲۰۔ دیوان، ۱۳۱؛ ۲۵۔ آزاد، ۱۱۔ اضافہ نہیں کیا لیکن دو شعر اس طرح بدلے ہیں کہ ذوق کے نہیں رہے۔ ایک شعر کو مقطع کر دیا ہے اور یہ خیال نہیں کیا کہ ایک ہی شعر کے بعد پھر مقطع ہے۔ ذوق کا شعر تھا:

حسن سے بے تاول آہن بھی گرم اختلاط ۔ شمع کی گلگیر جو منہ میں زبان لینے لگا

آزاد نے پہلا مصرع یوں بگاڑا ہے کہ: ذوق حسن و عشق روشن ہو گیا سب بزم پہ

یہاں اگر "ذوق حسن و عشق" پڑھا جائے تو شعر کسی حد تک بہتر ہو جائے گا لیکن وہ بات پیدا نہیں ہوتی جو ذوق کے شعر میں ہے۔

۲۱۔ دیوان، ۱۳۲؛ ۲۷۔ آزاد، ۱۳۔ اشعار کی ترتیب بہت بدلی ہوئی ہے۔ لفظی ترمیم صرف ایک آدھ ہے البتہ ذوق کے مطلع اول کو تیسرا کر دیا ہے اور پہلے مطلع کی جگہ اپنا مصنفہ یہ مطلع بڑھا دیا ہے:

عبث جاں منتظر ہونٹوں پہ پر وہ شوخ کب آیا ۔ اگر چہلم کو بھی آیا تو ہم جانیں گے اب آیا

۲۳۔ دیوان، ۱۳۳؛ ۲۸۔ آزاد، ۱۴۔ تین شعر کے علاوہ لفظی ترامیم بھی کافی ہیں۔ اضافے کے اشعار میں ایک تو ذوق کے مقطع کا عکس ہے: فقط تار نفس کا ذوق خط جادہ کافی ہے

پئے عمر رواں کیا چاہیے رستا گزارے کا (ذوق)

اسے تو آزاد نے برقرار رکھا ہے لیکن اس میں سے یہ شعر نکالا ہے:

نفس ہے جادۂ عمر رواں جس طرح سے گزرے ۔ یہاں پوچھے ہے اے گمراہ کیا رستا گزارے کا

شعر مہمل ہے: جادہ جس طرح سے گزرے، کیا ہوا؟ مصنفۂ آزاد دو شعر اور بھی ہیں، ان کا نقل کرنا بے ضرورت ہے۔

۲۴۔ دیوان، ۱۳۳؛ ۲۹۔ آزاد، ۹۔ سوائے اشعار کی ترتیب الٹ پلٹ کرنے کے آزاد نے اس غزل میں کوئی ترمیم و اضافہ نہیں کیا، اور دو درجن غزلوں میں یہ پہلی غزل ہے جسے آزاد کے قلم نے بخش دیا ہے۔

۲۵۔ دیوان، ۱۳۴؛ ۳۰۔ آزاد، ۱۱۔ لفظی ترمیم کئی جگہ ہے اور اس کے لیے آزاد نے لکھ دیا ہے: "پرانی غزل ہے نظر ثانی میں

کوچۂ یار میں جاؤں گا تو مثلِ خورشید　　پاسِ آداب سے میں سر ہی کے بل جاؤں گا

جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے آزاد کو "یار" کا استعمال پسند نہیں (صرف ذوق کے لیے ورنہ خود بے محابا ایسے شعر کہہ کر ذوق کو بخش دیتے ہیں جن میں یار کا لفظ آتا ہے، مثال آگے آتی ہے) لہٰذا انھوں نے شعر بدل دیا، اگرچہ اس طرح مہمل ہو گیا ہے:

دیکھ کر کوئے صنم کہتا ہے یہ پاسِ ادب　　ہوں جو خورشید تو یاں سر ہی کے بل جاؤں گا

لیکن کوچۂ یار میں سر کے بل جانے کو وہ نظر انداز نہ کر سکے، لہٰذا اس مطلعے کا اضافہ کیا:

آج اگر راہ نہ پاؤں گا تو کل جاؤں گا　　کوچۂ یار میں سر ہی کے بل جاؤں گا

ذوق کی پوری غزل قدامت پر دلالت کرتی ہے۔ آزاد نے چوں کہ "اپنے سامنے دوبارہ بنوائی" اس لیے اس میں بڑھاپے کا شعر داخل کر دیا:

کہتا وحشت سے ہے یہ جامۂ پیری میرا　　دیکھ کپڑا ہوں پرانا ابھی چل جاؤں گا

باقی اضافہ شدہ اشعار بھی ایسے ہی ہیں لہٰذا ان کا نقل کرنا غیر ضروری ہے۔

۱۵۔ دیوان ۔ ۶، آزاد ۔ ۶ ۔ کوئی اضافہ نہیں۔ دو جگہ معمولی ترمیم کے علاوہ ایک شعر یک سر بدلا اور اسے مہمل کر دیا ہے:

وھاں زرع شگفتگی سے گلِ وردِ بن گیا　　یاں غم سے روئے زرد گلِ زرد ہو گیا

(ذوق)

ترمیم کے بعد یہ صورت ہو گئی ہے: تو اے صبا چمن کے گلِ زرد دیکھ لے　　عاشق کا رنگِ زرد زرِ زرد ہو گیا [۱]

جن غزلوں میں کوئی اضافہ نہیں اور محض معمولی ترامیم ہیں، آئندہ انھیں نظر انداز کر دیا جائے گا اور ترتیب کے فرق کو آزاد سے پہلے نمبر شمار سے ظاہر کر دیا جائے گا،

۱۶۔ دیوان ۶ ۳۱۔ آزاد وغیرہ

۱۷۔ دیوان ۔ ۹، ۲۲۔ آزاد ۔ ۹ ۔ سوائے اس کے کہ ترمیم سے کچھ شعر مہمل ہو گئے ہیں، کسی شعر کا اضافہ نہیں ہوا البتہ غزل کے ساتھ اس کہانی کا اضافہ ضرور ہوا ہے: "استاد کے مسودے سے جس دن یہ غزل میں نے لکھی فرمایا کہ عجیب اتفاق ہوا۔ ایک دن میاں نثار علی شاہ تشریف لائے، حسبِ عادت غزل کی فرمائش فرمائی۔ میں نے بھی یہ غزل کہی تھی۔ انھیں سنائی خوش ہوئے۔ بہت عنایت کی اور چلے گئے۔ دوسرے دن سنا کہ چلے ہی گئے کاش کوئی اور غزل سناتا" اس لحاظ سے اس غزل کو ۱۲۶۰ء میں کہا جانا چاہیے جس کا کوئی ثبوت نہیں۔ ردیف میں "جدا" کے لفظ نے آزاد کو یہ کہانی گھڑنے پر اکسایا ہو گا۔

دل نہ کر جلدی کہ جلدی کام ہے شیطان کا
ہو تو عاشق سونچ کر اس دشمن ایمان کا

۱۱۔ دیوان ۱، ۱۲؛ آزاد، ۱۲ - - دیوان میں مطلع ثانی ایک شعر کے فصل سے درج ہوا تھا، آزاد نے اسے اپنے مقام پر کر دیا اگرچہ غزل کا نمبر ۲۱ ہے صرف ایک مصرعے میں ترمیم کے سوا غزل میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔

۱۲۔ دیوان و نگارستان، ۱۵؛ آزاد، ۱۳ - آزاد نے مطلع ثانی کو اول اور اول کو ثانی ہی نہیں کیا بلکہ اس میں ترمیم بھی کی ہے۔ اور شعروں میں بھی ترمیم روا رکھی گئی ہے، نیز دو شعر کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک شعر کا "ن" بھی تجویز کیا ہے۔ اس طرح تین شعر کا اضافہ ہوا۔ ذوق نے تیسرے مطلعے میں غبار کا قافیہ باندھ دیا تھا، آزاد نے اسے تو برقرار رکھا لیکن اس قافیے سے ایک نیا مضمون پیدا کیا اور ایک شعر کا اضافہ کر دیا۔

قاصد لکھوں لفافہ کو خط غبار سے ٭ تا جائے وہ یہ خط ہے کسی خاکسار کا

ذوق نے انتظار کے قافیے میں ایک شعر کہا تھا، آزاد نے نہ صرف اس کا پہلا مصرع بدل دیا بلکہ اس قافیے میں ایک شعر کا اضافہ بھی کر دیا:

آتا ہے گر تو آ کہ سینے سے چل کے اب ٭ آنکھوں میں آ کے ٹھہرا ہے دم انتظار کا

اور یہ مہمل ہے۔ انتظار کا دم آنکھوں میں ہے یا عاشق کا؟ اس کے علاوہ ذوق کا ایک شعر تھا:

اس روئے تابناک پہ ہر قطرۂ عرق
گویا کہ اک ستارہ ہے صبح بہار کا

آزاد کو یہ صورت کچھ زیادہ پسند نہیں آئی۔ انھوں نے "ن" دے کر حاشیے میں اس کا بدلہ درج کر دیا:

دیکھا اپنے دُرِ گوش کو عارض کے متصل
دیکھا نہ ہو ستارہ جو صبح بہار کا

۱۳۔ دیوان، ۷؛ آزاد، ۷ - اضافہ کرنے کے باوجود جن دو اشعار میں آزاد نے ترمیم کی ہے، شعر مہمل ہو گئے ہیں۔ نسخۂ آزاد میں یہ غزل ۲۸ ویں ہے۔ علاوہ ازیں "یہ بھی تیس ہزاری باغ کا چمن ہے" کا کوئی ثبوت نہیں۔

۱۴۔ دیوان، ۱۲؛ آزاد، ۱۸ - آزاد میں بہ لحاظ ترتیب یہ غزل ۲۹ ویں ہے۔ دیوان اور نگارستان میں اس کے ۱۲-۱۴ شعر ہیں۔ ڈاکٹر تنویر علوی نے اسے "بیاض" کے حوالے سے نقل کیا ہے اور اس میں ۱۴ شعر بتائے ہیں۔ آزاد نے یہ کہہ کر کہ "پرانی غزل تھی میرے سامنے دوبارہ بنائی تھی" نہ صرف کئی اشعار میں ترمیم کی گنجائش نکال لی بلکہ ۲ شعر بڑھانے کا جواز بھی پیدا کر لیا۔ ذوق کا ایک شعر تھا:

چاہیے تھا۔ خدا جانے آزاد کیسے چوک گئے۔

۵۔ اگلی غزل تمہ دیوان میں ۱۹ شعر کی ہے اور آزاد میں ۲۲ شعر کی۔ اگرچہ دیوان میں اس پر "ناتمام" لکھا ہے، اس کے باوجود آزاد کے یہاں جو فاضل شعر ہیں وہ خود ان کی تصنیف معلوم ہوتے ہیں۔ ایک شعر دیکھیے:

کیا تھا پا نہ تھا سب ہم پہ گزرا — فلک تو نے کیا اپنا نہ پایا

[کیا کیا تھا اور کیونکر گزرا!]

۶۔ دیوان میں اگلی غزل ہے: ع نام یوں ہستی میں بالاتر ہمارا ہوگیا، جس میں ۱۱ شعر ہیں۔ آزاد میں یہ غزل ساتویں ہے اور اس میں ۱۳ شعر ہیں۔ آزاد نے مطلع کا مصرع اولیٰ یکسر بدل دیا ہے اور عام طور سے وہی مشہور ہے۔ اس کے علاوہ بھی آزاد نے کچھ تبدیلیاں کی ہیں۔ آزاد کے مصنفہ دو شعر حسب ذیل ہیں:

ہر حباب بحر کی کھل جائے گی تالای آنکھ — عکس افگن گر رُخِ روشن تمہارا ہوگیا

شیخ نے افطاریوں کے تر نوالے کھا کے خوب — ہے مگر روزوں کی گرمی سے چھوارا ہوگیا

۷۔ دیوان = ۱۱؛ آزاد = ۱۲۔ گویا اس میں ایک شعر کا اضافہ ہے، اور وہ آزاد کا ہے:

سنہ جو کیا چاک تو واں کچھ بھی نہ پایا — کیا جل کے جگر خاک کہیں ہو ہی چکا تھا

۸۔ دیوان = ۹، آزاد = ۹۔ سوائے ایک شعر مکمل اور دو تین شعروں میں ایک ایک لفظ بدل دینے کے آزاد نے اس غزل میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ البتہ ان کے نسخے میں یہ غزل ۲۳ ویں ہے۔

۹۔ دیوان = ۱۰؛ آزاد = ۱۱۔ آزاد کے یہاں یہ غزل ۲۴ ویں نمبر پر ہے۔ لفظی تبدیلیوں کے علاوہ ایک شعر کا اضافہ بھی ہوا ہے:

دے دعا وادیِ پُرخار جنوں کو ہر گام — واد یہ تیری ہے لے آبلہ پائی دیتا۔

اس پر آزاد نے ایک نوٹ بھی لگایا ہے: "عالم شباب کا مطلع خاص و عام ہو رہا تھا۔ اور آخر عمر میں آکر غزل پوری ہوئی۔ ۱۲۶۰ھ میں تیس ہزاری باغ میں کہی تھی" یہ بیان درست نہیں۔ مطلع اور بقیہ اشعار میں ایسا کوئی تفاوت نہیں جو ایسے مختلف اوقات یعنی اتنے وقفے کے بعد کہا ہوا ثابت کر سکے۔ آخر عمر کی بجائے یہ پہلے ہی زمانے کی غزل لگتی ہے۔

۱۰۔ دیوان = ۱۱؛ آزاد = ۱۱۔ آزاد میں یہ غزل ۲۵ ویں ہے۔ اس پر یہ نوٹ ملتا ہے: "یہ غزل بھی تیس ہزاری باغ کی بہار ہے" جو درست نہیں۔ آزاد کا جہاں جی چاہتا ہے اس قسم کی باتیں لکھ دیتے ہیں۔ اس میں کسی شعر کا اضافہ تو نہیں ہوا۔ البتہ آزاد نے دوسری معمولی تبدیلیوں کے علاوہ مطلع میں ایسی ترمیم کی ہے کہ مطلع مہمل ہوگیا ہے:

نکتہ اس بت سے کبھی لیویں گے ہم ایمان کا — ایسی کیا جلدی ہے جلدی کام ہے شیطان کا

اگرچہ ذوق کا مطلع کچھ بہت اچھا نہیں تاہم بامعنی اور مربوط ضرور تھا:

دکھائی مجھ کو راہِ شرع اصحاب پیمبر نے ۔۔۔ چراغِ راہ ہے اکرامِ اصحاب کرم میرا [۹]

اس کے بعد تینوں شعر منقبت کے ہیں:

کہیں شاہِ نجف کے عشق میں دل میرا ڈوبا تھا ۔۔۔ کہ ہے دُرِ نجف ہو کر چمکتا دُرِّ یتیم میرا [۹]

رہیگا دانہ افشاں مزرعِ امید بخشش میں ۔۔۔ غمِ آلِ نبی سے دانۂ ہر اشکِ نم میرا

شہِ بغداد کا خطِ غلامی ذوق رکھتا ہوں ۔۔۔ نہ کیوں دل اس خطِ بغداد سے ہو جامِ جم میرا

خط کشیدہ حصے توجہ طلب ہیں۔ اس کے بعد اسی زمین میں ۱۰ شعر کی دوسری غزل ہے۔ اس میں چھ شعر ذوق کی غزل کے ہیں اور گیارہ شعر آزاد نے خود کہے ہیں۔ ایک شعر میں "ن" (نسخہ) اور ایک میں یک لفظی ترمیم روا رکھی ہے۔ اس کے علاوہ ذوق کا مقطع چوں کہ پہلی غزل میں نہیں کھپا سکے تھے، اُسے شعر کے اِس میں شامل کر لیا ہے۔ ذوق کا مقطع تھا:

نہ ہوبے وقر ترکِ سجدۂ ابلیس سے آدم ۔۔۔ عدو کی سرکشی سے ذوق کب رتبہ ہو کم میرا

آزاد نے مصرعِ ثانی کو یوں بنا دیا ہے:

عدو کی سرکشی سے رتبہ کب ہوتا ہے کم میرا ۔ اِس غزل کے مہملات کا تجزیہ بے ضرورت معلوم ہوتا ہے پہلی غزل کے جائزے کے بعد یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اس کے خالق بھی آزاد ہیں۔

۲۔ نسخۂ دیوان میں دوسری غزل ۲۳ شعر کی ہے لیکن تتمے میں دو شعر اور بھی ہیں۔ اِس طرح اِس غزل میں کل ۲۵ شعر ہیں۔ دو ایک جگہ لفظی ترامیم سے قطع نظر، آزاد میں بھی اشعار کی تعداد یہی ہے۔ اس غزل سے پہلے آزاد نے ایک کہانی لکھی ہے کہ "ناسخ کی غزل لکھنؤ سے آئی تھی ......" وغیرہ لیکن یہ کہانی دروغِ محض ہے۔ اِس کا ذکر حصۂ اوّل ہو چکا ہے، یہاں دُہرانا فضول ہے۔ آزاد کے دوسرے بیانات سے اِس کہانی کی تردید ہوتی ہے۔ آزاد نے نثار علی شاہ کے واقعے میں لکھا ہے کہ "ناسخ کا دیوان انھیں دنوں پہلے پہل ہمارے یہاں آیا تھا" اور یہ واقعہ ۱۲۴۵ھ یا ۱۲۶۰ھ کا ہو سکتا ہے۔ واقعے کی بنیاد شاہ نصیر کی ترغیب پر ہے لیکن یہ ۱۲۴۵ھ ہو یا ۱۲۶۰ھ، شاہ نصیر کا دلّی میں ہونا ممکن نہیں۔ پہلی صورت میں وہ حیدر آباد دکن میں تھے، دوسری صورت میں اُن کا اِنتقال ہو چکا تھا۔ لہٰذا اس پر مزید تبصرے کی ضرورت نہیں۔

۳۔ تیسری غزل؛ ع دیکھیے اُسے خط میں کہ ستم اٹھ نہیں سکتا، دونوں نسخوں میں نو شعر کی ہے، لہٰذا بحث سے خارج ہے۔

۴۔ اگلی غزل؛ ع نام منظور ہے توفیق کے اسباب بنا، دیوان میں چودّہ اور آزاد میں ۱۵ شعر کی ہے۔ البتہ تین شعروں میں آزاد نے ترمیم روا رکھی ہے۔

آزاد کا مصنّفہ شعر یہ ہے:

اپنے جلسوں میں جلاتے ہیں مجھے میرے حبیب ۔۔۔ میں ہوں اِک شمع پئے محفلِ احباب بنا

آزاد کے مزاج کے مطابق مصرعِ اولیٰ میں "حبیب" کی جگہ جلیس یا مصرعِ ثانی میں "محفل" کی جگہ مجلس ہوتا

غزلیات

گذشتہ صفحات میں دکھایا جا چکا ہے کہ جتنے قصائد ذوق نے کہے کم و بیش اتنے ہی آزاد نے لکھ کر دیوان میں شامل کر دیے۔ غزلیات کا حال قصائد سے کچھ بہتر نہیں بلکہ یہاں اضافوں کے علاوہ تحریفیں بھی بہت ہیں اور اگر ان کا جائزہ بھی لیا جائے تو دیوان سے زیادہ حجم کی ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ ان تحریفوں کو دو حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ایک وہ اشعار جن میں تبدیلیاں بہت ہیں، کہیں پورے پورے مصرعے بدل دیے گئے ہیں اور کہیں الفاظ میں اس قدر اُلٹ پھیر ہو گیا ہے کہ شعر کی صورت ہی بدل گئی ہے۔ دوسرے وہ تبدیلیاں ہیں جہاں ایک آدھ لفظی ترمیم روا رکھی گئی ہے۔ پہلی قسم کی تبدیلیوں کا جائزہ پروفیسر شیرانی مرحوم، اور دوسری قسم کا جائزہ عطا کاکوی لے چکے ہیں۔ اگرچہ اب بھی کئی اشعار ایسے ہوں گے جو نشاندہی سے رہ گئے ہوں گے۔ تاہم ہم اُن کا ذکر نہیں کریں گے ہم حتی الوسع صرف اضافوں سے واسطہ رکھیں گے۔

دیوان ذوق نسخۂ دیران میں ردیف الف کی چالیس غزلیں مکمل اور ۱۵ نا تمام متفرق اشعار یا فردیات کے ذیل میں یعنی کل ۵۵ غزلیں ہیں؛ اور تعدادِ اشعار ۵۵۴ ہے۔ دیوان مرتبہ آزاد میں تمام و نا تمام اور متفرق اشعار کی تعدادِ غزلیات ۷۶، اور تعدادِ اشعار ۷۵۳ ہے۔ گویا صرف ردیف الف میں ۲۲ غزلوں یا ۱۹۸ اشعار کا اضافہ ہے جو اصل کا تقریباً دو تہائی ہے۔ ذیل میں اُن کی تفصیل و تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

سر دیوان پہلی ہی غزل جلی ہے نسخۂ دیران میں اس کا مطلع حمد میں ہے اور اس میں سات شعر ہیں۔ آزاد نے اشعار کی تعداد تو سات ہی رکھی ہے لیکن سوائے مطلعے کے [اس میں بھی مصرعِ ثانی میں ایک "ن" یعنی نستہ کا اضافہ کر دیا ہے] سارے شعر خود کہے ہیں اور ایسے کہ جنھیں دیکھ کر ذوق کے شیعہ ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ ویسے اپنی طرف سے آزاد نے اس میں حمد، نعت، منقبت، مدحِ صحابہ سب کچھ ڈال دیا ہے تاکہ بادی النظر میں شبہ پیدا نہ ہو۔ حمدیہ مطلعے کے بعد نعت کا یہ شعر ملتا ہے:

رہے نام محمد لب پہ یارب اوّل و آخر — اُلٹ جائے بوقتِ نزع جب سینہ میں دم میرا

"اوّل و آخر" حشوِ محض ہے۔ اس کے بعد کا شعر ہے:

محبت اہلِ بیتِ مصطفےٰ کی نور برحق ہے — کہ روشن ہو گیا دل مثلِ قندیلِ حرم میرا

اس کے بعد مدحِ صحابہ میں یہ شعر ہے:

شادباش عمر و دولت و اقبال و عزّ و جاہ — فرخ یہ تجھ کو سال گرہ ہو ہر ایک سال
بلکہ خدا کرے تری عمر اس قدر دراز — ہوں جس میں بے شمار گرہ بے شمار سال

پہلے شعر کا مصرع اولیٰ کم و بیش انھیں لفظوں میں اِنشا کے یہاں آیا ہے۔ اور ناسخ نے اسے ایک فارسی قطع میں اپنا لیا ہے۔ آزاد کی نظر سے یقیناً دونوں اشعار گزرے ہوں گے۔ لیکن انھیں اس سے کیا مطلب کہ مضمون کس کا ہے؟ انھیں تو اُستادِ کے کلام میں ہر نادر مضمون دیکھنے کی دُھن تھی۔ اور اس کے لیے انھوں نے ہر خرمن سے خوشہ چینی کی ہے۔
بہرحال بیانِ قصائد ختم ہوا۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ جعلی اشعار کا تفصیل سے جائزہ پیش کر دیا جائے تاکہ قارئین کرام کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔ ہمارے خیال میں یہ سب قصائد آزاد کے ذہن کی پیداوار ہیں۔ انھیں ذوقؔ کا کلام ماننا مشکل ہے اگر یہ کلام ذوقؔ کا ہے تو یا تو یہ ماننا پڑے گا کہ ذوقؔ کو شعر کہنا نہیں آتا تھا یا پھر اس میں اس قدر تحریف و تصحیف ہوئی ہے کہ اس میں ذوقؔ کا حصہ بالکل نہیں رہ گیا اور یہ بھی وہی بات ہوئی کہ کلام مذکور ذوقؔ کا نہیں۔ اب ہم آئندہ صفحات میں غزلیات کا جائزہ پیش کریں گے۔

ایک نابینا شخص پر تہمت لگاتے ہوئے آزاد کے ضمیر نے کروٹ تک نہ لی ہوگی۔ اگر حافظ ویران مرحوم اشعار مقصد رذیل، اس شخص کو دے سکتے تھے تو اپنے مرتبہ دیوان میں شامل کرنے میں کون مانع تھا؟ حافظ صاحب کو تین شعر یاد تھے یا ملے، انھوں نے اپنے مرتبہ دیوان میں درج کر دیے۔ باقی دس شعر خود آزاد کے ذہن کی پیداوار ہیں اگرچہ ان میں کئی شعر ایسے ہیں جن کی اصل ذوق کے مختلف قصائد میں موجود ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہزاروں شعر کہنے کے باوجود آزاد نے ذوق کو سوائے بدنامی کے کچھ نہیں دیا۔ انھیں کا مال تھا، انھیں کے حوالے کیا، بس اک ذرا چہرہ مسخ کر کے۔ یہ وضاحت کر دینا بھی ضروری ہے کہ حافظ ویران آزاد کے دیوانہ ہو جانے اور دیوان کی اشاعت کے بھی کئی سال بعد تک زندہ تھے۔ ان کا انتقال ۱۹۰۵ء میں ہوا۔

لیکن ایک نابینا کو اس کا علم کیونکر ہو سکتا تھا کہ آزاد نے ان کے نام سے کیا کچھ منسوب کر دیا ہے!!

تین مصدقہ اشعار میں سے ایک میں آزاد نے خفیف سی ترمیم کر دی ہے۔ بہرحال ان کو نقل کرنا چنداں ضروری نہیں۔ گھوڑے کی تعریف کے تحت آزاد نے مندرجہ ذیل دس شعر لکھے ہیں:

کروں میں کیا تِرے گُلگوں کا وصفِ چالاکی ۔۔۔ اُڑا ہی جاتا ہے وہ تو برنگِ طائرِ رنگ

نہ پہنچے گرد کو اس کی وہ پیکِ فکرِ رسا ۔۔۔ کہ ہووے عرصۂ نہ چرخ جس کی ایک شلنگ

چلے ہے یوں کج و واکج ادا و ناز کے ساتھ ۔۔۔ کہ جیسے مستِ مے ناز کوئی دلبرِ شنگ

وہ چلنے میں ہے تذر اور اڑنے میں شاہیں ۔۔۔ اچکنے میں ہے وہ آہو، لپکنے میں ہے پلنگ

[آزاد کے محاورے میں، تذر میں چلنے کا ثبوت چاہیے۔ تذر اُٹھتی ہے، دوڑتی ہے، اُڑتی ہے، لڑتی ہے؛ الجھتی ہے؛ ملتی؛ جھکتی ہے، غرض سب کچھ کرتی ہے، لیکن چلتی نہیں ہے۔]

نہیں پری وہ پری سے ہے پرسوا اپراں ۔۔۔ نہیں وہ آدمی لیکن سب آدمی کے ڈھنگ

رواں ہو گر وہ نہ بک سیرِ آبِ دریا پر ۔۔۔ تو سُم بھی تر نہ ہو اس کا چہ جائے زانو و تنگ

جو چھیڑے اس کو تو میداں میں، اور کہیں اُم سکے ۔۔۔ بزیرِ نعلِ سُم آکر شرر فشاں ہو سنگ

شرارِ سنگ نظر سے نہاں نہ ہونے پائے ۔۔۔ ڈپٹ کے اور وہ پھر آئے سینکڑوں فرسنگ

اگر ہو تجھ کو تماشا اس کے خانۂ زیں میں ۔۔۔ تمام عرصۂ گیتی کی سیر کا آہنگ

تو اس ارادہ کے آنے میں دل تلک ہو دیر ۔۔۔ اور اُس کے جا کے پھر آنے میں کچھ نہ ہووے درنگ[1]

غالب نے ایک قصیدے میں بادشاہ کو درازی عمر کی دعا ان الفاظ میں دی تھی:

تم سلامت رہو ہزار برس ۔۔۔ ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

ذوق کے مصدقہ قصائد میں کوئی ایسی دعا نہیں ملتی۔ البتہ آزاد کے مرتبہ دیوان میں یہ دو شعر ملتے ہیں

---

[1] کلیات مرتبہ ڈاکٹر علوی کے ہندوستانی یا پاکستانی کسی اڈیشن میں یہ اشعار نہیں ہیں۔

پرورش امن کے سایہ میں کیا کرتا ہے — شیر نر بچۂ آہو کو بجائے فرزند
قصر دولت سے ترے مرغ نظر ریختہ پر — بام حشمت یہ ترے کاہکشاں نصف کمند[1]

نسخۂ دیوان میں ایک قطعہ ہے "قطعہ مدح میرزا شاہرخ بہادر" اور اسے دوسرے قصائد کے ساتھ ہی
درج کیا گیا ہے لیکن آزاد نے اسے "اشعار قصائد و قطعات و مخمسات وغیرہ" کے تحت درج کیا ہے اور اس
کا عنوان: "قصیدہ در مدح میرزا شاہرخ بہادر" دیا ہے۔ اشعار میں کمی بیشی نہیں کی اور نہ ہی کہیں ترمیم کی ہے
آخری شعر میں ذوق نے تاریخ نکالی تھی، لکھی ہے ذوق میں نے یہ توصیف، مع تاریخ ثانئ رستم
۱۲۶۱ھ نکلتا ہے۔ یہی نسخۂ دیوان میں درج ہے لیکن آزاد نے اسے "ثانئ رستم" لکھا اور اس کے نیچے ۱۲۶۲ھ
لکھا ہے۔ اگر ہمزہ کا ایک عدد شمار کریں (جو شاذ ہے) تو اس سے ۱۲۶۲ نکل سکتا ہے لیکن جب نسخۂ دیوان
۱۲۶۱ھ لکھا ہے اور یہ نسخۂ آزاد کے پیش نظر تھا بھی، اور یہ قطعہ انھوں نے وہیں سے لیا ہے، تو یہ ترمیم کیوں کی۔
مطلع قصیدہ "مدح اکبر شاہ" کے بعد نسخۂ دیوان میں "ناتمام" کے تحت قصیدے کے تین متفرق شعر ملتے
آزاد کو گھوڑے کی تعریف سے خاص شغف معلوم ہوتا ہے۔ چناں چہ اپنے مصنفہ قصائد میں وہ کئی کئی
گھوڑے کی تعریف میں صرف کرتے ہیں۔ یہاں بھی آزاد نے اس کے لیے موقع نکالا اور ان اشعار سے پہلے
نقشہ بیان کیا ہے:

> بادشاہی قصہ خوانوں میں میر امیر علی [کذا] نام ایک خوش بیان شخص تھے۔ انھوں نے استاد مرحوم
> سے کہا کہ گھوڑے کی تعریف میں چند شعر کہہ دیجیے کہ داستان میں جب ایسا موقع آتا ہے تو اشعار حسب
> دلخواہ نہیں پاتا۔ جی ڈھونڈتا رہ جاتا ہے۔ استاد مرحوم نے حسب عادت وعدہ کرلیا۔ مگر پورا کرنے کی
> فرصت کہاں۔ جب کئی تقاضے گزر گئے۔ اور انھوں نے پھر کہا تو ایک دن فرمایا کہ جب ہم بادشاہ کے
> لیے قصیدہ کہیں تو یاد دلانا [جیسے وہ اس وقت پاس ہی تو بیٹھا ہوگا!] اس میں طبیعت پر زور ڈال کر
> کہیں گے [ورنہ تو بغیر طبیعت پر زور ڈالے کر دیتے ہوں گے، آخر قصہ گو کی فرمائش کوئی معمولی بات
> تو نہیں۔ بادشاہ کا کیا انھیں تو ہلکے اشعار سے بھی ٹرخایا جاسکتا تھا] تمہارا کام ہو جائے گا ہمارے
> قصیدہ کا ایک جز قوی ہو جائے گا۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا۔
> قصیدۂ مذکور معدوم ہوگیا۔ غدر کے بعد عالم تباہی میں ایک دن میر موصوف حافظ ویران کو
> مل گئے۔ حافظ کو اللہ مغفرت کرے ان سے اشعار مفصلہ ذیل حاصل کیے۔ اور مجھے دیے۔ تین شعر
> متفرق اور بھی ہیں وہ بھی لکھتا ہوں۔ [یہیں جعل کے ذوق میں آزاد نے ایک شخص کو زندہ درگور کر دیا۔

---

1. کلیات ج ۲ میں ان اشعار کا ماخذ نسخۂ دیوان کو بتایا گیا ہے لیکن دیوان میں یہ اشعار نہیں ہیں، بعنوان البتہ ہیں یعنی اشعار متفرقات قصائد ناتمام وغیرہ۔

قصیدہ مرقومۃ الذیل آغازِ شباب کا تھا۔ والد مرحوم نے ایامِ جوانی میں ایک بیاض بنائی تھی۔ استادِ مرحوم کی غزلیں لکھا کرتے تھے۔ اس میں ایک قصیدہ اکبر شاہ رضوان اللہ علیہ کی مدح میں تھا۔ [جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ذوق نے اکبر شاہ کی مدح میں بھی ایک قصیدہ کہا تھا ورنہ والد مرحوم ایامِ جوانی کی اس بیاض میں اور قصائد بھی نقل کرتے] ایک زمانہ تھا کہ بندہ آزاد کو سب یاد تھا۔ افسوس کہ نہ وہ رہے نہ وہ رہے [کذا] نہ بیاض رہی [یہ گویا دوبارہ اعتراف ہے اور ہمارے قیاس کی تصدیق کہ دیوان کی ترتیب کے وقت آزاد کے پیشِ نظر وہ بیاض نہیں تھی اور مذاق بدایونی کو جس بیاض کا حوالہ دیا گیا تھا وہ وجودِ خارجی سے محروم تھی۔] یہ چند اشعار یادگار رہے [اگرچہ اشعار یادگار رہے تھے تو عنوان میں صرف مطلع، لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ آزاد نے عنوان نسخۂ ویراں سے لیا اور جب مطلع درج کرنے لگے تو طبیعت لگ گئی اور شعر کہنا شروع کیا، لیکن ذہن نے ساتھ نہ دیا۔ اور صرف تین شعر کہہ کر رہ گئے۔ تین شعر کے بعد انھوں نے ذوق کا مطلع بھی مدحِ حاضر کے اشارے کے ساتھ درج کر دیا لیکن عنوان بدلنا بھول گئے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پہلے ذوق کا مطلع درج کرتے کہ یہ بہرحال ان کے سب اشعار پر بھاری تھا لیکن آزاد اس میں بھی اصلاح دینے سے نہیں چوکے کہ انھیں داخل ہر بانگ، اچھا نہیں لگا اور اسے انھوں نے ہر اذاں میں شامل، بنا دیا] اللہ تو باقی و یادگار باقی۔

آج کچھ ایسی ہوائے عیش کی تاثیر ہے ہر ورق کاغذ کا رشکِ گلشنِ کشمیر ہے
گو نہالِ دشت کو شوقِ حنابندی نہیں ہاتھ کیوں مہندی سے رنگنا برگِ بید الخیر ہے
مدحِ حاضر میں سنا دے مطلعِ روشن کہ ذوق منظرِ مشرق میں بیٹھا مہرِ پرتنویر ہے
• نام کو اللہ اکبر کیا تری تاثیر ہے ہر اذاں میں شامل اور داخل بہر تکبیر ہے۔

نسخۂ ویراں میں یاے مجہول و معروف میں امتیاز نہیں ملتا۔ آزاد نے اکثر اشعار کو من وعن نقل کر دیا ہے جس سے اکثر اشعار غلط بلکہ مہمل ہو گئے ہیں۔ انھوں نے اشعار کی معنویت پر غور نہیں کیا۔ دوسرا مصرع ذوق کے ہاں نہ صرف صاف تھا بلکہ زیادہ چست بھی تھا: داخل ہر بانگ ہے شامل بہر تکبیر ہے آزاد کی ترمیم میں 'اور' کو زبردستی ٹھونسا گیا ہے۔

اسی طرح حاشیے میں 'اشعار قصیدۂ ناتمام' لکھ کر ایک قصیدے کے پانچ شعر نقل کیے ہیں۔ عنوان تو لگتا ہے جیسے نسخۂ ویراں سے لیا گیا ہے لیکن یہ پانچوں شعر نہیں ملتے۔ یہ اشعار بھی ذوق سے تب تک منسوب نہیں کیے جا سکتے جب تک کسی مستند ماخذ میں نہ ملیں۔ اگرچہ بظاہر اشعار صاف ہیں، اس کے باوجود ان میں فکرِ آزاد کا پرتو بھی نظر آتا ہے:

خسروا نیرِ اقبال کی تیرے خورشید کھائے وقتِ شرف عزّ و شرف کی سوگند [؟]
تاب کیا نجمِ سعادت سے ترے ہو ہمسر منزلِ اوج پہ چمکے مہِ تاباں ہر چند
دمِ تحویل یہ کہتے ہیں عناصر چاروں چار چند آپ کا ہو مرتبہ بلکہ صد چند

قصیدہ ۱۲ ؍۱۲ پر بطور عنوان یہ نوٹ ہے :

"اکبر شاہ ثانی کی مدح میں ہے مگر نظرِ ثانی نہیں پائی"

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے اکبر شاہ ثانی کی مدح میں اب تک ذوق کا کوئی قصیدہ دستیاب نہیں ہوا نسخۂ دیوان میں صرف ایک مطلع ہے جس سے گمان ہوتا ہے کہ شاید ذوق نے کبھی کوئی قصیدہ اکبر شاہ کی مدح میں بھی کہا ہو۔ البتہ اس کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بادشاہ کے آخری عہد اور ذوق کی پختگی کے زمانے میں کہا گیا ہوگا جس کی آخری حد ۱۲۵۰ھ ہے، ملاحظہ ہو: مطلع قصیدہ مدحِ حضرت بادشاہ اکبر شاہ جنت آرامگاہ:

نام کو اللہ اکبر تیرے یہ توقیر ہے — داخلِ ہر بانگ ہر شامل بہر تکبیر ہے"

[اس مضمون کو آزاد نے، بگاڑ کر سہی، اپنے مصنفہ قصائد میں باندھ لیا ہے] نسخۂ دیوان میں ظفر کی مدح میں نو بند کا ایک قصیدہ مسدس دعائیہ" ملتا ہے جو بحرِ ہزج مثمن سالم میں ہے اور تین بند کا ایک مخمس "در مدح" بحرِ رمل محذوف مقصور میں ہے۔ آزاد نے یہ دونوں اپنے مرتبہ دیوان میں بھی نقل کیے ہیں۔ عین ممکن ہے انھیں سے متاثر ہو کر انھیں اکبر شاہ کی مدح میں مخمس کہنے کا خیال آیا ہو، یہ مخمس بحرِ رجز میں ہے اس میں کل سات بند ہیں جن میں ایک یہ ہے :

ہے تیری قرو فر بہ افر فریدوں کا نشاں [کذا] — نصفت کو تیری دیکھ کر کسریٰ کی بھی ہو کسر شان
تو وہ سکندر قدر ہے اے فخرِ شاہانِ جہاں — تیرے ضمیر پاک کو پہنچے ہے جام جم کہاں
وہ جام ہے گیتی نما یہ آئینہ ہے حق نما

جب تک کسی مستند ذریعے سے تصدیق نہ ہو جائے یا اس کا مسودہ یا اندراج کسی مستند ماخذ میں نہ ملے، تب تک ہم اسے ذوق کے کلام میں شامل نہیں کر سکتے اگرچہ اس کے اکثر بند با معنی بھی ہیں، برمحل بھی اور ان میں ذوق کا انداز جھلک مارتا ہے[1]

اس مخمس کے نیچے ایک خط کھینچ دیا گیا ہے اور اس کے نیچے جلی قلم سے "تمت بالخیر" لکھ کر قصائد کا حصہ ختم کر دیا گیا ہے، لیکن ورق اُلٹتے ہی اگلے ورق پر جلی قلم سے "قصیدہ ۱۲ ؍۱۲" لکھا ملتا ہے۔ یہاں سے گویا ذوق کے مصدقہ قصائد شروع ہوتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس حصے میں آزاد کا مصنفہ کلام ہے ہی نہیں قصیدہ ۱۲ ؍۱۲۔ ۱۲ ؍۱۲، کل ۱۱ قصیدے، ذوق کے ہیں۔ اس کے بعد متفرق کلام ہے۔ اسی میں نسخۂ دیوان کے آخر سے "اشعارِ متفرقات قصائد و قطعات و مخمسات وغیرہ" کا عنوان لے لیا ہے اور اس کے تحت جو کلام درج ہوا ہے اس میں اکبر شاہ کی مدح والا مطلع مع عنوان نقل کیا ہے لیکن ایک تو اس کے ساتھ طویل نوٹ ہے، دوسرے صرف گوہرا حافظہ نباشد کے مصداق، عنوان میں تو کوئی تبدیلی نہیں کی لیکن ایک مطلع کی بجائے اشعار چار ہو گئے ہیں، ملاحظہ ہو: "مطلع قصیدۂ مدحِ حضرت بادشاہ اکبر شاہ جنت آرامگاہ"

---

[1] نظرِ ثانی کرتے ہوئے کلیات ج ۲ مرتبہ ڈاکٹر علوی کے حواشی دیکھے تو معلوم ہوا کہ انھوں نے یہ مخمس بیاضِ باقر کے حوالے سے درج کیا ہے۔

ہو وہ صوابدیدِ فلاطوں ہیں خُم نشیں — کہہ بیٹھوں گر نشے میں کوئی حرف ناصواب [؟]
یہ ذہن کو ہے عالم مستی میں روشنی — ہر خشتِ خُم ہے حکمتِ اشراق کی کتاب

اسے بھی تھوڑی دیر کے لیے تسلیم کر لیجیے لیکن:

ہر روز جام بادۂ روشن کا مجھ کو شغل — ہے مثل شغل آئینہ و شغل آفتاب

"شغلِ آئینہ" اور "شغلِ آفتاب" کیا ہوتا ہے!

پرہیز میرا یہ ہے کہ تقویٰ سے ہے گریز — تقوے ہے میرا یہ کہ ہے توبہ سے اجتناب
تسلیم اگر — لیکن ہے ابر رحمتِ باری کہ دُرفشاں — دامانِ تر مرا روشِ دامنِ سحاب

فیضِ رحمتِ باری سے عین ممکن ہے کسی گناہ گار کا دامن دُرفشاں ہو جائے لیکن "ابر رحمت باری" سے کسی کے دامنِ تر کی دُرفشانی سمجھ میں نہیں آتی۔

آزاد رعایتِ لفظی کی دھن میں موزونیت و مناسبت کو ہمیشہ بھول جاتے ہیں۔ خیر اس کے بعد مدح شروع ہوتی ہے اور کئی اُلٹے سیدھے شعروں کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

انگور زخم دل پہ نہ بدخواہ کے بندھے — اس خوف سے کہ ہوتی ہے انگور کی شراب
کیا ہی مے پرست ہو مانندِ چشم یار — مقدور کیا کرے قدح مے کا ارتکاب
بلکہ نہ لے دعا قدح کا بھی منہ سے نام — بالفرض گر وہی ہو دعاؤں میں مستجاب

غالباً آزاد کو یہ یاد نہیں رہا کہ قصیدے کی ساری تشبیب شراب سے چھلک رہی ہے لیکن اس اچانک انقلاب کا انھوں نے سبب بتایا اور جواز پیش کیا ـــــ توصیفِ نطق شاہ میں ایک شعر ہے:

کہیے ترے تکلم شیریں کو شہد کیا — یہ شربتِ خضر ہے شہا وہ قئے ذباب

"تکلم شیریں" نہیں شیرینیٔ کلام کا مقام ہے۔ شربتِ خضر کے کوئی معنی ہوتے ہوں یا نہ لیکن یہ شعر غالب کے ایک شعر کی یاد ضرور دلاتا ہے:

کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد — مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

قصہ مختصر ان اشعار کی بے ربطی اور بے معنویت کے باوجود اگر کوئی انھیں ذوق سے منسوب کرے تو یہ اس کی اپنی صوابدید ہے۔ ہمیں کم از کم یہ ذوق کا کلام نہیں لگتا۔

اس کے بعد قصیدہ ۱۱ ذوق کا مشہور قصیدہ ہے: ع ساون میں دیا پھر مہِ شوال دکھائی۔ لیکن آزاد نے اپنے علٰحدہ جعلی قصائد کے ساتھ درج کر دیا ہے۔ اس پر کسی بحث کی ضرورت نہیں البتہ اس امر کی طرف اشارہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کسی کسی شعر میں آزاد نے ترمیم روا رکھی ہے۔ نسخۂ ویران میں "ناتمام" کے تحت اس کے صرف دس شعر ملتے ہیں لیکن یہ قصیدہ دلی اُردو اخبار میں شائع ہوا تھا لہٰذا اس کے مصدقہ ہونے میں کلام نہیں۔ آزاد نے بھی وہیں سے لیا ہوگا۔

میں بے ربطی کا جو فاصلہ ہے وہ بھی غور طلب ہے

یاں تک ہیں بے دماغ، بولیں گے منہ سے وہ
دے گا جواب نامہ نکیرین کو جواب

"دوسرے مصرع کا کیا مطلب؟ اس شعر سے تو ایسا لگتا ہے جیسے اس سے پہلے شعر میں 'کنج خرابات' سے مراد 'گوشۂ قبر' ہو۔ اس کے بعد یکایک پھر اپنی سرمستی اور تلقینِ رندی کو بھول گئے ہیں اور اپنی پرانی شکوہ طرازی پر اُتر آئے ہیں:

رکھتا ہے چرخ اہلِ سعادت کو بدمذاق
گزران ہے ہما کی سرِ روزیِ کلاب

'بدمذاق' کے معنی یہاں بدمزہ سمجھیے لیکن 'ہما کی گزران' 'سرِ روزیِ کلاب' ہے سے کیا مراد ہے؟ ہما ہڈیاں کھاتا ہے، ضروری نہیں کہ وہ کتوں کی ہڈیاں ہوں۔ پھر یہاں ہڈیوں کا سرے سے ذکر ہی نہیں۔ 'کتوں کی روزی کے سر پر ہے' سے وہ مفہوم کیونکر نکلے گا جو آزاد چاہتے ہیں۔ کتوں کی روزی بھی تو صرف ہڈیاں نہیں ہوتیں۔

ساقی جو تجھ کو عین عنایت سے جام دے
لے اور لگا کے آنکھوں سے پی جا اسے شتاب

کہنا چاہتے ہیں کہ اگر ازراہِ مہربانی ساقی تجھے کوئی جام دے لیکن کہا 'عین عنایت سے جام دے' اور اسی رعایت سے دوسرے مصرعے میں آنکھوں سے لگانے کی تلقین کر دی۔ لیکن کہاں عین عنایت سے ایک جام میسر آنے کی بات تھی اور کہاں یہ دریادلی:

گر بے حساب جام پہ جام آئیں تیرے ہاتھ
روزِ حساب تک تو پیے جا علی الحساب

'حساب' کی یہ بے حساب تکرار بے جا ہے۔ اگر بے حساب جام ہاتھ آئیں تو علی الحساب پیے جانے کا مطلب؟ یہ ساری نصیحت یا 'تلقین' 'دلا' کو ہے جس کی تصدیق اگلے شعر سے ہوتی ہے۔

مستی میں ایسا مطلعِ تازہ کوئی سنا
جامی بھی سن کے دل سے جسے کرے انتخاب

اس کے آگے ذوق کا مطلعِ ثانی نقل کر دیا ہے جو اوپر درج ہو چکا لیکن ابھی روشِ مستانہ قائم ہے البتہ بے محل، بے معنی:

گلگونِ نشہ سے گلگوں پہ ہو مرا
پابوسِ آسماں روشِ حلقہ رکاب (کذا)

مطلب کیا؟

مستی مری سکھلائے اگر جھومنے کی طرز
ٹپکے ہمیشہ ابر سے مستی بجائے آب

مصرعِ ثانی، پہلے مصرعے کا جواب ہے نہ دلیل:

بے ہوشیوں میں ہیں وہ مری گرم جوشیاں
ہوتے ہیں جس سے طائرِ ہوش و خرد کباب

نہ پردۂ فلک کو اٹھا دوں اک آن میں
ہو جاؤں میں جو عالمِ مستی میں بے حجاب

چلیے ان اشعار کو کس قدر برمحل اور ان میں کیے گئے دعووں کو صحیح تسلیم کر لیجیے، لیکن آگے؟

لیکن آزاد نے یہ خدمت بھی خود بادشاہ کو سونپ دی؛ پھر کہا۔ ہوں؛ (یعنی پھر پڑھو)۔ "ہوں" کے بعد یہ سوال کیوں؟ اب گویا بادشاہ کی اجازت ہوگئی اور دوبارہ جب ذوق نے پڑھنا شروع کیا تو سب کے دہن بند کھل گئے۔ اور آزاد یہ سب رقم کرنے کو وہاں موجود تھے۔ خیر ممکن ہے ایسا ہی ہوا ہو لیکن وہ شعر بھی دیکھ لیجیے جس نے سب کے دہن بند کھول دیے:

ہر بازیٔ فلک پہ تو نوروز روز کر — دکھ آفتاب گنجفہ پر سال کا حساب

ہم گنجفے کے کھیل سے واقف نہیں، اس لیے حساب لگانے سے قاصر ہیں جن کی سمجھ میں آئے خود حساب لگا کر دیکھ لیں کہ اس شعر کے کیا معنی ہیں۔ ہم تو کچھ اور مہمل اور بے محل اشعار کا تجزیہ پیش کیے دیتے ہیں۔ ذوق نے اس قصیدے کی تشبیب رندانہ رکھی تھی (اگرچہ کل چھ شعر ملے ہیں) اس میں رندی و سرمستی کا ذکر ہے بادشاہ کو بھی مستی و عیش کی تلقین کی ہے اور خود بھی مستی کا اظہار کیا ہے:

پیری میں پُر ضرور ہے جام شرابِ ناب — پائے فروغ صبح نہ بے نور آفتاب
تائب نہ ہو تو اس سے کہ ڈاڑھی ہوئی سپید — کر خوب میکشی کہ یہ ہے پیرِ ماہتاب

آگے چل کر کہتے ہیں:۔

جو دم مزے میں گزرے غنیمت سمجھ اُسے — گردش ہے آسماں کو زمانے کو انقلاب

مطلعِ ثانی ہے:

دے گر چمن کو گریۂ مستانہ میرا آب — بیضوں سے بلبلوں کے ہو پیدا بطِ شراب

کہاں یہ دورِ شراب و مستی اور کہاں آزاد کی یہ تلقین بزرگانہ:

آئی ہے جب سے قالبِ خاکی میں تیری جان — غافل پئے سفر ہے اُسی دن سے پا بہ رکاب

قصیدے میں شیخ سعدی اس قسم کے پند و نصائح کی جرأت کر سکتے تھے، ذوق نہیں۔ خود آزاد بھی اگر دربار میں قصیدہ پڑھتے تو بادشاہ وقت کو غافل کہنے کی جرأت نہ کرتے۔ اس کے بعد زمانے کو انقلاب والا شعر ہے اور پھر ساتواں شعر جس پر سب کے دہن بند کھل گئے۔ اس کے بعد آزاد اپنے دل کی بات کہنے سے باز نہیں رہ سکے:

حاصل ہے کیا ہنر سے ولا آئینہ کو دیکھ — جوہر سے دل میں رکھتا ہے کس درجہ پیچ و تاب

اور اس کے بعد گویا اپنے دل کو رندی کی تلقین شروع کی ہے۔ اور اپنی رندی و سرمستی کا اظہار کئی شعروں میں کیا ہے، ملاحظہ ہو:

گر ہو سکے تو خاکِ درِ مے کدہ ہو تو — اس خاکداں میں تا نہ ہو مٹی تری خراب
آسودگانِ کنجِ خرابات کے لیے — جانا بہشت تک بھی ہو دوزخ کا عذاب

یہ تو ایسا کہا ہے جیسے بہشت ہمسائے میں ہو لیکن یہ دو قدم کا سفر بھی عذابِ دوزخ سے کم نہ ہو۔ ان دو شعروں

گزشتہ بیانوں کی نفی کر رہا ہے۔ جب دربار میں پڑھتے وقت ہر قصیدہ ذوق صاف کرتے ہیں تو پھر ہر جعلی قصیدے
کے ساتھ "افسوس کہ نظر ثانی سے محروم رہا" کا فقرہ کیا معنی رکھتا ہے! اس کے ساتھ ہی آزاد کو وقت کا احساس
اندازہ بھی نہیں ہوتا۔ مثلاً اس قصیدے میں کل ۵۶ شعر ہیں۔ ذوق کئی دن سے کہہ رہے تھے اور مکمل کر لیا تھا۔
بعد شام صاف کرنے بیٹھے، گویا صرف اشعار کو نقل کرنا تھا لیکن آزاد نے اس میں سات آٹھ گھنٹے لگوا دیے۔ آزاد کو
صاف کرنے کا اپنا انداز یاد رہتا ہے کہ خود پے در پے کانٹ چھانٹ اور بار بار تبدیلیاں کرنے کے عادی ہیں۔ لہٰذا
مسودہ صاف کرنے میں بہت زیادہ وقت صرف کرتے ہیں۔ یہاں تو ذوق کئی دن سے قصیدہ لکھ رہے تھے۔
(گویا قصیدہ ہر لحاظ سے مکمل تھا۔ محض صاف کاغذ پر نقل کرنا باقی تھا۔ اس کے باوجود "بعد شام
کرنے بیٹھے ...... اور پھر ...... رات کے دو بجے تک قصیدہ صاف کر لیا"۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ کئی دن،
نہیں تو کم از کم "بعد شام" سے رات دو بجے تک کا سارا عرصہ آزاد ذوق کے پاس بیٹھے رہے۔ اسے وہی
لوگ تسلیم کر سکتے ہیں جو ذوق اور آزاد کے سوانح و حالات سے قطعی طور پر لاعلم ہوں۔ بہرحال ابھی چند شعر
لکھے تھے، [یہاں "چند" دو تین سے زیادہ نہیں ہو سکتے کہ "کئی شعر پڑھے گئے"، گو آزاد نے محض ۶ شعر کے
لیے استعمال کیا حالانکہ انداز بیان کم از کم بیس شعر پر دلالت کرتا ہے] کہ عرض بیگی کا آدمی آیا اور آداب کیا۔
اور آہستہ سے کہا" آخر کیوں؟ شاید اس لیے کہ آزاد نہ سن لیں۔ لیکن انھوں نے پھر بھی سن لیا ورنہ یہ سب کچھ
لکھتے کیونکر؟ پھر جو کچھ اس نے آہستہ سے کہا اس پر یقین کرنے کے لیے بڑی سادہ لوحی کی ضرورت ہے:
"اسی وقت بیگم صاحب کا حکم پہنچا ہے کہ کل استاد قصیدہ سنائیں تو دربار میں کوئی اُن کے شعروں پر تعریف
نہ کرے۔" آخر یہ حکم کس کو پہنچا؟ عرض بیگی کو؟ کیوں؟ کیا دربار میں پکار دینے کے لیے، یا بادشاہ کو
عرض کرنے کے لیے؟ سازشیں کرنے والے اس طرح کھُلم کھُلا نہیں کرتے۔ کیا سب درباری اس وقت
وہاں موجود تھے کہ "اسی وقت حکم پہنچا" اور سب کو علم ہو گیا کہ جب قصیدہ پڑھا جائے تو انھیں اپنی زبان
بند رکھنی ہے۔ زینت محل بادشاہ کی چہیتی بیگم تھیں۔ ان کی خاطر بادشاہ خود ہی بے انصافیاں کرنے پر آمادہ تھا
جس کا شکار وہ خود اپنی ولی عہدی کے سلسلے میں ہو چکا تھا۔ بادشاہ کی اس چہیتی بیگم کے لیے ذوق [جو بادشاہ
کے ملازم تھے] کا یہ الفاظ استعمال کرنا: "اس بیگم کو کیا ہو گیا ہے" ذرا مشکوک ہے۔ یہ لہجہ ذوق کے اس مزاج
سے بھی میل نہیں کھاتا جس کا ڈھنڈورا آزاد نے ساری آب حیات میں پیٹا ہے۔ "انھوں نے قصیدہ پڑھنا شروع
کیا۔ گرد دیکھتے ہیں کہ تمام دربار دم بخود۔ کئی شعر پڑھے گئے، سب صُم بُکم۔ جب ساتواں شعر پڑھا تو بادشاہ نے
اشارہ کیا کہ آگے آؤ۔" خیر یہاں تک کوئی قباحت نہیں لیکن وہ آگے آ کر پاس پہنچے تو اشارہ کیا کہ سر جھکاؤ۔ یہ کام
بادشاہ کا نہیں۔ اس کے لیے نقیب موجود ہوتے تھے۔ پھر ہاتھ پھیلا کر گلے ہی لگانا تھا تو سر جھکانے کا اشارہ
کرنے کے کیا معنی؟ لیکن آزاد جانتے ہیں کہ دربار کی یہی رسم ہے۔ بادشاہ کے قریب جانے پر سر جھکانا ہی پڑتا،
خواہ کوئی خود جھکائے، اور اگر رسم و رہِ دربار سے ناواقف ہو، تو نقیب اُسے اس کا احساس دلا دیتا ہے۔

قصیدہ سنائیں تو دربار میں کوئی اُن کے شعروں پر تعریف نہ کرے۔ آپ کو خیال رہے۔ استاد نے کہا بہت خوب۔ میری طرف سے انہیں دعا کہنا۔

وہ شخص رخصت ہوا۔ آپ تھوڑی دیر خاموش سوچتے رہے اور ایک دم گرم ہو کر کہا اس بیگم کو کیا ہو گیا ہے! خدائی کے منہ بند کرتی ہے! میں جب قصیدہ پڑھوں گا تو دیوانِ خاص کے در و دیوار سے واہ واہ ہوگا۔ یہ کہا اور پھر لکھنے لگے۔ رات کے دو بجے تک قصیدہ صاف کر لیا [اور آپ دو بجے رات تک وہیں بیٹھے رہے:]

صبح کو دربار میں حاضر ہوئے، وقتِ معین پر ایما ہوا کہ استاد اپنا قصیدہ عرض کریں، انھوں نے پڑھنا شروع کیا، مگر دیکھتے ہیں کہ تمام دربار دم بخود، کسی شعر پر شمہ کے سب صم بکم۔ جب ساتواں شعر پڑھا تو بادشاہ نے اشارہ کیا آگے آؤ پاس پہنچے تو اشارہ کیا کہ سر جھکاؤ۔ اور ہاتھ پھیلا کر گلے لگا لیا۔ پھر کہا، ہوں! (یعنی پھر پڑھو) پھر پڑھنے لگے تو سب کے دہن بند کھل گئے تھے، خوب تعریفیں ہوئیں۔ بیگم نے بھی سنا کلیجہ مسوس کر رہ گئیں۔

۱۸۴۹ء میں لکھا تھا۔

فی الوقت اس افسانے کی تصدیق کا کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ تاہم بہ وجوہ یہ بیان مشکوک ہے۔ آزاد جشن کی مبارکباد کا ذکر کرتے ہیں لیکن حسبِ عادت جشن کی صراحت نہیں کرتے۔ قصیدے کے شروع میں ایک جگہ نوروز کا ذکر آیا ہے اور دعائیے میں عید کی مبارک باد ہے۔ اگرچہ نوروز بھی عید ہے لیکن قصائد میں عموماً اس کا ذکر بالتصریح کیا جاتا ہے۔ آزاد کو یہ سوچنے کی فرصت ہے نہ ضرورت۔ انھیں محض اشعار کی تعداد میں اضافہ کرنا مقصود ہے اس لیے وہ ہر چیز میں خلط مبحث کر دیتے ہیں۔ تشبیب میں مدح، مدح میں تشبیب ابھی دعائیں دے رہے ہیں ابھی نصیحت کر رہے ہیں۔ غرض عجب افراتفری کا عالم ہوتا ہے اور یہ قصیدہ بھی اس افراتفری سے بری نہیں۔ اس کا جائزہ اپنے مقام پر پیش ہوگا، پہلے نوٹ کے مشتملات کا جائزہ مکمل کر لیا جائے۔

دوسری بات آزاد نے یہ بتائی ہے کہ ذوق "بعد شام قصیدہ صاف کرنے بیٹھے" آزاد جب بھی ذوق سے قصیدہ پڑھوانے کا افسانہ گھڑتے ہیں تو نظرِ ثانی سے محروم رہنے والا اپنا پسندیدہ فقرہ بھول جاتے ہیں۔ اُس وقت ان کا احساسِ کمتری تھوڑی دیر کے لیے اُن کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے اور وہ یہی سمجھنے لگتے ہیں کہ قصیدہ ذوق نے کہا ہے۔ اس کی صریح خامیوں سے بھی وہ بے نیاز ہو جاتے ہیں، اور یہ نہیں سوچتے کہ ان کا موجودہ بیان اُن کے سبب

بقیہ دیگرے آگے

آلودہ کرنا اچھی بات نہیں۔ فی الوقت اس کہانی کو تاریخی طور پر پرکھنا ممکن نہیں۔ دلی اردو اخبار سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۰ء کے آس پاس خلیفہ اسماعیل اپنے سابقہ عہدے پر بحال کیے گئے تھے۔ ان کی معزولی یا اس کے اسباب کا علم نہیں۔ محبوب خواجہ سرا وہی ہیں جن سے آزاد نے ایک کہانی منسوب کر کے ذوق سے ایک شعر کہلوایا ہے، جو دل تار خانہ میں مدت سے لگا چکے۔ وہ کعبتین چھوڑ کے کعبے کو جا چکے۔ اور یہ محض افسانہ ہے۔ حیرت اس پر ہے کہ افسانہ تراشی کے جوش میں آزاد مرحومین کو بدنام کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ اعاذنا

اس قصیدے کے صرف آٹھ شعر ملتے ہیں: ۶ تشبیب کے اور ۲ مدح کے۔ اس کا مطلب ہے کہ ذوق نے اس زمین میں قصیدہ کہا ضرور تھا۔ اس میں کل کتنے شعر تھے، فی الوقت کہنا مشکل ہے۔ حافظ ویران اور ان کے ساتھی صرف ۸ شعر فراہم کر پائے۔ باقی ۴۸ شعر جعلی ہے۔ مہمل اشعار کے تجزیے سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔ اس سے پہلے کہ ان اشعار کا تجزیہ کیا جائے، یہ بتا دینا ضروری ہے کہ آزاد نے آٹھ کے آٹھ شعر نہ یک جا اور مسلسل نقل کیے ہیں اور نہ من وعن۔ جہاں ان کا جی چاہا، لفظی تبدیلیاں کر لی ہیں۔ شروع کے تین شعر بعینہٖ ہیں۔ اس کے بعد تین شعر ہیں تو کم وبیش مطابق نسخہ ویران لیکن ان کا مقام تبدیل کر دیا گیا ہے۔ مثلاً چوتھا شعر آزاد کے ہاں چھٹا ہے۔ نسخہ ویران میں اس کے بعد مطلع ثانی ہے جو آزاد کے ہاں ستروان ہے لیکن اس میں آزاد نے دو لفظی ترمیم کر دی ہے: ع دے گر چمن کو جلوہ مستانہ میرا آب، آزاد نے خط کشیدہ ٹکڑا "گلشن کو دے" بنا دیا ہے۔ چھٹا شعر ۲۱ واں ہے، ساتواں اور آٹھواں بالترتیب ۴۸ واں اور ۴۹ واں ہے لیکن ان دونوں میں ترمیم ہوئی ہے:

کرتا ہے روز و شب کو برابر شہنشا میزان عدل اسی تری میزاں میں آفتاب
خورشید کھینچتا ہے جو برج اسد پہ تیغ چاہے ہے شیر جنگ وہ تجھ سے مگر خطاب

آزاد نے پہلے شعر کے مصرع ثانی میں "میزانِ عدل" کو "تعمیلِ عدل" سے بدل دیا ہے، جو مہمل ہے۔ دوسرے شعر کا پہلا مصرع یکسر بدل دیا گیا ہے: خورشید شیرِ چرخ پہ جو کھینچتا ہے تیغ، اور مصرع ثانی میں "وہ" کو "یہ" کر دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے آزاد کو "برجِ اسد" پسند نہیں آیا۔ اگر دوسرے مصرعے میں بھی اسد جنگ ہوتا تو شاید انھیں اس تحریف کی ضرورت نہ پڑتی لیکن مجبوری یہ تھی کہ اسد جنگ وزن میں نہیں آتا۔ لہٰذا انھوں نے "برجِ اسد" کو "شیرِ چرخ" بنا دیا۔ بہ ہر حال، اب آزاد کے مصنفہ کچھ مہمل اشعار کو بھی دیکھ لیا جائے، مگر اس سے پہلے آزاد کا یہ نوٹ بھی ملاحظہ ہو:

> استاد مرحوم جشن کی مبارکباد کے لیے کئی دن سے قصیدۂ مرقومۃ الذیل لکھ رہے تھے بعدِ شام صاف کرنے بیٹھے کہ صبح دربار میں پڑھیں گے۔ چند شعر لکھے تھے جو مرزا علی عرض بیگ کا آدمی آیا اور کہا مرزا صاحب نے آداب عرض کیا ہے (اور آہستہ سے کہا) اسی وقت بیگم صاحبہ[ل] کا حکم پہنچا ہے۔ کہ کل استاد

ل بیگم صاحب پر آزاد نے یہ حاشیہ لکھا ہے: بیگم سے مراد زینت محل بیگم تھیں کہ بادشاہ نے وزارتِ سلطنت ان کے نام کر دی تھی۔ اور ان کی طرف سے محبوب خواجہ سرا کل دربار اور کاروبار کا انتظام کرتا تھا۔ خلیفہ اسمٰعیل کے پاس خدمتیں تھیں وہ بیگم نے لے لی تھیں اس لیے آپ ہمیشہ مضطر تھا کہ شاید استاد بیٹے کی سفارش کریں یا میرے برخلاف کچھ کہیں۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ بادشاہ استاد کی بات کا بہت لحاظ کرتے تھے مگر استاد نے نہ پہلے نہ بعد خلیفہ مرحوم کی سفارش میں کچھ نہیں کہا۔ نہ بیگم کی شکایت کی بلکہ حق یہ ہے کہ کسی کی شکایت سے بھی زبان آلودہ نہیں کی۔ ان کا قول تھا کہ زبان جوہر لطیف ہے اسے عیب سے

(باقی اگلے صفحہ پر)

اشکِ خوں میں ہے مرا آتشِ یاقوتِ یمن   گرچہ ہوں آب میں لیکن ہوں ہمیشہ سوزاں

"آتشِ یاقوتِ یمن" تو اشکِ خونیں ہے پھر آپ کیوں ہمیشہ سوزاں ہیں؟ آپ بھی اشک ہے اور آب میں بھی وہی۔ "بندا ہوں" کہنا غلط۔ مضمون آفرینی کی دھن میں آزاد زبان و بیان کی ایسی فاش غلطیاں بھی نہیں دیکھ پاتے اس طرح کی بلا مبالغہ سیکڑوں مثالیں ان کے مصنفہ اشعار میں موجود ہیں۔ کئی مثالیں ہم پیش کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں مزید قارئین کرام کو دیوانِ ذوق مرتبہ آزاد میں بآسانی مل سکتی ہیں۔

دل اُڑا جاتا ہے جل جل کے جو بن آگ مرا   طائرِ رنگِ حنا بن کے ہوا ہوں پرآں

دل نہیں، خونِ دل جل جل کے اُڑا جاتا ہے۔ "طائرِ رنگِ حنا" کی ترکیب آزاد کو بہت پسند ہے، لہٰذا یہاں بھی اُسے باندھ دیا، بے سلیقہ ہی سہی۔ چاہیے تو یہ تھا کہ خون طائرِ رنگِ حنا بن کر پرآں ہے، لیکن کہا: میں پرآں ہوں۔

طفلِ معصوم کا ہے خواب مری موت و حیات   کہ یہی لب مرا خنداں ہے یہی ہے گریاں

عجزِ بیان صاف ظاہر ہے۔ آزاد جو کہنا چاہتے ہیں وہ شعر میں انہیں پایا۔ ذوق کا ایک مشہور شعر ہے:

جوں دانۂ روئیدہ تہ سنگ ہمارا   سر زیرِ گراں بارِ الم اٹھ نہیں سکتا

آزاد نے اس کا خون ان الفاظ میں کیا ہے:

اُٹھ سکا سر نہ مرا مزرعِ گیتی میں ذرا   دل رہا دانۂ روئیدہ تہِ سنگِ گراں

کوئی بھی شاعر اپنے ضرب المثل شعر کا حلیہ بگاڑنا پسند نہیں کرتا۔ ذوق بھی اپنے اس شہرہ آفاق شعر کو نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ یہ کسی غیر شاعر ہی سے ممکن ہے پہلے مصرعے میں سر نہیں اٹھا، لیکن "دانہ روئیدہ تہہ سنگِ گراں" دل رہا، مطلب کیا ہوا؟

وہ شہنشاہ کہ جشن اُس کا ہے افلاک کی سیر   بنتے مہوش سی ہیں تو کرتے ہیں ستارے افشاں

یہ شعر ذوق کے شعر سے استفادے کے ذیل میں پہلے نقل ہو چکا ہے۔ دوبارہ نقل کرنے کا مقصد اس طرف توجہ دلانا ہے کہ آزاد نے قصیدے سے پہلے طویل نوٹ لکھ کر یہ بتایا ہے کہ قصیدہ ہذا شہزادہ سلیم کی شادی کی تہنیت میں کہا گیا لیکن اس میں شہنشاہ کے جشن کا ذکر ہے۔ آخر یہ کون سا جشن ہے؟

مدحِ حاضر کے لیے حاضرِ دربار ہو ذوق   تو ہے خاقانیِ ہند اور وہ ہے خاقانِ زماں

اُس وقت تک اگر ذوق خاقانیِ ہند ہوتے بھی تو بھی اس انداز کی تعلّی نہیں کر سکتے تھے۔ ظاہر ہے یہ شعر بہت بعد میں کہا گیا کہ آزاد کے ذہن کی پیداوار ہے۔ بھلا مدحِ غائب کیا گھر بیٹھ کر کر رہے تھے کہ مدحِ حاضر کے لیے حاضرِ دربار ہونے کی تلقین فرما رہے ہیں؟ یہ شعر حصۂ اوّل میں زیرِ بحث آ چکا ہے لہٰذا اس پر مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ یہی مثالیں اس کے جعلی ہونے کے ثبوت کے لیے کافی ہیں۔

قصیدہ ۱۰ عاشق نہال چشتی کی مدح میں ہے اور اس پر پہلے بحث کی جا چکی ہے۔ قصیدہ ۱۱ در مدح ابوظفر بہادر شاہ مرحوم ہے۔ آزاد نے اس قصیدے کے ۵۶ شعر درج کیے ہیں۔ نسخۂ دیوان میں "ناتمام" کے

اس گلستاں کی روش پر گل بازی ہوں میں
نہ اِدھر ہوں نہ اُدھر ہوں نہ وہاں ہوں نہ یہاں

اوّل تو "اُس گلستاں" کی جگہ "اِس گلستاں" ہونا چاہیے۔ دوسرے جب گلستاں کی روش پر ہیں تو اِدھر اُدھر کہیں تو ہوں گے۔ لہٰذا دوسرا مصرع غلط۔ جنھیں شعر گوئی کا تجربہ ہے اور جنھوں نے کبھی شاگردوں کی تربیت کی ہے۔ ان کے مشاہدے میں آیا ہوگا کہ مبتدیوں کو جب کسی شاعر کا کوئی شعر بہت متاثر کرتا ہے تو اس کا مضمون ان کے تحت الشعور میں مرتسم ہو جاتا ہے اور وہ دانستہ یا نادانستہ اُسے اپنے اشعار میں بہ تکرار باندھا کرتے ہیں۔ آزاد کو بھی جو اشعار پسند آتے ہیں، موقع ہو نہ ہو، وہ انھیں اپنی تحریر میں گھسیٹ لاتے ہیں، خواہ اپنے نام سے ہو، خواہ "استاد" کے نام سے ہو، یا کسی واقعے یا قصّے کے ذیل میں۔ معلوم ہوتا ہے جرأت کا ایک مطلع انھیں بہت پسند آیا۔ لہٰذا اُسے اس طرح داخلِ دیوانِ ذوق کیا:

ایک دن کئی استادوں کے مطلع سنائے اور فرمایا ان کے جواب نہیں، (کذا) لاثانی ہے۔ انھی میں جرأت کا مطلع پڑھا:

رتبہ گل بازی کا دلا کاش تو پاتا
ہاتھوں سے جو گرتا تو وہ پلکوں سے اٹھاتا

پھر فرمایا کہ لڑکپن میں یہ مطلع سن کر ہم نے بھی ایک مطلع کہا تھا۔ مگر لڑکپن ہی تھا بھلا یہ کجا وہ کجا۔ وہ اور ہی بات ہے۔ پھر اپنا مطلع پڑھا:

پلکوں سے اٹھاؤ گے نہ ہاتھوں سے گراؤ
جتنا ہے نمک سب مرے زخموں میں کھپاؤ

[یہ افسانہ صریحاً غلط ہے۔ دونوں مطلعوں میں کوئی تعلق نہیں۔ ذوق مشہور روایتوں پر اکثر شعر کہہ دیتے ہیں چناں اور بھی اسی طرح کی روایتیں ان کے ہاں نظم ہوئی ہیں۔ اگر ذوق اپنے مطلع کو اتنا ہی معمولی سمجھتے تو یہ اُن کے کلام میں شامل نہ ہوتا]

اللہ مغفرت کرے کیا با انصاف طبیعت اور نیک دل لائے تھے۔ دیکھ لو۔ ویسا ہی حسنِ قبول بھی اللہ نے اُن کے کلام کو دے دیا۔

یہ افسانہ تراشنے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ "گل بازی" والا مضمون انھیں بہت پسند آیا۔ کہیں پڑھ لیا ہوگا: استاد کو ویسے تو بخش نہیں سکتے تھے اس لیے ایک قصہ گھڑ لیا۔ ان کے ذہن میں یہ شبہ بھی موجود ہے کہ ذوق کا مطلع غالباً جرأت کے مطلع سے متاثر ہو کر کہا گیا ہے لیکن اس پائے کا نہیں۔ اب ایک تیر سے دو بلکہ تین شکار ہو گئے: استاد سرقے کے الزام سے بچ گئے، ان کی انصاف پسند اور نیک طبیعت کی سند مہیا ہو گئی اور آزاد کا پسندیدہ شعر بھی "استاد" کے دیوان میں جگہ پا گیا۔ یہ تو ایک پہلو ہے۔ اتنے سے ان کی تشفی نہیں ہوئی۔ انھیں تو یہ مضمون کسی نہ کسی طرح "استاد" کے کھاتے میں ڈالنا تھا۔ چنانچہ قصیدے کا مندرجہ بالا شعر کہا: انھیں اس سے غرض نہیں کہ اس طرح استاد کی نیک نامی میں اضافے کی بجائے اس میں بٹہ لگتا ہے:

اُس وقت جب وہ خلیفہ اسماعیل کے پاس جا کر آزاد کا کلام جمع کر کے صاف کر رہے تھے اور غزلیں صاف کر لی تھیں۔ قصیدے باقی تھے کہ غدر ہو گیا۔ خلیفہ اسماعیل کے ساتھ وہ سارا کلام بھی ضائع ہو گیا، پھر یہاں تک کیونکر پہنچا!

بہر حال ۹۲ شعر کے اِس بے ربط و مہمل قصیدے کے چند شعر مثالاً لکھے جاتے ہیں تاکہ ہمارے قول کی تصدیق ہو جائے ؛

دل کہ اِس دہر میں ہے گرسنۂ نازِ بتاں   نم تیغ اس کو غنیمت ہے کہ دیکھا لبِ ناں

یہ نم تیغ ، غالباً خم تیغ ہوگا۔ مطلعے کی لغویت ظاہر ہے۔ دل گرسنۂ نازِ بتاں ہے، اُسے نان یا لبِ نان سے کیا مطلب ؟ اِس پر مزید تبصرہ بے ضرورت ہے البتہ مصحفی کا ایک شہر آشوبیہ قصیدہ ہے، اس میں جہاں وہ سلاطین کی حالتِ زار کا نقشا کھینچ رہے وہاں ایک شعر آیا ہے جو آزاد کے شعر کا ماخذ معلوم ہوتا ہے ؛

خورشید دکھاتا ہے سحر دوڑ سے گردہ   اور شب کو مہ نو کہے ہے تو لبِ ناں ہے

مصحفی کا شعر بہر حال بامعنی ہے لیکن آزاد کا شعر مہمل۔ کسی کا مضمون اڑا لینا بھی ایک فن ہے۔ اس کے لیے ایک خاص سلیقے کی ضرورت ہے، جو آزاد کے حصے میں نہیں آیا۔ بہر حال اگلے دو شعر دیکھیے ؛

ہوں وہ لب تشنہ کہ میں دامنِ دریا پھوں   برق پُر سوز کا ہاتھ آئے جو طرفِ داماں

وہ خنک دل ہوں کہ جس کے نفسِ سردِ آہ   دم میں یخ بستہ ہو سرچشمۂ مہرِ رخشاں

کہاں مزاج کی یہ خنکی اور کہاں یہ آتش مزاجی ؟

میں ہوں وہ شعلۂ جوالہ بزیرِ گردوں   کہ اگر دل کو قرار آئے تو چکر میں ہو جاں

میں وہ مجنونِ جگر تفتہ ہوں جس کے دمِ قصد   ہر بُنِ مو سے عوض خوں کے نکلتا ہے دھواں

ہوں وہ تصویر سر صفحۂ عالم جس پر   مو قلم دو تو کرے کارِ سنان و پیکاں

یہ مو قلم دینا کیا ہوا ؟

میں ہوں وہ کشت کہ بیگانہ ہے سبزہ جس سے   اور اُگے ہے تو ہے آغشتۂ زہرابِ سناں

جب پہلے مصرعے میں کہا گیا کہ "سبزہ ہے بیگانہ جس سے" تو دوسرے مصرعے میں، "اور اگر ہے" کا کیا مطلب ہے ؟

فلکِ سبز کے نیچے ہوں میں تلوار کا کھیت   آبِ شمشیر مجھے دو کہ یہی ہے مری جاں

شعر کے اہمال سے قطع نظر یہ شعر ناسخ کے اسی شعر سے ماخوذ ہے جس کے اِس مصرعے :

'سبز ہوتے کھیت دیکھا ہے کہیں شمشیر کا'

پر آزاد نے یہ کہہ کر اعتراض کیا تھا کہ محاورہ تلوار کا کھیت ہے شمشیر کا کھیت نہیں۔

ماہِ نخشب کی طرح ہوتا عیاں ہوں سرِ کوہ   اور ابھی پل میں جو دیکھو تو عیاں ہوں نہ نہاں

یہ کیا بات ہوئی ؟ اگر عیاں نہیں تو نہاں ہوگا۔ نہ عیاں ہوں نہ نہاں، یہ کیونکر ممکن ہے ؟

تو تھی نہیں۔ ظفر نہ سعادت علی خاں تھے اور نہ ذوق [اتنی] ایک برس وفات سے پہلے فرمایا کہ اگر ہوتا تو ائے
دست کرتے۔ [گیا کہاں تھا!] طبیعت نے عالم جوانی میں بلند مضامین پیدا کیے تھے۔ خیر اکثر اشعار اور
مطالب خیال میں ہیں [جب ایسا ہی زبردست حافظہ تھا کہ ۵۰ سال بعد —— وفات ۱۲۷۱ھ ——
بھی اکثر اشعار اور مطالب خیال میں تھے تو دوبارہ لکھ لیتے افسوس کرتے رہنے کی کیا ضرورت تھی ؟] ایک قطعہ
لکھ دیتے ہیں۔ چناں چہ ۲۲ شعر کا قطعہ لکھا اور عید قرباں کی تہنیت میں ابوظفر بہادر شاہ کو سنایا [جب
شعر ہی خیال میں تھے تو وہی قصیدہ لکھ لیتے قطعہ لکھنے اور ابوظفر کو سنانے کی کیا ضرورت تھی۔ قصیدہ تیرہ او-
کے عقد کے موقع پر کہا گیا تھا۔ اب کون سی شادی تھی۔ اگر کہنا ہی تھا تو مرزا جواں بخت کی شادی
کے موقع پر کہہ کر سناتے۔ دونوں میں کیا اشتراک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ ذوق نے مرزا سلیم
کی شادی کے موقع پر کوئی قصیدہ کہا تھا (راوی خود آزاد ہیں) اور نہ ہی وہ اس وقت تک
قصیدہ کہنے کے قابل ہی ہوئے تھے۔ اب بھی انھوں نے کوئی قطعہ نہیں لکھا بلکہ عید قرباں کے موقع پر
۴۸ شعر کا قصیدہ کہا۔ آزاد نے اشعار کی تعداد کم دیکھی تو اسے قطعہ کہہ دیا اور یہ نہیں دیکھا کہ خود اس
قصیدے میں دو دو اشعار کے تین قطعے موجود ہیں لیکن آزاد نے اپنے مرتبہ دیوان میں ق یعنی
علامت قطعہ کو چھوڑ دیا۔ اس کے علاوہ آخر کے ۶ شعر بھی چھوڑ دیے۔ البتہ ایک شعر کا چربا اپنے مقطع
قصیدے میں داخل کر لیا: کیوں نہ ارباب ہمم ہوں تری ہمت کے غلام

حق یہی ہے کہ الانسان عبید الاحساں

ذوق کا شعر اس طرح تھا: ترے احساں سے ہر انساں ہے غلامی میں تری

سچ کہا ہے کہ الانسان عبید الاحسان

آزاد کو استاد کے کلام میں اضافے کے لیے اتنے متمنی تھے کہ ہزاروں شعر کہہ کر انھیں بخش دیے، خود استاد
کے کہے ہوئے اشعار کو نظر انداز کر دیا۔ غالباً انھیں اپنے کہے ہوئے اشعار کی کثرت کے سبب تسلی تھی
ہزاروں کے سامنے ۶ شعروں کی کیا بساط ؟ تاہم ان اشعار کے مضامین کو انھوں نے کہیں نہ کہیں کھپا
دیا۔ ایک اور شعر کا عکس اسی قصیدے میں موجود ہے، ملاحظہ ہو:

اے فلک جاہ ترے در کے ہیں وہ ذرۂ خاک
جن سے خورشید چنے اپنی جبیں پر افشاں (ذوق)۔

وہ شہنشاہ کہ جشن اس کا ہے افلاک کی سیر
ہنستے مبہوت ہیں تو کرتے ہیں تارے افشاں (آزاد)

ستاروں کا افشاں کرنا توجہ طلب ہے] بعد انتقال کے یہ قصیدہ بھی نکلا۔ الحمد للہ کہ یہاں تک پہنچا۔
اول قصیدہ لکھتا ہوں۔ پھر قطعہ [اس سلسلے میں آخری بات یہ کہنی ہے کہ اگر قصیدہ نکلا ہوتا تو یہ قول آزاد

اِنشا نے ہمدم کو لاثانی بتایا تھا آزاد نے اُسے رخش کی نسل سے ملا دیا، اگرچہ یہ رخش کی مثال بھی اِنشا ہی کے کلام سے لی آئی ہے۔ بہرحال آزاد کے ذہن میں ہمدم کا نام محفوظ رہ گیا اور اُنھوں نے مذکورہ مطلع کہہ دیا لیکن چوں کہ اس میں ہمدم کا کوئی مطلب نہیں اِس لیے بات بن نہیں سکی۔ ہم نے کہا نا کہ آزاد کے ہاں پریشاں خیالی بہت ہے ابھی ابھی وہ کہہ چکے ہیں کہ گھوڑا "نسلِ آدم" ہے لیکن ایک ہی شعر کے بعد کہتے ہیں:

ہے تو وہ حور شمائل نہیں پر زادۂ حور
خوے آدم ہے و لیکن نہیں نسل آدم

اب کہیے کون سی بات درست مانی جائے؛ ویسے گھوڑے کے لیے حور اور پری کی مثال بھی انھوں نے ذوق' ہی سے لی ہے:

ہے وہ ہیکل میں اگر دیو تو صورت میں پری ہے اُڑان اس میں ملک کی تو لبت کے سی خصال

ہمارا خیال ہے کہ اِس قصیدے کے جعلی ہونے کے ثبوت میں یہی کافی ہے مزید جہلات نقل کرنا فضول ہے۔ البتہ ایک بات کی طرف اِشارہ کر دینا مناسب ہوگا۔ ذوق قصیدے میں غزلیں نہیں کہتے۔ اُن کے کسی مصدقہ قصیدے میں غزل کہنے کا ذکر نہیں ملتا سوائے اس کے کہ عِ ذوق موقوف کر انداز غزل خوانی کو' اور یہ غزل خوانی تشبیب کے لیے ہے۔ یہاں سے شاعر نے گریز کیا ہے لیکن قصیدۂ زیرِ بحث میں، اپنی پراگندہ بیانی میں آزاد نوش کی تعریف کرتے کرتے یکایک بادشاہ کی تعریف پر اُتر آتے ہیں اور فرماتے ہیں:

مدح میں اس کی رقم کرتا ہوں اِک تازہ غزل کہ غزلخواں ہے ہر اک آج بجانِ خرّم

اور مطلع بجائے غزل کے قصیدے کا کہا ہے:

تو ہے وہ ابر سخا تو ہے وہ دریاے کرم جس میں ہوں فلس کی جا کیسۂ ماہی پہ درم (کِتنا)

ویسے فلسِ ماہی کو درم (دھریں) کہنے کا یہ مضمون بھی آزاد نے ذوق ہی سے اُڑایا ہے۔ لیکن دوسرا مصرع؟ بادشاہ ابرِ سخا ہے اور دریاے کرم بھی اور اس میں مچھلیاں بھی ہیں۔ بہرحال، آئیے اب قصیدہ ۹ کا جائزہ لیا جائے۔ آزاد نے اسی قصیدے پر یہ طویل نوٹ لکھا ہے:

> یہ قصیدۂ مبارکبادی مرزا سلیم شاہزادہ کی شادی میں لکھا تھا۔ بندہ آزاد ان دنوں طفلِ مکتب بھی نہ تھا۔ [حقیقت یہ ہے کہ آزاد اُس کے بیس سال بعد پیدا ہوئے] جب حاضر خدمت ہونے لگا تو حضرت مرحوم اکثر اس کے اشعار پڑھا کرتے تھے۔ ڈھونڈنے کی فرصت نہ تھی [غور فرمائیے کہ مرزا سلیم کی شادی کے بیس سال بعد آزاد پیدا ہوئے۔ آخر ذوق کس تقریب سے ایک لڑکے کے سامنے اس قصیدے کے اکثر اشعار پڑھا کرتے ہوں گے؟ پھر انھیں ڈھونڈھنے کی فرصت کیوں نہیں تھی۔ آخر سارا دن کرتے کیا تھے؟ اُن کی مصروفیت تو گاہ گاہ دربار کی حاضری ہی تھی نا! ہر دم کی مصاحبت

بھی آگیا ہے تو آزاد نے پھر اسے باندھا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں وہ سادگی ہے نہ خوش سلیقگی۔ ساچق کا ذکر ذوق کے ایک قصیدے میں اس طرح آیا ہے :

یہ کہنہ دسیاہ وہ خوش رنگ و نو بہ نو — فائق ہو کیا سبوچۂ ساچق پر آسماں

تھلیوں میں ہیں وہ نقل پڑے، ان کا عکس گر — ہے کہکشاں کی مانگ میں موتی بھر آسماں

ذوق کے یہ شعر گویا آزاد سے کہہ رہے ہیں کہ — دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخن ور سہرا

منہ پہ نوشاہ کے یوں سہرۂ زرتار کی زیب — روئے خورشید پہ جوں خطِ شعاعی کی جھلم

آزاد جیسے قسم کھا کر اُستاد کے ہر شعر کا منہ بگاڑنے پر تلے ہوئے ہیں۔ یہ اس روایتی بندروالی دوستی جیسی ہے جس نے مالک کے چہرے سے مکھی اڑانے کے لیے تھپڑ سے اس کا سر ہی پھوڑ دیا تھا۔ خطِ شعاعی اور خورشید کا یہ مضمون ذوق کے مشہور سہرے کے اس شعر کی بیت کدائی ہے :

تابشِ حسن سے مانندِ شعاعِ خورشید — رخ پرنور پہ ہے تیرے منور سہرا

بہرحال : ہوا شبدیز فلک سیر پہ دولھا جو سوار — روز نے صدقہ کیا اشہب وشب نے ادہم

وصف میں اس کے پڑھوں کیونکہ اک مطلع میں — توسن طبع نے اب تیز نکالا ہے قلم، اقدم

مطلع ہم بعد میں نقل کریں گے، پہلے یہ دیکھ لیجیے کہ آزاد نوشہ کے گھوڑے کی تعریف میں مطلع کہنا چاہتے ہیں لیکن دوسرے مصرعے سے معلوم ہوتا ہے کہ نوشہ کے گھوڑے کی شان میں نہیں اپنے توسن طبع کی شان میں مطلع کہہ رہے ہیں ذوق کیا ایسے ہی غیر شاعر تھے کہ گھوڑے کے لیے "تیز نکالا ہے قلم" کہتے۔ یہ آزاد کو بھی کھٹکا۔ چناں چہ انھوں نے "ن" (نسخہ) میں اسے "قدم" بنادیا۔ پھر جو مطلع کہا، اگر اصلیت اور اس کے ماخذ کا علم نہ ہو تو مہمل بکہ لغو لگے گا :

یار ہمدم نہیں لیکن ہے وہ نسل آدم — ہے وہ اس نسل میں جو اصل میں رخش رستم

پہلے مصرعے کا مطلب تو یہی ہوا کہ وہ یعنی گھوڑا یار ہمدم نہیں لیکن آدم کی نسل سے ہے۔ گھوڑا اور آدم کی نسل سے، یعنی چہ ؟ دوسرے مصرع میں اسے رخش رستم کی نسل سے بتایا ہے۔ رخش رستم کے گھوڑے کا نام تھا، لہٰذا ایک گھوڑے کا نسل سے ہونا چنداں تعجب خیز نہیں۔ لیکن پہلا مصرع خصوصاً "یار ہمدم" معمّا ہی رہے گا جب تک اس کی اصل کا علم نہ ہو۔ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ آزاد انشا سے بہت متاثر ہیں۔ یہ قصیدہ بھی انشا ہی کی زمین میں کہا گیا ہے جس طرح ذوق کا کلام آزاد کو یاد ہے اسی طرح انھیں انشا کے بھی بہت شعر یاد معلوم ہوتے ہیں، اور یہ "ہمدم" وہیں سے آیا ہے : "ہمدم" دراصل نواب سعادت علی خاں کے گھوڑے کا نام تھا۔ انشا نے ایک رباعی کہی تھی جس کا عنوان تھا :

"رباعی در تعریف ہمدم نام اسپ خاصّہ سواری حضور پرنور..... " پہلی بیت ہے۔

مخلوق تند گر صنع باری — ہمدم صفت اسپے بایں طرّاری

چھوڑیے۔ اگلے ہی شعر میں "پہنائے گا سلیماں خاتم" کہہ کر معاملہ مستقبل پر ٹال دیا۔ ممکن ہے انگوٹھی پہنانے کی کوئی رسم رہی ہو جو شادی کے بعد ادا کی جاتی ہو، ہماری معلومات کے مطابق تو دلہن کو انگوٹھی پہنائی جاتی ہے دولہا کو نہیں، لیکن شعر کا انداز ایسا ہے جیسے دولہا کوئی معمولی شخص ہے اور شادی ہے اس کا رتبہ اتنا بلند ہو گیا ہے کہ سلیماں یعنی بادشاہ اُسے انگوٹھی پہنائے گا لیکن حاشیہ لکھ کر آزاد نے شعر میں جو تھوڑی بہت معنویت تھی وہ بھی ختم کر دی۔ چلیے اس سے بھی درگذر کیجیے اور اس حقیقت پر غور کیجیے کہ اس شعر کے خالق کو اس کا علم نہیں کہ سلیمان شکوہ نوشہ کو انگوٹھی پہنا ہی نہیں سکتے کیوں کہ وہ ۱۲۰۲ھ میں غلام قادر روہیلہ کے مظالم سے تنگ آ کر قلعے کی فصیل سے کود کر نکل گئے تھے اور ۱۲۰۵ھ سے لکھنؤ میں بس گئے تھے۔ مرزا سلیم کی شادی ۱۲۲۵-۲۶ھ کا واقعہ ہے، اور وہ لکھنؤ میں تھے۔ ذوق اگر یہ شعر کہتے تو انھیں اس کا علم ہوتا۔ آزاد نے چوں کہ بہت بعد میں یہ قصیدہ کہا، لہٰذا یہ شعر کہتے ہوئے انھیں یہ بات بھول گئی ورنہ انھیں اس کا علم تھا۔ صرف یہی ایک شعر اس قصیدے کے جعلی ہونے کا واضح ثبوت ہے تاہم کچھ اور اشعار بھی دیکھ لیجیے!

پہنچا ہے خطۂ کوس کا گردوں پہ دماغ — کہ نہیں رکھتا سرِ زمیں اپنا قدم

یا تو خطۂ گردوں پر پہنچا یا دماغ لیکن خطۂ کوس کا دماغ گردوں پر پہنچا کیا معنی؟

کہتا ہر دم ہے یہ نقارچیِ پیرِ فلک — کہ تھا مدت سے دمامہ کا مرے پھولا شکم

سارے ارمان نکالوں گا وہ اس شادی میں — اس کے سینے سے جو نکلیں گے بآوازِ بم

ہر دم نقارچیِ پیرِ فلک کہتا ہے کہ میرے دمامے کا مدت سے شکم پھولا ہوا تھا۔ اول تو نقارچی بھی پیرِ فلک، دمامہ بھی پیرِ فلک۔ چلیے مان لیجیے کہ پیرِ فلک اپنے پیٹ کے دمامے کو بجا کر سارے ارمان نکالے گا لیکن "وہ اس شادی میں" کیا! پھر کیا ارمان بآوازِ بم نکلیں گے یہ چلیے نکلیں گے لیکن کس کے سینے سے!

چوگھڑے روپے کے اور سونے کی تھیلیاں لائیں — صف بہ صف دیکھ کے ان کو پکارا عالم

ہے یہ سلکِ درِ شہوار بگوشِ بہجت — یا کہ نہستی ہے خوشی دانت نکالے پیہم

سونے کی تھیلیاں اور روپے کے چوگھڑے کس لیے؟ غالباً آزاد کے ذہن میں ساچق کا بیان تھا جو یہاں مذکور نہیں۔ آزاد کی مراد اگر تھیلیوں اور چوگھڑوں میں "سے" ہے تو پھر صف بہ صف کس کے لیے ہے؟ "ہے سلکِ درِ شہوار" میں "یہ" کس کی طرف اشارہ ہے؟ پھر بہجت بھی خوشی اور خوشی بھی خوشی، دونوں تشبیہوں میں کیا فرق ہوا؟

ہر سبوچے پہ یہ جوبن ہے کہ جیسے کوئی شوخ — اپنے ابھرے ہوئے پستاں پہ چڑھائے محرم

دیکھ نقلوں کو سبوچوں میں یہ حیراں ہے خلق — کہ بھرے موتیوں سے کیونکر حبابِ لبِ یم

یہ عریانی یا شوخی ذوق کا مزاج نہیں، آزاد نے انھیں شوخی اور رنگینی بخشنے کی کوشش کی ہے۔ ویسے آزاد نے ہر چیز کا ذکر ذوق ہی کے اشعار سے اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ذوق کے یہاں اگر کسی ایک چیز کا ذکر سرسری

درج شعر کہنے کے بعد قصیدے کا رُخ شادی کے مضامین کی طرف مُڑ گیا، چناں چہ آزاد نے کہا۔

آج اُس شاہ کے فرزند کی ہے شادی طوی ۱؎ | کہ شجاعت میں وہ رستم ہے سخا میں حاتم
کون وہ ظلِ خدا ـــــ شاہ محمد اکبر | جس کی ہمت سے ہوں دریوزہ گرا رباب ہمم
شاہ کا پوچھو جو فرزند تو شہزادہ سلیم | ہو سلامت روی اس کی بہ سلامت منعم

یہ قصیدہ انشا کے مشہور قصیدے کی زمین میں ہے جو انھوں نے سعادت علی خاں کے جشن جلوس کے موقع پر کہا تھا۔ اس میں انشا نے کئی زبانوں میں شعر کہے ہیں۔ آزاد نے اگرچہ کئی زبانوں میں شعر نہیں کہے تاہم کئی اشعار میں عربی ٹکڑے یا پورے پورے فارسی مصرعے انشا کے اثر پر دلالت کرتے ہیں۔ اور بھی کچھ ایسی باتیں ہیں جن سے انشا کا اثر نمایاں ہے۔ علاوہ ازیں خود ذوق کے قصائد سے بھی کسبِ فیض کیا گیا ہے بعض اشعار، ذوق کے اشعار کا چربا معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً ذوق کا ایک شعر ہے:

اس قدر سازِ طرب سازی کی آواز بلند | چھیڑیں گر تار کھرج کا تو ہو پیدا دھیوت

آزاد نے اِس کا چربا یوں اُڑایا ہے:

لو گے جس سازِ خدا ساز کو آغوش میں آج | تار چھیڑو گے کھرج کا تو سنو گے پنچم

ذوق کے شعر میں کھرج سے دھیوت پیدا ہونے کا سبب موجود ہے، آزاد نے اس کی پروا نہیں کی لہٰذا شعر مہمل ہو گیا ہے۔ بہرحال ہم چند بے ربط و مہمل اشعار کی نشاندہی کر کے اگلے قصیدے کا تجزیہ پیش کریں گے۔ قارئین کرام اگر چاہیں تو پورا قصیدہ ملاحظہ فرما کر ہمارے قول کی تصدیق کر سکتے ہیں: ؎

بزم شرف کی طرف کرتا ہے جو نظارہ | پڑھتا یہ مطلعِ رنگیں ہے وہ ہو کر خرم (بزم کی طرف نظارہ؟)
ہے اٹھا عیش کا طوفاں لبِ ساحلِ یم | زمزمہ موج کا بر ربط سے ہوا ہے ہم دم

مصرعِ ثانی کا "موج" تو خیر موج ہو گا لیکن یہ "لبِ ساحلِ یم" کیا ہے اور موج کا زمزمہ بربط سے کیسے ہمدم ہوا ہے؟

جن مزامیر کو ہم سنتے تھے واعظ کو حرام | وجد میں آئیں سنیں آج گر آہوئے حرم

"آہوئے حرم" کو تو حرام پہلے بھی نہیں تھے، واعظ کو حرام تھے، وہ اب بھی ہیں۔ آخر اس شعر کا مطلب کیا ہے؟ اگر واعظ کو حرام تھے تو آہوئے حرم کو وجد میں لانے کی کیا ضرورت تھی، خود واعظ کیوں وجد میں نہ آئیں؟

یہ چڑھاوے کی ہے کثرت کہ جڑے ہیں ہر صبح | دگدگی پر گل داؤدی کے ہیرے شبنم
اللہ اللہ رے نوشہ ترا عالی رتبہ | جس کی انگلی میں پنہائے گا سلیمان ۲؎ خاتم

یہ دونوں شعر اور حاشیہ غور طلب ہے۔ شروع میں ہے کہ آج اُس شاہ کے فرزند کی ہے شادی طوی، چڑھاوا ابھی اُسی دن ہو گا ہر صبح دگدگی پر ہیرے جڑنے کی کیا ضرورت ہے، پھر دگدگی ایک اور اتنے ہیرے! خیر

۲؎ مرزا سلیمان شکوہ اکبر شاہ کے بھائی تھے۔

لکھتے ہیں :

شہا ہے آج اُسی شاہزادے کی شادی   جہاں میں جو ہے جہانگیر شاہ نیک اطوار

اس قصیدے پر حصّہ اوّل میں خاصی بحث ہو چکی ہے ۔ ۱۲۲۵ھ ذوقؔ کی شاعری کا ابتدائی زمانہ ہے ۔ اُن کی رسائی نہ دربارِ ولی عہدی میں ہوئی تھی اور نہ دربار شاہی میں ۔

قصیدہ ۸۸ اور ۸۹ دونوں مرزا سلیم کی شادی کی تہنیت میں ہیں ۔ یہ قصیدے کہتے وقت آزادؔ کو اپنا پرانا بیان بھول گیا جس میں انھوں نے ذوقؔ کی زبانی کہلوایا تھا کہ " مرزا سلیم کی شادی میں ایک مثنوی ہم نے لکھی تھی " آبِ حیات کی تصنیف کے وقت آزادؔ کو چوں کہ یہ خیال تھا کہ ذوقؔ نے صنفِ مثنوی کو ہاتھ نہیں لگایا اس لیے ذوقؔ کی زبانی مثنوی کا ذکر کر کے گویا یہ کمی پوری کر دی ۔ لیکن جب دیوان مرتّب کرنے بیٹھے تو معلوم ہوا کہ صنفِ مثنوی میں " نامۂ جانسوز " موجود ہے جس میں کل ۴۰ شعر تھے ۔ آزادؔ نے " کل پانسو سے اوپر اشعار بتلائے لیکن اضافہ صرف آٹھ شعروں کا کر سکے ۔ چلیے خانہ پُری تو ہو گئی ۔ دوسری طرف ذوقؔ خاقانیِ ہند کہلائے [یہ معما اب تک نہیں کھلا کہ ذوقؔ کو خاقانیِ ہند کا خطاب کب اور کس سے ملا ؟ ہمارا خیال ہے کہ یہ عوام کا عطیہ ہے ۔ گلشنِ بے خار میں جو معروف بہ خاقانیِ ہند کہا ہے اس کا مطلب یہی ہے ۔ ممکن ہے کہ ایامِ ولی عہدی میں ظفرؔ کے منہ سے اپنے مادح اور اُستاد کی تعریف میں " خاقانیِ ہند " کا فقرہ نکل گیا ہو ۔ لیکن جب وہ بادشاہ ہوئے تو ایک قصیدے کے صلے میں سلطان الشعرا کا خطاب عطا فرمایا جو ملک الشعرا ہو کر مشہور ہوا ۔ اکبر شاہ کے دربار میں اُن کی حاضری یا خطاب یابی کا کوئی ثبوت نہیں ۔ اگر اکبر شاہ نے انھیں خطاب دیا ہوتا تو کسی نہ کسی تذکرے میں اس کا ذکر ضرور ملتا ، اور شیفتہؔ انھیں محض معروف بہ خاقانیِ ہند نہ لکھتے] صہبائیؔ نے البتہ انتخاب دواوین میں لکھا ہے :

ذوقؔ تخلص شیخ محمد ابراہیم نام دہلوی خطاب خاقانیِ ہندی بیس برس کے عرصہ سے ملازم درگاہ حالتِ ولی عہدی سے شاہ حال دہلوی کے ہیں ...... " خاقانی کی شہرت کا دار و مدار قصیدہ گوئی پر ہے آزادؔ نے دیوان دیکھے تو انھیں محض دس بارہ قصیدے ملے ۔ اُن میں تین کسی قابل تھے ، اور وہی مشہور بھی ہوئے ۔ آزادؔ نے شہرت کی بنیادِ تعدادِ قصائد کو سمجھا چناں چہ تعداد میں اضافہ ضروری ٹھہرا ۔ چوں کہ وہ اُنیس برس کی عمر سے نہ صرف ذوقؔ کو دربارِ ولی عہدی میں پہنچا چکے تھے بلکہ اُسی عمر میں انھیں خاقانیِ ہند بھی بنوا چکے تھے ، اس امر سے ضرور پریشان ہوئے ہوں گے کہ یہ اکبر شاہ کا دور ہے اور اکبر شاہ کی مدح میں ذوقؔ کا کوئی قصیدہ موجود نہیں ۔ چنانچہ انھوں نے " اُستاد کے قصائد کو سامنے رکھا اور انھیں کے بیشتر مضامین کو نقل کیا ۔ کچھ سوداؔ اور انشاؔ کے کلام سے مدد لی اور جتنے قصیدے اُستاد نے کہے تھے کم و بیش اتنے ہی قصیدے تصنیف کیے اور " اُستاد " کو بخش دیے ۔ چناں چہ ترتیبِ دیوان کے وقت یہ بھول کر کہ شہزادہ سلیم کی شادی کے موقع پر وہ ذوقؔ سے ایک مثنوی منسوب کر چکے ہیں ، اُنھوں نے دو قصیدے کہے ۔ اُن میں پہلے " ۸۸ " میں شادی کی وضاحت نہیں ہے صرف اتنا لکھا ہے : " اکبر شاہ مرحوم کی مدح میں ہے ۔ عالمِ شباب کا کلام اور نظرِ ثانی سے محروم ہے " البتہ ایک

۱۵۔ یہ زہرِ غم چڑھا ہے کہ سبزہ بزیرِ زلف — سوجھے ہے یوں کہ زہر کی تھا یہ بلا گرہ

۱۶۔ میں دل گرفتہ آہ اگر کارواں میں ہوں — حیرت سے اینٹھ کر ہو زبانِ درا گرہ

۱۷۔ رویا میں شکلِ شیشہ کبھی کھول کر نہ دل — میرے گلو میں گریہ ہمیشہ رہا گرہ

۱۸۔ دل بستگی کا اپنے قلم بند کر کے حال — باندھو پہ مرغِ دل کے اگر دوں لگا گرہ

۱۹۔ کھائیں کبوتران گرہ باز کی طرح — سینے سے آن کر سرِ دوش ہوا گرہ

[یہ دونوں شعر قطعہ بند معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ نہیں کھلتا کہ "سرِ دوش ہوا" کون گرہ کھائیں گے؟ ان تو دلبستگی، جسے دل گرفتگی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، کا حال لکھا گیا۔ پھر مرغِ دل کے بازو پر گرہ لگائی گئی۔ گرہ بھی واحد اور حال بھی۔ ہے یہ کہ آزاد ایک لفظ کے ساتھ اس کی ساری صفات کو فرض کر کے شعر کو دیتے ہیں لیکن اس پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ اس کا استعمال مناسب ہے یا نہیں۔ چوں کہ مرغِ دل کے بازو پر دل بستگی کا حال لکھ کر باندھا گیا تھا اس لیے آزاد حال، دل بستگی، بازو سب بھول گئے، انھیں صرف مرغ یاد رہا۔ اور مثال میں چوں کہ کبوتران گرہ باز تھا، اس لیے سرِ دوش ہوا، گرہ کھائیں، باندھ دیا۔ اِس طرح کی مثالیں ان کے ہاں اور بھی بہت ہیں]

۲۰۔ وہ دل گرفتہ ہوں کہ اگر نکلے پاس سے — جوں غنچہ ہو رہوں بہ جبینِ صبا گرہ

غرض کہاں تک شعر نقل کیے جائیں۔ اسی طرح اٹھی شعروں میں جا و بے جا گرہیں لگاتے چلے گئے ہیں تیسرے، چھٹے، آٹھویں، دسویں، بارھویں، سولھویں، سترھویں اور بیسویں یعنی آدھے شعروں میں دل گرفتگی کا ذکر ہے اور آگے بھی کئی مرتبہ یہی مضمون بندھا ہے لیکن شاذ ہی کہیں سلیقے سے بندھا ہو۔ بے ربطی مضامین سے قطع نظر بے سروپائی بھی قابلِ توجہ ہے۔ مثلاً ۱۱ویں شعر میں بجائے خون کے "خوں بہا" کو گرہ کیا ہے۔ اسی طرح ۲۳ویں شعر میں بجائے ماہ کے ماہرو کو گنا دیا ہے، ملاحظہ ہو!

گھٹنا نا ماہرو کا ہے کبتا کر دیکھو — قینچی کی طرح کٹے ہے چرخ دوتا گرہ

مزید تفصیل کی گنجائش نہیں۔ مختصر یہ ہے کہ ذوق کے کلام میں اس طرح کی بے ربطی و بے سروپائی نہیں ملتی۔ البتہ آزاد کے تخیلِ فلک سیر سے کچھ بعید نہیں۔

قصیدہ ۱۱: "اس قصیدہ پر بھی نظرِ ثانی نہیں ہوئی۔ اکبر شاہ مرحوم کی تعریف میں ہے" مطلع ہے:

قلم جو صفحۂ کاغذ پہ ہووے نکتہ نگار — تو اپنے نقش مشادیں جہاں کے جادوکار

اس قصیدے سے متعلق ہمیں کچھ زیادہ نہیں کہنا سوائے اس کے کہ نوٹ میں محض "اکبر شاہ مرحوم کی مدح میں ہے" لکھا ہے، آخر میں جا کر کھلتا ہے کہ یہ شہزادہ مرزا جہانگیر کی شادی کی تہنیت کا قصیدہ ہے جسے آزاد جہانگیر شاہ

آزاد کے ہاں شکوہ وشکایت کی لے اکثر زار نالی اور گداگری تک پہنچ جاتی ہے۔ پھر ان کی تشبیہوں میں استقلال نہیں ملتا۔ ایک شعر میں زار نالی ہے تو دوسرے میں خوشی کا پہلو نکلتا ہے اور آزاد کو اِس تضاد کا احساس تک نہیں ہوتا [یہ غزل کی ریزہ خیالی بھی نہیں ہے] اُن میں چشمِ امتیاز کی بھی کمی معلوم ہوتی ہے۔ وہ مدح کے مضامین کے لیے الفاظ کا موزوں ح مناسب انتخاب نہیں کر پاتے۔ مضمون کی تکرار بھی اُن کے ہاں بہت ہوتی ہے۔ وہ ایک ہی بات کو بار بار کہتے ہیں لیکن زبان وبیان میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔ اس لیے یہ تکرار قاری کو مکدّر کر دیتی ہے۔

اب قصیدہ ۶۰ کی تشبیب کے کچھ شعر دیکھیے:

۱۔ گردش میں چشمِ مست کی ہو دل مرا گرہ ۔۔۔ اور کھولے ہائے دانہ کی یوں آسیا گرہ

[چشمِ مست بے محل ہے۔ پھر چشمِ مست کی گردش میں "دل کیسے گرہ ہوگا؟ مصرع مہمل ہے]

۲۔ سینہ میں اگر دل نہ گرہ تھا تو کس لیے ۔۔۔ ہر اشک میری آنکھ سے ہو کر گرا گرہ

۳۔ اپنا دل شگفتہ چمن میں نہ وا ہوا ۔۔۔ غنچہ ہزار جا پہ کھلا اور ہوا گرہ

[جب غنچہ کھل ہی گیا تھا تو پھر گرہ کیونکر ہوا؟ مراد نئے غنچے نکلنے سے ہے]

۴۔ چلتا نہیں ہے پنجۂ مژگاں کا کچھ عمل ۔۔۔ ہے ایسی چشم ترے بہم آشنا گرہ [؟]

۵۔ قمری ہے لائی چاک گریباں چمن میں آہ ۔۔۔ لے سرو گل سے دے سرِ بند قبا گرہ

[مطلب کیا ہے؟ قمری طوقِ گردن کے لیے تو مشہور ہے گریباں چاک کے لیے نہیں۔ پھر سرو سربند قبا گل سے گرہ دے کر گریبان کو کیونکر سیے گا؟]

۶۔ ہوں وہ گرفتہ دل کہ نزرِ پر ہجوم اشک ۔۔۔ ہوتا ہے شکلِ خوشۂ انگور آ گرہ

۷۔ میں مجمرِ فنا میں ہوں کیا دانۂ سپند ۔۔۔ کھولے ہے کار بستہ کی میری صدا گرہ

۸۔ تصویرِ غنچہ ہوں چمنِ روزگار میں ۔۔۔ وا کر سکے گی میری بھلا کیا صبا گرہ

۹۔ مرقد پہ میرے طرّۂ شمشاد کی طرح ۔۔۔ پھوٹے گی نخلِ شمع میں بھی جابجا گرہ

۱۰۔ آیا ہوں میں سرشت میں لے کر گرفتگی ۔۔۔ ہوویں گے استخواں بگولے ہما گرہ

۱۱۔ رہوے گا شکلِ دستِ حنا بستہ حشر تک ۔۔۔ قاتل کے دست و دل میں مرا خوں بہا گرہ

[قاتل کے ہاتھ پر یا ہاتھ اور دل میں؟ خون جم کر گرہ ہو جائے گا یا خون بہا گرہ رہے گا؟]

۱۲۔ گر میں گرفتہ دل ہوں تو جوں دانۂ انار ۔۔۔ محفل میں ہوگا خندۂ دنداں نما گرہ

۱۳۔ ہیں عکس اپنا دل تو ہو جوہرے آئینہ ۔۔۔ جوں دام موج وشکلِ خطِ بوریا گرہ

[بھلا خط کیوں کر گرہ ہو سکتا ہے۔ جوہر بھی خط سے مشابہ اور خطِ بوریا بھی سیدھی لکیر۔ انھیں گرہ کہنا کہاں تک مناسب ہے؟]

۱۴۔ عکسِ دلِ فسردہ سے مینائے بزم مے ۔۔۔ رہ جائے شکلِ دانۂ انگور کھا گرہ [مینائے بزم مے؟]

اور اُس کے بعد ہو کہنا کہ نام پاک ہے وہ ― جسے نمازوں میں لیتے ہیں سب پکار پکار

[اکبر شاہ کی مدح میں صرف ایک شعر نسخۂ دیوان میں ملتا ہے یہ اسی کا بھونڈا چربا ہے۔

نام کو اللہ اکبر کیا ترے توقیر ہے ― داخل ہر بانگ ہے شامل بہ ہر تکبیر ہے]

خدا کا سایہ ہے اور نائب رسول خدا ― محمد اکبر عالم نواز و عرش وقار

[صرف نام بتانے کے لیے آزاد کے سات شعر صرف کیے ہیں اور پھر بھی ڈھنگ سے نام نہیں لیا۔ خیر اور دیکھیے]

کون وہ ظل خدا۔ شاہ محمد اکبر ― جس کی ہمت سے ہوں دریوزہ گر ارباب ہمم

پھر تو کر غور کہ مداح ہے کس شاہ کا تو ― دیکھ وہ ابر کرم قلزم جوُد و احساں

وہ شہنشاہ کہ جشن اس کا ہی افلاک کی سیر ― بنتے مہوش ہیں تو کرتے ہیں ستارے افشاں

ماہ گردوں پہ ہے اور کے زمیں پر مہتاب ― کثرت عیش سے دریا میں ہے شب کو قصاں

سن کے یہ مژدۂ جاں بخش ہر اک گویاں تک ― شوق نظارہ ہوا عام بہ گلزار جہاں

دیکھتا ہوں کہ سر شاخ مژہ کاسۂ چشم ― رخ نظارگیاں پر ہے بنا نرگس واں

[آنکھ مژگاں کے پیچھے ہوتی ہے یعنی مژگاں کو سر چشم تو کہہ سکتے ہیں لیکن چشم کے کاسے کو سر شاخ مژگاں رکھنا عجب الٹی بات ہے]

آج عالم کا ہے دل شاد کہ جوں عالم نور ― جلوہ گر ہے سر اورنگ بصد شوکت و شاں

او فرخندہ لقب شاہ محمد اکبر ― تاج شاہان زماں فخر سلاطین جہاں

[یہاں بھی محض نام بتانے کے لیے سات شعر صرف ہوئے ہیں]

مداح ہوں میں اس کا کہ ہے جس کے دور میں ― شیب زمانہ کے لیے کیفیت شباب

پیر فلک بنے ہے جوان سیاہ مست ― ریش شعاع مہر پہ ہے ابر سے خضاب

مانند ناف آہو اگر جام میں ہو خوں ― اس کی شمیم فیض سے ہو جائے مشک ناب

اُس شاہ کے نم کرم و بوئے خُلق سے ― ہر خار بن ہو ہمسر فوارۂ گلاب

وہ بادشاہ جس کا نہاد و نشیہ اسم پاک ― ہے دُر جک زمانہ کا یکتا و خوش آب

بہرحال، یہ تو ضمناً ایک خصوصیت کا ذکر نکل آیا۔ اب واپس چلیں اکبر شاہ کی مدح کے قصیدے کی طرف۔ مندرجہ بالا تشبیب کے بعد مدح شروع ہوتی ہے جو ۳۲ شعروں پر پھیلی ہوئی ہے اُس میں ایک سے ایک عجیب اور مہمل شعر ہے۔ مزید مثالیں بے جا تطویل کا باعث ہوں گی۔ قارئین خود ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

قصیدہ ۷ ۰ اِس قصیدے پر بھی نظر ثانی نہیں ہوئی۔ اکبر شاہ مرحوم کی مدح میں ہے؛
ذوقؔ کے قصائد کی تشبیب میں تنوع کے باوجود مضامین موقع کی مناسبت سے ہوتے ہیں۔ ان میں مسرت و انبساط اور رجائیت کا پہلو ہوتا ہے۔ شکوہ و شکایت میں بھی ان کے یہاں رونا دھونا اور انداز گداگری نہیں ملتا۔

[یہ یکایک بزمِ خسرو اور باربَد بزمِ سخن کا ذکر کہاں سے نکل آیا؟ یہ گریز کا شعر ہے۔ یہاں نہ یہ بتایا گیا ہے کہ کس خسرو کی بزم میں جاتا ہے اور نہ ہی یہ بتایا ہے کہ یہ باربَد بزمِ سخن کون ہے۔ شاعر اس مقام پر اپنے سے خطاب کرتے ہیں۔ یہاں ایک تیسرے شخص سے خطاب کیا جا رہا ہے۔ جو کوئی مشّاق قصیدہ گو نہیں کرے گا۔ اس کے بعد تین شعر اِس باربَد کی تعریف میں ہیں اور اُن میں بھی اُس کی شخصیت نہیں کھلتی۔ اس کے ساتھ ہی اُسے یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ مدح کے زمزمے لکھے، ملاحظہ ہو]

تیرا قانون ترے پاس خطِ مسطر ہے — چھیڑ دے زابل و نیریز و خراسان و عراق

[قانون اور اُصول تبلے کو کہتے ہیں۔ چوں کہ ایک نغمہ سرا کو مشورہ دیا جا رہا ہے اس لیے قانون کا ذکر کیا لیکن بظاہر تبلے اور خطِ مسطر میں کوئی مشابہت نہیں۔ پھر صرف ایک خطِ مسطر قانون ہے یا خود مسطر؟]

تیرے نغمے ترے مضمون ہیں یہ شہنائے قلم — دم کشی پر ہے سرِ دست کمربستہ وچاق

[اوّل تو دم کشی کیا؟ خاموش رہنا یا سانس کھینچنا۔ پھر دم کشی پر کون کمربستہ وچاق ہے؟ پہلے مصرعے میں تو مضامین اشعار کو نغمے کہا گیا ہے جو شہنائے قلم سے وجود میں آتے ہیں]

زمزمۂ مدح کے لکھ اس کی جسے کہتے ہیں، — نائبِ ختمِ رُسل ظلِّ خدائے خلّاق

[اس شعر میں ذوق کے اِس شعر کا عکس صاف دیکھا جا سکتا ہے:

روزِ جشن آج ہے اس کا کہ جسے کہتی ہے خلق — نائبِ ختمِ رُسل ظلِّ خدائے مُتعال]

کون وہ یعنی شہنشاہ محمد اکبر — دستِ بخشش سے خجل جس کے ہو بحرِ آفاق

ممدوح کو متعارف کرنے کا یہ انداز، خالص آزاد کا انداز ہے۔ ذوق کے سارے مصدّقہ قصائد دیکھ جائیے، ہر جگہ براہِ راست ممدوح کا نام لیا گیا ہے لیکن آزاد کے مصنّفہ بیشتر قصائد میں یہی انداز ہے۔ یعنی وہ کون؟ اور پھر نام لیتے ہیں اور وہ بھی اکثر درست نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ ممدوح کا نام لیتے ہی آزاد "بخشش" شروع کر دیتے ہیں یعنی بادشاہ کی سخاوت کی تعریف اور بالواسطہ حسنِ طلب، اور اس میں کئی اشعار صرف کرتے ہیں جو ذوق کے قصائد میں کہیں نہیں۔ مثلاً ایک شعر تو اوپر نقل ہوا، کچھ اور مثالیں یہ ہیں:

۲۔ کون وہ یعنی محمد شاہ اکبر دیں پناہ — نیک صورت نیک سیرت نیک طالع نیک نام

۳۔ وہ کون یعنی اکبر ثانی کہ جس نے وا — تیرے بھی کام دل سے ہے کی بارہا گرہ

۴۔ لے آیا حسنِ مقدر اس آستاں پہ مجھے — کہ سجدہ کرتے ہیں جھک جھک کے جس پہ پیل نہا

سحابِ جود ہے اُس کے زمانہ گلشن ہے — نہالِ ابرِ کرم اس کے ہیں صغار و کبار

یہ سُن کے مجھ سے کہا طبع نے کہ اے ناداں — کچھ اس کے نام کی تصریح بھی تو ہے درکار

ہے اُس کے نام کا لینا بھی یوں تو بے ادبی[!؟] — کہ چشمہ پاس نہ دریا نہ ابر دریا بار

سو میں زباں کو گیا لے کے دل کے دریا میں — مذاقِ آب گہر میں ہلا لیا کئی بار

(اگر کس بجنے سے تو پل میں بدر اور پل میں ہلال نظر آتا تھا؟ خدمت دائرہ داری تھی یا شعبدہ بازی؟)

اس کا طنبور جو دیتا تھا سُروں کو ثبات — جرم خورشید سے ہوتی تھیں شعائیں اشراق
تیر گردوں کا خوشی سے تھا جو دل لہراتا — دیکھئے ترتیب ثریا کو باقسام ایاق
جلترنگ ایسی بجاتا تھا کہ سب دیدنی تھی — بعتان فلکی صورت ابل اوراق

(کون جلترنگ بجاتا تھا؟ تیر گردوں! ایک تیر سے جل ترنگ کا بجنا معلوم۔ کم از کم دو تیر تو ہوتے۔

نظر آجاتا تھا گر اختر دُمدار کوئی — دیتا مریخ دم تیغ سے اس کو الحاق (کذا)

(یہ دُمدار ستارہ کہاں سے نکل آیا؟ اور اگر نظر آ بھی جاتا تھا تو مریخ کو اس سے کیا دشمنی تھی؟)

ہاتھ پھر مار کے چورنگ کا اک پھرتی سے — دم میں تھا اپنے طپنچہ پہ چڑھاتا چقماق

(معلوم ہوتا ہے آزاد اپنی معلومات کا مظاہرہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں ورنہ مریخ بیچارے کے پاس نہ تیغ نہ طپنچہ اگر مریخ تیغ ہے تو طپنچہ کون ہے؟)

جو چلا پارۂ تن اس کا سوئے عالم خاک — یہ اڑا اس پہ تڑاقا وہ اڑا اس پر تڑاق

(تڑاقا و تڑاق کے صوتی آہنگ کے علاوہ اس شعر میں کیا ہے؟ بیچارے اختر دُمدار کا آدھا جسم تو کٹ کر سوئے عالم خاک چل دیا پھر اس پہ تڑاقا کون اڑا اور اس پر تڑاق کا تعلق کس سے ہے؟ اس تڑاق پڑاق کے بعد یہ معاملات حسن و عشق کتنے بے جوڑ لگتے ہیں):

سعدِ اکبر کہ جسے کہتے ہیں قاضی فلک — حسن کو عشق سے دیتا تھا بہم ربط وفاق
ہوتا زاہد بھی تھا آمادۂ دامادی — زال دنیا کو جو تھا بیٹھ رہا دے کے طلاق

(اول تو یہ حضرت زاہد فلک پر پہنچے کیونکر؟ اور اگر پہنچ ہی گئے تھے تو کس کی دامادی کے لیے آمادہ ہوتے تھے؟)

چرخ ہفتم پہ فلک ہے تو بطی الحرکت — عالم خاک میں پر ہے تنگ و دو کا مشتاق (کذا)

(چرخ ہفتم پہ فلک؟)

نغمۂ تفریح سے پُر یاد ہے گردوں کا شکم — لیکن اس وقت میں تنقیہ بہت اس کو ہے شاق (کیوں؟)
بے جوہر کوچہ میں آرائش نوبت خانہ — خالی آواز دمامہ سے نہ ہو کوئی رواق (؟)
یوں جو آراستہ افلاک پہ ہو بزم طرب — گلشن عیش و طرب کیوں نہ ہو بزم آفاق
آج وہ روز ہمایوں ہے جسے کہتے ہیں عید — بذلہ سنجی میں شگفتہ ہے دلِ اہلِ مذاق

(ان دو شعروں میں عجب الٹی بات کہی گئی ہے۔ پہلے افلاک پر بزم طرب سجی ہے جس کی کوئی تقریب نہیں اُسے دیکھ کر گلشن آفاق یعنی دنیا بھی بزم عیش و طرب ہو گئی ہے اور یہ اس لیے ہے کہ عید کا روز ہے۔ عید کی خوشیوں کے اظہار کے لیے آزاد کو سوائے بذلہ سنجی کے کوئی بات نہیں سوجھی حالاں کہ افلاک پر کئی محفلیں سجا چکے ہیں۔)

بزم خسرو میں چل اے یار بہ بزم سخن — سب یہ کہتے ہیں کہ تو نکتہ سرائی میں ہے طاق

چمک اس برقِ جہاں کی ہو بیاں کیا کہ اگر — اُفقِ طبع پہ دکھلائے فروغ اِسراق (؟ اشراق)
شعلۂ رنگِ حنا کر کے اڑا دیوے ابھی — قفسِ دل میں جو ہیں بند طیورِ اشواق

جب طیورِ اشواق قفسِ دل میں بند تھے تو قفس کا در کھول کر اڑا دینا ہی کافی ہوتا، شعلۂ رنگِ حنا میں ان کی قلبِ ماہیت کی کیا ضرورت تھی ؛ خیر، معلوم ہوتا ہے یہ تین شعر کہتے کہتے مولانا بھول گئے کہ ان کا فکرِ فلک سیر انھیں صبح دم عرش پر اڑائے گیا تھا، ورنہ چوتھے شعر میں یہ نہ کہتے :

رات مجھ کو یہ فلک گر وہاں لے کے گیا — کہ معقولِ عقلا کی تھی جہاں طاقت طاق

غالباً ایسا ہی تھا۔ اگر عقولِ عقلا کی طاقت طاق نہ ہوتی تو یہ معجزہ کیونکر رونما ہوتا ۔

فلسفی دہر کے جو جو تھے ہوئے مشائیں — نورِ اشراق سے تھے ہو گئے سب اہلِ رواق

بھلا مشائین یا اشراقیوں کو رواقیوں سے کیا تعلق ؟ یہ دونوں فلسفے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ آخر مشائین کس معجزے کے تحت رواقی ہو گئے ؟ اگر اشراق اہلِ رواق اور مشائیں کو فلاسفہ سے ہٹ کر لغوی معنی میں بھی لیا جائے تو بھی بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ ہے یہ کہ ذوق کے ایک آدھ شعر میں اشراقیوں کا نام آگیا ہے۔ اسی پر آزاد نے انھیں فلسفی یا فلسفہ دان بنانے کی بنیاد رکھی ہے۔ ذوق کی فلسفے سے اس قدر دلچسپی کا کوئی ثبوت نہیں ملتا جو آزاد کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے :

”خصوصاً تصوف میں ایک عالمِ خاص تھا کہ وحدتِ وجود وحدتِ شہود میں علمِ اشراق کا پرتو دے کر کبھی ابوسعید ابوالخیر تھے کبھی محی الدین عربی۔ پھر جو کہتے کانٹے کی تول کہتے تھے کہ دل پر نقش ہو جاتا تھا۔“

یہ آزاد کی اپنی دلچسپی ہے جو انھوں نے ذوق کو بخش دی۔ وحدتِ وجود اور وحدتِ شہود میں علمِ اشراق کا پرتو دینا یعنی چہ؟ معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کو اشراق سے دلچسپی ضرور تھی لیکن اشراقی فلسفہ غالباً ان کی سمجھ میں کبھی نہیں آیا۔ اس کا ثبوت آزاد کی آخر عمر اور عالمِ جنوں کی تصانیف میں دیکھا جا سکتا ہے جہاں وہ اپنے مرشد سے اشراقی فلسفے پر سوال جواب کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں یہ بھی نظر میں رہے کہ بات آسمان کی ہو رہی ہے اور یکایک دہر کے فلسفیوں کا ذکر نکل آیا۔ اگلے شعر سے پھر آسمان کا قصہ چھڑ گیا ہے لیکن ان میں نہ کوئی ربط ہے نہ تعلق۔ مضامین بھی عجیب و غریب ہیں۔ اکثر شعر مہمل ہیں۔ اس پر لطیفہ یہ کہ بات فلسفے کی ہو رہی تھی کہ یکایک موسیقی کا تلازمہ شروع ہو گیا، چند شعر دیکھیے اندازا ہو جائے گا :

”تھی تعب کی نہ جا بارِ جلالت سے ہو گر — حرکتِ چرخِ گراں بار کی قطبین پہ شاق
انجمِ ثابت و سیار سعادت سے بہم — یوں نظر آئے کہ جوں دستِ و بغلِ اہلِ وفاق
نجمِ ناہید۔ لقب جس کا ہے رقاصِ فلک — تھا چپ و راست پہ آہنگ ربابِ عشاق
بدر تھا پل میں قمر پل میں نظر آتا ہلال — خدمتِ دائرہ داری میں تھا ہر رنگ سے طاق“

(کذا۔ خط کشیدہ الفاظ توجہ طلب ہیں)

تاکہ فروری، مارچ، آب۔ ایلول، اپریل　　ماہ شمسی ہو مطابق ہر ولایت میں مدام
یا رب اُس کا رتبۂ عالی ہمیشہ ہو فزوں　　دولت اس کی ہو کنیز، اقبال ہو اُس کا غلام

قاعدے سے قصیدہ یہیں ختم ہو جانا چاہیے تھا کہ یہی اس کا نقطۂ عروج یا کلائمکس ہے، لیکن آزاد اچھے ڈراما نگار نہیں تھے۔ لہٰذا اب اینٹی کلائمکس شروع ہوتا ہے اور مندرجہ بالا شعر کے بعد بے فصل اچانک ہم اس شعر سے دوچار ہوتے ہیں۔

کون وہ یعنی محمد شاہ اکبر دیں پناہ　　نیک صورت نیک سیرت نیک طالع نیک نام

(قصیدہ محمد شاہ کی مدح میں ہے یا اکبر شاہ کی مدح میں؟) اس کے بعد ۲۸ مہمل شعر مدح کے حامل ہیں جن میں زبان و بیان کی غلطیاں بھی ہیں اور داستانی فضا بھی جو انشا کی کچھ غزلوں میں ملتی ہے۔ یوں بھی یہ قصیدہ انشا کے اس قصیدے کی زمین ہے جو اس علی خاں کی مدح میں ہے اور جسے انشا نے "آنا قصیدہ" کہا ہے۔ ہاتھی وغیرہ کی تعریف میں جو اشعار ہیں، ان میں سے چند میں انشا اور سودا کے اشعار کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا قصیدے کی تشبیب دعائیہ ہے، اس لیے اسے دعا پر ہی ختم ہو جانا چاہیے تھا لیکن آزاد ان تین اشعار سے مطمئن نہیں ہوئے اور آخر میں ذوق کے نام اور انداز سے یہ دو شعر ٹانک دیے ہیں:

تہنیت کو ہے دعا پر ذوق کرتا مختصر　　ہو مبارک تجھ کو عیش و طرب عید صیام
جو کہ ہوں بدخواہ وہ ناشاد اور غمگیں رہیں　　اور ہوا خواہوں کے دل ہو دیں ہمیشہ شادکام

عنوان میں ایام طالب علمی کی تصنیف کی بات کہی گئی ہے اور کہ اکبر شاہ مرحوم کی مدح میں ہے۔ مقطعے میں آکر معلوم ہوا کہ عید صیام کی تہنیت میں ہے (آزاد اکثر ایسا ہی کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ شاہزادہ جہانگیر کی شادی کے موقع پر کہے گئے قصیدے کے بھی آخر میں شادی کی تہنیت کی بات کھلتی ہے) اسے ذوق کا کلام کہنے والوں سے گزارش ہے کہ وہ اس قصیدے کو ایک بار اوّل تا آخر پڑھ کر دیکھیں۔ اشعار کی بے ربطی اور مہملیت پر بھی غور کریں اور اس کا فیصلہ کریں کہ یہ کلام کس کا ہے؟ ہم نے کچھ حقائق پیش کر دیے ہیں۔ زبان و بیان کی وہ خوبیاں یا خامیاں جو آزاد سے منسوب ہیں، ان کا ذکر ہم نے نہیں کیا۔ قارئین کرام خود ملاحظہ فرمالیں۔

قصیدہ مشہ "افسوس کہ نظر ثانی سے نور نہ پایا"
۲۴ ویں شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر شاہ ثانی کی مدح میں ہے ۔

کون وہ یعنی شہنشاہ محمد اکبر　　دست بخشش سے مخجل جس کے ہے بحر آفاق

اس کی تشبیب اجرام فلکی سے متعلق ہے اگرچہ اسے علم نجوم سے نسبت نہیں دی جا سکتی۔ آغاز میں کہا ہے کہ مجھے میرا تخیل ایسی جگہ لے گیا جہاں عقول عقلا کی طاقت تھی، لیکن ابتدائی چار اشعار ہی سے بے ربطی عیاں ہو گئی ہے، ملاحظہ ہو:

صبح دم فکر جو تھا سیر فلک کا مشتاق　　عرش پر آ گیا اک آن میں مانند براق

اب جب کہ فکر فلک سیر عرش پر آ گیا تھا تو وہاں اپنی کارگزاری دکھاتا، لیکن یہاں عالم یہ ہے:

اِس شعر میں کوئی خامی تو نہیں لیکن ذوق سے اِس کا انتساب ذرا مشکوک ہے۔ ۱۹۰۹ء – ۱۸۱۰ء (اندازاً ذوق کا زمانۂ طالب علمی) میں تو قوسِ قزح کو شیطان کی کمان سمجھا جاتا تھا۔ اُس کی یہ سائنسی توضیح آزاد کے دَور کے عام تصورات ہو سکتے ہیں (انگریزوں اور انگریزی تعلیم کے اثر سے)۔ ذوق کو سائنس کے جدید تصوّرات سے اتنی دلچسپی تھی، کہنا مشکل ہے۔ آزاد کو البتہ ہر نئی چیز سے دلچسپی تھی۔ لہٰذا اُن کو یقیناً علم ہوگا کہ جب سورج کی کرن بارش کے قطرے سے گزرتی ہے تو اُس کے رنگ الگ الگ منعکس ہو جاتے ہیں اور قوسِ قزح کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ تصور اگرچہ نیا نہیں تاہم عام نہیں تھا۔

۱۷ ؛ تا حقیقت کے لیے لطفِ سخن ہووے مجاز صنعتیں اُس سے ہوں پیدا باِرام و بے اِرام

خدا جانے حقیقت کے لیے لطفِ سخن کیونکر مجاز ہوگا اور اس سے باِرام و بے اِرام صنعتیں کیونکر پیدا ہوں گی ؟

۱۸ ؛ تا اَن و لن کے اذن دیں فعلِ مستقبل کو نصب جازم فعلِ مضارع اِن و لَم لمّا و لام

حروفِ جار کی اِس گردان کے کیا معنی ؟ یہ دراصل مِایۃ عامل منظوم قسم کی چیز ہے۔ اس دور کے درسیات میں منظوم مایۃ عامل شامل تھے۔ اِنشا نے بھی شرح ماتیہ عامل نظم کی ہے۔ آزاد نے انھیں سے کسبِ فیض کیا ہے۔

۱۹، ۲۰ ؛ تا کہ علمِ شعر ہو داخل بہ اوزان و بحور تا افاعیل و تفاعیل اِس سے پائیں انضمام
اور زحافوں کا عمل لے کر ردیف و قافیہ کچھ عرب کا ہے عجم میں ان کو دے موزوں مقام

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ردیف و قافیہ زحافوں کا عمل کیونکر لیں گے ؟ زحافوں کا عمل شعر میں ہر جگہ ہو سکتا ہے لیکن آج تک دیکھا نہ سنا کہ ردیف بھی مزاحف ہو سکتی ہے ! اس کے علاوہ کیا یہ عمل عرب اور عجم ہی میں موزوں مقام پاتا ہے۔

۱۲۸ ؛ تا خس و حکاک لازغ برجوۂ ثاقب ثقیل جب تلک امراضِ مہلک کا اِطبّا میں ہو نام
(کلیات ؟)

۱۳۰ ؛ کلیات اخمسہ ہوں منطق میں ایساغوجیا یعنی جنس و فصل و نوع و خاصہ اور عرضِ عام

ہمیں یقین ہے اگر با اختیار حالتِ اور تمنا فاضلی نے تفیس لامرکزیت اظہار" اور "آثان تعزیب برمحیدن" قسم کی نظمیں کہنے سے پہلے آزاد کا یہ قصیدہ دیکھ لیا ہوتا تو ہر لفظ میں معنی ڈھونڈھنے والوں پر ہرگز طنز نہ کرتے بلکہ اپنے اشعار کی "جزوی معنویت" پر ترماتے اور "اظہارِ مہلیت" میں مزید غور و فکر سے کام لیتے۔ ذوق نے ایک جگہ "خمسِ بازغہ" باندھ دیا تھا کہ شمسِ بازغہ کی جا پڑھیں ہیں بدمنیر۔ آزاد کو شمسِ بازغہ شاید آسان معلوم ہوا لہٰذا انھوں نے "ایساغوجیا" کا ذکر ضروری سمجھا ورنہ شاید ذوق کا منطق کا علم ادھورا رہتا۔ مزید اشعار نقل کرنا بے سود ہے۔ لہٰذا چند چیزوں کی طرف اِشارہ کر کے بات ختم کی جاتی ہے۔

اِس قصیدے کی تشبیب کو دعائیہ کہہ سکتے ہیں۔ تقریباً ہر مصرع یا شعر "تا" یعنی جب تک سے شروع ہوتا ہے۔ اِس سلسلے کے آخری دو شعر ہیں :

پابوس نقشِ پاے تیرے جو کنکری ہو · جا کر فلک پہ اس کو تاروں سے برتری ہو

ے نقشِ پاے پابوس ہو، یعنی چہ؟ پھر تاروں سے برتری کے لیے فلک پر گئے بغیر گزارا تھوڑے ہی ہو سکتا ہے؟

جاروب کش ہے تیرے شکوہِ خسروی کا · زیبا ہے ماہ کو گر فرمانِ مہتری ہو

ہتر لاہور۔ قسم کی ترکیب ذوق کو کیونکر سوجھ سکتی تھی۔ اس کے لیے آزاد کا زرخیز ذہن چاہیے۔ مہتر یعنی جاروب
ش خالص اردو ہے۔ اسے فارسی سے کیا واسطہ! غرض اسی طرح پچاس کے پچاس شعر بے ربط
اور مہمل ہیں۔ کہاں تک درج کیے جائیں جنھیں مزید شوق ہو، دیوان دیکھ لیں۔ ہمیں تو یہ کہنا ہے کہ ان مہملات کا ذوق
سے کوئی واسطہ نہیں۔

قصیدہ ۵۲: "یہ قصیدہ ایامِ طالب علمی کا ہے۔ مطالب اس کے عہدِ مذکور پر شاہدِ حال ہیں۔ افسوس کہ نظرِ ثانی
ے نور نہ پایا۔ اکبر شاہ مرحوم کی مدح میں ہے۔" اگر آزاد "استاد" کے زمانۂ طالب علمی کی وضاحت کر دیتے تو بہتر
ہوتا اور فیصلہ کرنے میں آسانی ہوتی۔ آخر ذوق کا آغازِ شباب یا زمانۂ طالب علمی کب تک تھا؟ اکبر شاہ ثانی ۱۲۲۱ھ
میں تخت پر بیٹھے اور کم و بیش ۳۲ سال حکومت کی۔ کیا ذوق نے ان کے آخری عہد میں کوئی قصیدہ نہیں کہا؟ اگر کہا تو
وہ آزاد کے ہاتھ کیوں نہ لگا؟ اس متعلق قصیدے میں عہدِ طالب علمی کے کوئی آثار نہیں سواے اس کی انتہاے بے ربطی
اور عربی قواعد یا عروض سے متعلق ان مضامین کے جو طلبہ ابتدائی اسباق میں رٹا کرتے ہیں۔ اس کی تشبیب بے ربطی
کا عجب جلوہ دکھاتی ہے۔ مطلع البتہ خاصا زوردار ہے لیکن اس کے آگے؟ معلوم ہوتا ہے یہ قصیدہ کہتے وقت
آزاد کے ذہن میں ذوق کا آخری قصیدہ: ع شب کو میں اپنے سرِ بسترِ خوابِ راحت تھا۔ جس میں ذوق نے
اپنے علم و عمل کا ثبوت بہم پہنچانا چاہا ہے۔ اس میں اگرچہ یہ احساس ہوتا ہے کہ ذوق نے مختلف علوم کی اصطلاحات
کو بغیر پوری طرح ہضم کیے یک جا کرنے کی کوشش کی ہے، تاہم اس میں ایک وقار، ایک شکوہ ہے آزاد کے قصیدے
میں چھچھورا پن ہے۔ اس سے ذوق کی علمیت کا اظہار تو نہیں ہوتا البتہ ہلکے پن کا تاثر ضرور ملتا ہے جہاں تک
مضامین یا خیالات کا تعلق ہے، آزاد نے ذوق کے مختلف قصائد سے مختلف اجزا و تراکیب اخذ کر لیے ہیں
اور بار بار انھیں کو اپنے ناپختہ انداز میں دہراتے رہے ہیں۔ چند شعر دیکھیے:

(۱) تا زباں زد دہر میں ہو فلسفی کا یہ کلام · ہے پئے افلاک لازم نفیِ خرق والتیام

(۲) منجمد ہو کر میانِ طبقہ ہاے زمہریر · قطرہ افشاں تا بخارِ ابر ہوں بن کر غمام

مطلع یقیناً زوردار ہے لیکن شعر ۲ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ زمہریر میں تو پانی کے قطرے منجمد ہوں گے۔ پھر وہی منجمد
پانی (یا برف)، گرمی سے پگھل کر زمین پر قطرہ افشاں ہوں گے لیکن مصرعِ ثانی سے یہ معنی نہیں نکلتے۔ اس کی شرح کچھ
اس طرح ہوگی: جب تک (تا سے یہی مراد ہے) بخارِ ابر غمام بن کر قطرہ افشاں ہوں۔ ابر بھی بادل اور غمام بھی۔ آخر
بادل کے بخارات بادل بن کر قطرہ افشاں کیونکر ہوں گے

(۳) آبِ باراں سے گزر کر منتشر ہو تا شعاع · انعکاسِ رنگ سے قوسِ قزح پاے تمام

سگئے کہ موتی کان مجھے نہیں نکلتے، چہ کان جوہری ہیتے تو بہتر تھا؛ وکان جوہری، ہی کہہ دیتے۔ بہرحال مطلع مذکور یہ ہے؛
شاہا! نظر کرم کی جس ذرہ پر ذری ہو — وہ آسماں پہ جا کر خورشید خاوری ہو
ظاہر ہے جب تک آسمان پر نہیں جائے گا ذرہ خورشید خاوری کا مقابلہ کیونکر کرے گا؟ اب یہاں سے مدح شروع ہونی چاہیے تھی لیکن اگلا ہی شعر یہ ہے؛

دیکھی ہے چین ابرو آئینہ جبیں میں — کیونکر نہ تن میں اس کے ہیبت سے تھرتھری ہو

آئینۂ جبیں میں کس نے چین ابرو دیکھی ہے کہ ہیبت سے تھرتھر کانپ رہا ہے؟ کیا وہ ذرہ جو نظر کرم شاہ سے فلک پر جا کر خورشید خاوری ہو گیا ہے؟ ؎

کیا تاب ہے فلک کی جنبش کرے جگہ سے — گر بہر پائے بندی ایمار سرسری ہو

یہ بھی بے ربط ہے: ؎

یہ آستان دولت ہے سجدہ گاہ عالم — دل کو تری عقیدت اور ننگ سروری ہو

یعنی چہ؟ ؎

سورج مکھی کا تیرے اک پھول مہر انور — قربان چتر دولت نہ چرخ چنبری ہو

مصرع اولیٰ کا مطلب؟ ؎

باغ جہاں میں نرگس نے کیوں نہ جام زریں — جب ہر گدا کو دیتا اک ساغر زری ہو

نرگس کس سے جام زریں لے؟
ہر گدا کو ساغر زری کون دیتا ہے؟ ویسے یہاں زریں بلکہ زر کا مقام ہے، زری کا نہیں۔ ؎

دکھلائے آبداری جب تیغ شعلہ دم کی — شیروں کے دل میں ٹھنڈا خون دلاوری ہو

شیروں کا خون ٹھنڈا ہو کر جم جائے یا خون دلاوری؟ پھر، دل میں خون ٹھنڈا ہو، باقی جسم میں نہیں؟ ؎

کشت امل کو سر سبز آب گہر کر دے — ابر کرم کی تیرے جب فیض گستری ہو

"آب گہر سے کشت امید کو سر سبز کرنا" "آب گہر میں کشتیاں چلانا" "آب گہر میں وضو کر لینا" یا مذاق آب گہر میں زبان بلا کر پاک کر لینا، آزاد ہی کے بس کا کام تھا، ذوق کے بس کا نہیں۔ ؎

شیوہ مہوسوں کا مہر کرم میں تیرے — تیری گداگری ہو کیوں کیمیاگری ہو

کہنا تھا مہوس تیرے کرم کے طفیل تیری گداگری کرتے ہیں اور کیمیاگری ترک کر چکے ہیں، لیکن شعر سے یہ مفہوم نہیں نکلتا بلکہ اس میں مہوسوں کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ کیمیاگری چھوڑ کر اکبر شاہ کی گداگری اختیار کریں۔

گر آفتاب تیرا ڈالے کرن کو اپنی — تاج گدا کا جلوہ جوں تاج قیصری ہو

کیا بادشاہ آفتاب بنا تا تھا؟ اگلے شعر میں ایک مطلع کہنے کا اشارہ کیا (ہے) اور یہ مطلع کہا ہے؟

چل کر خورشیدِ خاوری، باندھا بھی ہے چوتھے شعر تک پہنچتے پہنچتے معلوم ہوتا ہے اور جن چیزوں کے حصول کی خواہش کی گئی ہے وہ حاصل ہوگئی ہیں ورنہ یہ کیونکر کہتے:

ہیں رستمِ معانی اور سیستانِ سخن ہے — دیتا جو زورِ قسمت دل کو تناوری ہو

گویا سخن سیستان ہے اور مادح رستمِ معانی، لیکن اگلا مصرع بہ اعتبارِ زبان پھر غلط ہوگیا ہے۔ جب آپ سیستانِ سخن کے رستمِ معانی ہوگئے تو پھر دیتا جو زورِ قسمت دل کو تناوری ہو۔ سمجھنے کا کیا مقام ہے؟ خود تناوری غور طلب ہے۔

برگشتہ بخت اپنا گر آئے راستی پر — گردوں میں سرنگوں پھر دیکھ اپنی سروری ہو

اسے تشبیب کا آخری شعر سمجھیے۔ اب گریز کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

یہ کہہ رہا تھا میں جو یکبار عقل بولی — وہ بات کہہ کہ جس میں میری بھی دلبری ہو

معلوم ہوا اس سے پہلے جو کچھ کہا گیا، خلافِ عقل تھا۔ علاوہ ازیں یہاں "دلبری ہو" کے کیا معنی ہیں؟ اس کے بعد مدح شروع ہوتی ہے۔ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ ذوق کے قصائد میں حسنِ طلب کا عنصر نہیں ہوتا لیکن آزاد کی مدح کا انداز گویا یہ ہوتا ہے:

بے فکر کیا جب ایسا فیاض ہو جہاں میں — اور دل کا اس کے مقصد خود بندہ پروری ہو

نقلِ سحاب جا کر باندھے ہوا فلک پر — جس پر کہ اس کی چشمِ الطاف سرسری ہو

دربار میں تو اس کے ہو بہرہ یاب جاکر — بہروزی ہووے میری اور تیری بہتری ہو

(تیری اور میری کا مقام ہے)

لیکن رہ رسائی اس وقت ہوگی روشن — جب خضرِ راہ تیری طبعِ سخن وری ہو

اول تو رہ رسائی کا روشن ہونا مہمل۔ پھر طبعِ سخن ور خضرِ راہ ہو یا طبعِ سخن وری؟

تو بھی تو سوچ دل میں تیرے دُرِ سخن کا — اس کے سوا جہاں میں کون آج جوہری ہو

اس کی نظر چڑھیں گر یہ تابدار گوہر — پھر نام تیرا روشن مانندِ انوری ہو

تب بحرِ فکر میں دل غواص ہو کے اترا — معلوم تا کہ سب کو زورِ شناوری ہو

آپ ان سب اشعار کو گریز کہ لیجیے لیکن ان میں صریح حسنِ طلب کا پہلو ہے۔ دل کی بحرِ فکر میں غواصی کا نتیجہ یہ نکلا:

مطلع یہ ہاتھ آیا شہوار ین کے موتی — شرمندہ جس کے آگے صد کان جوہری ہو

مصرعِ اول کی تعقید توجہ طلب ہے۔ بحرِ فکر کی غواصی سے چاہیے تو یہ تھا کہ قصیدہ کہنے کا حوصلہ ملتا، یہاں ملا تو مطلع اور وہ بھی مدحِ حاضر میں۔ مالاں کہ مدحِ غائب سے مدحِ حاضر میں آنے سے پہلے شعرا اشارہ کر دیا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ مطلع ہاتھ تو آیا بحر سے لیکن اس کے آگے شرمندگی صد کانِ گوہر کو ہوگی۔ یہاں آزاد یہ بھول

یہ بھی اُن تین قصائد میں شامل ہے جن کے مسودے بہ قلم آزاد، ڈاکٹر محمد صادق کو ملے تھے۔ لہٰذا اِسے ذوق کی تصنیف نہیں مانا جاسکتا۔ نمونے کے طور پر صرف مطلع پیش ہے سب اشعار کا تجزیہ طول طویل ہوگا۔

صبح سعادت نور ارادت تن بہ ریاضت دل بہ تمنا　　　جلوۂ قدرت عالم وحدت چشم بصیرت محو تماشا

دونوں مصرعوں یا مختلف تراکیب میں ربط ڈھونڈھنا، اندھیرے کمرے میں عدم وجود سوئی کی تلاش سے کم نہیں۔ اہل نظر پورا قصیدہ پڑھیں بلکہ بار بار پڑھیں، اور اگر سوائے ان تین شعروں کے جو ہم نے اوپر درج کیے ہیں، اُنھیں کوئی شعر اتنا مربوط بھی نظر آئے تو ہماری معلومات میں بھی اضافہ فرمائیں۔

قصیدہ ۱۳۔ (اکبر شاہ مرحوم کی مدح میں ہے۔ افسوس کہ نظر ثانی سے محروم رہا۔ آغاز جوانی کا کلام ہے)۔ کیا ذوق ایسے ہی لاپروا تھے کہ ہر قصیدہ بغیر نظر ثانی کے دربار میں پڑھ دیتے تھے! یہ ذوق ہی کی نہیں اُن کے ممدوحین کی بھی توہین ہے جن کے درباروں میں وہ ایسے ناقص اور بے جوڑ اشعار پڑھتے تھے۔ ڈاکٹر صادق کو ملنے والے مسودوں میں اِس قصیدے کا مسودہ بھی شامل ہے۔ گویا یہ بھی ذوق نے نہیں آزاد نے کہا ہے۔ کچھ شعر دیکھیے، حقیقت واضح ہوجائے گی:

خضر نصیب کی گر دنیا میں رہبری ہو　　　اور شاہ راہِ دل پر چشم ہنر وری ہو

معنی یہ ہوئے کہ اگر دنیا میں (ان کو یا مجھ کو) خضر نصیب کی رہبری حاصل ہو اور دل کی شاہراہ پر ہنر وری کی نظر ہو، تو پھر؟ شعر ادھورا ہے نہ دیوان مرتبہ آزاد اور نہ کلیات مرتبہ ڈاکٹر علوی ہی میں اسے قطعہ بند لکھا گیا ہے۔ گویا ہر دو حضرات کی نظر میں شعر مکمل و بے عیب ہے۔ حالاں کہ سرسری دیکھنے سے بھی شعر ادھورا نظر آتا ہے۔ آج تک کم از کم ہماری نظر سے ایسا کوئی اردو قصیدہ نہیں گزرا جس کا مطلع ادھورا ہو۔ معلوم ہوتا ہے آزاد بے خیالی میں اسے اگلے شعر سے قطعہ بند کر گئے ہیں:

منظور ہر نظر میں تب شکل آئینہ ہوں　　　روشن قلم سے میرے تاجِ سکندری ہو

گویا جب خضر نصیب رہبری کرے اور دل پر ہنر وری کی چشم کرم ہو، تب میں آئینے کی طرح ہر نظر میں منظور ہوں۔ "نظر میں منظور" پر وہی اعتراض ہوسکتا ہے جو آزاد نے ناسخ کے شعر میں خود ترمیم کرکے روا رکھا تھا؂

سُرمہ منظورِ نظر ٹھہرا ہے چشم یار میں

یہاں منظور بہ معنی مقبول ہوا لیکن اگلا مصرع بے تکا ہے۔ قلم سے تاجِ سکندری کا روشن ہونا کیا ہوا؟ یہ بے تکا پن محض آئینہ و سکندر کی رعایت کو شعر میں کھپانے کی وجہ سے پیدا ہوا۔

تارہ کی طرح چمکے ذرہ مرے سخن کا　　　اور نام میرا روشن جوں مہر و مشتری ہو

یہ شعر بھی اوپر کے دونوں شعروں سے قطعہ بند ہے، البتہ تشبیہ ناقص ہے۔ جب نام مہر کی طرح روشن ہو کہ دیا تو پھر مشتری سے مشابہت مضمون میں تنزل ہے اگر مشتری پہلے اور مہر بعد میں آتا تو بات البتہ درست ہوتی۔ یہاں آزاد بہ آسانی "مہرِ خاوری" کہہ سکتے تھے۔ ترکیب غریب ہوتی لیکن تشبیہ تو ناقص نہ رہتی خود آزاد نے آگے

جُول پھیلانے کو بدستِ داماں، کہنا عجیب ہے۔ اس کے علاوہ ممدوح کی تعریف کے لیے عرب ایران کی تہنیتوں
کو طلب کرنا، انشا کا اثر ہے ؎

جو آئیں جنبش میں لعلِ شیریں، چمک ہو ان کی کلام نگیں
جو حکم دیوے تو ہووے آئیں تو ہنس کے بولے تو گل ہو خنداں

یہ ہِملات شاہِ وقت کی تعریف میں ہیں! ؎

جو ہو سوارِ سمندِ تازی کرے تو میداں میں اسپ تازی
تو سمجھے دورِ فلک کو بازی بپائے گوے و بدستِ چوگاں

یقین ہے کہ ایسے بھونڈے اشعار اگر ذوق سرِ دربار پڑھتے تو انھیں نہ صرف دربار سے نکلوا دیا جاتا بلکہ ہمیشہ کے لیے ملک
بدر کروا دیا جاتا تاکہ لوگ عبرت پکڑیں۔ جعل کو اصلیت کا رنگ دینے کے لیے تینتیسویں اور چوبیسویں اشعار کے بعد آزاد نے
(یہاں سے چند شعر پڑھے نہ گئے) ، لکھ دیا ہے تاکہ لوگ ذوق کی بد خطی یا مسودوں کی خستگی پر قیاس کر کے اس
قصیدے کو اصلی سمجھیں۔ اصلیت یہ ہے کہ چھتیس شعر کا یہ قصیدہ آزاد نے کہا اور ذوق کے انتقال کے بعد کہا۔[1]

قصیدہ ۲۱ : اس میں ۲۵ شعر ہیں۔ آغاز سے پہلے آزاد نے یہ نوٹ لکھا ہے :

اکبر شاہ مرحوم کی مدح میں ہے۔ افسوس کہ نظرِ ثانی سے نور نہ پایا۔ ورنہ عجیب جلوہ دکھاتا
اکثر شعر اس کے زبانی سُنا کرتے تھے۔ دل روشن ہو جاتے تھے۔ کئی شعر مسودہ میں موجود نہ تھے
(بندہ آزاد کو) ان کی زبانی سنتے ہوئے یاد تھے۔ وہ بھی درج کیے ہیں۔

یہ جعل پر جعل ہے۔ لوگوں کو یقین دلانے کے لیے کہ یہ اشعار ذوق ہی کے ہیں، اور آزاد کو مسودہ ناقص صورت میں
ملا تھا، "زبانی یاد تھے" کا تتمہ لگا دیا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہ قصیدہ بھی آزاد کی معلوماتِ الفاظ کا بھونڈا اظہار
ہے۔ یہ وزن بھی قلیل الاستعمال ہے۔ ذوق تو کیا ان کے معاصرین مثلاً مومن، غالب، شاہ نصیر اور شاہ ظفر تک
کے دستیاب کلام میں کہیں نظر نہیں آتا۔ اگر یادداشت خطا نہیں کرتی تو بحر الفصاحت میں مولوی نجم الغنی کو اس
وزن میں آزاد ہی کے مصنفہ دو شعروں : ع توسرِ دنیا ظلِ الٰہی حکم ترا تا ماہ بہ ماہی۔ کے علاوہ کوئی اور مثال ہاتھ
نہیں آئی۔ البتہ وزن بہت رواں ہے اس میں عجیب موسیقیت ہے۔ ترصیع کا التزام اس پر مستزاد ہے۔ سوائے دو تین
اشعار کے، باقی سب بے ربط الفاظ کا ڈھیر ہیں : ؎

توسرِ دنیا ظلِ الٰہی حکم ترا تا ماہ بہ ماہی — تحت ترا ہے تا بہ ثریٰ اور فوق ہی تیرا تا بہ ثریا
حکم پہ حاضر نظم پہ ناظر تیرے جلوسِ جشن کی خاطر — فوجِ سکندر لشکرِ دارا تختِ فریدوں مسند کسریٰ
تیری شمیمِ خلق سے طاری تیری نسیمِ طبع سے جاری — بادِ بہاری مشک تتاری عود قماری عنبر سارا

[1] دلی میں ایک روز ڈاکٹر علوی صاحب سے ان جہلات پر گھنٹوں گفتگو رہی۔ انھوں نے حیرت انگیز طور پر انھیں معنی پہنانے
کی سعی کی۔ یہ ان کی قوتِ استدلال اور کمالِ علمیت کا ثبوت تو ہو سکتا ہے لیکن اس سے جعلی کو اصلی ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ عابد

ہے۔ ؎

وہ گوش پرزیب کجکلاہی جو بینی دیکھو تو یاالٰہی
دہن میں غنچہ لبوں میں گل برگ و روئے روشن میں مہر تاباں

گوش پر کج کلاہی کیسے زیب دیتی ہے! "جو بینی دیکھو تو یاالٰہی" سے تو گمان ہوتا ہے کہ آگے اُسی کی تعریف ہوگی لیکن آزاد دوسرے مصرعے میں "دہن میں غنچہ" "لبوں میں گل برگ" اور "روئے روشن میں مہر تاباں" کی بات کرنے لگتے ہیں۔ پھر جب آغاز ہی چہرے کے حسن سے ہوا تو لبوں کے بعد پھر چہرہ کیوں در آیا؟ ؎

نگاہ ساغر کش تماشا۔ بیاض گردن صراحی آسا　　وہ گول بازو۔ وہ گوری ساعد وہ پنجہ رنگیں بخون مرجاں

آزاد سراپا بیان کر رہے ہیں۔ بے ربطی سے قطع نظر۔ اِس میں ایسے اعضا کا بیان بھی ہے جن سے عریانی جھلکتی ہے، لذتیت و لمسیت کا احساس ہوتا ہے! یہ خصوصیت اِنشا و رنگین کے یہاں ملتی ہے، ذوق کے کلام پر عریانی کا پرتو نہیں پڑا۔ اپنے معرکتہ الآرا قصیدے ع "شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت" میں ذوق نے "نوید بہجت" کا سراپا بیان کیا ہے لیکن اُس میں اِس قسم کی کوئی چیز نہیں لیکن آزاد کے یہ شعر دیکھیے!

کمر نزاکت سے لچکی جائے کہ بے نزاکت کا بار اٹھائے
اور اُس پہ سو نور لہر کھائے۔ پر اُس پہ ہیں دو قمر فروزاں

کمر پر سو نور کا لہر کھانا بھی عجیب ہے۔ ذوق نے کمر کا بیان محض اِشاروں میں کیا ہے پستان و ساعد و ساق سیمیں کسی چیز پر توجہ نہیں کی:

کھول دے معنی معدوم کمر کی جنبش　　واکرے عقدۂ موہوم، لبوں کی حرکت

ذوق کے یہاں ظاہری اعضا کی بجائے خواص باطنی کی تعریف پر زیادہ زور ہے لیکن آزاد، انشا کے اثر سے ظاہری اعضا کی نمود و نمایش پر زور دیتے ہیں اور یہ اُن کے کہے ہوئے اکثر اشعار میں ہے، اور وہ ع
وہ ران روشن وہ ساق سیمیں وہ پائے نازک حنا میں رنگیں، جیسے مصرعے بھی کہہ جاتے ہیں ؎

جو نام پوچھا کہا خوشی ہوں جو وصف پوچھا تو دلبری ہوں
سبب جو پوچھا تو ہنس کے بولا کہ ذوق تو بھی عجب ہے ناداں

نام پوچھا تو اس نے کہا خوشی ہوں، لیکن وصف پوچھا تو "دلبری ہوں" کہنا غلط۔ یا تو "دلبری ہے" کہتے لیکن قوافی درون شعر کے شوق میں آزاد "دلبری ہوں" لکھ گئے۔ سبب کس چیز کا پوچھا، نام کا یا وصف کا! پھر خوشی مونث ہے، ہنس کے بولا، کیوں؟ اس کے بعد مدح میں ایسے ایسے لغو اشعار ہیں کہ ان کا تجزیہ تضیع اوقات ہے۔ البتہ تین شعر نمونتاً دیکھ لیجیے: ؎

تری سخاوت کا سن کے عالم اُمڈ پڑا ہے تمام عالم　　عرب سے آیا ہے چل کے حاتم بلب سوال و بدست دامان

ہمارے خیال میں اکبر شاہ ثانی کی مدح میں کہا ہوا ذوق کا کوئی قصیدہ آج تک دستیاب نہیں ہوا چنانچہ
ب قصیدے جنھوں نے نظر ثانی سے نورتن پایا، اور اکبر شاہ کی مدح میں ہیں۔ اُن میں ایک بھی ذوق کی
نیف نہیں۔ ڈاکٹر محمد صادق نے اپنی کتاب کے ضمیمہ ۸ میں جو فہرست شامل کی ہے اس میں
پہلا قصیدہ یہی ہے۔ گویا انھیں اس قصیدے کا مسودہ ملا تھا جس سے اس کے اصلی ہونے میں
شک پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے پاس کوئی مسودہ نہیں لیکن بعض اشعار دیکھنے سے اندازہ ہو جائے گا۔
اس قصیدے کو دیکھ کر پہلا تاثر تو یہ ہوتا ہے کہ اس میں خوب صورت لیکن بے محل الفاظ کا ڈھیر لگا دیا
گیا ہے جن کو ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں۔ بحر چوں کہ بہت رواں ہے اس لیے بادی النظر میں
بے ربطی اور اہمال کا احساس نہیں ہو پاتا ہے۔ مطلع ہے:

سحر جو گھر میں بشکل آئینہ تھا میں بیٹھا زار و حیراں
تو اک پری چہرہ، حور طلعت بشکل بلقیس ماہ کنعاں

(ڈاکٹر صادق کی کتاب میں مصرع اولیٰ میں "سحر جو گھر سے" بجائے "گھر میں" ہے، جو مہمل ہے آزاد نے طباعت
دیوان کے وقت اصلاح کی ہوگی۔) ظاہرا اس میں کوئی خرابی نہیں۔ ایک پری چہرہ کا ذکر ہے جس کے حسن
کی تین تشبیہیں نظم ہوئی ہیں (۱) حور طلعت، یعنی اس کا چہرہ حور جیسا ہے (یہاں پری اور حور کو مترادف سمجھ
لیجیے) (۲) لیکن اس کی شکل بلقیس کی بھی ہے، اور (۳) ماہ کنعاں یعنی حضرت یوسف کی بھی۔ یہ عورت
اور مرد کا عجیب امتزاج ہے اس کے علاوہ آئینے کو حیران تو ہونا تھا، "زار" ممنوع نہیں۔ تیسرا شعر ہے:

انیس خلوت، جلیس جلوت، حریف حکمت، ظریف صحبت
بہ بزم یاراں، بدل بہاراں، بہ اہل عزلت، گلے بداماں (نقل کالاصل)

شاید کوئی صاحب ذوق اہل نظر ان مصرعوں میں ربط و معنی پیدا کر سکے۔ ہمیں تو یہ الفاظ کا بے مقصد ڈھیر لگتا ہے۔
مدعا یہ کہ وہ پری چہرہ، خلوت میں انیس ہے، جلیس جلوت ہے، حریف حکمت ہے اور ظریف صحبت (؟ کہ
ظریف صحبت) ہے، لیکن دوسرا مصرع؟ "بہ بزم یاراں" ہے یا "بہ بزم یاراں ہے"؟ "دل سے" تو جلوہ بہار ہے
لیکن "با اہل عزلت" کیا ہے؟ اور "گلے بداماں" بھی کیا ضرورت ہے؟ پانچواں شعر ہے:

بروے رنگیں نگار ریتاں، شگوفہ خنداں، بگریہ خنداں
بموے پیچاں بہ عشق پیچاں جو ہیں پریشاں تو دل پریشاں

"بروے رنگیں نگار ریتاں" کا کیا مطلب ہے؟ اور "شگوفہ خنداں بگریہ خنداں" کے کیا معنی ہیں؟ مصرع ثانی بھی مہمل

اِس سے پہلے کہ غزلیات پر گفتگو شروع کی جائے۔ بقیہ مشکوک قصائد کا جائزہ ختم کر لینا بہتر ہوگا۔ ڈاکٹر تنویر علوی کے بہ قول آزاد کو قصیدہ گوئی سے ذوق نہ تھا اس لیے اُن کے مرتبہ دیوان میں شامل اُن سب قصائد کو جو کہیں اور نہیں ملتے، ذوق کی تصنیف مان لینا چاہیے۔ ہم ابھی ابھی دیکھ چکے ہیں کہ جس قصیدے کے مسودے کو بہ یقین ذوق کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا کہا گیا ہے، وہ بھی ذوق کی تصنیف نہیں ہے۔ پھر ان قصائد کو جن کے لیے ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا گیا، ذوق کی تصنیف مان لینا سہل پسندی ہوگا۔ ڈاکٹر علوی نے اپنے مرتبہ کلیات کے حصۂ قصائد میں صرف نو قصیدے بروایتِ آزاد درج کیے ہیں۔ لیکن ایک قصیدہ "آب میں" کو اشعارِ غزل و قصیدہ وغیرہ کے تحت غزلوں میں درج کیا ہے۔ اِس طرح کل دس قصیدے بروایتِ آزاد ہوئے۔ لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ ڈاکٹر علوی نے کئی مشکوک قصیدے جو ذوق کے غیر مشکوک یا مصدقہ کلام کے ساتھ درج کیے ہیں، وہ یقیناً آزاد کے ذہن کی پیداوار ہیں۔ مثلاً ایک تو یہی سید عاشق نہال چشتی کی مدح والا قصیدہ۔ دوسرا اکبر شاہ کی مدح میں "چمن کی شاخ" والا قصیدہ جسے ہم حصۂ اول میں ثابت کر چکے ہیں کہ ذوق کا نہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی قصیدے ہیں۔ تفصیل کچھ اس طرح ہے:

آزاد نے دیوانِ ذوق کی تدوین میں جتنی محنت کی ہے، اتنی غالباً اپنی کسی اور تصنیف میں نہیں کی۔ آزاد کا دعویٰ تو یہ ہے کہ جس طرح وہ "استاد" کا دیوان مرتب کر رہے ہیں، تدوین و ترتیب کے لحاظ سے ایسا کوئی دیوان شائع نہیں ہوا ہوگا، لیکن دیوان پر ایک نظر ڈالیے تو اندازا ہوتا ہے کہ اس ترتیب میں بڑی بے ترتیبی ہے۔ فی الوقت حصۂ غزلیات سے صرفِ نظر کیجیے۔ غزلوں وغیرہ کے بعد قصیدے شروع ہوتے ہیں۔ ان پر عنوان کی جگہ ۱، ۲ لکھ کر نمبر ڈال دیے گئے ہیں اور ان کے نیچے آزاد نے اپنے نوٹ میں بتایا ہے کہ کس کی مدح میں ہے یا کب کہا گیا۔ ۱۲+۱=۱۳ قصیدوں (آخری مخمس ہے جسے ہیئت کے اعتبار سے قصیدہ نہیں کہا جا سکتا) کے آخر میں ایک خط کھینچ کر جلی قلم سے "تمت بالخیر" لکھا گیا ہے۔ (ص ۲۰۷) اِس کا مطلب تو یہی ہے کہ قصیدے ختم ہوئے۔ اب آگے یا تو دیوان ختم ہو جائے گا یا دوسری اصناف شروع ہوں گی، لیکن اگلے ہی صفحے (۲۰۸) پر قصیدہ ۱۳ کا عنوان موجود ہے۔ اس کا کیا مطلب؟ کیا یہ لغزشِ ذہن و قلم ہے یا دانستہ ایسا کیا گیا ہے؟ ہمارے خیال میں یہ لغزش نہیں ہے۔ سبب یوں کہ پہلے ۱۲ قصیدے (آخری مخمس کو چھوڑ کر۔ یہ سہواً تمت سے پہلے درج ہو گیا ہے۔) ذوق کے نہیں آزاد کے کہے ہوئے ہیں۔ قصیدہ ۱۳ تا ۲۳ (۱۱ قصیدے) ذوق کے مصدقہ قصیدے ہیں جو دوسرے مآخذ میں بھی مل جاتے ہیں۔ گویا آزاد نے پہلے وہ قصیدے درج کیے جو خود کہے اور بعد میں وہ قصائد جو واقعی ذوق کے ہیں (غزلوں میں ترتیب تقریباً برعکس ہے۔ البتہ جن غزلوں میں آزاد نے مطلعوں کا اضافہ کیا ہے اُن میں پہلے اپنے کہے ہوئے مطلعے درج کیے ہیں اور ذوق کے مطلعے بعد میں۔)

قصیدہ ۱ "سحر جو گھر میں بشکلِ آئینہ تھا میں بیٹھا نزار و حیران" اِس کے نیچے یہ نوٹ ہے:

"نظرِ ثانی سے نور نہیں پایا۔ اکبر شاہ مرحوم کی مدح میں ہے۔"

جاتا ہے (دوڑ) دوڑ کے تیری طرف خیال
توکردے پاس نام سے اپنے اسے نہال

دھو دھو کے پاؤں پیچھے پیک خیال کے
جوں غنچہ دل گرفتہ ہے باعث ملال کے

جاتا ہے دوڑ دوڑ کے ہر دم تیری طرف
کردے بیار نام سے اپنے اسے نہال

....
جھوکوں میں آگیا ہے سموم ملال کے
[جھونکوں۔ ڈاکٹر علوی]

دنیا میں ساتھ چین کے وہ زندگی کرے
اور اُٹھے صبح حشر شفق وار سُرخ رو

ایمان اس کے ساتھ ہو وقت انتقال کے
بے رنگ دوستی سے محمد کی آل کے
[عکس میں صاف 'بیٹھے' ہے خدا جانے علوی صاحب نے کیونکر پڑھا]

دنیا میں زندگی کرے آرام سے بسر
نکلے بہ صبح حشر تو رنگ اس کا جوں شفق

....
جو سرخ دوستی سے محمد کی آل کے
[ڈاکٹر علوی نے 'اصلاح آزاد' میں 'یہ' درج کیا ہے، دیوان میں 'یہ' 'ہے']

۴۰ - 'مسودۂ ذوق' اور نسخۂ آزاد دونوں کے متن کا مقابلہ ڈاکٹر علوی کے اس مفروضے کو غلط ثابت کرتا ہے کہ مذکورہ مسودہ ذوق کے ہاتھ کا ہے اور ذوق کا کلام ہے۔ اس میں وہی خامیاں نظر آتی ہیں جو آزاد کے مصنفہ کلام میں ہیں۔ یہ تیار کر آزاد نے پہلے ایک قصیدہ کہا، اس کا مسودہ تیار کیا۔ اس پر ایک کہانی بھی بنائی، اور مسودۂ دیوان کرتے وقت جہاں جہاں انہیں پھیلاؤ خوش خامی نظر آئی اس کی اصلاح کر دی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے۔

ہے گرچہ تو جنوب میں لیکن ترا کماں — روشن سوا کمال سے قطب شمال کے

[گویا دونوں مسودوں میں شعر بے ربط تھا آزاد نے ترتیب دیوان کے وقت اصلاح سے مربوط بنانے کی کوشش کی ہے]

منہ سے ترے غلاموں کے سُن سُن کے تیرا ذکر — یوں جس طرح اذان کو منہ سے بلال کے

سنتے ہیں جاں نثاروں سے جب تیرا ذکر خیر — گویا اذاں کو سنتے ہیں منہ سے بلال کے

[جسے ذوق کا مسودہ کہا گیا ہے اس میں مصرعے بے ربط ہیں ظاہر ہے یہ ذوق کی نہیں آزاد کی تصنیف ہیں اور مسودہ انھیں کا ہے۔]

[علوی صاحب نے آزاد کے اصلاحی ۲۰ مصرعے کلیات ج ۱ میں درج کیے ہیں لیکن مندرجہ بالا شعر کے بعد کا شعر انھوں نے درج نہیں کیا حالانکہ اس میں اصلاح کی گئی ہے:]

مسودے کے عکس میں شعر اس طرح ہے:

سر تا قدم ہیں شوق ترے طالب جمال — مشتاق روزہ دار ہیں گویا ہلال کے

. . . . مشتاق روزہ دار کھڑے ہیں ہلال کے

ہر ساعت ایک روز ہے اور روز ہفتہ وار — ہر ہفتہ ماہ، ماہ برابر ہے سال کے

ساعت بقدر روز ہے اور روز ہفتہ وار — ہر ہفتہ ماہ و ماہ برابر ہے سال کے

تا جلد اس کا کوکب طالع کرے عروج — آجائے گھر میں اوج کے گھر سے وبال کے

آ تا جلد اس کا کوکب طالع پہ عروج — آجائے سمت اوج پہ گھر سے وبال کے

[تنویر علوی صاحب نے مسودے میں اس کی یہ قرأت درج کی ہے، گویا اصلاح مزید ہے]

آ تا جلد اس کا کوکب طالع پئے عروج — آجائے سن کے اوج میں گھر سے وبال کے

مرغ نظر کی طرح اڑا چاہتی ہے چشم — مژگاں سے دونوں بازو لیے پر نکال کے

مرغ نظر کے ساتھ اڑا چاہتا ہے دل . . . . . .

[ہر دو صورت شعر ذوق کے مزاج سے میل نہیں کھاتا]

مشہور ہے لیکن ان کے کلام میں نہیں ملتا۔ بنا کسی اور کا ہوگا۔ اس میں پرندوں کے لیے جانور آیا
ہے۔ نثر میں بھی کئی جگہ جانور یعنی طائر پڑھنے میں آیا ہے اس کے باوجود شعر میں یہ استعمال عام نہیں۔
اس کے علاوہ پیرایہ، حرف ال سے مخصوص ہے۔ پہلی صورت میں اس کا اطلاق ہر جانور پر ہوتا تھا
اور یہی عیب دور کرنا اصلاح کا مقصد بھی ہے اور دونوں صورتیں آزاد ہی کی تصنیف ہیں]

انجم جنہیں سمجھتے ہیں لوگ اپنے زعم میں — قطرے جبیں پہ ہیں عرقِ انفعال کے

انجم جنہیں ہیں کہتے منجم جہاں کے — ....

[ہر دو صورت مصرعے بے ربط ہیں۔ یہ پہلے شعر سے
قطعہ بند ہے جس کی طرف اشارہ نہ مخطوطے میں ہے اور
نہ دیوان میں۔]

جو دیکھے تیری طرف کو اُس کی نگاہ میں — جامِ جہاں نما ہے برابر سفال کے

جس دل پہ تو نگاہ کرے اس کے سامنے — ....

[ڈاکٹر علوی نے کلیات ج ۱ میں مصرعِ اول کی پہلی
صورت چھاپی ہے لیکن ج ۲ میں جہاں تنقیہ چھاپا ہے
وہاں تیری طرف کو تیرے طرف سے بدل دیا ہے
غالباً یہی صحیح ہے۔

ہے گرچہ تو جنوب میں لیکن ترا جمال — روشن ہوا جمال سے قطبِ شمال کے

[علوی صاحب نے اصلاحِ آزاد کے تحت یہ شعر اس طرح درج کیا ہے:
ہے .... — روشن ہوا کمال سے قطبِ شمال کے

جس وقت اس کا حکم کرے منع انقطاع ۔ رہ جائے ازہ چوب پہ دنداں نکال کے
بیبت وہ اس کی ہیبت حق جس کو دیکھ کر جا چھپے چپ کے شیر بھی گھر میں شغال کے

ہو اس کا حکم عام جو بر منع انقطاع : [علوی صاحب نے مصرع برنکے بغیر تبایا ہے اور لکھا ہے]
ہیبت جو اس کی وادی حق میں کرے ظہور .... گھر میں غزال کے
[شعر ہر دو صورت غلط اور بے رکا ہے پہلی صورت
میں ایک معنی یہ بھی نکلتے ہیں کہ اس کی ہیبت کو دیکھ کر
ہیبت حق شغال کے گھر میں چھپ جائے اور یہ
لغویت ذوق سے ممکن نہیں]

اس کی شمیم لطف سے ہو دم میں مشک بو ہے وہ جو خون جام میں ناف غزال کے

خوشبو سے اس کی فیض کے ہوتا ہے مشکبو [ڈاکٹر علوی اس کی فیض کی .... گویا دیوان میں
مزید اصلاح ہوئی ہے]

تل بھر گھٹے بڑھے نہ زمانہ میں رات دن چاہے اگر زمانہ کو وہ اعتدال کے

کیا تاب رات دن میں تغیر ہو بال بھر وہ لائے گر زمانہ میں دن اعتدال کے
[ڈاکٹر علوی کے مطابق بات ، بجائے تاب اور غالباً
سہو طباعت ہے۔ پہلی صورت میں مصرع ثانی ناقص
تھا آزاد نے دوبارہ اصلاح کر دی پہلی صورت ذوق
سے ممکن نہیں]

کرتے ہیں جانور بھی ہمیشہ اسی کا ذکر نکلے ہے پیر پیر صدا منہ سے لال کے

طائر بھی اس کے ذکر سے ہیں سرخرو ہوئے ....
[آزاد کو لال کے لیے جانور کا لفظ کھٹکا ہوگا لہٰذا انھوں نے اسے طائر کر دیا اگرچہ ذوق
کے نام سے ایک شعر ازعمن یوں ہی رہے گا اور ہر لعل جانور تو اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے۔

حاشیہ ص ۲۷۱

ترمیم قصیدہ ۱۰ در مدح عاشق نہال چشتی

م

وہ ابر درفشاں ہے چمن میں کمال کے
ہے چشم مہر و ماہ میں اب یہ جو روشنی
یک ذرہ چشم مہر سے گروہ تطرہ کرے

ہے اس کے آگے بحر بھی کشتی بکف گدا
کشتی گدا کی کشتی پُر زر ہو آن میں

ہیں اس کے در کے خاک نشیں استقدر غنی

عاشق نہال کیوں نہوں عاشق نہال کے
روشن ہیں دونوں نور سے اس کے جمال کے
بھر جائیں پل میں جس سے دامن خیال کے

کھولے نہیں صدف ہی نے کچھ لب سوال کے
دست عطا سے اس شہ دریا نوال کے

خواہاں نہ ملک کے ہیں نہ جویا ہیں مال کے

دیوان مرتبہ آزاد

ہے ابر درفشاں وہ چمن میں کمال کے
ہیں دیدہ ور ستاروں میں خورشید و ماہ اگر
اس کی نگہ سے گر مگر سنگ پائے رنگ [illegible]

ہے بحر اس کے سامنے کشتی بکف گدا
آب گہر میں ہووے رواں کشتی گدا

...... خاک نشینوں کے دل غنی

(پہلی قرأت میں مصرعے اوپری بے ربط لگتے ہیں) (پہلی صورت میں مصرعے مربوط ہیں لیکن رعایتیں آزادی کے انداز کی ہیں)

پھرتا صدف ہے کھولے ہوئے لب سوال کے
دست کرم ......
[آزاد میں یہ شعر ۱۰ واں ہے] اور اگلا شعر چھٹا
خواہاں وہ ملک کے ہیں نہ جویاں ہیں مال کے
[ڈاکٹر علوی نے جویاں کی جگہ بھی خواہاں (لکھا) ہے، جو سہو معلوم ہوتا ہے غالباً یہ قرأت منسوخ ہی ہیں درج ہے یعنی دیوان میں آزاد نے ایک اور ہی اصلاح کی ہے]

۱۲۴۶ھ میں جب دوبارہ آئے تو کہیں سے نثار علی شاہ کا خطاب لے آئے تھے۔ لہٰذا ۱۲۴۵ھ میں نثار علی شاہ کے ایما یا اثر سے قصیدہ کہنے کی کہانی مشکوک ہے۔ ذوق کا ایک شعر ہے۔

تری زباں کا مزا تیری شعر خوانی میں
بجز نثار علی شاہ کون جانے ذوق

اور اسی شعر نے آزاد کو نثار علی شاہ سے متعلق کہانی بنانے پر اکسایا ہوگا۔ جب ۱۲۴۵ھ میں حافظ علی شاہ، نثار علی شاہ تھے ہی نہیں تو قصیدے میں ع سنتے ہیں جاں نثاروں سے جب تیرا ذکر خیر، جیسے اشارے اسے ذوق سے منسوب کرنے میں مانع آتے ہیں۔ لیکن مسودے میں اس کی صورت دوسری تھی:

سنتے ہیں جاں نثاروں سے جب تیرا ذکر خیر
گویا اذاں کو سنتے ہیں منہ سے بلال کے

اور یہ شعر خلا میں لٹکا نظر آتا ہے۔ اِس صورت میں اِسے ذوق سے منسوب کرنے میں تامل ہوتا ہے۔ دوسری وجہ ترقیمے کی عبارت کی تبدیلی ہے۔ آخر ترقیمے کی عبارت میں تبدیلی کیوں کی گئی؟ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ترقیمہ ذوق نے لکھا ہی نہ ہو، اور یہ بعید از امکان نہیں کہ ترقیمے کا اضافہ آزاد نے کیا ہو، ذوق نے سرے سے کوئی ترقیمہ لکھا ہی نہ ہو۔ سنہ، تاریخ اور دن کی عدم مطابقت سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ دوسری بے شمار کہانیوں کی طرح یہ کہانی بھی آزاد کی بنائی ہوئی ہو اور اسے اصلیت کا رنگ دینے کے لیے آزاد نے ترقیمے کا اضافہ کر دیا ہو۔ جس کا مطلب یہ ہوگا کہ متعلقات جعلی ہیں لیکن قصیدہ ذوق کا کہا ہوا ہے لیکن بہ صورتِ موجودہ اِس کا ایک شعر بھی مربوط نہیں۔ لہٰذا اسے ذوق سے منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ ڈاکٹر علوی کی اطلاع کے مطابق مسودے کے ۳۶ مصرعوں میں آزاد نے اندوی روشنائی سے ترمیم کی ہے۔ لیکن مسودے کے وہ اشعار جن میں ترمیم کا ہمیں علم ہے، وہ بھی درست نہیں ہیں۔ اِس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ مسودہ بھی ذوق کا لکھا ہوا نہیں ہے، اور اگر ذوق نے عاشق نہال چشتی کی مدح میں واقعی کوئی قصیدہ کہا تھا تو وہ اصل صورت میں ہم تک نہیں پہنچا اور اس کی تلاش جاری رہنی چاہیے۔

برادرِ محترم رشید خاں کا کہنا ہے کہ یہ قصیدہ اپنی ابتدائی شکل میں یقیناً ذوق کا کہا ہوا ہے (وہ ابتدائی شکل خواہ کیسی ہی رہی ہو) اور یہ ممکن ہے کہ آزاد نے اپنی اِصلاحوں یا تحریفوں سے اس کی صورت مسخ کر دی ہو۔ اپنے قول کی دلیل میں وہ فرماتے ہیں کہ کوئی شیعہ کسی صوفی کی مدح نہیں کر سکتا۔ شیعیت اور تصوف کے تخالف کی بات ہم پہلے بھی سن چکے ہیں۔ اصول اور عقیدے کی حد تک ممکن ہے یہ بات درست ہو لیکن عملاً خصوصاً شعرا اِس پر کاربند نظر نہیں آتے۔ غالب کہتا ہے: ع شیعی کیونکہ ہو جو کہ ہووے صوفی۔ اس کے باوجود وہ مسائل تصوف کی بات کرتا ہے اور غالب کے شیعہ ہونے میں شبہ نہیں۔ انشا کہتے ہیں:

شیعہ و سنی و صوفی رند و دُرد آشام بھی
دوستی اپنی ہے سب سے مہرباں اپنے ہیں سب

نیز وہ سہا پیر اور چار خانوادے کے ذکر میں کہتے ہیں: ع چشتیہ سب سے اچھے یہ زندہ سلسلہ ہے۔ ہیں تو یہ بھی ایک صوفی کی نہیں ایک پورے سلسلے کی مدح ہی لگتی ہے۔ آں کا یہ شعر بھی ہماری نظر سے گزر چکا ہے:

اے بندگی نظامِ امور کن
در بندگی رسیدہ ام افلاس دور کن

اللہ شہرتِ عام اور بقائے نام نصیب کرے۔ اصل سے نقل ہوتی ہے۔ (ص ۲۹۸)

صرف ۴۴ صفحے لکھتے لکھتے آزاد یہ بھول گئے کہ سید نثار علی شاہ داروغہ آبدار خانۂ شاہی کے ہاں اترے تھے یا خود آزاد کے ہاں: کسی سید بزرگوار کے گھر نہیں۔ زیب النسا کا مقبرہ بھی انھیں یاد نہ رہا، تیس ہزاری باغ تو صاف ہوگیا تھا یاد سے بھی محو ہوگیا۔ قصیدہ کہتے وقت آزاد یہ بھول گئے کہ ۱۲۴۵ھ میں سید صاحب حافظ علی شاہ تھے ورنہ ع

• سنتے ہیں جاں نثاروں سے جب تیرا ذکر خیر، نہ کہتے۔ پھر جب قصیدہ کہا گیا تو آپ پیدا بھی نہ ہوئے تھے، ساٹھ برس اور کئی مہینے سے یہی نکلتا ہے۔ ۱۲۴۵ + ۶۰ = ۱۳۰۵۔ آزاد ۱۲۴۵ھ میں ۱۸ ذی الحج کو پیدا ہوئے تھے۔ اس لحاظ سے شاہ صاحب ۱۲۴۵ھ کے آغاز یا وسط میں وارد ہوئے ہوں گے۔ اب اگر یہ مان ہی لیا جائے کہ وہ کسی سید کے ہاں اترے تھے اور ۲۶ برس بعد ان کے گھر میں کوئی نہ رہا سوائے ایک اہل اللہ بی بی کے، تو آزاد کس رشتے سے انھیں سلام کرنے جاتے تھے؟ انھیں کیا معلوم کہ وہ کس سید کے ہاں اترے تھے؟ کیوں کہ دوسری مرتبہ تو وہ پہلے خود انھیں کے ہاں اترے تھے پھر تیس ہزاری باغ میں گئے۔ اور اس دور میں سید بزرگوار کا ذکر تک نہیں کیا گیا۔ گویا تھے ہی نہیں۔ پھر اس اہل اللہ بی بی نے اجزا کا بستہ انھیں کو کیوں دیا؟ ۱۲۶۰ھ میں جب شاہ صاحب دوبارا آئے تو انھیں کو کیوں نہ دیا کہ پہلی مرتبہ تو انھیں کے ہاں شاہ صاحب کا بستر بچھا اور جزدان سرہانے رکھا گیا تھا۔ پھر ۱۲۷۱ھ تک ذوق زندہ تھے۔ شاہ صاحب کی ملاقات ان سے اسی شخص کے ہاں ہوئی تھی جس کے ہاں وہ اترے تھے۔ اتنے، وہ ذوق کو اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ وہ بستہ ان کے سپرد کیوں نہ ہوا۔ اور ان کے والد کو کیوں نہ دیا گیا کیا آزاد کی ولادت سے پہلے شاہ صاحب آیندہ ہونے والے اس بچے کے نام وصیت کر گئے تھے؟ (اس بستے میں صرف قصیدہ ہی کیوں برآمد ہوا۔ ذوق کا اور کلام کیوں نہ ملا کہ شاہ صاحب تو اپنی بیاض میں ذوق کا کلام درج کرتے یا کرواتے رہتے تھے۔) اس ساری بحث کا خلاصہ کچھ اس طرح ہوگا:

(۱) ۱۲۴۵ھ میں ذوق نے نثار علی شاہ سے سید عاشق نہال چشتی کے فضائل و محامد سن کر اورنگ آباد بھیجنے کی غرض سے ان کی شان میں ایک قصیدہ اپنے ہاتھ سے لکھا جس کا مسودہ آزاد کو اس بستۂ اجزا میں ملا جو انھیں ۲۶ سال بعد ایک اہل اللہ بی بی نے دیا تھا۔ یہ ۲۶ سال قصیدے کی تصنیف کے بعد ہوں تو ۱۲۷۰-۱۲۷۱ ہوں گے اور اگر ۱۲۶۰ھ یعنی شاہ صاحب کی دوبارہ آمد کے بعد ہوں تو ۱۲۸۶ھ ہوں گے اور جب ذوق خود زندہ ہو سکتے ہیں، یہ اس لیے ممکن نہیں کہ تب تک آزاد کو دلی چھوڑے اور لاہور میں آباد ہوئے کئی برس ہو چکے تھے) (۲) بہ قول ڈاکٹر اسلم فرخی و ڈاکٹر تنویر احمد علوی صاحبان یہ قصیدہ خود ذوق کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور اس پر ترقیمے میں قصیدہ کہنے کی تاریخ پنجشنبہ ۱۴ جمادی الاول، ۱۲۴۵ھ مطابق ۲۴ اکبر شاہی درج ہے (۳) مسودے کے ترقیمے میں، ہمارے خیال کے مطابق "نوشتہ بدست خویش" کے ساتھ "مصنف عقیدت کیش" لکھنا مشکوک تھا۔ ترتیب دیوان کے وقت اسے بقلم مصنف عقیدت کیش سے بدل دیا۔ اس کے علاوہ مسودے میں سنہ ہجری مقدم اور اکبر شاہی موخر تھا، دیوان میں یہ ترتیب الٹ دی گئی۔ ہمیں بوجوہ یہ سب باتیں مشکوک لگتی ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ جب ۱۲۴۵ھ میں پہلی بار نثار علی شاہ ، وارد ہوئے اور داروغۂ آبدار خانۂ شاہی کے یہاں اترے تھے تو اس وقت تک وہ حافظ علی شاہ تھے اور

تھے۔ باوجود اس کے علوم رسمی سے آگاہ تھے، شعر و سخن کا مذاق بہت خوب تھا۔ اُستاد سے تھوڑے عرصے میں بہت ربط بڑھ گیا۔ اُستاد نے والد مرحوم کو بھی ملایا۔ شاہ موصوف اُستاد کی غزلیں اپنی بیاض میں لکھواتے تھے (؟) اور فرمائشیں کر کے کہواتے تھے۔ طبیعت کی آزادی اور بے نیازی اُن کی تعداد و سلطنت معلوم ہوتی تھی۔ کئی مہینے کے بعد دفعتہً غائب ہو گئے۔ بستر بچھا اور جزدان سرہانے رکھا رہ گیا۔ اُس وقت اکبر شاہ بادشاہ تھے۔

۱۲۴۰ھ میں دفعتہً پھر آئے۔ کہا ہمیں نثار علی شاہ خطاب ہوا ہے۔ یہ زمانہ تھا کہ دلّی کے ٹوٹے پھوٹے تخت پر بہادر شاہ بیٹھے تھے۔ اُستاد کی شاعری اوج پر اور اختیارات موج پر تھے۔ خلیفہ اسمٰعیل کو سرکار شاہی سے کئی خدمتیں حاصل تھیں۔ انھی میں بقول شاہی (املاک شاہی) بھی سپرد تھے۔ شاہ صاحب ہمارے ہاں اُترے۔ مگر فرمایا فقیر کو شہر میں رہنا مناسب نہیں۔ کوئی جگہ باہر ہونی چاہیے کہ اوقات میں خلل نہ ہو۔ شہر کے اندر کابلی دروازہ کے پاس ہی اُستاد مرحوم رہتے تھے۔ باہر ایک باغ بادشاہی تیس ہزاری باغ مشہور تھا۔ عمارات قدیم تعمیر تھیں۔ زیب النساء بیگم خواہر عالمگیر (کذا) کی قبر بھی تھی۔ اس میں ایک بالاخانہ مرمت کر کے درست کروا دیا۔ شاہ صاحب وہیں جا رہے۔ شام کو اُستاد اور والد مرحوم وہاں جاتے تھے۔ شیخ ناسخ کا پہلا دیوان انھی دنوں ہمارے ہاں آیا تھا۔ اس کی غزلوں میں سے کوئی مصرع لیتے تھے اُسی پر اُستاد غزل کہتے تھے والد مرحوم لکھتے تھے۔ شاہ صاحب سنتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ عجب گلزار صحبت تھی۔

خدا جانے اس کہانی میں سچائی کا عنصر کتنا ہے، تاہم تھوڑی دیر کے لیے اس پر یقین کر لیجیے، صرف دو باتیں خیال میں رہیں۔ ۱۲۴۵ھ میں جب شاہ صاحب آئے تو حافظ علی شاہ تھے، اور آبدار خانہ شاہی کے داروغہ کے پاس اُترے اور وہیں ذوق سے ملاقات ہوئی۔ دوسری یہ کہ ۱۲۶۰ھ میں دوبارہ آئے تو نثار علی شاہ کا خطاب لے آئے تھے (کہاں سے؟) اور مولوی باقر کے یہاں اُترے مگر وہاں رہنا مناسب نہ سمجھا، اور اُن کے قیام کا انتظام تیس ہزاری باغ میں زیب النساء بیگم کے مقبرے میں ایک بالاخانے پر کیا گیا۔ ذوق وہاں شعر کہتے اور مولوی باقر لکھتے تھے۔ قصیدہ درج کرنے سے پہلے آزاد نے لکھا:

جب پہلے ۱۲۴۵ھ میں سائیں نثار علی شاہ وارد دہلی ہوئے۔ بیان کیا کہ اورنگ آباد ہمارے وطن میں میاں عاشق نہال چشتی ایک بزرگ ہیں اُن کے ہم دیکھنے والے ہیں۔ اُستاد مرحوم کی خوش اعتقادی نے جبھی ایک قصیدہ لکھا تھا۔ اور تعجب یہ کہ اُن کے پاس مسودہ بھی نہ رہا تھا (کیوں؟) کوئی کوئی شعر سنایا کرتے تھے (کسے؟ اور کب؟ کیا آزاد کو اُن کی ولادت سے پہلے؟) خدا کی قدرت۔ ۲۶ برس کے بعد اس گھر میں کوئی بھی نہ رہا۔ مگر ایک پاکیزہ نفس، پاکدامن۔ اہل اللہ بی بی۔ میں کبھی کبھی اُن کے سلام کو جایا کرتا تھا۔ ایک دن انھوں نے مجھے ایک بستہ اجزا کا دیا کہ یہ سائیں چھوڑ گئے تھے۔ اُن میں دیکھوں تو قصیدۂ مذکور ہے۔ جو اُستاد مرحوم نے اورنگ آباد بھیجنے کو اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔ آج اس تحریر کو پورے ساٹھ برس اور کئی مہینے ہوئے۔

مسوّدہ : جمادی الاوّل روز پنجشنبہ ۲۴ اکبر شاہی مطابق ۱۲۴۵ھ ہجری قدسی
آزاد : در قلعۂ شاہجہاں آباد۔ گر قبول افتد زہے عزّ و شرف
مسوّدہ : ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"نوشتہ بدستِ خویش" اور "اعنی" دونوں پر ہمیں شبہ تھا۔ آزاد نے ترتیبِ دیوان کے وقت دونوں کو نکال دیا۔ اس کے علاوہ مولانا نے ہجری اور اکبر شاہی سنین کی ترتیب بھی بدل دی ہے۔ پہلے اکبر شاہی مقدم تھا بعد میں ہجری مقدم ہوگیا۔ اس اُلٹ پھیر سے ہمیں غرض نہیں البتہ ایک بات ضرور عرض کرنا ہے۔ ۱۴ جمادی الاوّل ۱۲۴۵ھ کو پنجشنبہ تھا۔ اس کے لیے ایک نہیں جتنی تقویمیں میسر آئیں، دیکھ لیجیے۔ ہمارے پیشِ نظر انجمن کی تقویم بھی ہے اور ایتھاسک جنتری پتر ک بھی۔ ضابطۂ ہلالیہ کی رو سے کسی ماہ میں رویتِ ہلال کا دن معلوم کیا جا سکتا ہے۔ جو لوگ اس ضابطے کو جانتے ہیں وہ خود تصدیق کر سکتے ہیں۔ ہمیں دو تقویموں میں فرق نظر نہیں آیا اس لیے ہم حساب کتاب کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتے جنھیں شبہ ہو کلنڈر کے قاعدے سے بھی تصدیق کر لیں، چارشنبہ ہی آئے گا۔ اس کے علاوہ، جس سال کوئی چیز لکھی جائے اگر اسی وقت اُس پر سنہ لکھا جائے تو غلطی کا امکان کم سے کم ہوتا ہے۔ اگر ہم چند سال کے بعد کسی پرانی تاریخ میں کوئی چیز لکھیں اور پھر دو سنوں کو مطابق کر کے لکھنا چاہیں تو غلطی کا احتمال رہتا ہے۔ بادی النظر میں ۱۲۴۵ ہجری اور ۲۴ اکبر شاہی مطابق ہیں۔ مثلاً اگر آپ ۲۴ سال کے بعد اکبر شاہی کو ہجری سنہ میں بدلنا چاہیں تو اس طرح کریں گے : ۱۲۲۱ + ۲۴ = ۱۲۴۵ (اکبر شاہ ثانی رمضان ۱۲۲۱ھ میں تخت پر بیٹھے تھے) لیکن یہ طریقہ گمراہ کن ہے اس سے نتیجہ ہمیشہ غلط نکلے گا، کیوں کہ جلوس کا پہلا سال تو ۱۲۲۱ ہوگا آگے بھی شمار کرنا چاہیے۔ اس طرح سادہ جمع کے قاعدے سے ۲۲ جوڑنا چاہیے تاکہ ۲۴واں سال نکل سکے۔ اب آپ انگلیوں پر گن کر دیکھیں۔ اگر ۱۲۲۱ھ، ایک اکبر شاہی ہو تو ۲۴ اکبر شاہی کب ہوگا؟ ظاہر ہے ۱۲۴۴ھ میں۔ لیکن مسوّدے اور دیوان دونوں میں صاف ۱۲۴۵ لکھا ہے کہ اسی سال نثار علی شاہ دلی میں وارد ہوئے تھے۔ کیا ذوق جو جلوس اکبر شاہ کے ۲۴ویں سال یہ تقریظ لکھ رہے تھے، ایسی غلطی کے مرتکب ہو سکتے تھے؟ ہمارے خیال سے نہیں۔ نتیجہ کیا نکلا؟ یہ مسوّدہ وضعی اور جعلی ہے یہ مولانا آزاد کے ذہن کی تخلیق ہے۔ آزاد نے ایک قصیدہ کہا، اس کا متنی تیار کیا اور اسے اُستاد سے منسوب کرا دیا۔ اس کا "متنی" یہ آسی آگ کی نذر ہو گیا جس سے بچے ہوئے چودہ مسوّدے پروفیسر شیرانی مرحوم کو دستیاب ہوئے تھے (ڈاکٹر صادق کو جو ۲۷ + ۲ مسوّدے ملے، اُن کا ماخذ دوسرا ہے) اتمامِ حجّت کے طور پر اس مسوّدے کی دریافت کی کہانی بھی ملاحظہ کر لیجیے :

> ۱۲۴۵ھ میں ایک بزرگ کہن سال حافظ علی شاہ نام اورنگ آباد ملکِ دکن سے واردِ دہلی ہوئے اور قلعہ میں آبدار خانۂ شاہی کے پاس آ اترے۔ وہاں اُستاد سے ملاقات ہوگئی۔ وہ صاحبِ معرفت شخص تھے۔ طرزِ معاشرت سے معلوم ہوا کہ خاندانی رئیس تھے۔ امیری چھوڑ کر فقیری اختیار کی تھی۔ زبان سے نہ کہتے تھے مگر ٹیپو سلطان اور خوانین (و خوانین) مدراس کے معرکے اس طرح بیان کرتے تھے گویا آپ شامل

انجم نہیں سمجھتے ہیں لوگ اپنے زعم میں لیکن عرقِ انفعال کے یہ قطرے گردوں کی جبیں پر ہیں، شعر میں یہ نہیں بتایا گیا اور یہ عجزِ بیان ہے اس کے بعد شاطرِ زمانہ والا شعر ہے۔ اعادے کی ضرورت نہیں۔ کلیات میں ایک شعر ہے:

جو دیکھے تیرے ظرف کو اس کی نگاہ میں ، جامِ جہاں نما ہے برابر سفال کے

اگرچہ مصرعِ ثانی عجزِ بیان کی مثال ہے (جامِ سفال کا مقام تھا) تاہم سید صاحب کے ظرف کو دیکھنا ان کی مدح ہے یا ذم؟ آزاد کو اس عیب کا خیال آگیا لہٰذا انھوں نے دیوان میں درج کرتے وقت روایت بدل دی: ع

جس دل پہ تو نگاہ کرے اس کے سامنے

مژگاں سے دونوں بازوؤں پہ پر نکال کے
مرغِ نظر کے ساتھ اڑا جاتا ہے دل

کلیات میں اگرچہ مصرعِ اولیٰ میں "اڑا جاتی ہے چشم" ہے، لیکن وہ اس سے بھی لغو یا اندازِ بیان آزاد کا حصہ ہے۔ اب ترقیمے کی بات بھی ہو جائے۔

ہے۔ اِن اشعار کی لغویت انھیں ذوق سے منسوب کرنے میں مانع آتی ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے یہ فرض کر لیجیے کہ یہ قصیدہ ذوق نے کہا اور مسودہ انھیں کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور آزاد نے حسبِ عادت اس کے اشعار میں تحریف و ترمیم کی ہے کہ وہ "استاد" کے شعروں کو اور بلند کر کے دکھانا چاہتے تے۔ لیکن ترقیمہ جو اس کے بدستِ ذوق ہونے کا ثبوت ہے، اس میں تو ترمیم کی ضرورت نہیں ہو سکتی کہ اس سے اپنا ہی دعویٰ مشکوک ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ علوی صاحب نے یہ تو لکھا ہے کہ ۲۶ مصرعوں میں آزاد نے ترمیم کی ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ انھوں نے ترقیمے میں تبدیلی کی ہے یہ بتاتے بھی کیوں کر؟ انھیں نسخۂ آزاد میں ترقیمہ دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ ان کے سامنے مسودہ موجود تھا۔ انھیں یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ ترقیمے میں بھی ترمیم کی جا سکتی ہے۔ ہماری نظر تو اتفاقاً نسخۂ آزاد میں درج ترقیمے پر پڑ گئی لیکن پہلے ہی جملے کو دیکھ کر ماتھا ٹھنکا۔ اپنے حافظے پر شبہ ہونے لگا۔ ہمارے ذہن میں "نوشتہ بدستِ خویش ......" کا فقرہ نقش ہو چکا تھا۔ یہاں یہ الفاظ نہیں ہیں۔ چناں چہ ہم نے کلیات میں مسودے کا عکس نکالا اور یہ دیکھ کر حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جن متعلقات پر ہیں: شبہ تھا، یہاں ان میں بیشتر جگہ ترمیم کر دی گئی ہے، ملاحظہ ہو:

آزاد : بقلمِ مصنفِ عقیدت کیش صداقت اندیش سراپا شوق ابراہیم ذوق برائے تذ
مسودہ : نوشتہ بدستِ خویش مصنفِ عقیدت کیش الخ، " " "
آزاد : جنابِ فیض مآب گلشنِ فضل و کمال حضرت سید عاشق نہال چشتی بتاریخ چہاردہم
مسودہ : " " " " " " " " " چہاردہم
آزاد : جمادی الاوّل روز پنجشنبہ ۱۲۴۵ ہجری قدسی مطابق ۲۴-اکبر شاہی

---

[۱] اب ان سے گفتگو میں معلوم ہوا کہ انھیں اس کا علم ہی نہیں ہے۔ بلکہ وہ تو یہ سمجھتے ہیں کہ آزاد نے دیوان میں یہ ترقیمہ دیا ہی نہیں کیا۔ چنانچہ اوپر ہم نے جو قیاس کیا ہے، وہ درست ہے۔

شعر مہمل، ردیف بے ربط: خیال کا · کا مقام ہے۔

دُنیا نے خاکساری آسے دی ہے نذریں — مٹی خمیر یہ ہے گھر میں کلال کے

کلیات میں یہ شعر اس طرح ہے:

دے (کذا) نے خاکساری آسے دی ہے نذریں — مٹی خمیر کی ہے یہ گھر میں کلال کے

شعر ہر دو صورت سمجھ میں نہیں آتا۔

ہیبت جو اُس کی وادیٔ حق میں کرے ظہور — جا بیٹھے چپ کے شیر بھی گھر میں غزال کے

کلیات: ہیبت وہ اُس کی ہیبتِ حق جس کو دیکھ کر — جا بیٹھے چپ کے شیر بھی گھر میں شغال کے

ہر دو صورت شعر کے کوئی معنی نہیں؛ درویش کی ہیبت کیا اور شیر کا غزال و شغال کے گھر میں چھپنا کیا؟

اس کی شمیم خلق معطر کرے جو گل — لے کے سونگھیں اہلِ چمن پھول ڈھال کے

مسوّدے میں اس کا متن کچھ بہتر تھا۔ آزاد نے مزید ترمیم سے مہمل کر دیا:

ہوں اُس کی بوئے خلق سے خوشبو جو گل تمام — پھر کیا عجب کہ پھول معطر ہوں ڈھال کے

پہلے دوسرا مصرع بہتر تھا لیکن مصرعِ اولیٰ کی وجہ سے محض تکرار لگتا ہے جب "تمام گل خوشبو ہو جائیں" تو پھر دوبارہ معطر ہوں" کہنا فضول ہے۔ آزاد نے ایک عیب کو دور کرنے کے لیے دوسرا عیب پیدا کر دیا۔

خوشبو سے اُس کی فیض کے ہوتا ہے مشکبو (کذا) — ہے وہ جو خون جام میں نافِ غزال کے

کلیات:

اُس کی شمیم لطف سے ہو دم میں مشکبو — ہے وہ جو خون جام میں نافِ غزال کے

یہ شعر اس سے پہلے شعر کا عکس ہے۔ آزاد یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ کون سا شعر رکھا جائے۔ لہٰذا دونوں کو بحال رکھا۔
قوتِ فیصلہ کی یہ کمی آزاد کے وضع کردہ مسوّدات میں عام ہے:

ہو شکر تنا سے، اگر اس کی کامیاب — لب بند ہو دیں طوطیِ شیریں مقال کے

شکر تنا سے کامیاب ہونا، یعنی چہ؟

آب گہر میں ہووے رواں کشتیِ گدا — دستِ کرم سے اُس شہِ دریا نوال کے

آب گہر میں کشتیاں چلانا، مذاق آب گہر میں زبان بلا لینا (قصیدہ "تہنیتِ عقدِ شہزادہ") آزاد ہی کہہ سکتے ہیں۔ کلیات میں متن نسبتاً بہتر ہے۔ آزاد نے ترمیم سے مہمل کر دیا ہے۔ اگلے دو شعر قطعہ بند معلوم ہوتے ہیں لیکن نہ کلیات میں اور نہ نسخۂ آزاد میں اس کی صراحت کی گئی ہے:

گردوں بھی پست ہو کے ہوا خوب منفعل — رتبہ کو دیکھا جب ترے اوجِ کمال کے

انجم جنھیں ہیں سمجھتے منجم جہان کے — قطرے جبیں پہ ہیں عرقِ انفعال کے

قطعے کی صراحت نہ ہونے کی صورت میں دوسرا شعر مہمل ہو جائے گا۔ کلیات میں دوسرے شعر کا مصرعِ اولیٰ یوں ہے:

پہلے عکس میں موجود پانچ اشعار سے متعلق دو جملے عرض کر دیے جائیں۔ یہ عکس قطعے سے شروع ہوتا ہے :

ہے گرچہ تو جنوب میں لیکن ترا کمال
روشن سوا جمال سے قطب شمال کے

دوسرے مصرعے میں "ہے" کی کمی بری طرح کھٹکتی ہے۔ آزاد نے "ہوا" چھاپا ہے لیکن اُس صورت میں قطب شمال کی تلمیح سمجھ میں نہیں آتی۔

منہ سے ترے غلاموں کے سن سن کے تیرا ذکر
یوں جس طرح اذان کو منہ سے بلال کے

مصرعے بے ربط اور شعر نامکمل ہے۔ آزاد نے اصلاح کر کے اسے مربوط بنا دیا :

سنتے ہیں جاں نثاروں سے جب تیرا ذکر خیر
گویا اذاں کو سنتے ہیں منہ سے بلال کے

یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ ڈاکٹر علوی نے مسودے کے متن کو، جو ان کے بہ قول ذوق کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، چھوڑ کر آزاد کے متن کو کیوں قبول کیا ؛ حالاں کہ شعر مربوط ہونے کے باوجود تشبیہ ناقص بھی ہے عجیب بھی اور ذوق کے انداز فکر سے میل بھی نہیں کھاتی۔

سر تا قدم ہیں شوق ترے طالب جمال
مشتاق روزہ دار ہیں گویا ہلال کے

ہلال کو روزے سے کیا تعلق ؛ اس سے روزے داروں کی تضحیک کا پہلو نکلتا ہے۔ ہلال کو عید سے تعلق ہے اور روزہ تو پہلا بھی ہو سکتا ہے ؛ دسواں بھی ؛ اور بیسواں بھی۔ تیسویں دن کے روزے دار اگر ہلال کے مشتاق ہوں تو کوئی قباحت نہیں ورنہ عام طور سے اگر روزہ دار ہلال کا منتظر ہو تو یہ سمجھا جائے گا کہ روزے کو جزو ایمان سمجھنے کی بجائے بلائے جان سمجھتا ہے، اور اس شعر سے یہی نکلتا ہے۔ ذوق کا اس پہلو پر توجہ نہ دینا تعجب انگیز ہے۔ اگلا شعر ہے :

ہر ساعت ایک روز ہے ہر روز ہفتہ وار
ہر ہفتہ ماہ، ماہ برابر ہے سال کے

مصرع اول کم زور تھا۔ آزاد نے درج دیوان کرتے وقت اسے اصلاح سے چست کر دیا :

ساعت بقدر روز ہے اور روز ہفتہ وار
ہر ہفتہ ماہ و ماہ برابر ہے سال کے

ڈاکٹر علوی نے یہی متن قبول کیا ہے۔ کیا وہ ذوق کے کلام کو کم زور سمجھ کر آزاد کی طرح اس میں ترقی کے خواہشمند ہیں! البتہ انھوں نے مصرع ثانی میں واو عاطفہ کو غلط سمجھ کر قبول نہیں کیا۔ اس کے بعد کا شعر چوں کہ عکس میں پورا نہیں آیا اس لیے نظر انداز کیا جاتا ہے۔ آخری شعر ہے :

اور اٹھتے صبح حشر شفق وار سرخرو
یہ رنگ دوستی سے محمد کی آل کے

یہاں ردیف درست ہے۔ بنا ڈاکٹر علوی نے یہی متن قبول کیا ہے۔ پورا مسودہ ہمارے سامنے نہیں ورنہ معلوم ہوتا کہ انھوں نے اور کون کون سی اصلاح کو مرجح سمجھا ہے۔ ہم صرف یہ سوال کرنا چاہتے ہیں کہ کئی شعروں میں آزاد کی روایت کو ترجیح دینے کا کیا یہ مطلب ہے کہ ان کی نظر میں اس مسودے کی حیثیت مشکوک تھی ؛ اس سے پہلے کہ ہم ترتیب کی طرف رجوع ہوں، چند اشعار اور دیکھ لیجیے :

اس کی نگہ سے گر جگر سنگ پائے رنگ
بھر جائیں پل میں لعل سے دامن خیال کے

جان نثاروں نے ہمیں چونکا دیا۔ یہ علم ہے۔ اس قسم کی ترکیبیں تراشنا، آزاد کے مزاج کا خاصہ ہے۔ اس سے پہلے ہم "الطاف وکرم" اور "اہلِ ذوق" جیسی تراکیب کی اشارہ کرچکے ہیں۔ اوپر کے شعر میں نہال کی ایک حیثیت عَلَم کی بھی ہے۔ بہ قول مولانا آزاد، سید عاشق نہال چشتی کی شخصیت اور بزرگی کا علم ذوق کو سید صاحب کے ایک مرید نثار علی شاہ کے ذریعے ہوا تھا اور یہاں جاں نثاروں کا اشارہ صریحاً نثار علی شاہ کی طرف ہے۔ ذوق یہ شعر نہیں کہہ سکتے اس موقع پر ہم نے کُلیاتِ ذوق کی طرف رجوع کیا تو انکشاف ہُوا :

"...... اس میں ۲۱ مصرعے ایسے ہیں جن میں مولانا آزاد کے قلم اور اُودی روشنائی سے تبدیلیاں ہوئی ہیں۔" (ص ۵۵) چنانچہ خیال آیا کہ یہ یقیناً آزاد کی اصلاح ہوگی، لیکن کُلیات میں یہی متن ہے۔ حُسنِ اتفاق سے ڈاکٹر علوی نے اس قصیدے کے مسودے کے کچھ حصّے کا عکس بھی شائع کیا ہے۔ قصیدہ بیاض کی صورت ترچھی سطروں اور دو کالموں میں لکھا گیا ہے ترتیبہ یا نوٹ گھسیٹ کر لکھا گیا ہے۔ پہلے کالم میں چار شعر اور پانچویں شعر کے مصرع اولیٰ کا آخری ٹکڑا "اشتیاق مند" ہے (باقی حصّہ عکس میں نہ آیا ہوگا) دوسرے کالم میں قصیدے کا آخری شعر (جسے مقطع کہہ لیجیے۔ اس میں تخلّص نہیں آیا بلکہ تخلّص آخر سے پانچویں شعر میں ہے) عکس کے نیچے یہ عبارت لکھوائی گئی ہے :

"قصیدہ نمبر ۲ کے اختتام پر ذوق کی تحریر کا عکس۔" مرتّب کی اس رائے سے اتفاق کرنا مشکل ہے، اپنی ظاہری ہیئت سے یہ مسودہ جعلی معلوم ہوتا ہے۔ وجوہ یہ ہیں :

کسی کو پیش کرنے کے لیے جو چیز لکھی یا لکھوائی جاتی ہے، اس کی تزئین و آرائش پر خصوصی توجہ صرف کی جاتی ہے۔ چناں چہ ۲۵ شعروں کو کسی ایک ورق پر خوب صورت اور متناسب انداز میں لکھا جاتا، اور چوں کہ بہ قول مرتب یہ مصنّف نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے، اس لیے وہ خود اسے مناسب اور متناسب انداز میں لکھ سکتا تھا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں دو کالم ہیں، سطریں ترچھی بہ صورتِ بیاض لکھی گئی ہیں۔ ترقیمے کی تحریر میں اُس خوش خطی کو بھی ملحوظ نہیں رکھا گیا جو اشعار کی تحریر میں نظر آتی ہے بلکہ اسے گھسیٹ شکستہ آمیز انداز میں لکھا گیا ہے۔ کہا نہیں جاسکتا کہ یہ قصیدہ ایک ہی ورق پر ہوگا اس لیے کہ پہلے کالم کے آخری شعر اور دوسرے کالم کے پہلے شعر کے درمیان چھے شعر کا فصل ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ چھٹے اشعار کا عکس لیا ہی نہیں گیا۔ یعنی اس کے نیچے چھے شعر اور تھے تو یہ بھی ماننا ہوگا کہ اسی قدر اشعار اوپر کے حصّے میں بھی چھوڑے گئے ہوں گے۔ لیکن اوپری حصّے میں جو پہلا شعر ہے، وہ قصیدے کا چوبیسواں شعر ہے۔ گویا اوپر سے تیئس شعر چھوٹے ہوئے ہیں، جو درست نہیں معلوم ہوتا۔ اس صورت میں تناسب بگڑ جائے گا۔ اس کے علاوہ یہ بھی عجیب معلوم ہوتا ہے کہ محض ایک شعر اور ترقیمہ لکھنے کے لیے دوسرا کالم بنانا پڑا، حالاں کہ اگر مصرعے بجائے اوپر نیچے لکھنے کے آمنے سامنے لکھے جاتے تو نہ صرف حُسن و تناسب برقرار رہتا بلکہ اس سے نصف ورق میں پورا قصیدہ سما جاتا۔ ظاہر تو یہی ہوتا ہے کہ اگر دو ورق نہیں ہیں تو قصیدہ ورق کے دونوں طرف لکھا ہوا ہوگا۔[1] جو پیش کش کے لیے لکھے گئے قصیدے کے لیے کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

اس مقام پر ہم نے نسخۂ آزاد میں یونہی اس ترقیمے پر نظر ڈال لی۔ وہاں حیرتوں کا مزید سامان موجود تھا، لیکن

---

[1] ڈاکٹر علوی نے دورانِ گفتگو اس کی تصدیق فرمائی کہ قصیدہ ورق کے دونوں طرف لکھا ہُوا ہے اور کاغذ بھی نہایت معمولی ہے۔

شاہا یہ تیرا ذوق ہے اُمیدوارِ لطف
ہو حالِ پُر نگاہ اِس آشفتہ حال کے
تاجلد اس کا کوکبِ طالع پئے عروج
آجائے سمتِ اوج پہ گھر سے وبال کے
("زوال" بہتر تھا)

کردے بہار نام سے اپنے اسے نہال
جھوکوں میں آگیا ہے سموم ملال کے
(بہار، نہال، جھوکوں، سموم، یہ سب رعایتیں توجہ طلب ہیں) اگرچہ کسی صوفی بزرگ کو شاہ کہنے میں کوئی قباحت نہیں تاہم یہاں "شاہا" کا انداز کچھ ایسا ہے جیسا عام بادشاہوں کے لیے ہوتا ہے اس قیاس کو تقویت اس شعر سے ملتی ہے:

اے شاطرِ زمانہ تصدّق ہو نیلِ چرخ
شطرنجِ عشق میں ترے گھوڑے کی چال کے

حیرت ہے کہ ایک صوفی بزرگ کو "شاطرِ زمانہ" کہا جا رہا ہے۔ ہے یوں کہ بادشاہوں کے قصائد میں ان کے ہاتھی، گھوڑے، تلوار، عدل وغیرہ کی تعریف کرنے کا رواج ہے یہاں بھی گھوڑے کی تعریف مقصود ہے۔ لیکن درویشوں کو گھوڑوں سے کیا واسطہ! چناں چہ شطرنج کے گھوڑے کی چال کی تعریف کردی گئی (شطرنج بھی شطرنجِ عشق جس میں گھوڑے کا وجود نہیں ہوسکتا)، لیکن جب تک شطرنج سے ممدوح کا تعلق نہ دکھایا جائے تعریف بے محل رہے گی۔ لہٰذا انھیں شاطرِ زمانہ قرار دے دیا اور شعر کی لغویت پر غور نہیں کیا گیا۔ ایسے شطرنج کی یہ چالیں آزاد کو ذوق ہی کے ایک قصیدے سے سوجھیں۔ یوں بھی آزاد نے اکثر قصائد میں ذوق ہی کے اچھے مضامین کا خون کیا ہے۔ حسبِ مواقع ان کی مثالیں بھی پیش ہوں گی، فی الوقت شطرنج کے یہ شعر ملاحظہ ہوں جو ذوق نے ظفر کی مدح کے ایک قصیدے میں کیے یہاں یہ مربوط بھی ہیں با معنی بھی کہ سلیقے سے بندھے ہیں لیکن آزاد روا ناروا پر غور کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ انھیں مضمون باندھنے اور اشعار کی تعداد بڑھانے سے غرض ہے اور بس: ؎

کرتا اوّل کو جو اعلیٰ نہ تیرا منصوبہ
پاتا شطرنج میں فرزیں کا نہ رُتبہ زیبق
مشتری بھی تری شطرنج کا ایک مہرہ ہے
آفتاب ایک ترے گنجفہ کا گر ہے ورق

کیا ایک عقیدت کیش مُرید بلکہ مُرید کے مُرید کی زبان ایسے لغویات کی متحمل ہوسکتی ہے؟ مہمل اور لغو اشعار بھی جنھیں آپ نازک خیال کہہ لیجیے، آزاد کی خصوصیت ہے۔ وہ اپنی دور از کار نازک خیالی کے لیے بڑا پیچ دار پیرایہ اختیار کرتے ہیں، اور شعر مہمل ہو جاتا ہے۔ مثلاً یہ شعر دیکھیے:

مُرغِ نظر کے ساتھ اُڑا جاتا ہے دل
مژگاں سے دونوں بازوؤں پہ پر نکال کے

رنگ اسی طرح کے کئی شعر ہیں جن سے شبہ پیدا ہوا، خصوصاً جب یہ شعر نظر سے گزرا:

سنتے ہیں جاں نثاروں سے جب تیرا ذکرِ خیر
گویا اذاں کو سنتے ہیں منہ سے بلال کے

بھی مفو سے آگے، سے اسی موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔ اتفاقاً قصائدِ ذوق کی اس حقیقت کا ذکر چل نکلا۔ میں نے عرض کیا کہ سوا ایک قصیدے کے جو حمید الدولہ کی مدح میں ہے اور آپ نے ذوق سوانح اور انتقاد میں غیر مطبوعہ کلام کے تحت شائع کیا تھا کسی میں حسن بلند نہیں۔ فرمایا: "وہ قصیدہ بھی مشکوک ہے"۔ البتہ راقم ان کے اس خیال سے متفق نہیں۔

نوشتہ بدست خویش مُصنّف معتقد کیش صداقت اندیش اعنی سراپا شوق شیخ ابراہیم ذوق برائے
نذر جناب فیض مآب گلشن فضل و کمال حضرت سید عاشق نہال حسینی بتاریخ چہاردہم جمادی الاول روز پنجشنبہ سنہ
۲۴ اکبر شاہی مطابق سنہ ۱۲۴۵ھ قدسی در قلعہ شاہجہاں آباد، گر قبول افتد زہے عزو شرف۔

ممکن ہے اس عبارت کو دیکھ کر کسی کے ذہن کوئی شبہ پیدا نہ ہو۔ شاید اس میں بظاہر کوئی غلطی نہیں، لیکن ہم نے جب پہلے پہل یہ نوٹ دیکھا تھا، اسی وقت سے پہلا فقرہ ذہن میں کھٹکتا تھا اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ شبہ کیسے دور ہو۔ مثلاً ہمارے خیال میں جب "نوشتہ بدست خویش" موجود تھا "مُصنّف" لکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیا مُصنّف کو یہ شبہ تھا کہ نوشتہ بدست خویش سے اس کا مفہوم واضح نہیں ہوتا؟ اس کے بعد "اعنی" کا لفظ بھی ہمیں ناموزوں معلوم ہوتا تھا۔ تیسرے، مصنّف کا نام، "شیخ ابراہیم ذوق" اگرچہ اس میں کوئی غلطی نہیں لیکن پھر بھی ایسا لگتا ہے جیسے یہ مُصنّف کے علاوہ کسی شخص کی تحریر ہے جو مُصنّف کا ذکر بڑے ادب سے کرنا چاہتا ہے۔ یہ وہم سہی، لیکن تھا۔ اور آخری "در قلعۂ شاہجہاں آباد" ہے۔ کیا یہ قصیدہ ذوق نے قلعے میں بیٹھ کر لکھا تھا؟ یہاں صرف "شاہجہاں آباد" کافی تھا۔ لیکن یہ سال بھر پہلے کی بات ہے۔ ہمارے سامنے ایسا کوئی ذریعہ نہیں تھا جو ہمارے شکوک کی تسکین کا سامان فراہم کر سکے۔ اس اثنا میں کتاب کا پہلا حصہ لکھا گیا۔ دوران تسوید بار بار پڑھنے سے مولانا آزاد کے انداز کی کچھ خصوصیات ہماری نظر میں واضح ہوئیں۔ ایک دن اتفاقاً خیال آیا کہ لاؤ اس قصیدے کو ایک بار پھر پڑھ کر دیکھیں، ممکن ہے اس میں کچھ ایسے اجزا نظر آجائیں جو مولانا آزاد سے مخصوص ہیں۔ اتفاق پر اتفاق یہ کہ اس مرتبہ کلیات کی بجائے دیوان مرتبہ آزاد ہاتھ آگیا۔ چناں چہ ہم نے، خدا جانے کیوں، قصیدے کو آخر سے یعنی بجانب مقطع پڑھنا شروع کیا۔ اور پہلا ہی شعر کھٹکا ملاحظہ ہو!

نکلے بہ صبح حشر تو رنگ اس کا جوں شفق ہو سرخ دوستی سے محمد کی آل کے

بصورت موجودہ ردیف غلط معلوم ہوتی ہے یہاں "آل کی" کا مقام ہے۔ پھر یہ شعر تنہا نامکمل ہے۔ اس سے پہلا شعر ہے:

"دنیا میں زندگی کرے آرام سے بسر ایمان اس کے ساتھ ہو وقت انتقال کے"

گویا یہ دونوں شعر قطعہ بند ہیں، لیکن دیوان میں اس کی صراحت نہیں۔ ذوق درمیان غزل و قصیدہ اس طرح کے قطعات نورا کم ہی کہتے ہیں۔ یہ آزاد کا انداز ہے کہ وہ ایک شعر میں مضمون پورا نہیں کرپاتے۔ اس لیے قطعہ بند اشعار کہتے ہیں۔ یہ خصوصیت ان کے قصائد میں نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ ذوق کے جتنے مُستند قصائد ملے ہیں، ان میں کسی میں حسن طلب کا وجود نہیں۔ لیکن مولانا آزاد نے اُن کے نام سے جتنے قصیدے تصنیف کیے ہیں، کم و بیش سب میں یہ جز داخل کر دیا ہے[1] چنانچہ اس میں بھی تین شعر بلکہ آخری پانچ شعر حسن طلب قرار دیے جاسکتے ہیں۔

---

[1] آج کل (جون ۱۹۸۲ء) راقم اس کتاب کے سلسلے میں دلی میں ہے۔ کل یونیورسٹی میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی صاحب سے رباعی مفرد دیکھ کر

قصائد

سب سے پہلے اس کلام کو لیا جائے جس پر کسی نے شک نہیں کیا بلکہ ہمارے دور کے دو دو محقق اس کے مدعی ہیں کہ انھوں نے اس کا مسودہ "بقلم ذوق" دیکھا ہے۔ اگرچہ بہ قلم ذوق قرار دینے کی وجہ انھوں نے بیان نہیں کی۔ ہماری مراد ۲۵ شعر کے اس قصیدے سے ہے جو سید عاشق نہال چشتی کی مدح میں ہے، اور جس پر ایک نوٹ بہ طور تقریبہ مصنف کی طرف سے لکھا گیا ہے اسی سے ڈاکٹر علوی اور ڈاکٹر فرخی نے دھوکا کھایا ہے۔ انھوں نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی کہ اگر ایک شخص خود کلام تصنیف کر کے ذوق سے منسوب کر سکتا ہے یا اس کے نام سے مسودے تیار کر سکتا ہے، تو اس قسم کا نوٹ بھی لکھ سکتا ہے۔ لہٰذا ایسے کلام کو قبول کرنے میں احتیاط کی ضرورت ہے۔

جیسا کہ ذکر ہوا، آزاد نے اپنے اڈیشن میں ۲۵ شعر کا ایک قصیدہ درج کیا ہے اور اس کی دستیابی سے متعلق ایک کہانی بھی بیان کی ہے۔ چوں کہ ہم نے آزاد کا مرتبہ دیوان بعد میں دیکھا اور کلیات مرتبہ ڈاکٹر علوی پہلے، اس لیے پہلے مذکورہ مرقعے کی عبارت ہمیں کلیات کے مطابق یاد تھی۔ بعد میں جب نسخۂ آزاد میسر آیا تو باہم اختلاف نے ذہن میں شبہ پیدا کر دیا۔ پہلے کلیات سے متعلقہ عبارت نقل کی جاتی ہے:

> حافظ ویران نے بھی اپنے اُستاد کے کلام کا ایک معتد بہ حصہ اپنے حافظے کی بنیاد پر مدون کرایا تھا۔ اس حق سے مولانا آزاد کو بھی محروم نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم مولانا کے یہاں کلام ذوق میں اصلاح دہی اور اضافہ کاری کی جو کوشش ملتی ہے، وہ کہیں کہیں اس قدر واضح اور غیر مشتبہ ہے کہ اس کی توجیہہ (بسا اوقات) بہت مشکل نظر آتی ہے۔ خاص طور پر ذوق کے ایسے مسودوں میں جو بالکل صاف واضح اور روشن خط میں مولانا کے پاس موجود اور محفوظ تھے۔ (اس عبارت سے ڈاکٹر صاحب نے جو مفہوم مراد لیا ہے وہ اس سے نہیں نکلتا۔ ڈاکٹر صاحب کا مقصد تو یہ ہے کہ جو مسودے آزاد کے پاس صاف اور روشن خط میں موجود و محفوظ ہیں، وہ غیر مشتبہ ہیں، اور ذوق ہی کا کلام ہے۔ حالاں کہ یہ عبارت انھیں مشکوک و مشتبہ قرار دے رہی ہے) اس کی ایک بہت نمایاں مثال سید عاشق نہال چشتی کی خدمت میں پیش کیا جانے والا وہ قصیدہ ہے جو ذوق کی اپنی تحریر میں مولانا کے پاس موجود تھا۔ اور اس کے خاتمے پر ذوق نے یہ لکھا تھا:

ہے۔ اس فہرست سے میں نے ایسے اشعار ترک کر دیے ہیں جن میں ایک لفظ کی تبدیلی یا اُلٹ پھیر پائی گئی۔ میں نے ایک سے زیادہ لفظوں کی تبدیلی والے اشعار کا انتخاب کیا ہے ؎ (ایسی تبدیلیوں سے بہت کم غزلیں بچی ہیں)
چناں چہ ہم اصلاحات و ترامیم کا ذکر نہیں کریں گے بلکہ صرف اضافوں سے بحث کریں گے۔ اِس تمہید کے بعد اضافوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

؎ ، مقالاتِ شیرانی ج ۳، ص ۲۵۲۔
اس کتاب کی فراہمی کے لیے راقم ڈاکٹر گیان چند جین کا شکر گزار ہے جنھوں نے کتاب مذکور حیدر آباد سے بھجوائی۔

کے بعد میں اصلیت کا علم ہوگیا اور بعض غلط فہمیوں کا ازالہ ہوگیا۔ خود کلام ذوقؔ کے سلسلے میں نگارستان میں شامل ذوقؔ سے منسوب ایسے کلام کو جس کی تصدیق کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہوتی، ڈاکٹر فرخی سوفی صد ذوقؔ کے اندازِ کلام کا نمائندہ قرار دیتے ہیں، لیکن اِس سوفی صدی کا تجزیہ اُنھوں نے پیش نہیں کیا۔ اس کے لیے ذوقؔ اور ظہیرؔ کے اندازِ کلام کا موازنہ ضروری تھا تاکہ معلوم ہوسکتا کہ دونوں کا رنگ کیا ہے اور ان کے مماثلات یا اختلافات کیا ہیں۔ بہرحال آیندہ سطور میں ہم مشکوک کلام کے سلسلے میں یہی تجزیاتی رویہ اختیار کریں گے فیصلہ اصحابِ نظر پر موقوف ہے۔ اگر ہمارے دلائل درست ہوں تو اُنھیں قبول کیا جائے ورنہ ہمیں اصرار نہیں یہاں یہ عرض کردینا مناسب ہوگا کہ بنیاد ہم نے بھی نسخۂ دیوان کو بنایا ہے (وجوہ پہلے بیان ہوچکے ہیں) اِس نسخے میں شامل اشعار کی تعداد پروفیسر شیرانی کے مطابق ۱۸۳۲ (صرف غزلیات) ہے۔ ڈاکٹر تنویر علوی نے اگرچہ مختلف اصناف کی فہرست کے ساتھ تعدادِ اشعار درج کی ہے لیکن اس میں طباعت کی ایسی غلطیاں ہوگئی ہیں کہ قطعی تعدادِ اشعار کا علم نہیں ہوپاتا۔ نسخۂ دیوان ہمارے پیشِ نظر بھی ہے لیکن ہمیں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم نسخۂ دیوان اور نسخۂ آزاد کا مشترک کلام آمنے سامنے درج کرتے جائیں تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ کہاں کہاں آزادؔ نے کتنے اشعار کا اضافہ کیا اور اُس میں کتنا کلام اصلی اور کتنا وضعی ہے۔ اس کے بعد کچھ وضعی کلام کا تجزیہ بھی پیش کردیا جائے گا تاکہ ہمارے نقطۂ نظر کی وضاحت ہوجائے۔ مولانا آزادؔ نے کلامِ ذوقؔ میں اضافے کے علاوہ اُن کے کلام پر اصلاحیں بھی دی ہیں۔ پروفیسر شیرانی مرحوم نے اپنے مضمون میں ایسی اصلاحوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ سلسلہ مقالات ج ۳، کے ۳۶ صفحات پر پھیلا ہوا ہے (۲۱۶ - ۲۵۲)۔ ہر صفحے پر عام طور سے ۱۳ شعر ہیں لیکن آخری صفحے پر ۹ یعنی ۴ شعر کم ہیں۔ اس سلسلے کے دو شعر ص ۲۱۵ پر بھی ہیں۔ اس طرح اشعار کی کُل تعداد ۴۶۲ ہوتی ہے نصف جس کے ۲۳۱ ہوں گے۔ گویا شیرانی مرحوم نے ۲۳۱ اصلاحی اشعار کا متن پیش کیا ہے لیکن کچھ صفحات پر حاشیے کی وجہ سے ایک آدھ شعر کم بھی ہے۔ لہٰذا یہ قطعی تعداد نہیں ہے۔ دیوان مرتبہ آزاد کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اصلاحیں اِس سے کہیں زیادہ ہیں۔ خود پروفیسر شیرانی نے اس کی طرف اِن الفاظ میں اشارہ کردیا ہے:

فہرستِ ہذا اکثر اشعار پر حاوی ہے۔ یہ دعویٰ نہیں کیا جاتا کہ ہر شعر اِس میں شامل

خیر، یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ اصل چیز تو جُنگ مذکور کی اصلیت کی تلاش ہے۔ مذاق کے خط میں آزاد نے دو باتیں نئی کہی ہیں، یعنی اپنے سابقہ بیانوں پر اضافہ کیا ہے۔ پہلی یہ کہ کتاب (جنگ) کے علاوہ پہلی مرتبہ آزاد اکثر مسودوں کی بھی بات کرتے ہیں جس کا مطلب ہے کہ اُس وقت تک جُنگ کے علاوہ اکثر مسودے بھی تیار ہو چکے تھے۔ اس جُنگ کو ڈاکٹر تنویر علوی ذوق کی اپنی بیاض قرار دیتے ہیں اور اس کے اندراجات میں بیشتر کو ذوق کے اپنے قلم کی تحریر مانتے ہیں۔ اس پر ہم کئی جگہ شبہے کا اظہار کر چکے ہیں۔ یہاں صرف ایک بات اور عرض کرنا ہے۔ اگر یہ خود ذوق کی بیاض تھی تو اس میں (کم از کم ان کی زندگی میں) دوسروں کا اپنے ہاتھ سے اپنا کلام درج کرانا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بلکہ یہ ہمارے قیاس کی تصدیق کرتا ہے کہ مولانا آزاد کے گھر میں کوئی بیاض تھی جس میں ان کے والد اور وہ اپنا پسندیدہ کلام درج کیا کرتے تھے۔ لہٰذا بیشتر تحریریں آزاد کے قلم کی ہیں۔ علوی صاحب نے اِن کے بہ قلمِ ذوق ہونے کا کوئی قطعی ثبوت ہم نہیں پہنچایا سوائے اِس کے کہ اِن میں اکثر غزلوں پر اسمائے مبارکہ کو "تمغۂ عنوان" بنایا گیا ہے۔ ہم یہ لکھ چکے ہیں کہ یہ آزاد کی عادت تھی، ذوق سے اِسے منسوب کرنے کے لیے ثبوت درکار ہے۔ ہم نے پہلے اِس سلسلے میں ڈاکٹر محمد صادق کو ملے مسوّدوں کا ذکر کیا تھا اب مقالاتِ شیرانی، ج ۳ دیکھنے کے بعد ہمارا خیال مزید پختہ ہو گیا ہے۔ جو مسودے شیرانی مرحوم کو ملے اُن پر بھی بہ طور تمغۂ عنوان "اللہ ولی" کے الفاظ موجود ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ آزاد پہلی بار اپنے والد کی کسی چھوٹی بیاض کا ذکر کرتے ہیں جس سے بخیال اُن کے، مذاق نے ذوق کے قصیدے نقل کیے ہوں گے۔ اغلباً ترتیبِ دیوان کے وقت یہ بیاض آزاد کے پاس موجود نہیں تھی۔

اِس تمام بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جُنگ اور مُسوّدوں سے مُتعلق آزاد کے بیانات مشکوک ہیں۔ اُنھیں بے شک وشُبہہ اصلی مان کر اُن کے اِندراجات پر انحصار نہیں کیا جاسکتا حتیٰ کہ اُس کلام پر بھی نہیں ڈاکٹر علوی اور ڈاکٹر فرخی جن کے اصل مسودے (بقلم ذوق) دیکھنے کے مُدّعی ہیں۔ ذوق کی وفات کو سو سال سے اُوپر گزر چکے ہیں۔ اب کسی قسم کے خارجی شواہد کے ملنے کا امکان کم ہے۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ داخلی شواہد پر بھروسا کیا جائے۔ اندازِ کلام اور رنگِ سخن اگرچہ FOOL PROOF اصطلاً میں نہیں ہیں۔ اِن میں غلطی اور غلط فہمی کا امکان ہمیشہ رہتا ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے اساتذہ دھوکا کھا چکے ہیں لیکن ایسی مثالیں موجود ہیں

خط کا حوالہ دیا گیا ہے اُس کی تاریخ کتابت یکم فروری ۱۸۸۸ء ہے۔ پروفیسر شیرانی مرحوم نے
جن چودہ غزلوں کے مسودے بہ خطِ آزاد تلاش کیے تھے اُن میں ایک کاغذ ریلوے کا مطبوعہ
فارم ہے جو جنوری ۱۸۸۸ء میں چھپا تھا۔ ظاہر ہے کہ چھپتے ہی مولانا آزاد کے ہاتھ نہیں لگ
گیا ہوگا بلکہ اُن تک پہنچتے پہنچتے کچھ دن لگے ہوں گے۔ اگر یہ فارم فروری میں بھی اُن کے ہاتھ
لگا ہو تو اُس پر لکھی گئی غزل اُس کے بعد ہی تصنیف کی گئی ہوگی۔ مذکورہ مسودوں میں مارچ
۱۸۸۸ء کے کاغذ بھی ہیں۔

اس خط سے ایک اور غلط فہمی ہو سکتی ہے، یعنی مولانا نے ہر ممکنہ ذریعے سے کلام بہم
پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ معلوم نہیں ٹُنٹے سے کس شخص نے اُنھیں مذاق کا نام لکھا تھا اور
اگر وہ آزاد کو اطلاع نہ دیتا تو مولانا ان کی طرف رجوع نہ کرتے۔ اس قیاس کا ثبوت یہ ہے
کہ اتنی دُور دُور سے کلام فراہم کرنے والا اپنے سامنے کے اور بآسانی دستیاب مآخذ سے
کوئی فائدہ نہیں اُٹھاتا۔ مثلاً جن تذکروں کا آزاد کو علم تھا اور جو اُن کی دسترس میں تھے، اُن
میں موجود کلام کو اُنھوں نے اپنے مرتبہ دیوان میں شامل نہیں کیا۔ نگارستانِ سخن مرتبہ
ظہیر دہلوی بھی اُنھیں آسانی سے دستیاب ہو سکتا تھا اور ممکن ہے اُنھوں نے دیکھا بھی ہو لیکن
اُس میں موجود کلام کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اس پر ڈاکٹر فرخی نے مفصل تبصرہ کیا ہے جس سے
اتفاق کرنا مشکل ہے۔ کیوں کہ ظہیر نے جو کلام اپنے انتخاب میں شامل کیا ہے وہ بہ وجوہ مشکوک
ہے (اس پر تبصرہ حسبِ موقع آئے گا) اور ڈاکٹر فرخی کا یہ جملہ کہ "اس کا انداز سو فی صدی
ذوق کا ہے" سنجیدہ غور و فکر کا نتیجہ نہیں معلوم ہوتا۔ ڈاکٹر فرخی کا تھیسس مثالی حیثیت رکھتا
ہے۔ اس کے باوجود یہ محسوس ہوتا ہے تصانیفِ آزاد کے سلسلے میں انھوں نے سب
سے کم توجہ مولانا کے مرتبہ دیوانِ ذوق پر صَرف کی ہے، اور جو کچھ اُنھیں پروفیسر شیرانی مرحوم
کے مبسوط سلسلۂ مضامین میں ملا اُسی سے استفادے پر اکتفا کر لی، کہیں کہیں تنقید و تبصرہ
ضرور کر دیا، جو درست نہیں۔ انھوں نے دیوانِ ذوق کی تدوین کے سلسلے میں جو الفاظ مولانا
آزاد کے لیے استعمال کیے ہیں، کم و بیش وہی اُن کے تھیسس کے اِس حصے کے لیے کہے
جا سکتے ہیں۔ بہر حال، کہنا یہ تھا کہ آزاد نے دیوانِ ذوق کی ترتیب میں اگرچہ غیر معمولی محنت
بلکہ مشقت کا ثبوت دیا ہے لیکن کلام کی فراہمی کے لیے انھوں نے قطعاً کوشش نہیں کی۔
پروفیسر شیرانی کا یہ کہنا غلط نہیں کہ ان کے دیوان کی بنیاد نسخۂ ویران اور مبتینہ جنگ ہے۔

نے توفیق دی اور تائیدِ الٰہی نے یاوری کی کہ ایک کتاب اور اکثر مسودے متفرق ان کے ہاتھوں کے میں لے کر نکلا۔ یہ کتاب وہی ہے جس میں کہ آپ بھی اپنے ہاتھ سے کچھ کچھ اشعار اپنے لکھ آتے ہیں۔ آپ کے بعد اس میں بہت کچھ اور لکھا گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس فرض کے ادا کا وقت آپہنچا اور صرف پندرہ دن کا کام باقی ہے۔

اس ہفتے پٹنے سے کسی خدا ترس بندے کی تحریر پہنچی۔ اس نے آپ کا نام مبارک لکھا ہے کہ بدایوں میں ان کے پاس دو قصیدے استادِ مرحوم کے ایسے ہیں کہ دیوان مطبوعہ میں نہیں ہیں۔ میں نے غور کیا تو سمجھ میں آیا کہ عجیب نہیں جن دنوں آپ دلّی میں تشریف رکھتے تھے والد مرحوم کی چھوٹی بیاض یا استادِ مرحوم کے مسودات خاص میں سے آپ نے دو قصیدے نقل کیے (ہوں) آپ وہ دونوں قصیدے عنایت فرمائیں تو اس مجموعے میں داخل کیے جائیں۔ تاکہ اگر دیوان مطبوعہ میں نہیں مشتہر ہوئے تو اب مشتہر ہو جائیں انہیں اللہ مغفرت کرے وہ اب کچھ نہیں کر سکتے۔ ہم لوگوں کو بھی اللہ نے دسترس دے رکھی ہے واجب ہے کہ اُن کی آرزوؤں کو پورا کرنے میں سعادت حاصل کریں۔ وہ آج کچھ نہیں کر سکتے۔ قریب ہے وہ دن کہ ہم بھی نہ کر سکیں گے۔ آج اگر ہم ان کی آرزوئیں پوری کریں گے تو خدا ہماری آرزوئیں پوری کرے (گا)۔ ان کا فرزند نہ رہا۔ اللہ اسے مغفرت کرے۔ یہ فرزندانِ معنوی ہیں انہیں اللہ آپ کے اور میرے ہاتھوں عمر دیتا ہے۔ آپ کا تعلق تلمذ قدیمانہ کا ان (کذا) ان کے ساتھ اور شفقت و محبت جو بندہ آزاد کے ساتھ ہے اس کا لحاظ کر کے اُمید قوی ہے کہ آپ دونوں قصیدے وہ اور جو اشعار اور آپ کے خیال میں ہوں کہ دیوان مطبوعہ میں نہیں جلد مرحمت فرمائیں گے اور بندہ آزاد کو اوقاتِ مختلفہ میں دعائے خیر سے یاد کریں گے۔"

(بحوالہ محمد حسین آزاد، ج ۲، ص ۵۲۱)

معلوم ہوتا ہے کہ مذاق کے پاس ذوق کا کلام نہیں تھا اس لیے انھوں نے آزاد کو کچھ نہیں بھیجا۔ ورنہ آزاد ایسے بے مُروّت نہیں تھے کہ اُن کے فراہم کردہ دو قصیدوں پر ان کا حوالہ نہ دیتے۔ بہ قول آزاد یہ خط اُس وقت کا ہے جب دیوان کی تدوین میں صرف پندرہ دن کا کام باقی تھا، لیکن یہ محض اندازا تھا۔ آزاد اس کے کافی عرصہ بعد تک دیوان مُرتّب نہیں کر پائے ہوں گے۔ اوّل اِس لیے کہ اُن کے مُرتّبہ دیوان کے خاتمے پر جو عبارت ہے وہ اِس کی تردید کرتی ہے کہ دیوان ۱۸۸۸ء کے شروع میں مُدوّن ہو گیا ہوگا۔ دوسرے اُوپر جس

کو چھانٹنے، صاف کرنے اور ترتیب دینے کی ضرورت نہ تھی، اُنھیں خود اپنے گھر میں یہ کلام میسّر آجاتا۔ والدِ مرحوم (جو اُس وقت زندہ تھے) کی بیاضیں دیکھ لیتے اور کلام مرتب کرکے مطبع سے شائع فرمادیتے بلکہ ذوق کی زندگی ہی میں دیوان شائع کردیتے۔ اِس داستان کے وضعی ہونے کا ایک معمولی سا ثبوت یہی ہے کہ جب ۱۲۵۹ھ میں مولوی باقر کے پریس سے گلشنِ بے خار کا دوسرا اڈیشن شائع ہوا تو اُس میں کلامِ ذوق کے اِنتخاب میں کُل ۱۶۱ شعر کا اضافہ کیا گیا جس سے پہلے یہ فقرہ درج ہے: "یہاں تک اشعار تذکرۂ سابق سے نقل کیے ہیں اور باقی مہتمم مطبع نے بہت کوشش سے بہم پہنچا کر لکھے ہیں"۔ مطبع مولوی باقر کا تھا، مہتمم چاہے موتی لال ہوں۔ اب مہتمم کو بہت کوشش کی کیا ضرورت تھی؟ ذوق زندہ، اُن کے جگری دوست مولوی باقر زندہ، وہ خود ذوق سے مل کر کلام حاصل کرلیتے۔ کہا جاسکتا ہے کہ ذوق نے سب مسودے مٹکوں میں بھر دیے تھے اور ان کا نکالنا ممکن نہ تھا کہ فرصت نہ تھی لیکن مالکِ مطبع مولوی باقر کے پاس تو کئی بیاضیں موجود تھیں۔ اُن میں ڈھیروں کلام صاف کیا ہُوا موجود تھا۔ اِس کے باوجود کُل ۱۶۱ شعر کا اِضافہ ہوسکا، اُن میں بھی کچھ اشعار شک و شُبہے سے بالا نہیں۔ اِسی سے ہمارا خیال ہے ذوق نے بے خار کا یہ اڈیشن نہیں دیکھا تھا۔ کہا جاسکتا ہے کہ ذوق کی زندگی میں اُن کے نام سے الحاقی یا وضعی کلام شائع نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ذوق کو اُسے دیکھنے کی فرصت ہی نہیں معلوم ہوتی ورنہ وہ خود اگر مولوی باقر مانگتے تو اپنا کلام فراہم کردیتے۔ لہٰذا ان "کئی بیاضوں" کا وجود بھی مشکوک ہے۔ البتہ ایک آدھ بیاض تھی ضرور، اور اِسے وہی جُنگ سمجھ لیجیے جس میں آزاد "ظاہر و غائب" ذوق کا بلکہ اوروں کا بھی کچھ کلام یا مولوی باقر اپنے پسندیدہ اشعار درج کرتے رہے ہوں۔ نیز یہ بھی کہ اگر کسی معاصر شاعر کا کچھ کلام پسند آگیا اور وہ خود دہلی میں موجود ہوا تو خود اُس سے بھی بیاض میں اشعار لکھوا لیتے ہوں گے (یہ اُس دَور میں عام ہوتا ہے۔ اکثر شعرا نے خود اپنے دوست تذکرہ نگاروں کی بیاضوں میں اپنے اشعار لکھے ہیں) چناں چہ مذاق بدایونی تلمیذ ذوق کے نام آزاد کے ایک خط سے یہی ظاہر ہوتا ہے:

"... مشفق بر کاتہم ... مر کا کلام اگر اُن کے پاس سے باہر ... تی سے نکلتے وقت پروردگار

جاتا۔ یہ عین ممکن ہے کہ مولوی باقر نے کوئی بیاض بنائی ہو (جیسا کہ عام طور سے اُس زمانے میں لوگ کرتے تھے۔ خود آزاد کی بیاض موجود ہے جس میں انھوں نے اپنے پسندیدہ اشعار نقل کیے ہیں اور اسی نام سے چھپ چکی ہے۔) اور اُس میں اپنی پسند کے اشعار نقل کرتے رہتے ہوں جن میں کچھ اشعار ذوق کے بھی ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ یہ مشکوک ہے (وجہ شبہہ آگے آتی ہے۔) چناں چہ ڈاکٹر اسلم فرخی کا یہ خیال قبول نہیں کیا جا سکتا کہ "آزاد کی ذوق پرستی کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں جب اُنھیں اپنا گھر چھوڑنا پڑا تو اُنھوں نے اُستاد کے کلام کو اپنا سب سے قیمتی سرمایہ سمجھ کر اسے حرزِ جاں بنایا اور باقی سامان کی پروا نہ کی۔" (ص ۹۲) ذوق پرستی تو ظاہر ہے لیکن کلام کا حرزِ جاں بنا کر باقی سامان کی پروا نہ کرنا یقیناً مشکوک اور بعد کی گھڑی ہوئی کہانی ہے۔ پھر یہ جُنگ جسے بعد کو اتنی شہرت دی گئی خلیفہ اسماعیل کے ساتھ غدر میں ضائع ہو گیا تھا۔ اب جو بڑی تقطیع کی بیاض ملتی ہے وہ آزاد کی اپنی ہے اور اُس میں خود اُنھوں نے ذوق کا وضعی یا اصلی کلام دیوان مرتب کرنے کی غرض سے درج کیا ہے۔ آزاد دیوانِ ذوق میں جُنگ کی کہانی سُنانے سے پہلے لکھتے ہیں: "والدِ مرحوم نے آغازِ شباب میں کئی بیاضیں بنائی تھیں۔ وہ ہمیشہ علمی اور منصبی کاروبار میں عدیم الفرصت تھے۔ باوجود اس کے جب فرصت پاتے تو اُستاد کا کلام اُن سے لیتے اور صاف کرتے جاتے۔ بداندیشوں میں گھرے ہوئے تھے اِس لیے بہت احتیاط کرتے تھے۔ اپنی تصنیف کسی کو دیتے نہ تھے۔ البتہ جو چیز والدِ مرحوم کو دیتے جانتے تھے کہ اب محفوظ ہو گئی۔"

جُنگ کی کہانی، ذوق کی وفات کے فوراً بعد کلام کی ترتیب کی کوشش اور غزلوں کو صاف کرنا جیسے بیانات کو دیکھتے ہوئے مندرجہ بیان پر یقین کرنے کے لیے بڑی سادہ لوحی کی ضرورت ہے۔ اوّل تو ذوق کے بداندیشوں میں گھرے ہونے کا کوئی ثبوت ہے نہ سبب۔ دوسرے جب "والدِ مرحوم" نے کئی بیاضیں بنائی تھیں تو وہ کیا ہوئیں؟ پھر اگر ایسی کئی بیاضیں تھیں اور مولوی باقر ذوق سے اُن کا کلام لیتے اور صاف کرتے جاتے تھے (یہ کام مولوی باقر کے آغازِ شباب سے جاری تھا) تو ذوق کے انتقال کے وقت اُن کا کلام مرتب اور صاف شدہ حالت میں موجود ہونا چاہیے تھا۔ اور اگر ایسا ہوتا تو آزاد کو ذوق کی وفات کے چند روز بعد خلیفہ اسماعیل کے ساتھ مل کر اور اُن کے گھر جا کر مسودوں

چلتے وقت ایک چھوٹی سی دری اور آٹا وغیرہ گوندھنے کے لیے ایک لکڑی کا کٹھرا (تسلا)
بھی دے دیا تھا۔ وہ بھی ساتھ تھا۔ (جب تسلا ساتھ تھا تو ٹھیکرے پر آٹا گوندھنے کا
کیا مطلب) اور شہر سے باہر نکلا چاہتے تھے کہ ایک فرنگی نے ٹوکا اور ساتھ ہی اپنی
بندوق کی سنگین سے سر کا پلندہ اٹھا کر زمین پر دے مارا۔ (بغل کا پلندہ سر پہ
کب پہنچا؟) اور کہا کہ اے بڈھا اس میں کیا ہے؟ سنگین اور پاؤں کی مدد سے
پلندہ کھول ڈالا جب اُس میں سوائے پرانے کاغذ کے پرزوں کے اور کچھ برآمد نہ
ہوا تو کچھ بکتا ہوا چل دیا۔ (لے کے جُنگ چلے تھے۔ پلندے میں کاغذ کے پُرزے
کہاں سے آ گئے۔ کیا جُنگ پُرزے پُرزے ہو گیا تھا؟) آزاد نے بدقت تمام
کاغذات جمع کیے اور جلدی جلدی باندھ کر آگے روانہ ہوئے۔ یہاں تک کہ شہر
سے باہر نکل گئے۔" (لطیفے بحوالہ محمد حسین آزاد، ج ۱)

اسی مشکوک بیان سے ڈاکٹر صاحب یہ نتیجہ بھی نکالتے ہیں:
۱۸۵۷ء میں آزاد کی عمر ستائیس سال تھی لیکن پے بہ پے مصائب و آلام نے انھیں
قبل از وقت بوڑھا بنا دیا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ فرنگی نے انھیں بوڑھا کہہ
کر مخاطب کیا تھا۔ دلّی سے نکل کر کہاں کہاں گئے اس کی تفصیل آگے پیش ہوگی۔

اس پر کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اول تو یہ واقعہ پیش ہی نہیں آیا، یا پھر وہ فرنگی اندھا تھا۔
دلّی سے نکل کر آزاد ڈیڑھ برس تک مارے مارے پھرے۔ پہلے لکھنؤ پہنچے۔ کچھ عرصہ
وہاں قیام کیا۔ وہیں انھیں معلوم ہوا کہ اُن کے وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے ہیں۔ لہٰذا
وہاں سے نکل کھڑے ہوئے اور پنجاب (جیند، سنگرور وغیرہ) میں آ کر دم لیا۔ یہ سارا
عرصہ وہ استاد کا کلام کے لیے پھرے' ذرا مشکوک ہے۔ اس سفر آوارگی میں حالت
یہ تھی:

جیب میں ایک کوڑی نہ تھی۔ جگہ جگہ مسجدوں اور سراؤں میں ٹھہرتے' محنت مزدوری
کرتے۔ آخر چلتے چلتے لکھنؤ جا پہنچے۔ (نقوش بحوالہ محمد حسین آزاد ج ۱ ص ۱۱۳)

دراصل جُنگ سے متعلق اُن کا بیان بہت بعد کا ہے۔ جب تک "استاد" کا کلام مرتب
کرنے کی خواہش شدید ہو چکی تھی اور وہ گاہ گاہ نامکمل غزلوں کو پورا کرنے کی کوشش
کرتے رہتے تھے۔ ورنہ یہ جُنگ کہیں جُنگ، کہیں چھوٹی بیاض اور کہیں مسودوں میں بدل

گئے ہی نہیں۔ گولی مار دیے جانے کی افواہ سن کر گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ آزاد کی ایک خاندانی بیاض میں مولوی محمد باقر کی تاریخ وفات ۲۶ محرم ۱۲۷۴ھ درج ہے۔ (اور اس پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں) ۲۶ محرم برابر ہے ۱۶ ستمبر ۱۸۵۷ء کے۔ گویا آج وہ گرفتار ہوئے کل انھیں گولی مار دی گئی۔ بلکہ بعض قرائن تو اس پر دلالت کرتے ہیں کہ انھیں اسی دن گولی ماردی گئی تھی۔ مندرجہ بالا بیان پر ڈاکٹر اسلم فرخی کا تبصرہ یہ ہے:

> اس روایت سے پہلا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مولوی باقر چودہ دن سے زیادہ قید میں رہے اور اس کے بعد انھیں گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ ہم مولوی باقر کے حالات میں آغا محمد باقر کی ایک خاندانی بیاض کا تذکرہ کر چکے ہیں جس کی رو سے ان کی تاریخ وفات ۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء معلوم ہوتی ہے (۱۹ نہیں ۱۶ ستمبر! اور یہی ڈاکٹر فرخی لکھ چکے ہیں) اگر اس بیاض پر اعتماد کیا جائے تو پھر یہ واقعہ اور سکھ جرنیل کی روایت دونوں کی صحت مشتبہ ہو جاتی ہے۔ (یقیناً مشتبہ ہے۔ ڈاکٹر فرخی کے ذہن میں آغا محمد باقر کے دو مختلف بیانات محفوظ نہیں رہے جو ایک دوسرے کی تردید کرتے ہیں۔ پیچھے ایک بیان نقل ہو چکا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ برف خانے پہنچ کر اس کنبے نے ایک ٹھیکرے پر آٹا گوندھا اور ٹھیکرے ہی کو توا بنا کر کچی پکی روٹیاں پکائیں۔ دوسرا بیان فرخی صاحب نے اس تبصرے کے فوراً بعد نقل کیا ہے چناں چہ اس کے بعد پیش ہوگا۔) اس کے علاوہ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ قیدیوں کو چودہ دن تک قید رکھنا اور پھر انھیں گولی مار دینا اس زمانے کے عام واقعات سے مطابقت نہیں رکھتا۔ ۱۸۵۷ء میں فاتح انگریز فوج نے بلا سوچے سمجھے جس کو جی چاہا قتل کر دیا جو سامنے آجاتا تھا گردن زدنی ٹھہرتا تھا۔ ان حالات میں مولوی محمد باقر کا چودہ دن سے زیادہ جیل میں رہنا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

حیرت صرف اس امر پر ہے کہ ان بیانات کو رد کرنے کے باوجود ڈاکٹر فرخی نے انھیں سے کئی اہم نتائج اخذ کیے ہیں جو درست نہیں۔ ڈاکٹر فرخی آگے چل کر لکھتے ہیں "آزاد عجب شان سے دلّی سے نکلے"۔ بقول آغا باقر:

> صدمات نے انھیں بڈھا کر دیا تھا۔ دنیا آنکھوں میں اندھیر تھی۔ کہیں جانے کا راستہ نہ ملتا تھا۔ اُستاد کے کلام کا پلندہ بغل میں تھا۔ اس کے علاوہ سکھ سردار نے

دنیا آنکھوں کے سامنے اندھیر ہوگئی جب طبیعت نے یاوری کی تو دیکھا کہ ہاتھ سے اشارہ
کر رہے ہیں کہ بس آخری ملاقات ہوگئی۔ اب رخصت ہو دیر نہ کرو۔ اس اشارے
کے بعد انھوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ایسی حالت
میں اپنے پیارے اور اکلوتے بیٹے کے لیے کیا کیا دعائیں مانگی ہوں گی (ویسے آزاد
کی دو بہنیں بھی تھیں) آزاد نے اس وقت لاکھ ضبط کیا لیکن نہ رہ سکا اور وہاں سے
روتے ہوئے رخصت ہوئے اور اس وقت تک اس وفادار جرنیل کی حفاظت میں
رہے جب تک شاہجہاں آباد کی یہ مقدس اور معصوم روحیں قفس عنصری میں قید
رہیں۔[1]

اس سے قطع نظر کہ ۱۸۵۷ء کیا ۱۹۴۷ء تک انگریزی فوج میں کسی غیر انگریز کو جرنیلی کا عہدہ نصیب
نہیں ہوا، خط کشیدہ جملے پر نظر رہے یعنی جس دن آزاد نے عیال کو رخصت کیا اس کے دوسرے
یا تیسرے دن باپ کی ملاقات کو گئے۔ اب یہ بیان ملاحظہ ہو:

آزاد کو بچپن سے وظیفے اور درود پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ انھوں نے جرنیل
کے مکان میں رہ کر سورہ "صم قریش" کا ورد شروع کیا۔ یہ وظیفہ چودہ دن آدھی رات
کے بعد پڑھا جاتا ہے اور چودہ دن کے بعد دلی مراد بر آتی ہے۔ آزاد کو اس وظیفے پر
بڑا بھروسہ تھا۔ جرنیل صاحب کے کیمپ کے پاس (پہلے مکان تھا اب کیمپ ہوگیا)
ایک کھنڈر مکان تھا جو اس وظیفے کے لیے نہایت مناسب تھا۔ آزاد چودہ راتیں برابر
وظیفہ پڑھ کر اس کھنڈر میں سوتے رہے، آخری رات کو انھوں نے خواب میں دیکھا
کہ کوئی شخص آیا ہے اور کہہ رہا ہے: "محمد حسین لے کنجیاں لے!" یہ آواز تین مرتبہ کان
میں آئی اور ان کی آنکھ کھل گئی۔ اٹھ کر ادھر ادھر کنجیاں تلاش کرنی شروع کیں آخر
اس نتیجے پر پہنچے کہ قفل مراد کی کنجیاں ہاتھ آگئیں۔ آخر شہر میں یہ افواہ پھیلی کہ تمام
قیدیوں کو گولی کا نشانہ بنا دیا گیا ہے۔ آزاد عجیب عالم میں دلی سے نکلے ہیں۔[2]

پہلے بیان میں دوسرے تیسرے دن والد کی ملاقات کو گئے تھے۔ اب ۱۵ ویں دن گئے بلکہ

---

[1] آب حیات کے لطیفے بحوالہ محمد حسین آزاد، ج ۱ مصنفہ ڈاکٹر اسلم فرخی۔ ص ۷۷
[2] آب حیات کے لطیفے۔ بحوالہ محمد حسین آزاد، ج ۱ ص ۱۰۸ - ۱۰۹

چاروں طرف سنگین فوجی پہرہ تھا کہ کوئی جان بچا کر نکلنے نہ پائے۔ جنرل سردار نے واپس آکر آزاد کو ان حالات سے آگاہ کیا۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ دوسرے روز جنرل صاحب اپنے گھوڑے پر چلیں اور آزاد بحیثیت سائیس اس کے ساتھ ساتھ دوڑیں اور اس طریقے سے قیدیوں تک پہنچ جائیں۔ دوسرے روز اسی تجویز پر عمل ہوا۔ آزاد سائیس کا لباس پہنے جنرل کے گھوڑے کے ساتھ ساتھ چلے اور آخر اُس مقام تک پہنچے جہاں باغی قیدی اپنی زندگی کی آخری سانسیں گزار رہے تھے۔ کوئی بھوک سے رو رہا تھا۔ کسی کو موت اور بربادی کا الم نیم جاں کیے تھا۔ بہت سے بےفکرے اِس عالم میں بھی بے فکر تھے شطرنج اور چوسر اور گنجفے کی بازی لگ رہی تھی۔ انھیں لوگوں میں ایک طرف کو ایک مردِ خدا خلوص دل سے عبادت میں مشغول تھا۔ یہی آزاد کے شفیق بڈھے باپ تھے (مولانا محمد باقر کی عمر اس وقت ستر سال سے زائد تھی) (توسین کا فقرہ اغلباً ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب نے بڑھایا ہے۔ ویسے اُنھوں نے مولوی باقر کی ولادت کے دو سنہ ۱۷۸۰ء اور ۱۸۱۰ء لکھے ہیں اور ترجیح ۱۸۱۰ء کو دی ہے لیکن اِس فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے سنہ کو درست مانتے ہیں کیونکہ ۱۸۱۰ء کو درست ماننے کی صورت میں اُس وقت مولوی باقر کی عمر ۴۷ برس ہوگی اور ۱۷۸۰ء کے لحاظ سے ۸۰ کے قریب۔ اِسی لیے ہم نے کتاب کے پہلے حصے میں یہ لکھا ہے کہ ڈاکٹر فرخی پہلے سنہ کو درست مانتے ہیں حالاں کہ یہ درست نہیں معلوم ہوتا۔ سبب اِس کا یہ ہے کہ آزاد کی ولادت ۱۸۳۰ء میں ہوئی اور وہ مولوی باقر کی پہلی بیوی سے تھے۔ گویا جب وہ پچاس برس کے تھے تو اُن کے یہاں پہلی اولاد ہوئی۔ دو چار سال کے بعد وہ بیوی وفات پا گئیں۔ مولوی باقر نے کئی سال تک دوسری شادی نہ کی، لیکن پھر کرلی تو اس وقت اُن کی عمر ۶۰ سال سے کیا کم ہوگی۔ کچھ عرصے بعد دوسری بیوی کا بھی انتقال ہوگیا۔ اُس کے بعد اُنھوں نے ایک تیسری شادی بھی کی اور یہ بیوی ۱۸۵۷ء میں زندہ تھیں۔ کیا اُنھوں نے ۷۰ برس کی عمر میں تیسری شادی کی تھی؟) بہت دیر کے بعد نظر اُٹھائی تو تھوڑے فاصلے پر اپنا پیارا لاڈوں کا پالا جگر گوشہ سائیسوں کے لباس میں کھڑا ہوا نظر آیا۔ ایک دم چہرے پر پریشانی کے آثار ظاہر ہونے۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اِدھر یہی حالت بیٹے پر گزری

۱۸۹۰-۱۸۹۲ء کے دوران کسی وقت مجنوں ہو گئے تھے۔ آخر آزاد ان کی والدہ سے یہ سب باتیں کب بیان کرتے تھے اور وہ آغا باقر سے کب بیان کرتی تھیں ؟) یہاں بیٹھ کر یہ فیصلہ ہوا کہ تمام قافلہ منشی بشیر حسین کے ساتھ سونی پت روانہ ہو جائے منشی صاحب چھاپے خانے کے منتظم تھے اور اُن کے والد بھی ان سے پہلے یہی خدمت بڑی دیانت داری سے انجام دیتے رہے تھے (؟) اس لیے ان پر ہر قسم کا بھروسہ تھا۔ بدقت تمام بیل گاڑیاں کرایہ پر کی گئیں اور تمام سواریاں منشی صاحب کی نگرانی میں سونی پت روانہ ہو گئیں۔ آزاد کو ہر چند سب نے کہا کہ ہمارے ساتھ چلو اور اپنی جان کو مزید خطرے میں نہ ڈالو لیکن اُنھوں نے کہا کہ اللہ نگہبان ہے میں ایک مرتبہ اپنے والد سے ضرور ملوں گا۔ آخر سب روتے پیٹتے روانہ ہو گئے اور آزاد وہاں سے اپنے اُستاد کا کلام بغل میں دبائے سیدھے دہلی آ گئے۔

ہماری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اُستاد کا کلام، اگر کوئی تھا تو وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ سونی پت کیوں نہ بھیجا گیا۔ اتنی مشکل سے آزاد اُسے بچا کر لاتے تھے پھر اُسے ساتھ واپس لے جا کر معرضِ خطر میں کیوں ڈالا ؟ وہ تو آوارگی میں مبتلا تھے اور یہ معلوم نہیں تھا کہ کہاں کہاں بھٹکنا پڑے گا اس کے باوجود وہ "اُستاد" کا کلام ساتھ لے گئے۔ اس کے بعد کے واقعات زیادہ دردناک ہیں شہر میں نفسا نفسی کا عالم تھا۔ فتحیاب لشکر کے سپاہی جوشِ انتقام سے چُور شاہجہان آباد کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کے لیے تیار تھے۔ ہر شخص اُن کی نظروں میں گشتنی، سوختنی، گردن زدنی تھا۔ اس عالم میں آزاد کی کون مدد کرتا اور وہ کس کی دست گیری کے طالب ہوتے ؟ (محمد حسین آزاد ج ۱، از ڈاکٹر اسلم فرخی، ص ۱۰۷) بہ قول آغا باقر:

آخر آزاد کو ایک سکھ جرنیل کا خیال آیا کہ وہ مولانا محمد باقر کا بہت دوست تھا..... اس کے پاس پہنچے...... اس نے وعدہ کیا کہ جس طرح بھی ہوگا میں تمہاری مدد کروں گا۔ چناں چہ اُس نے سب سے پہلے یہ مشورہ دیا کہ اپنا لباس تبدیل کرو اور میرے سائیس کا لباس پہنو..... آزاد نے اسی پر عمل کیا۔ کہتے ہیں پہلے اس نے خود دہلی دروازے کے باہر جا کر باغی قیدیوں کا معائنہ کیا کہ لق و دق میدان میں پڑے تھے۔

سے آبِ حیات کے لیے بحوالہ محمد حسین آزاد، ج ۲، از ڈاکٹر اسلم فرخی۔

آتے اور بند وقتیں دکھائیں کہ جلد نکلو" ۲۲ نیم جانوں کی تفصیل ڈاکٹر اسلم فرخی کی کتاب میں دیکھی جا سکتی ہے۔ بعد کی کہانی آغا محمد باقر نے بیان کی ہے، ملاحظہ ہو:

یہ قافلہ دھوبی واڑے سے ہو کر برف خانے پہنچا (جہاں اب کناٹ پلیس ہے) (قوسین کا جملہ — غالباً ڈاکٹر اسلم فرخی نے بڑھایا ہے، اور یہ درست نہیں۔ برف خانہ جنتر منتر کے قریب واقع تھا اور جنتر منتر یہاں سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر تھا۔ یہ لوگ بڑی مصیبت جھیل کر وہاں پہونچے اور جان میں جان آئی (غالباً آغا باقر نے دلی نہیں دیکھی تھی) اس وقت دلی کی برباد شدہ لوگوں کو کوئی پانی پلانے کا بھی روادار نہ تھا کہ کہیں خود بغاوت کے الزام میں ماخوذ نہ ہو جائے۔ کسی درخت کے نیچے ڈیرے ڈال دیے اور کھانے پینے کی فکر ہوئی، کہ کئی دن سے سب چھوٹے بڑے فاقوں سے تھے۔ (ڈاکٹر فرخی نے اِس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ بھلا کشمیری دروازے سے نکل کر برف خانے تک پہنچنے میں کتنی دن کے فاقے کیوں کر ہو گئے؟) پیٹ بڑا دوزخ ہے جس کو ہر حال میں بھرنا ہی پڑتا ہے جو کچھ کسی کے پاس اتفاق سے رہ گیا تھا اُس نے نکال کر پیش کیا۔ وہاں ہزاروں دقتوں سے سونے کی تول آٹا ملا۔ ایسی حالت میں توا چولہا کہاں سے ملتا۔ مٹی کے ٹھیکرے میں آٹا گوندھا۔ پتھر جمع کر کے اُن کا چولہا بنایا۔ اِدھر اُدھر (سے) درختوں کے نیچے اور سوکھی ٹہنیاں جمع کیں اور آگ جلائی۔ ٹھیکرے ہی سے توے کا کام لیا اور کچھ کچی پکی روٹیاں پکائیں۔ کہیں سے مانگ تانگ کر لہسن، مرچیں اور نمک مہیا کیا۔ اُسے بھی پتھروں پر پیسا اور چٹنی تیار کی گئی۔ (جہاں ماخوذ ہونے کے ڈر سے کوئی پانی پلانے کا روادار نہ تھا، وہاں لہسن مرچیں وغیرہ دینے والے سخی کہاں سے پیدا ہو گئے؟) میری والدہ بیان کرتی تھیں کہ آزاد مرحوم کہا کرتے تھے 'بیٹی اس لہسن کی چٹنی اور ٹھیکروں پر پکی ہوئی روٹی میں ایسا مزہ آیا جو کبھی پلاؤ زردے اور قورمے بریانی میں نہیں آیا۔' (آغا محمد باقر کے اِس بیان پر ڈاکٹر فرخی نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ آغا باقر بیٹے ہیں آغا محمد ابراہیم کے۔ آزاد کے دلی سے نکلتے وقت تو آغا باقر کے والد یعنی آغا ابراہیم بھی پیدا نہیں ہوئے تھے۔ آغا ابراہیم غدر کے چھٹے سال بعد ۱۸۶۳ء میں پیدا ہوئے — چوبیس برس کی عمر یعنی ۱۸۸۷ء میں اُن کی شادی ہوئی۔ آغا باقر اپنے والد کی غالباً چوتھی اولاد تھے۔ کچھ برس تو اُن کے عالمِ وجود میں آنے میں بھی لگے ہوں گے۔ آزاد

اب آزادؔ کے مآخذ کی تلاش میں نکلیں۔

جس جُنگ کو وہ دلّی سے لے کر نکلنے کے مُدّعی ہیں اُس میں وہی غزلیں ہوں گی جو
اُنھوں نے خلیفہ اسماعیل کے ساتھ مل کر صاف کی ہوں گی (قرائن اس کی تردید کرتے ہیں)
لیکن مولانا کے مندرجہ بالا بیان میں یہ فقرہ بھی موجود ہے: "افسوس ہے کہ خلیفہ محمد اسماعیل
اُن کے فرزندِ جسمانی کے ساتھ اُن کے فرزندِ روحانی (مسوداتِ کلام) بھی دُنیا سے رخصت
ہوگئے"۔ ہم نے پہلے یہ بیان آبِ حیات سے نقل کیا تھا۔ اب کلیاتِ ذوقؔ مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد
علوی کے مقدمے سے نقل کیا ہے صرف یہ دکھلانے کے لیے کہ "فرزندِ روحانی" سے ذوقؔ
کا کلام مُراد لینے والے ہم تنہا ہی نہیں ہیں بلکہ مرتّبِ کلیات کا بھی یہی خیال ہے۔ چناں چہ
قوسین میں "مسوداتِ کلام" کا اضافہ اُنھیں کا ہے۔ اِس کے باوجود تیس سال کے بعد
جب آزادؔ "اُستاد" کی غزلوں کا جُنگ بغل میں مار لانے کی بات کرتے ہیں تو ہمارے
محققین اُسے من و عن قبول کر لیتے ہیں اور "بڑی تقطیع کی اس بیاض" کو ذوقؔ کی بیاض ماننے
میں اُنھیں تامّل نہیں ہوتا جو مولانا آزادؔ کے پاس تھی۔ اِس جُنگ پر پہلے کئی جگہ اظہارِ خیال
کیا جا چکا ہے، اعادے کی ضرورت نہیں۔ ذوقؔ کی مثنوی "نامۂ جانسوز" کے سلسلے میں
آزادؔ یہ اعتراف کر چکے ہیں: "میرے صاف کیے ہوئے مسودے بھی اُنھیں متفرق غزلوں
میں تھے جو خلیفہ صاحب کے پاس جا کر صاف کیا کرتا تھا"۔ مطلب صاف ہے۔ غدر میں سارا
کلام ضائع ہوگیا۔ آزادؔ کچھ بھی ساتھ نہیں لا سکے۔ آزادؔ نے غدر میں گھر سے نکلنے کی جو دردناک
کہانی بیان کی ہے وہ بھی محض افسانہ ہے۔ اُس میں حقیقت صرف اِتنی ہے کہ آزادؔ ۲۲ جانوں
کے کُنبے کے ساتھ گھر سے بلکہ شہر سے نکلے۔ باقی سب زیبِ داستاں کے لیے بڑھایا گیا
ہے۔ فاتح قوم کے بہادر اُس نفسا نفسی کے دَور میں کیا آزادؔ ہی کا گھر تلاش کرتے پھرتے
تھے کہ دفعتاً گھر میں گھُس کر بندوقیں دکھانے لگے۔ ایسا لگتا ہے جیسے اُن کے دروازے پر
پہرا ہی دے رہے تھے کہ اِدھر مولوی باقر مارے گئے اُدھر اُنھوں نے گھر پر قبضہ کر لیا۔
آزادؔ کے دلّی سے نکلنے اور مولوی باقر کی شہادت کے متعلق مُتضاد کہانیاں بیان کی گئی ہیں
جن میں ایک یہ ہے:
بائیس جانوں کے ساتھ گھر سے بلکہ شہر سے نکلنے تک کی کہانی آزادؔ نے خود بیان
کر دی ہے۔ ہمیں یہ فقرہ مشکوک لگتا ہے کہ "فتحیاب لشکر کے بہادر دفعتاً" گھر میں گھُس

اپنی پریشانی کا ذکر کیا تو حافظ موصوف نے کہا کہ تم فکر نہ کرو۔ مجھے سب کلام یاد ہے
اُن کے پاس کچھ مسودے بھی تھے۔ اس طرح دیوان مرتب ہُوا۔ ملاحظہ ہو مقدمہ نسخہ
ویرانؔ از انورؔ) حافظ موصوف کو خود بھی حضرت مرحوم کا کلام بہت کچھ یاد ہے اور
خدا نے اُن کی بصیرت کی آنکھیں ایسی روشن کی ہیں کہ بصارت کی آنکھوں کے محتاج
نہیں۔ اِس لیے لکھنے کی سخت مشکل ہوئی (جب بصارت کی آنکھوں کے محتاج
نہیں تھے تو "اِس لیے لکھنے کی سخت مُشکل ہوئی" کے کیا معنی؟ آخر دوسرے
درد خواہ بھی تو موجود تھے۔ مشکل کلام کی فراہمی کی تھی جسے حافظ موصوف نے حل
کردیا۔ وہ بولتے گئے اور انورؔ لکھتے گئے) غرضکہ ایک مشکل میں کئی کئی مُشکلیں
تھیں۔ اُنھوں نے اِس مہم کا سرانجام کیا۔ اور اپنی یاد کے علاوہ نزدیک بلکہ دور دور
سے بہت کچھ بہم پہنچایا سب کو سمیٹ کر ۱۲۷۹ میں ایک مجموعہ جس میں اکثر غزلیں تمام
اکثر ناتمام۔ بہت سے متفرق اشعار۔ اور چند قصیدے ہیں۔ چھاپ کر نکالا مگر دردمندی
کا دل پانی پانی ہوگیا ..... جس نے ادنےٰ ادنےٰ شاگردوں کو صاحب دیوان کردیا۔
اُس کو یہ دیوان نصیب ہُوا۔ خیر ع یوں ہی خدا جو چاہے تو بندے کا کیا چلے۔
میرے پاس بعض قصیدے ہیں (کہاں سے آئے؟) اکثر غزلیں ہیں داخل ہوجائیں گی
یا ناتمام غزلیں پوری ہوجائیں گی۔ مگر تصنیف کے دریا میں پیاس بھر پانی بھی نہیں۔
(اور یہ پیاس شاگردوں کی ہے، اُستاد کی نہیں) چنانچہ یہ تذکرہ چھپ لے تو اُس
پر توجہ کروں۔ (ص ۴۴۲ - ۴۸۳)

اِس بیان پر ہمیں کچھ زیادہ تبصرہ نہیں کرنا صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ اسی بیان کے پہلے
جُز میں آزادؔ نے غزلوں کا جنگ لے کر دلّی سے نکلنے کی بات کہی ہے اور آخری جُز میں "میرے
پاس بعض قصیدے ہیں" کے بھی مُدعی ہیں۔ اکثر غزلیں آپ کے پاس ہیں "داخل ہوجائیں
گی" لیکن ناتمام غزلیں پوری کون کرے گا؟ پھر جب حافظ ویران نے نہ صرف اپنے حافظے
کی بنا پر کلام لکھوایا بلکہ دُور دُور سے بھی بہت کچھ بہم پہنچایا تو آپ کے لیے گُنجایش ہی
کہاں چھوڑی۔ ویرانؔ کے زمانے میں ذوقؔ کے جاننے والے نہ صرف زیادہ موجود ہوں گے
بلکہ اُن سے رابطہ قائم کرنا بھی سہل ہوگا۔ کم و بیش تیس سال بعد اُن کی تعداد بھی کم رہ گئی
ہوگی اور اُن کو تلاش کرنا اور اُن سے رابطہ قائم کرنا اور بھی زیادہ مشکل ہوگا۔ خیر آئیے

کئی مہینے صرف ہوئے؟ پھر آزاد نے آبِ حیات "بہتری" غزلوں کا کیا کیا؟ پہلے غزلیں صاف کرنی شروع کی تھیں اور باطمینان کام کیا۔ چناں چہ کئی مہینے اِسی کام میں لگ گئے۔ کئی مہینے ۱۰/۸/۶/۴ ماہ کے لیے کہا جاسکتا ہے کامل دو برس کے لیے نہیں۔ اِتنی مدّت تو کتابت میں بھی نہیں لگتی۔ پھر یہ بھی نظر میں رہے کہ ۱۸۵۷ء کا غدر دفعتہً نہیں ہوگیا۔ مئی ۱۸۵۷ء سے شروع ہُوا اور ستمبر تک ہنگامہ جاری رہا۔ کیا اِتنے دنوں میں اُنھیں کوئی اندیشہ یا خدشہ نہیں محسوس ہُوا۔ پھر جب غزلیں صاف اور قصیدے الگ کر لیے تھے تو اُن کا کیا کیا؟ دیوان میں بے شمار جگہ آپ کے ہاتھ ایسے مسودے لگے جن پر نظرِ ثانی نہیں ہوئی تھی۔ گویا ڈھائی برس میں بھی آپ اُنھیں صاف نہیں کر سکے تھے۔ پھر آپ کا یہ بیان بھی موجود ہے کہ سارا کام آپ خلیفہ اسماعیل کے گھر جاکر کیا کرتے تھے۔ غدر میں خلیفہ اسماعیل بھی گئے اور وہ سب سامان بھی۔ گویا جو کچھ صاف کیا گیا تھا وہ سب ضائع ہوگیا۔ اب بھرے سجائے گھر میں آپ کو اور کچھ نظر نہیں آیا، بس اُستاد کی غزلوں کے جُنگ پر نظر پڑی جیسے کسی نے اُٹھا کر سامنے رکھ دیا ہو کہ میاں اُٹھا لو کام آئے گا۔ جب دُنیا آنکھوں میں اندھیر ہو اور جان کے لالے پڑے ہوں اُس وقت سامان کی نہیں جان بچانے کی فکر کی جاتی ہے۔ کتابیں اور لکھنے پڑھنے کا سامان اِس طرح نہیں رکھا جاتا کہ گھر میں گھسے اور وہ سامنے آجائے۔ پیچھے فاتح قوم کے بہادر بندوقیں دکھا رہے ہوں کہ نکلو اور پھر وہ آپ کو سامان بھی اُٹھانے دیں۔ غدر، اپنے والد کی وفات اور دلّی چھوڑنے سے متعلق آزاد کے بیانات میں تخیّل کی رنگ آمیزی بہت ہے۔ اُنھیں قبول کرنے سے پہلے بڑی چھان پھٹک کی ضرورت ہے۔ مختلف بیانات کی تلاش و تحقیق میں نکلنے سے پہلے مندرجہ بالا بیانات کا دوسرا حصّہ بھی دیکھ لیجیے۔

> غرض میں تو آوارہ ہوکر کہاں کا کہاں نکل آیا۔ مگر حافظ غلام رسول ویران کو محبت کے لحاظ سے میرے شفیق دوست اور حضرت مرحوم کی شاگردی کے رشتہ سے روحانی بھائی ہیں۔ اُنھوں نے شیخ مرحوم کے بعض اور دردخواہ دوستوں سے ذکر کیا کہ مسودوں کا سرمایہ تو سب برباد ہُوا۔ اِس وقت یہ زخم تازہ ہے۔ اگر اب دیوان مرتّب نہ ہُوا تو کبھی نہ ہوگا۔ (بات برعکس ہے۔ بعض دوسرے دردخواہ دوست پریشان تھے۔ حافظ ویران جو دورانِ غدر پانی پت چلے گئے تھے واپس آئے تو اُن سے

آتے ہیں یہی پوٹیں اور تھیلیاں اور تکیوں کے غلاف شاہ نصیر استعمال کرتے تھے اور ان کے کلام کی مقدار اور پُر گوئی کے پیشِ نظر اُسے دُرست کہا جا سکتا ہے لیکن ذوق کی پرگوئی مشکوک ہے۔ ("اہلِ ذوق" کے ذہن میں شاہ نصیر کی پُرگوئی تھی اور وہی اس قسم کے بیانات کی محرک ہوئی ہوگی۔) اُن کی قوتِ شعرگوئی یا قادر الکلامی کا ذکر اُن کے شاگردوں نے ضرور کیا ہے لیکن اس سے اُن کی اِس قدر پُرگوئی کا قرینہ نہیں نکلتا۔ مرنے والے کی خوبیاں مُبالغے سے بیان کرنا عام بات ہے اور یہی دہلی اردو اخبار میں ہُوا تھا۔ مولوی باقر ذوق کے گہرے دوست تھے اور عقیدت مند بھی۔ بیٹا، باپ سے بھی زیادہ ذوق سے متاثر و مرعوب معلوم ہوتا ہے۔ سبب اِس کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذہن پر بچپن میں بیٹھے ہوئے نقش ذرا مشکل ہی سے محو ہوتے ہیں۔ شاگردوں اور بادشاہ کی غزلوں کا ملا ہُوا ہونا بھی کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا آزاد یہ کہنا چاہتے ہیں کہ بادشاہ اور دیگر شاگردوں کی جو غزلیں اصلاح کے لیے آتی تھیں ذوق واپس نہیں کرتے تھے؟ یا اُن کی نقلیں رکھ لیتے تھے۔ اخبار میں ذوق کے ہزاروں شاگرد بتائے گئے ہیں لیکن ذوق پر کام کرنے والے تو دس شاگردوں کے نام بھی فراہم نہیں کر پائے۔ جگت اُستاد کہلانا اور بات ہے اور واقعی ہزاروں شاگردوں کی تربیت کرنا اور چیز۔

شہرت اور مقبولیت ہزار ہا شاگردوں کی موجودگی کا جواز نہیں بن سکتی۔ مولانا آزاد تو پانچ شاگردوں کے نام بھی نہیں لے پائے۔ ضمناً ویران اور مذاق کا ذکر آگیا ہے۔ عہدِ ذوق اور اُس کے بعد کئی تذکرے مُرتب ہوئے۔ اُن میں بھی ذوق کے شاگردوں کی طویل بلکہ مختصر فہرست بھی نہیں ہے۔ آتش، ناسخ، انیس اور دبیر کے شاگردوں کی فوج کی فوج کے دو گروہوں میں بٹے ہوتے ہونے کا ذکر کتابوں میں ہے لیکن ان کی تعداد بھی ہزاروں کیا سیکڑوں تک بھی نہیں پہنچی۔ آدھا لکھنؤ مصحفی کا شاگرد کہا جاتا ہے لیکن وہاں بھی تعداد سیکڑوں نہیں۔ غالب اور داغ سے زیادہ شاگرد کسی کو میسّر نہیں آتے اور وہاں بھی ہزاروں کہنا غلو ہے۔ پھر ذوق کے کلام میں کتنے شاگردوں کا کلام ملا ہوا تھا جسے الگ کرتے ہیں

ــــ گلستانِ سخن میں البتہ ۱۴ شاگردوں کا ذکر ملتا ہے اور یہی تعداد گلزارِ سخن میں بھی ہے جس میں شعرا کے شجرے ہیں۔ شجرے کے عکس کے لیے راقم جناب کالی داس گپتا رضا کا شکر گزار ہے۔

کیں۔ اس خطا کا مجھے اقرار ہے کہ کام کو میں نے جاری کیا مگر باطمینان کیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس طرح یکایک زمانہ کا ورق اُلٹ جائے گا۔ عالم تہ و بالا ہو جائے گا جس توں کے خون بہ جائیں گے۔ دل کے ارمان دل ہی میں رہ جائیں گے۔ دفعۃً ۱۲۷۳ھ کا غدر ہو گیا۔ کسی کا کسی کو ہوش نہ رہا۔ چنانچہ افسوس ہے کہ خلیفہ محمد اسمٰعیل اُن کے فرزند جسمانی کے ساتھ ہی اُن کے فرزند روحانی بھی دنیا سے رحلت کر گئے۔ میرا یہ حال ہوا کہ فتحیاب لشکر کے بہادر دفعۃً گھر میں گھس آئے اور بندوقیں دکھائیں کہ جلد یہاں سے نکلو۔ دنیا آنکھوں میں اندھیر تھی۔ بھرا ہوا گھر سامنے تھا اور میں حیران کھڑا تھا کہ کیا کیا کچھ اُٹھا کر لے چلوں۔ اُن کی غزلوں کے جُنگ پر نظر پڑی۔ یہی خیال آیا کہ محمد حسین! اگر خدا نے کرم کیا اور زندگی باقی ہے تو سب کچھ ہو جائے گا۔ مگر اُستاد کہاں سے پیدا ہوں گے جو یہ غزلیں پھر آکر کہیں گے۔ اب ان کے نام کی زندگی ہے۔ اور ہے تو ان پر منحصر ہے۔ یہ ہیں تو وہ مرکر بھی زندہ ہیں۔ یہ گئیں تو نام بھی نہ رہے گا۔ وہی جُنگ اُٹھا بغل میں مارا۔ سجے سجائے گھر کو چھوڑ کر بائیس نیم جانوں کے ساتھ گھر سے بلکہ شہر سے نکلا۔"

اس میں مولانا آزاد کی فنکاری اور انشا پردازی کی تمام صلاحیتیں بڑی موثر اور جاندار تصویر ہے۔ اس کے حسن و اثر میں کلام نہیں۔ یہ سچ جیسی لگتی ہے لیکن سچی پوری طرح کارفرما نظر آتی ہیں۔ اس میں کئی باتیں بیان ہوئی ہیں۔ اگرچہ یہ بیان نہیں۔ اس میں مبالغہ بھی ہے اور مغالطہ بھی۔ اس کے مشتملات کا فرداً فرداً جائزہ لینا ضروری ہے۔ حصۂ اول میں بھی نقل ہو چکا ہے تاہم یہاں اس کے مشتملات کا فرداً فرداً جائزہ لینا ضروری ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ ذوق کی وفات کے چند دن بعد ممکن ہے آزاد نے خلیفہ اسماعیل کے ساتھ مل کر اُن کے کلام کو ترتیب دینا چاہا ہو، لیکن انھوں نے واقعی کام شروع کیا تھا، مشکوک ہے۔ پہلے حصے میں دیوان وانور وغیرہ کا بیان نقل کیا جا چکا ہے؛ دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ دوسری بات مقدارِ کلام سے متعلق ہے۔ یہ غلو سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ اس انتقال کے فوراً بعد نومبر ۱۸۵۴ء میں دہلی اردو اخبار سے ملتا جلتا بیان اپنے الفاظ میں دُہراتے ہی کو میں چھپا تھا۔[۱]

اِس میں شک نہیں کہ آزاد کو ذوقؔ سے گہری عقیدت اور اُن کے کلام سے بے حد دلچسپی تھی۔ جب مولانا کی ولادت ہوئی (۱۸۳۰ء / ۱۲۴۵ھ) اُس وقت تک مولوی باقر اور ذوق میں مراسم پیدا ہو چکے تھے۔ مولانا نے ذوقؔ کو اپنے بچپن ہی میں دیکھنا شروع کیا ہوگا۔ سِن شعور کو پہنچنے یا تعلیم کے اِختتام (۱۵ برس کی عمر) تک گاہ گاہ اُن سے ملنے بھی لگے ہوں گے جسے وہ خدمت میں حاضر ہونا کہتے ہیں۔ ذوقؔ کے انتقال ۱۲۷۱ھ تک آزاد پر ذوقؔ کی عقیدت اپنا رنگ جما چکی تھی۔ اِس وقت تک اُن میں شعر گوئی کا جذبہ بھی بیدار ہو چکا ہوگا۔ تاہم اس وقت تک اُن کی شعر گوئی کا ثبوت ____________ ملتا ہے

اور نہ یہی درست معلوم ہوتا ہے کہ آزاد تخلص ذوقؔ ہی نے اُنھیں دیا تھا۔ اردو اخبار پریس سے جو کتابیں شائع ہوئی ہیں اُن پر یا ذوق کے اِنتقال پر کہے ہوئے قطعۂ تاریخ میں اُن کا نام ملتا ہے، تخلص نہیں۔ ذوقؔ کے اِنتقال کے ۲-۳ سال کے اندر غدر ہو گیا اور آزاد کو دلّی چھوڑنا پڑی۔ پنجاب میں سکونت اِختیار کرنے کے بعد جب ذرا سکون میسّر آیا تو اُنھیں ذوقؔ کا کلام مرتب کرنے ____________ کا خیال

آیا، اور اُنھوں نے اِس ضمن میں کوششیں شروع کر دی ہوں گی۔ ترتیبِ دیوان سے متعلق پہلا بیان ۱۸۸۰ء، ذوق کی وفات کے ۲۶ سال بعد کا ہے۔ اِس لیے اُسے مِن وعن قبول کر لینا اِحتیاط کے خلاف ہے۔ آبِ حیات میں لکھتے ہیں،

> اُن کے (کذا) وفات کے چند روز بعد میں نے اور خلیفہ اسمٰعیل مرحوم نے کہ وہ بھی باپ کی طرح اِکلوتے بیٹے تھے۔ چاہا کہ کلام کو ترتیب دیں۔ متفرق غزلوں کے بستے اور بڑی بڑی پوٹیں تھیں۔ بہت سی تھیلیاں اور مٹکے تھے کہ جو کچھ کہتے تھے گویا بڑی احتیاط سے اُن میں بھرتے جاتے تھے۔ ترتیب اُس کی پسینے کی جگہ خون بہاتی تھی کیونکہ بچپن سے لے کر دمِ واپسیں تک کا کلام انھیں میں تھا۔ بہت سی متفرق غزلیں بادشاہ کی۔ بہتیری غزلیں شاگردوں کی بھی ملی ہوئی تھیں۔ چنانچہ اوّل اُن کی اپنی غزلیں اور قصائد اِنتخاب کر لیے۔ یہ کام کئی مہینے میں ختم ہوا۔ غرض پہلے غزلیں صاف کرنی شروع

ــــ گذشتہ دنوں دلّی میں ڈاکٹر تنویر علوی صاحب نے مولوی باقر کے پریس کی چھپی ہوئی کوئی کتاب دکھائی تھی جس پر نام کے ساتھ آزاد تخلص بھی موجود تھا لیکن زمانۂ تصنیف ذوقؔ کی زندگی کا نہیں تھا۔

کوئی دیکھے پل بھر تو اُس مہروش کو | نظر جس سے میری لڑی دو گھڑی بھر
جہاں بیٹھے ہم تفتہ جاں واں نہ ہرگز | رہے شمع سوزاں گھڑی (اگھڑی) دو گھڑی بھر
ترے جس نے لعل مسی زیب دیکھے | رہا دیکھ کر غش دمڑی دو گھڑی بھر
مغاں ہے ابھی میری مستی میں سستی | شراب اور مجھ کو کڑی دو گھڑی بھر
کہاں تاب وہ دستِ نازک میں رکھیں | کوئی پھول کی پنکھڑی دو گھڑی بھر
مری آہ کی گلفشانی ہے پہروں | بہت گر چھٹے پھل جھڑی دو گھڑی بھر
پروتا ہے میرا گھڑی بھر کا رونا | ظفر موتیوں کی لڑی دو گھڑی بھر

نول کشوری اڈیشن ج ۴ ص ۱۵۸ پر ایک غزل اور ملتی ہے جس کی ردیف " یاد گھڑی " ہے۔ مطلع ہے:

گزری جو سخت مصیبت ہے کڑی یاد گھڑی ؛ تو وہ ہو روز قیامت سے بڑی یاد گھڑی

اس میں بھی تقریباً وہ سب قوافی موجود ہیں جو ذوق کی غزل میں ہیں۔ ذوق کا مصرع ہے ؛ سینے میں ہوگی سانس اڑی دو گھڑی کے بعد۔ ظفر کا مصرع ہے، آہ سینے میں مرے اور اڑی یاد گھڑی۔ لیکن بوجوہ اس غزل سے التباس ممکن نہیں۔

یہ تو ایک ضمنی بحث تھی۔ اب پھر ہم دیوانِ ذوق کی طرف رجوع کرتے ہیں جیسا کہ کہا گیا ہے سب پہلے ذوق کا دیوان حافظ ویران نے اپنے دو خواجہ تاشوں ظہیر اور انور دہلوی کی مدد سے ۱۲۷۹ھ میں ترتیب دیا تھا۔ اس میں بہ قول پروفیسر شیرانی اشعار کی تعداد ۱۸۲۲ تھی۔ آزاد کے نسخے میں یہ تعداد ۳۴۱۲ ہے ؛ گویا تقریباً دوگنی۔ صحیح تعداد کا حال جب ہم دونوں اڈیشنوں کا مقابلہ کریں گے تو کھلے گا۔ اب سوال یہ ہے آزاد کا ماخذ کیا ہے؟ حصۂ اول میں ثابت کیا جا چکا ہے کہ آزاد ذوق کے شاگرد نہیں تھے۔ انھیں ذوق کی خدمت میں حافظ ویران سے زیادہ حاضری اور ہم حاضر باشی کا شرف بھی حاصل نہیں ہوا۔ آزاد کے علم وفضل اور قوتِ حافظہ میں کلام نہیں لیکن یہ یاد رہے کہ حافظ ویران نابینا ہیں اور حافظِ قرآن بھی۔ نابینا لوگوں کا حافظہ بیناؤں کے مقابلے میں قوی تر ہوتا ہے، یہ ظاہر بات ہے اور ہر شخص کے مشاہدے میں آئی ہوگی۔ اس کے باوجود آزاد کے مرتبہ نسخے میں اشعار کی تعداد تقریباً دوگنی ہے جس کا مطلب ہے کہ اُن کے پاس ذوق کا کلام تحریری صورت میں موجود ہوگا ورنہ اس قدر اضافہ محض حافظے کی بنا پر ممکن نہیں۔ آیئے اس ضمن میں آزاد کے بیانات کا جائزہ لے کر دیکھیں۔

میں گیا تو غزل سُنائی ۔" اس بیان سے اُستاد کی دُوں فطرتی جھلکتی ہے ۔ اگر مولانا کا یہ بیان تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس غزل بلکہ اس سے پہلے کہی گئی غزل کو (جو یقیناً پست تر ہوگی) بادشاہ کے کُلیات میں ہونا چاہیے تھا، لیکن نہیں ہے ۔ سوال یہ ہے کہ حافظ ویران کو (اگر خط اصلی ہے) یہ خیال کیسے آیا کہ یہ غزل بادشاہ کی ہے ۔ یہ صرف اُس صورت میں ممکن ہے جب کہ اِسی زمین میں یا ایسی ہی زمین میں بادشاہ کی غزل بھی ہو جس سے التباس ممکن ہو سکے ۔ حافظ ویران نے غالباً ذوق کی غزل کو اِس لیے ظفر سے منسوب کیا کہ ظفر کے مصرعے میں سانس مؤنث بندھا ہے ۔ اِتفاق سے سوائے غزلِ مذکور کے ذوق کے پورے کلام میں سانس کا لفظ کہیں نہیں بندھا ۔ دم اور نفس البتہ ملتا ہے ۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حافظ ویران کو یہ خیال کیوں ہے کہ سانس صرف مذکر ہے ۔ فی الوقت بغیر کسی تلاش کے اِنشا جو ذوق کے معاصر بزرگ ہیں کے یہاں سے دو مثالیں یاد آگئیں ایک نثر دوسری نظم کی اور یہ دونوں مؤنث کی مثالیں ہیں ۔ رانی کیتکی کے آغاز میں اِنشا نے لکھا ہے : اُن کی ٹھنڈی سانس کی پھانس کا ٹھوکا کھا کر اسی کہانی کے درمیان میں ایک شعر ہے : چھا گئی ٹھنڈی سانس جھاڑوں میں ؛ پڑ گئی کوک سی پہاڑوں میں اس کے علاوہ مرزا قاسم علی خاں کی ہجو کا ایک مصرع ہے : لگے ہے دو قدم چلنے میں اُلٹی سانسیں بھرنے لہٰذا اس ایک لفظ کی بنیاد پر غزل کو رد نہیں کیا جا سکتا ۔ حافظ ویران کو کسی اور غزل سے التباس ہوا ہوگا ۔ حسنِ اِتفاق سے کلیاتِ ظفر حصّہ اوّل (پاکستانی اڈیشن) میں ایک ایسی غزل مل گئی ہے جس پر ردیف اور بحر کے اختلاف کے باوجود ذوق کی غزل کا دھوکا ہو سکتا ہے ۔ غزل مذکور کے قوافی وہی ہیں جو ذوق کی غزل کے ہیں ذوق کی غزل میں ۱۲ اور ظفر کی غزل میں دس شعر ہیں ۔ ذوق کی غزل کا مطلع ہے :

کیا آئے تم جو آئے گھڑی دو گھڑی کے بعد   سینے میں ہوگی سانس اڑی دو گھڑی کے بعد

ظفر کی غزل میں صرف ایک قافیہ ایسا ہے جو ذوق کے ہاں نہیں بندھا اور یہ وزن کی مجبوری ہے ۔ اس بحر میں یہ قافیہ آ ہی نہیں سکتا ۔ ذیل میں ظفر کی غزل نقل کی جاتی ہے تاکہ قارئین خود اندازا کر لیں کہ التباس کا اِمکان ہے کہ نہیں :

نہیں دیر تو کچھ بڑی دو گھڑی بھر   اگر ٹھہر جاؤ گھڑی دو گھڑی بھر

ڈبو دینے کو ہے دو عالم کے کافی   برسنے آنسوؤں کی جھڑی دو گھڑی بھر

غمِ ہجر آفت سے مری گیا وہ (کتنا)   مصیبت یہ جس پر پڑی دو گھڑی بھر

تے۔ خود ویران وغیرہ پوتلیوں اور پرزوں کی بات کرتے ہیں اور بیاض کے وجود سے واقف نہیں (ملاحظہ ہو مقدمہ دیوان ذوق از انور) بیاض کو شہرت صرف آزاد نے دی اور ان کے بیانات اتنے مختلف و متضاد ہیں کہ بیاض کا وجود مشکوک نظر آتا ہے۔ بیاض کا ذکر آزاد نے کئی جگہ کیا ہے اور اس میں ذوق، اپنے والد اور خود اپنے علاوہ مذاق بدایونی (تلمیذ ذوق) کے دستخط کا بھی ذکر کیا ہے ۔ اس کا کیا مطلب ہے ؟ ڈاکٹر تنویر احمد علوی ایک بیاض دیکھنے کے مدعی ہیں اور اس میں مولانا آزاد کے علاوہ مولوی باقر اور خود ذوق کے ہاتھ کی تحریر کے قائل ہیں لیکن ہمارے خیال میں انھیں تسامح ہوا ہے۔ یہ بیاض جعلی ہے۔ اس کا ذوق سے کوئی تعلق نہیں۔ اب اگر ویران کے مذکورہ خط کو اصلی مان لیا جائے تو بات کچھ اس طرح بنے گی ۔ مولانا آزاد نے بیاض کا ذکر ویران کے نام اپنے کسی خط میں کیا ہوگا۔ خلیفہ اسماعیل کی تحویل میں اُستاد کے اشعار کی کوئی بیاض رہی ہوگی (دہلی اردو اخبار میں ذکر ہے کہ کچھ شاگرد بیاضیں مرتب رکھتے تھے۔ فوق یعنی خلیفہ اسماعیل بھی ذوق کے شاگرد تھے) اور یہ بیاض غدر میں ضائع ہوگئی اس کے راوی خود مولانا آزاد ہیں۔ جواباً ویران نے کسی تسامح کی بنیاد پر مندرجہ خیالات کا اظہار کیا ہوگا۔ تاہم اس تاویل کے باوجود ویران کے خط میں دیوان کا لفظ معمّا ہے جس کا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا۔

اب آیئے غزلِ مذکور "گھڑی دو گھڑی کے بعد" کے ذوق کی تخلیق ہونے کی طرف۔ یہ غزل نسخۂ ویران میں موجود ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے حافظ ویران نابینا ہیں۔ انھوں نے اُستاد کا سارا کلام اپنے حافظے کی مدد سے لکھوایا۔ کتابت کے بعد جو امداد مرزا انور نے کی تھی۔ کچھ اور کلام ہاتھ آگیا۔ ظاہر ہے کہ یہ ویران کے حافظے سے باہر کا کلام تھا لہٰذا اسے الگ سے درج کیا گیا اور مذکورہ غزل اس حصّے میں نہیں ہے۔ اب ایک شخص جو حافظے سے شعر لکھوا رہا ہے کسی دوسرے شخص کی غزل کیوں کر لکھوا سکتا ہے۔ اس غزل میں ذوق کا تخلص ہے ظفر کا نہیں۔ رنگ اور اندازِ بیان سے قطع نظر، ہمیں یہ غزل ظفر کے کلیات میں نہیں ملی حالانکہ مختلف مطبعوں کے نسخے ہماری نظر سے گزرے ہیں۔ اگر یہ غزل ظفر کی تھی تو اُن کے کلیات سے کیوں غیر حاضر ہے۔ مولانا آزاد کا یہ بیان بھی قابلِ قبول نہیں کہ "پہلے بادشاہ نے اس طرح میں غزل کہی تھی۔ اُن کی غزل لکھ کر بیٹھے تھے۔ دل لگ گیا۔ اور چند قافیے خوشنما پہلوؤں پر بیٹھتے نظر آئے (دکھا) فرمایا ہم بھی اس طرح میں غزل کہتے ہیں۔ دوسرے دن

ذکر کیوں نہیں کیا؟ مذکورہ خط کی تاریخ نہیں بتائی گئی لیکن یہ ۱۸۸۸ء کے بعد کا نہیں ہوسکتا کیوں کہ حافظ ویران کا انتقال ۱۳۰۵ھ (۱۸۸۷-۱۸۸۸ء) میں ہوگیا تھا اور یہی وہ زمانہ ہے جب آزاد ترتیب دیوانِ ذوق میں مصروف تھے۔ ہم نے اوپر ویران کے خط کو مشکوک کہا ہے، اسباب یہ ہیں: خط میں کہا گیا ہے کہ خلیفہ اسمٰعیل نے دیوان میں شامل ہونے کے سبب اس غزل کو اُستاد کی بیاض میں لکھ دیا۔ یہ کس دیوان اور کس بیاض کا ذکر ہے؟ ظفر کے ایک شعر میں (جو اوپر درج ہوچکا ہے) دیوان کا ذکر شعری یا قافیے کی مجبوری سے ہوگیا ہوگا ورنہ وہ کلام کہتے۔ زندگی میں دیوان مُدوّن نہ ہونے کے راوی خود ویران و انوار بھی ہیں۔ خود ذوق کا ایک شعر ہے: ذوق کیونکر ہو اپنا دیواں جمع ؛ کہ نہیں خاطر پریشاں جمع۔ پھر خلیفہ اسماعیل نے کس دیوان میں شامل دیکھ کر استاد کی بیاض میں لکھ لیا؟ کیا دیوان مرتبۂ ویران دیکھ کر؟ لیکن نسخۂ ویران ۱۲۷۹ھ میں مرتب ہوا اور خلیفہ اسمٰعیل کا انتقال ۱۸۵۷ء (۱۲۷۴ھ) میں ہوگیا تھا۔ اس لیے اُن کے نسخۂ ویران کو دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔[1] اس خط میں اُستاد کی بیاض کا بھی ذکر ہے۔ یہ بیاض کہاں ہے؟ اُستاد۔۔۔ بیاض کے قائل ہی نہ

---

[1] یہ بات بھی کم حیرت ناک نہیں کہ دیوانِ ذوق کا آج تک ایک بھی قلمی نسخہ نہیں ملا جو ۱۲۷۱ھ یعنی ذوق کی وفات سے پہلے کا ہو۔ کچھ عرصہ پہلے تک دیوانِ ذوق کے کسی قلمی نسخے کا علم نہیں تھا۔ پھر معلوم ہوا کہ کتب خانہ خدا بخش خاں، پٹنہ میں کوئی قلمی نسخہ موجود ہے۔ خط لکھا، جواب نہ ملا۔ انھیں دنوں پروفیسر محمود شیرانی پر ایک سیمی نار جو کتب خانہ کے ڈائرکٹر کی طرف سے منعقد کیا گیا تھا، میں شرکت کی غرض سے رشید حسن خاں اور ڈاکٹر علوی صاحب تشریف لے جا رہے تھے۔ اُن سے گزارش کی گئی لیکن انھیں وہ نسخہ دیکھنے کا موقع نہ ملا۔ صرف اتنا معلوم ہوسکا کہ وہ مخطوطہ نسخۂ ویران کی نقل ہے۔ یہی ڈاکٹر علوی نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے، لیکن مخطوطہ دیکھنے کے وہ بھی مدعی نہیں ہیں۔ اسی اثنا میں اپنے شعبے کے کتب خانے میں ایک مخطوطہ مل گیا جو اغلباً ۱۲۸۰ھ کا لکھا ہوا ہے۔ کاتب بینی پرشاد ہیں۔ بہت خوش خط اور نفیس نسخہ ہے۔ کاغذ فرانسیسی ہے۔ اس کے بالاستیعاب مطالعے سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ بھی نسخۂ ویران پر مبنی ہے۔ جس کا مطلب ہے نسخۂ ویران کی اشاعت سے پہلے دیوانِ ذوق کا کوئی نسخہ نہیں لکھا گیا ورنہ دلی کی تباہی کے باوجود اُس دَور کے کئی مخطوطات محفوظ رہ گئے ہیں لیکن اپنے دَور کے مقبول ترین شاعر کے کلام کا ایک بھی نسخہ نہیں بچا۔

دیوان کے کسی خط کا ذکر کیا ہے جو ویران نے مولانا آزاد کو تدوینِ دیوانِ ذوق کے سلسلے میں لکھا تھا۔ اُس کے یہ جملے توجہ طلب ہیں :

"سانس دو جگہ مونث آیا ہے اور ایک تو یہ ہے ع ٹھنڈی ٹھنڈی سانس ہے آتی جاتی یہ یہ (کذا) غزل تو بادشاہ کی ہے اور ایک یہ ہے ع سینے میں سانس ہوگی اڑی دو گھڑی کے بعد سو یہ غزل بھی بادشاہ کی ہے۔ خلیفہ اسمٰعیل مرحوم نے بسبب دیوان میں داخل ہونے کے استاد کی بیاض میں لکھ دیا ہے"

یہ اقتباس اصل کے مطابق نقل کیا گیا ہے۔ اِس میں واوین لگانے میں کچھ گڑبڑ ہوگئی معلوم ہوتی ہے۔ اِس لیے شُبہہ ہوتا ہے کہ "دو گھڑی کے بعد" خط کا اقتباس ختم ہوگیا ہے لیکن "لکھ دیا ہے" کے بعد واوین کی موجودگی ظاہر کرتی ہے کہ اقتباس اِس فقرے پر ختم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر فرخی نے خط کا ماخذ یا حوالہ بھی غلطی سے دُرست نہیں لکھا۔ حوالے کی جگہ "دیوانِ ذوق میں شامل نہیں کیا ہوگا۔ یوں بھی ہمیں یہ خط مشکوک لگتا ہے۔ مگر پہلے مندرجہ اقتباس پر ڈاکٹر اسلم فرخی کا تبصرہ ملاحظہ ہو: "شاید اِسی وجہ سے یہ غزل دیوانِ ذوق مرتبہ ویران میں بھی شامل ہوگئی تھی لیکن ویران کے اِنتباہ کے بعد بھی آزاد کا اِس غزل کو دیوان میں شامل کر لینا جوشِ عقیدت کے سوا کچھ اور نہیں" (حصہ ۲، صفحہ ۵۴۴)

آزاد کا جوشِ عقیدت تسلیم، اُنھوں نے سیکڑوں بلکہ ہزاروں اشعار کہہ کر کلامِ ذوق میں شامل کر دیے ہیں اِس کے باوجود ہمارا خیال ہے کہ یہ غزل ذوق ہی کی ہے۔ اِس کا ہر شعر ذوق کے اندازِ سخن کا آئینہ دار ہے۔ کسی ایک شعر پر بھی شُبہہ نہیں ہوتا۔ اِس غزل پر اور کسی نے بھی شُبہے کا اظہار نہیں کیا۔ اگر حافظ ویران اِسے ظفر کا کلام سمجھتے تھے تو اُنھوں نے اِسے اپنے مرتبہ دیوان میں شامل کیسے کیا؟ اگر غلطی سے کر لیا تھا تو بعد میں اِس کی تردید کیوں نہ کی؟ سُنا ہے کہ دیوان کے ساتھ ایک غلط نامہ یا صحت نامہ بھی شائع کیا گیا تھا اور وہ نسخۂ ویران کی کچھ جلدوں میں شامل ہے[۵۰]۔ اُس میں اِس غزل کے ظفر کی ملکیت ہونے کا

۵۰۔ ہمارے پیشِ نظر نسخۂ ویران کا جو نسخہ ہے اُس میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔ ڈاکٹر علوی نے اپنے مرتبہ کلیات میں کہیں کہیں اس کا حوالہ دیا ہے۔ جناب رشید حسن خاں بھی یہ صحت نامہ دیکھنے کے مُدّعی ہیں جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دیوان کی اشاعت کے بعد جب مرتبین کو کچھ اغلاط کا علم ہُوا ہوگا تو صحت نامہ چھپوا کر جتنے نسخے اُن کے پاس موجود ہوں گے ان میں لگوا دیا گیا ہوگا۔

اِن ۲۷ غزلوں میں ۱۲ غزلیں (۱۱-۲۷) تو وہی ہیں جنھیں پروفیسر شیرانی جعلی قرار دے چکے ہیں۔ ایک درجن غزلیں ۳۲ غزلوں کی اُس فہرست میں شامل ہیں جنھیں شیرانی صاحب نے بچپن کے کلام کے تحت مشکوک ٹھہرایا ہے۔ (۱-۱۰، ۱۳-۱۵) غزل ۷۶ وہ ہے جسے ہم حصّہ اوّل میں مشکوک ثابت کر چکے ہیں اور ڈاکٹر علوی نے مشکوک قرار دینے کے باوجود کلیات میں، جگہ دی ہے اور وہ بھی پہلے حصّے میں جو اُن کے خیال میں غیر مشکوک ہے۔ البتہ غزل ۱۱ کو اس اس سے پہلے کسی نے مشکوک قرار نہیں دیا۔ تو اب صورتِ حال یہ ہوئی۔ کل الحاقی غزلیں ۱۴ + ۱۲ + ۱ + ۱ = ۲۸، اور قصیدے = ۳۔

غالب نے کہا تھا،

کوکبم را در عدم اوجِ قبولی بودہ است ❊ شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

ذوقؔ کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ اُن کی اپنی شہرت زندگی میں اپنے عروج پر تھی لیکن کلام خود اُن کے دورِ حیات میں ناپید ہونا شروع ہو گیا تھا، اور وفات کے بعد شاگردوں کی کوششوں سے کسی حد تک محفوظ بھی ہوا اور مشہور بھی۔ شہرت میں بڑا ہاتھ مولانا محمد حسین آزاد کا ہے لیکن کلام کی تدوین کا سہرا حافظ ویران، اُمرا و مرزا انور اور ظہیر دہلوی کے سر ہے جنھوں نے مل کر پہلی مرتبہ کلام کو مدون کیا (یہاں تحسینِ تلمیذِ ذوقؔ کو بھی نہیں بھولنا چاہیے جن کی تحریک پر حافظ ویران نے کلام کی فراہمی کا ذمہ لیا تھا) یہ عجیب اتفاق ہے کہ اُستاد شاہ بلکہ جگت اُستاد کا کلام اُس کی زندگی میں مُدوّن نہیں ہوا۔ شاگردوں نے اس کے جو اسباب بیان کیے ہیں وہ کوری عقیدت ہے، اس لیے شبہے سے خالی نہیں۔ ظفر کے کلیات میں ایک شعر ہے،

بخشے ہے ظفر اپنے یہ ذوق عجب دل کو ॥ ہم ذوقؔ کا ہاتھوں سے دیوان چھوڑیں گے

پروفیسر شیرانی نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "دیوان موجود تھا" (ہندستانی اپریل ۱۹۴۵ء) ڈاکٹر تنویر علوی نے اِس شعر کو ذوق کی وفات کے بعد کی تخلیق کہا ہے (ذوق سوانح اور انتقاد)۔ یہ شعر ظفر کے چوتھے دیوان میں ہے۔ ممکن ہے ذوق کی وفات کے بعد کہا گیا ہو (غالباً ذوقؔ کا انتقال ظفر کے تیسرے دیوان کی تکمیل سے پہلے ہی ہو گیا تھا) اس صورت میں بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ دیوان مرتب ہو چکا تھا لیکن ہمارے خیال سے ایسا نہیں تھا تفصیل آگے آتی ہے البتہ وفات کے بعد سے اگر علوی صاحب نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ شعر دیوان کی اشاعت کے بعد کہا گیا ہوگا تو درست نہیں۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نے اپنی کتاب کے دوسرے حصّے میں حافظ

۱۔ آنکھیں مری تلووں سے وہ مل جائے تو اچھا
۲۔ ہر گام پہ رکھے ہے وہ یہ ہوش بس نقشِ پا
۳۔ گزرے گر اس راہ سے، وہ رکھ دیدۂ تر زیرِ پا (کذا)
۴۔ دشمنِ جاں اس قدر سارا زمانہ ہوگیا
۵۔ چشمۂ کوہ سے ہے آب نکلتے دیکھا
۶۔ صبا سے ہو شگفتہ کس طرح دل گیر دل میرا
۷۔ ان سے کچھ ذکرِ ولا ب نہیں لانا اچھا
۸۔ ڈھونڈ غربت میں فروغ اپنا تو ہو گھر سے جدا
۹۔ اشکِ تر لختِ جگر دونوں بہم دونوں جدا
۱۰۔ لعل و لب و دندانِ صنم کا جس نے دل میں خیال کیا
۱۱۔ مجھ کو کیا کیا کچھ قلق اے سنگ دل پیدا ہوا
۱۲۔ آتشِ غم سے جلا دل، جو مری جاں میرا
۱۳۔ دیکھ لو آخری دیدار اگر دیکھتے ہو
۱۴۔ تم اشکِ سرمہ گوں عارض پہ کیا دکھاتے ہو
۱۵۔ اس قد کی دلا جو کہ ہے تصویر دکھا دو

۱۶۔ فلک نہ دیتا اگر چشمِ اشک بار مجھے
۱۷۔ جسے بیماریِ غم ہو اُسے کیا یاد رہے
۱۸۔ قتل کر کے مجھے چل دیکھو سنا یاد رہے
۱۹۔ تدبیر نہ کر فائدہ تدبیر میں کیا ہے
۲۰۔ پری رو خوش نظر کیا پیشتر ایسے نہ ہوتے تھے
۲۱۔ برق کب سے آشیاں میرا اٹھا کر لے گئی
۲۲۔ نہ اس حسرت زدہ کے کھینچ اپنا تیر پہلو سے
۲۳۔ بینی ہے تری چینِ جبیں سے صنم پر ہے
۲۴۔ ذکرِ مژگاں تیرا جس کے روبرو نکلا کرے
۲۵۔ خط تری مانگ کا جب یار نظر آتا ہے
۲۶۔ دکھلا دے خالِ ناف تو اے گلبدن مجھے
۲۷۔ تیر پہلو میں لگا دلبرِ جانی مانگے

قصائد

۱۔ سحر جو گھر سے شکلِ آئینہ تھا میں بیٹھا نزار و حیراں ہے۔
۲۔ صبحِ سعادت نورِ ارادت تن بہ ریاضت دل بہ تمنا
۳۔ خضر نصیب کی گر دنیا میں رہبری ہو۔

اس فہرست میں تین قصیدے اور ۲۷ غزلیں شامل ہیں۔ قصیدوں پر آج تک کسی نے سوالیہ نشان نہیں لگایا۔ صرف ایک قصیدے پر ڈاکٹر اسلم فرخی نے کچھ شبہے کا اظہار کیا ہے۔ ڈاکٹر علوی نے اگرچہ کئی قصائد کو کلیات کے حصہ دوم میں شامل کیا ہے، جو صرف بروایتِ آزاد ہے، تاہم وہ قصائد کو ذوق کا کلام مان لینے پر اصرار کرتے ہیں۔ اُن کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے۔ اول تو آزاد نے قصائد میں کچھ زیادہ ترمیم و تنسیخ نہیں کی دوسرے اُن کو "قصیدہ گوئی سے ذوق نہیں تھا" اس لیے جتنے قصیدے صرف بہ روایتِ آزاد ملتے ہیں اُنھیں ذوق کی تصنیف مان لینے میں کوئی حرج نہیں لیکن ہمارے خیال میں کچھ اور کے علاوہ وہ تمام قصائد جو اکبر شاہ ثانی کی مدح میں ہیں تمام تر مولانا آزاد کی تصنیف ہیں۔ آخر کیا سبب ہے کہ ان میں سے کسی کا کوئی شعر بھی حافظ ویران کے حافظے میں نہ رہا؟ بہرحال اُن پر مفصل گفتگو اپنے مقام پر کی جائے گی۔ سرِدست غزلیات کی اس فہرست کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔

بہ ہر حال ہم کہہ تو یہ رہے تھے کہ پروفیسر شیرانی مرحوم نے جن غزلوں کو الحاقی قرار دیا ہے اُن کی تعداد ۱۶ ہے۔ اگر ڈاکٹر محمد صادق کا یہ قول درست ہے کہ انھوں نے اپنے تحقیقی مقالے میں بہت کم اضافہ کیا ہے تو شیرانی سے بھی پہلے انھوں نے کچھ کلام پر شبہے کا اظہار کیا تھا۔ اُن کی کتاب میں کئی ضمیمے شامل ہیں۔ آٹھواں ضمیمہ ہے "مسودۂ دیوانِ ذوق"[1]۔ اس میں ڈاکٹر صادق لکھتے ہیں: "یہاں صرف اِس امر کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ آزاد نے کوئی دو درجن غزلوں اور قصیدوں کے ساتھ یہ نوٹ چپکا دیا ہے کہ اِن پر نظرِ ثانی نہیں ہوئی۔ اِس ضمن میں میرے پاس ناقابلِ تردید دستاویزی ثبوت موجود ہے کہ یا تو ان کے اصل مسودے آزاد کے ہاتھ نہیں لگے، اگر تھے تو وہ اُن تک ایسی خستہ و مخدوش حالت میں پہنچے کہ ان کا پڑھنا ممکن نہیں تھا، یا پھر وہ صریحاً تحریف شدہ تھے یا نامکمل تھے۔ بہتر ہوتا کہ آزاد انھیں جوں کا توں رہنے دیتے لیکن وہ ان نظموں کو قعرِ گمنامی سے نکالنے کے لیے اِتنے بے قرار تھے کہ انھوں نے انھیں سدھارنے اور اُن میں اصلاح کرنے کا فیصلہ کیا۔ بعض نظموں میں ترمیم و تکمیل یا اِضافے کے لیے انھوں نے اپنے حافظے پر بھروسا کیا اور جہاں اُن کے حافظے نے دغا کی وہاں اُن کا ذوق و شوق فرائضِ تدوین پر غالب آگیا اور آزاد نے اُن نظموں کو از سرِ نو لکھ ڈالا بلکہ تصنیف کر ڈالا اور اب ہم انھیں ذوق کا کلام نہ ماننے میں حق بجانب ہوں گے۔ ترمیم و تحریف کی اِنتہائی مثال کے لیے دیکھیے ضمیمے کے آخر میں شامل ایک ہی غزل کے دو مسودوں کا عکس ..... ذیل میں اُن غزلیات و قصائد کی فہرست پیش کی جاتی ہے جن کے مسودے میرے پاس محفوظ ہیں۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ سب اگر یکسر جعلی نہیں تو بھی مختلف نظموں کا پایۂ اِستناد کسی نہ کسی حد تک مشکوک ہے[2]۔" گویا ڈاکٹر صادق ان نظموں کو یکسر جعلی نہیں تو بڑی حد تک مشکوک مانتے ہیں۔ اب اُن کی پیش کردہ فہرست ملاحظہ ہو:

---

[1] ڈاکٹر صادق نے ضمیمہ ۸ مسودۂ دیوانِ ذوق میں لکھا ہے کہ "میں نے اپنے مضمون ترتیبِ دیوانِ ذوق میں اس پر تفصیل سے لکھا ہے اور جنھیں اس دلچسپ معاملے میں مزید مطالعے کا اشتیاق ہو، میرا مذکورہ مضمون دیکھ لیں۔" جس کا مطلب ہے کہ مسودۂ دیوانِ ذوق سے متعلق ضمیمہ اُن کے مقالے (۱۹۳۹ء) میں شامل نہیں تھا، بعد کا اضافہ ہے۔ اس لیے یقین ہے کہ شیرانی صاحب کے مضمون کے بعد کا ہوگا۔

[2] MUHAMMAD HUSAIN AZAD - HIS LIFE & WORKS P.155

نے نہیں۔ اِس کے مسودے کا عکس ڈاکٹر علوی کی کتاب "ذوق سوانح اور انتقاد" میں شامل ہے اس میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو آزاد کے تیار کردہ مسوّدوں میں پائی جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ غزل آزاد نے آبِ حیات کی طبع اوّل کے بعد اور طبع ثانی سے پہلے کہی تھی۔ اِس لیے کہ طبع اوّل میں معروف کے تلمذِ ذوق پر سعیدالدین احمد خاں نے اعتراض کیا تھا۔ طبع دوم میں آزاد نے فرمایا کہ: "دو مسودے موجود ہیں دکھاؤں کسے" اس پر پروفیسر شیرانی نے لکھا تھا کہ اس زمانے میں معروف کے دیکھنے والے کئی لوگ زندہ ہوں گے۔ آزاد انھیں وہ مسودے دکھا سکتے تھے۔ ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ آزاد نے دو مسوّدوں کی بات کہی اور مسوّدہ تیار کیا ایک غزل کا اور یہ بھول گئے کہ انھوں نے دعویٰ دو غزلوں کے مسوّدے کا کیا ہے۔ چناں چہ ڈاکٹر علوی کا اس غزل کو کلیات میں شامل کرنے کا کیا جواز ہے؟

۸۔ ۱۵۱ کے لیے بھی وہی کچھ کہا جاسکتا ہے جو مسوّدہ ۱۵۱ کے لیے کہا گیا ہے۔ یعنی اگر غزل ظفر کے نام سے ہے تو اب اسے ذوق کی ملکیت نہیں قرار دیا جاسکتا۔ لیکن اس سے شاید علوی صاحب کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ ذوق ظفر کے نام سے غزلیں کہتے تھے ہم گستاخی کی معافی چاہتے ہوئے یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ جن لوگوں نے ظفر کے کلیات کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے انھیں ہمارے اِس خیال سے اتفاق ہوگا کہ جہاں تک شاعرانہ صلاحیت کا تعلق ہے ظفر اپنے اُستاد ذوق اور دادا اُستاد شاہ نصیر (ویسے ظفر شاہ نصیر کے شاگرد بھی تھے) سے بہت آگے ہیں۔ کلیاتِ ظفر نایاب نہیں، بازار میں مل جاتا ہے پڑھ کر دیکھ لیجیے حقیقت واضح ہو جائے گی

۹۔ اور آخری یہ کہ نسخۂ دیوان میں کسی شعر یا اشعار کا نہ ملنا اس امر کی دلیل نہیں کہ وہ کلامِ ذوق کا ہو ہی نہیں سکتا لیکن جب تک وہ کسی معتبر مآخذ میں نہ ملے اُسے ذوق کا کلام قرار دینا کہاں تک مناسب ہے؟

یہ تو خارجی شواہد کا جائزہ تھا۔ اِس فہرست میں شامل کلام کا مفصل داخلی جائزہ مناسب موقع پر لیا جائے گا۔ یہاں صرف اِس امر کی طرف اشارہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان ۵۰ غزلوں (کل ۶۰۱ اشعار) کو جن پر مذکورہ "تمغۂ عنوان" موجود ہے بہ یقین ذوق کے ہاتھ کی تحریر کہنے کا کوئی جواز نہیں۔

قصیدہ اسی زمین میں حضرت ظلِ سبحانی ؛ سایۂ رحمتِ ربانی ؛ محمد سراج الدین بہادر شاہ خلداللہ ملکہ کی مدح میں لکھا اور (یہ) وہ دن تھے کہ حضرت بادشاہ ہنوز مسندِ ولی عہدی پر متمکن تھے ۔ کہتے ہیں کہ اس قصیدے میں نہایت شوکتِ الفاظ اور جودتِ معانی صرف کی تھی ......" (گلستانِ سخن بحوالہ ڈاکٹر اسلم فرخی) یہ ایک معاصر شہزادے کا بیان ہے لیکن نہ اُس نے یہ معرکہ دیکھا اور نہ اس طرح میں شاہ نصیر اور ذوق وغیرہ کا کلام۔ ثبوت اس کا یہ بھی ہے کہ اس زمین میں تین غزلیں شاہ نصیر کے کلیات ج ۲ میں موجود ہیں جسے خود ڈاکٹر علوی نے مرتب کیا ہے۔ پہلی غزل ۱۸ شعر کی ہے جس میں غلطی سے دو شعر گنشیام داس عاصی کے بھی آ گئے ہیں، دوسری میں ۱۲، اور تیسری میں ۱۴ شعر ہیں۔ گویا کُل ۴۴ شعر۔ اب اسے مبالغے کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔ بہر حال صاحب نے ذوق کے قصیدے کی "بہت تعریف" تو یہ کہہ کر کی ہے ناکہ "کہتے ہیں اُس قصیدے میں نہایت شوکتِ الفاظ ...... الخ" کوئی شعر مثال میں پیش نہیں کیا۔ اس سے وہ نتیجہ کیوں کر نکالا جا سکتا ہے جو ڈاکٹر علوی نے اخذ کیا ہے۔

۶۔ ۱۵۷ چمن کی شاخ والے قصیدے پر حصہ اوّل میں بحث کی جا چکی ہے۔ اس میں نہ ۲۱ نہ ۳۹ بلکہ پورے ۶۸ شعر ہیں جو خود آزاد نے تصنیف کیے ہیں۔ نسخۂ ویران میں صرف ۱۳ شعر ہیں (بہ قول ڈاکٹر علوی دس شعر) آزاد نے اُن میں سے کوئی شعر اپنے مرتبہ دیوان کے متن میں داخل نہیں کیا سوائے ایک شعر کے جسے اُنھوں نے نسخے کے تحت حاشیے میں درج کیا ہے۔ مولانا آزاد کے اس بیان پر یقین کرنے کے لیے بڑی سادہ لوحی کی ضرورت ہے "معلوم ہوتا ہے اس پر نظرِ ثانی نہیں ہوئی۔ خیر یادگار تو ہے" دربار میں پڑھے جانے والے اشعار کا نظرِ ثانی سے محروم رہنا تعجب خیز ہے، مزید حیرت اس امر پہ ہے کہ ذوق کا ہر مسودہ نظرِ ثانی سے محروم ہوتا ہے۔

۷۔ ۱۵۸، اوّل تو ۹ شعر کے ساتھ دو مصرعوں کی موجودگی اس مسودے کو مشکوک کرتی ہے، دوسرے یہ کہ جب یہ غزل معروف کے تخلص سے کہی گئی ہے ۶ ——— اسے ذوق کی ملکیت قرار دینا مناسب نہیں۔ اگر کوئی شخص اپنے شعر دوسرے کو بیچ دے یا بخش دے تو اُنھیں دوبارہ اپنی ملکیت قرار نہیں دے سکتا۔ اس سے کردار کی پستی ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن اس امر کا کوئی ثبوت نہیں کہ یہ غزل معروف کے نام سے ذوق نے کہی تھی آزاد

۱۔ مسودہ م۱ ، م۲ ، م۳ ، م۵ ، م۱۱ ، م۱۵ ، م۱۲ میں مکمل اشعار کے ساتھ ایک ایک، یا دو دو شعر یا مصرعے ناتمام کیوں ہیں؟ نسخۂ دیوان اور خود دیوان مرتبۂ آزاد میں ایسا ایک جگہ بھی نہیں، آخر کیوں؟

۲۔ مسودہ م۷ میں آخری دو شعروں کی روشنائی بدلی ہوئی کیوں ہے؟ کیا اس لیے نہیں کہ آزاد مختلف رنگوں کی پنسلیں اور روشنائیاں استعمال کرنے کے عادی تھے جیسا کہ پہلے حصّے میں دکھایا جا چکا ہے آزاد نے اپنی یہ عادت ذوق کو بخش دی۔ یہاں لگے ہاتھوں یہ بھی بیان کر دینا نامناسب نہیں ہوگا (کہ پہلے حصّے میں ایسا نہیں کیا جا سکا) کہ کھانے کے بعد اور صبح کو ٹہلنے اور لمبی سیر کی عادت آزاد کو تھی ذوق کو نہیں اور اپنی یہ عادت بھی اُنھوں نے ذوق کو بخش دی۔

۳۔ اگر مسودہ م۸ بہ قلمِ ذوق موجود تھا تو ڈاکٹر علوی نے اس غزل کو کلیات کے اُس حصّے میں کیوں شامل کیا جو صرف بروایتِ آزاد ہے؟

۴۔ م۱۱ میں ۲۵ کے علاوہ باقی اشعار کی قرأت کیوں ممکن نہیں؟ کیا اس لیے کہ اس میں بہت زیادہ کاٹ چھانٹ ہوئی ہے اور یہ کاٹ چھانٹ آزاد کا مزاج ہے؛ ذوق کے لیے اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ ایک ایک شعر کے ایک ایک مصرعے کو چار چار، پانچ پانچ مرتبہ آزاد کہتے تھے اور پھر بھی اُن کا اطمینان نہیں ہوتا تھا۔ ثبوت میں وہ تمام مسودے پیش کیے جا سکتے ہیں جن کا عکس ڈاکٹر صادق، پروفیسر شیرانی وغیرہ نے پیش کیا ہے۔ خود دیوان مرتبہ آزاد میں مزاج کی بے اطمینانی کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے بیشتر اشعار کے ساتھ "ن" (نسخہ) پیش کرنے کا یہی مطلب ہے۔ ذوق کے لیے تو لوگوں نے جو کچھ لکھا ہے (دہلی اردو اخبار وغیرہ میں) اُس سے تو یہ لگتا ہے کہ نہایت برجستہ گو تھے اور کئی کئی شاگردوں کو بہ یک وقت فی البدیہہ اصلاح بھی دیتے جاتے تھے اور اپنی غزل، قصیدہ وغیرہ بھی تصنیف کرتے جاتے تھے۔

۵۔ مسودہ م۱۳۔ قادر بخش صابر نے ذوق کے "تیلیاں والے" قصیدے کی بہت تعریف کی ہے" گم راہ کن بیان ہے۔ یا یوں کہیے کہ غلط استخراجِ نتائج کی عمدہ مثال ہے۔ "شاہ نصیر کی تلاش پر ہزار آفریں کہ ہر بار دو غزلہ ساٹھ ستر شعر کا پڑھتا تھا اور ہر شاگرد کی غزل اُنیس بیس بیت سے کم نہ ہوتی تھی۔ آخرالامر شیخ ابراہیم ذوق نے ایک

BUT EVEN SUCH APPARENTLY TRIVIAL AND MECHANICAL ACTIONS SHED LIGHT ON ONE's LIFE AND MAY NOT BE DISMISSED AS PURE FORMALITY" (P.82)

ہمیں آزاد کے مذہبی رجحانات یا تعصبات سے غرض نہیں۔ ہمارے مطلب کی بات صرف اتنی ہے کہ وہ "یا علی" ، "یا علی مدد" ، "اللہ علی یا ہوالعلی" جیسے اسمائے مبارکہ کو تمغائے عنوان بنائے بغیر کچھ لکھتے ہی نہیں۔ ڈاکٹر صادق کی رسائی آزاد کے کوائف تک نسبتاً آسان تھی۔ وہ "آزاد کی حمایت میں"* بھی بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ اس لیے اُن کی فراہم کردہ اطلاعات پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ معلوم ہوا کہ اسمائے مبارکہ کو تمغائے عنوان بنانا آزاد کی عادت بلکہ فطرت ہے ذوق کی نہیں کہ ذوق کے ہاتھ کی کوئی مُصدقہ تحریر ہم تک نہیں پہنچی۔ لہٰذا یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ جن مسوّدوں پر اس قسم کے عنوانات ملتے ہیں وہ ذوق کے ہاتھ کی تحریریں ہیں۔ (شیرانی مرحوم نے جن جعلی مسوّدوں کا ذکر کیا ہے اُن پر بھی یہی اسمائے مبارکہ بطور تمغائے عنوان ملتے ہیں)

اب آئیے مندرجہ بالا ۲۸ مسوّدوں کی طرف۔ اُنھیں دیکھنے کے بعد چند سوالات پیدا ہوتے ہیں:

---

* یہ عنوان ہے ڈاکٹر محمد صادق کے ایک مضمون کا جو صحیفہ کراچی بابت ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نے اپنی کتاب "محمد حسین آزاد" میں اس سے خاصا استفادہ کیا ہے۔ باوجود تلاش کے یہ مضمون کئی سال تک ہاتھ نہیں آیا۔ ۱۹۸۲ء کے آغاز میں معلوم ہوا کہ کشمیر یونی ورسٹی میں ڈاکٹر کبیر احمد جائسی کی زیرِ نگرانی صحیفہ کا اشاریہ مُرتب ہوا۔ میری درخواست پر محترم جائسی صاحب نے اُس مضمون کی ٹائپ شدہ نقل مہیا فرمائی جس کیلئے میں اُن کا شکر گذار ہوں۔ مضمون مذکور میں کوئی خاص یا نئی بات نہیں ملی۔ ڈاکٹر صادق نے م۔ ق خطوط کے حوالے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آبِ حیات کیلئے مواد فراہم کرنے میں آزاد نے ہر ممکنہ مواخذ سے مواد فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ مسئلہ اتنا نزاعی نہیں ہے، جتنا سمجھ لیا گیا ہے یا بنا دیا گیا ہے۔ اصل مسئلہ تو آزاد کے بیانات اور ان کی راست گفتاری کا ہے۔ ڈاکٹر صادق کچھ مفروضوں کو حقیقت مان کر چلے ہیں لہٰذا ان کے نتائج سے اتفاق کرنا ممکن نہیں۔

عابد

مسوّدوں پر ایسے الفاظ اور اعداد (۱۵۲ = ہوالعلی) لکھا ہوا ملتا ہے وہ ذوق ہی کے قلم سے ہیں۔ کیا اُن مسوّدوں پر ذوق کے دستخط ہیں؟ ایک جگہ علوی صاحب نے لکھا ہے: "وہ غزلیں جن کا تمغۂ عنوان ۱۵۲ (ہوالعلی) لکھا ہوا ملتا ہے مولینا باقر کے قلم سے ہیں" (اِس کا ثبوت؟) " مولینا آزاد کی یہ عبارت بگمانِ غالب انھیں تسویدات سے تعلق رکھتی ہے:

والدِ مرحوم کی بہت سی تحریریں ہیں بہت کچھ میری قسمت کے نوشتے ہیں کہ حاضر و غائب لکھتا اور جمع کرتا تھا"

تحقیق میں محض ظنِ غالب یا گمانِ غالب کی بنیاد پر کوئی دعویٰ کرنا کچھ زیادہ موزوں نہیں۔ مسودات میں مختلف مبارک الفاظ بہ طور تمغۂ عنوان ملتے ہیں۔ صرف "ہوالعلی" (۱۵۲) ہی کو مولوی باقر سے منسوب کرنے کا سبب؟ اِس فہرست کے دیگر مندرجات پر تبصرہ آگے آئے گا، فی الوقت "تمغۂ عنوان" پر اظہارِ خیال کی اجازت دیجیے۔ ڈاکٹر محمد صادق نے جنوری ۱۹۳۹ء میں "محمد حسین آزاد — حیات اور کارنامے" کے عنوان سے اپنا تحقیقی مقالہ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری کے لیے بزبانِ انگریزی پنجاب یونی ورسٹی میں داخل کیا تھا۔ خود مصنف کے بیان کے مطابق بہت معمولی ترمیم و اضافے کے ساتھ اِسے ۱۹۶۵ء میں شائع کر دیا گیا۔ اُس میں ایک باب "آزاد بہ حیثیت انسان" ہے۔ اس میں جہاں ڈاکٹر صادق نے آزاد کے خلاف مولوی خلیل الرحمٰن کے تعصّب کے الزام کو اِس بنا پر رد کیا ہے کہ وہ خود شیعوں سے متنفر تھے، اور آزاد کو ایک صاف باطن اور صاف گو شخص ثابت کیا ہے وہیں باطنی طور پر شیعیت کی طرف اُن کے جھکاؤ کا ذکر بھی کیا ہے ملاحظہ ہو:

MY OWN FEELING IS THAT AZAD's INTEREST IN SHI'ISM WAS EXCESIVE. FOR EXAMPLE, HE SELDOM PUT HIS PEN TO PAPER WITHOUT THE INVOCATION YA "ALI OR ALLAH-O-ALI". THIS MAY BE NO MORE THAN THE 786 بسم اللہ الرحمٰن الرحیم WITH WHICH ORTHODOX MUSALMANS, AND FOR THAT MATTER EVEN THE NON-ORTHODOX BEGIN THEIR LETTERS AND NOTES,

یاعلی مدد ۱۸ (...... صفحۂ محشر سے کم نہیں) ۲۷ شعر

ہواللہ اکبر ۱۹ (....... پیدا اگر ہو جائے گا) ۴ شعر

〃 ۲۰ (........ وہ چمن میں کمال کے) ۳۵ شعر

〃 ۲۱ (........ عزّ و شرف کی سوگند) ۵ شعر (اشعار قصیدہ ناتمام)

〃 ۲۲ (........ جو ہیں وفا کے بندے) ا شعر

〃 ۲۳ (........ کھاکر زمین دیکھے) ا شعر

〃 ۲۴ (........ یہ اغماض کہ ہائے) ا شعر

〃 ۲۵ (........ فسوں کے اثر سے کھیلے) ا شعر

〃 ۲۶ (........ عاشق کا خط سنائے) ا شعر

〃 ۲۷ (........ شانِ خط سے جُدا) ا شعر

〃 ۲۸ (........ سوزِ جگر کو دیکھتے ہیں) ۵ شعر" (کلیات ص ۵۲)

اِس فہرست میں ۲۸ مسوّدوں کا ذکر ہے جن میں اشعار کی مجموعی تعداد ۲۰۴ بنتی ہے۔ (ایک ایک مصرع نظر انداز کر دیا گیا ہے) ڈاکٹر علوی کا فرمان ہے کہ یہ ذوق کے اپنے مسوّدے ہیں۔ اِس کا سب سے بڑا اور واحد ثبوت وہ مبارک الفاظ ہیں جنھیں ذوق اپنی نگارشات کا تمغۂ عنوان بناتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ انھیں اِس کا علم کہاں سے ہوا کہ ذوق اِن مبارک الفاظ کو اپنی نگارشات کا تمغۂ عنوان بناتے تھے؟ کیا خود ذوق نے کہیں اس کا ذکر کیا ہے؟ کیا ذوق کے پس ماندگان (جو بہ قول ڈاکٹر علوی اَن پڑھ اور جاہل ہیں) میں سے کسی نے اس کا ذکر کیا ہے؟ کیا ذوق کے مستند تلامذہ؛ داغ؛ ویران؛ ظہیر؛ انور وغیرہ نے کہیں یہ لکھا ہے؟ اور اگر نہیں تو ڈاکٹر صاحب قطعیت سے یہ حکم کس بنا پر لگاتے ہیں؟ ڈاکٹر علوی سے بہت پہلے مولانا محمد حسین آزاد پر تحقیق کی جا چکی تھی ——— حیاتِ ذوق بھی لکھی جا چکی تھی۔ کیا حیاتِ ذوق میں اس کا ذکر ہے؟ نہیں۔ کیا مولانا محمد حسین آزاد جنھیں علوی صاحب نے ذوق کے تلامذہ میں سرِ فہرست رکھا ہے۔ (ملاحظہ ہو ذوق سوانح اور انتقاد) نے کہیں اس بات کا ذکر کیا ہے؟ حالاں کہ وہ ذوق سے ایسی ایسی باتیں منسوب کر گئے ہیں، جو کوئی بہت ہی قریبی شخص کر سکتا ہے اور جو نظر بہ ظاہر حقیقت معلوم ہوتی ہیں اگرچہ دراصل ایسا نہیں ہے۔ پھر آخر اس امر کا ثبوت کیا ہے کہ جن

یا علی مدد ملا (....... لب پہ وہ لائے تو سہی) ١٠ شعر ایک مصرعہ

- ملا (....... مضطرب احوال ہے) ٢٥ شعر باقی اشعار کی قرأت ممکن نہیں.
- ملا (....... داد رس کی تیلیاں) ٣٦ شعر ایک مصرعہ. غزل اور قصیدے کے اشعار ایک ہی مسودے میں موجود ہیں. اس زمین میں ذوق اور شاہ نصیر کے مابین معرکۂ سخن ہوا تھا۔

ملا (اس قد کو کیونکہ کہیے نہال چمن کی شاخ) ٣٩ شعر غزل اور قصیدے کے اشعار ایک ہی مسودے میں موجود ہیں. مولینا نے اسے غزلیات کے ذیل میں درج کیا ہے اور اس سے متعلق لکھا ہے ؛
اس زمانے کا ایک مسودہ میرے ہاتھ آگیا۔
معلوم ہوتا ہے اس پر نظر ثانی نہیں ہوئی۔
خیر یادگار تو ہے۔

یا علی مدد شلا (...... رخ و لب اس قدر لذیذ) ٦ شعر دو مصرعہ ۔ یہ غزل ذوق نے معروف کے نام سے لکھی ہے۔

یا علی مدد ملا (.......آنکھ کا یوں ڈورا اٹھ جائے) ٦ شعر ایک مصرعہ ۔ یہ غزل ظفر کے نام سے لکھی گئی ہے۔

یا علی مدد ملا (...... شغلِ عشق بازی ہے) ٧ شعر

ـــه اس کی تفصیل مولینا آزاد کے علاوہ صاحبِ گلستانِ سخن مرزا قادر بخش صابر نے بھی پیش کی ہے اور ذوق کے قصیدے کی بہت تعریف کی ہے۔ مولینا آزاد نے اپنے مرتبہ دیوان میں ٢٧ شعروں پر مشتمل ایک غزل پیش کرتے ہوئے لکھا ہے اُستاد کی سب غزلیں اس زمین میں نہ ملیں۔ پہلے مشاعرے کی غزل بہت خوب تھی۔ دو مسودے ساتھ (؟ ہاتھ) آ گئے ہیں۔ ایک پر کچھ شعر قصیدے کے بھی ہیں۔ مگر سب پڑھے نہیں جاتے. غزل کے شعر لکھتا ہوں۔ مولینا آزاد کے پیش کردہ غزل کے ١٤ شعر بہ اختلاف نسخ اس مسودہ میں مل جاتے ہیں)

قابلِ لحاظ حصّہ ذوق کے اپنے مسودات اور اور بجنبل تحریروں کی صورت میں موجود تھا یہ
ذخیرہ ہنوز خاندانِ آزاد میں محفوظ چلا آتا ہے۔ ممکن ہے مولینا کے پاس اس سے بھی کچھ
زیادہ موجود ہو۔ اس وقت جو مسودے ذوق کے اپنے قلم سے موجود ہیں اُن میں
اُردو کی غزلوں اور قصیدوں کے علاوہ فارسی زبان میں کچھ کچھ اشعارِ غزل و قصیدہ
بھی ملتے ہیں۔ اور اکثر مسوّدوں کے ساتھ وہ مبارک الفاظ و اعداد بھی برکت کے لیے
لکھے ہوئے ہیں جنھیں ذوق مرحوم اپنی نگارشات کا تمغۂ عنوان بناتے تھے۔ (مقدمہ ص۶)

بات مناسب ہے۔ حافظ ویران اور اُن کے ساتھیوں کی دسترس میں تمام ماٰخذ نہیں
ہو سکتے تھے (ظہیر دہلوی کی دسترس میں تھے کیوں کہ نسخۂ ویران کی ترتیب میں شریک ہوتے
ہوئے بھی کچھ غزلیں نگارستان میں کم و بیش اسی وقت شامل کیں اور حافظ ویرآن کو اس
سعادت سے محروم رکھا) اگر اس طرح کے ماٰخذ تک موجودہ محققین کی رسائی ہے تو کوئی تعجب
کی بات نہیں۔ اگر یہ ماٰخذ مستند و معتبر ہیں تو اُن میں پایا جانے والا کلام بلاشُبہ کلیاتِ
ذوق میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ مگر بات مُستند و معتبر کی ہے۔ اِس پر مزید اظہارِ خیال
حسبِ موقع کیا جائے گا۔ بہر دست " تمغۂ عنوان " والے قول پر تبصرہ ضروری ہے۔ ڈاکٹر
علوی لکھتے ہیں :

"ذوق کے ان مسودوں کے مشتملات حسبِ ذیل ہیں :

یا علی مدد ۱ (...... تو کیا پتھر تھے) ۶ شعر ایک مصرعہ
" " " ۲ (...... تو نگر تھے تو کیا پتھر تھے) ۴ شعر دو مصرعے
" " " ۳ (...... خیالِ چشمِ فتاں ہی رہا) ۴ شعر
یا علی مدد کن ۴ (...... اِک رات بہا آنسو گرم) ۲۲ شعر ایک مصرعہ
ہو اللہ اکبر ۵ (...... دل تنگ لگاؤں) ۷ شعر، شعرِ دوم کا پہلا مصرعہ ناتمام ہے۔
یا علی مدد ۶ (...... در سے اوپر ہیں) شعر ۲ ایک مصرعہ دو طرح سے لکھا ہوا ملتا ہے۔
ہو اللہ اکبر ۷ (...... کیا خاک ہم سر ہو) ۱۴ شعر آخیر کے دو شعروں کی رُشنائی بدلی ہوئی ہے
" " ۸ (...... زر کو دیکھتے ہیں) ۶ شعر
" " ۹ (...... ایمان نہ دیں رہا محفوظ) ۹ شعر
" " ۱۰ (...... زخم نئے تیغ زن نہیں دیتے) ۱۵ شعر

یاعلی مدد ۱۱۱ (....... لب پہ وہ لائے تو سہی) ۱۰ شعر ایک مصرعہ

" ۱۱۲ (....... مضطرب احوال ہے) ۲۵ شعر باقی اشعار کی قرأت ممکن نہیں.

" ۱۱۳ (....... وادرس کی تیلیاں) ۳۶ شعر ایک مصرعہ. غزل اور قصیدے کے
اشعار ایک ہی مسودے میں موجود ہیں اِس
زمین میں ذوق اور شاہ نصیر کے مابین معرکۂ
سخن ہوا تھا۔*

۱۱۴ (اس قد کو کیونکہ کہیے نہال چمن کی شاخ) ؛ ۳۹ شعر غزل اور قصیدے کے
اشعار ایک ہی مسودے میں موجود ہیں مولینا
نے اسے غزلیات کے ذیل میں درج کیا
ہے اور اس سے متعلق لکھا ہے ؛
اس زمانے کا ایک مسودہ میرے ہاتھ آگیا۔
معلوم ہوتا ہے اس پر نظر ثانی نہیں ہوئی۔
خیر یادگار تو ہے۔

یاعلی مدد ۱۱۵ (...... رُخ و لب اِس قدر لذیذ) ۹ شعر دو مصرعہ ۔ یہ غزل ذوق نے معروف
کے نام سے لکھی ہے۔

یاعلی مدد ۱۱۶ (...... آنکھ کا یوں ڈورا اُڑ جائے) ۹ شعر ایک مصرعہ ۔ یہ غزل ظفر کے نام
سے لکھی گئی ہے۔

یاعلی مدد ۱۱۷ (...... شغلِ عشق بازی ہے) ۷ شعر

---

* اس کی تفصیل مولینا آزاد کے علاوہ صاحبِ گلستانِ سخن مرزا قادر بخش صابر نے بھی پیش کی ہے اور ذوق کے قصیدے کی بہت تعریف کی ہے۔ مولینا آزاد نے اپنے مرتبہ دیوان میں ۲۷ شعروں پر مشتمل ایک غزل پیش کرتے ہوئے لکھا ہے اُستاد کی سب غزلیں اس زمین میں نہ ملیں۔ پہلے مشاعرے کی غزل بہت خوب تھی۔ دو مسودے ساتھ (؟ ہاتھ) آ گئے ہیں۔ ایک پر کچھ شعر قصیدے کے بھی ہیں۔ مگر سب پڑھے نہیں جاتے. غزل کے شعر لکھتا ہوں۔ مولینا آزاد کے پیش کردہ غزل کے ۱۴ شعر بہ اختلاف نسخ اس مسودہ میں مل جاتے ہیں)

قابلِ لحاظ حصہ ذوق کے اپنے مسودات اور اور بچّل تحریروں کی صورت میں موجود تھا یہ ذخیرہ ہنوز خاندانِ آزاد میں محفوظ چلا آتا ہے۔ ممکن ہے مولینا کے پاس اس سے بھی کچھ زیادہ موجود ہو۔ اس وقت جو مسودے ذوق کے اپنے قلم سے موجود ہیں اُن میں اُردو کی غزلوں اور قصیدوں کے علاوہ فارسی زبان میں کچھ کچھ اشعارِ غزل و قصیدہ بھی ملتے ہیں۔ اور اکثر مسوّدوں کے ساتھ وہ مبارک الفاظ و اعداد بھی برکت کے لیے لکھے ہوئے ہیں جنھیں ذوق مرحوم اپنی نگارشات کا تمغۂ عنوان بناتے تھے۔ (مقدمہ ص۹)

بات مناسب ہے۔ حافظ ویران اور اُن کے ساتھیوں کی دسترس میں تمام ماٰخذ نہیں ہو سکتے تھے (ظہیر دہلوی کی دسترس میں تھے کیوں کہ نسخۂ ویران کی ترتیب میں شریک ہوتے ہوئے بھی کچھ غزلیں نگارستان میں کم و بیش اُسی وقت شامل کیں اور حافظ ویران کو اس سعادت سے محروم رکھا) اگر اس طرح کے ماٰخذ تک موجودہ محققین کی رسائی ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اگر یہ ماٰخذ مُستند و معتبر ہیں تو اُن میں پایا جانے والا کلام بلاشُبہہ کلیاتِ ذوق میں شامل کیا جا سکتا ہے، مگر بات مُستند و معتبر کی ہے۔ اِس پر مزید اظہارِ خیال حسبِ موقع کیا جائے گا۔ سردست " تمغۂ عنوان " والے قول پر تبصرہ ضروری ہے۔ ڈاکٹر علوی لکھتے ہیں :

" ذوق کے ان مسوّدوں کے مشتملات حسبِ ذیل ہیں :

یا علی مدد ۱ (...... تو کیا پھرتے تھے) ۶ شعر ایک مصرعہ

〃 〃 〃 ۲ (...... تونگر تھے تو کیا پھرتے تھے) ۴ شعر دو مصرعے

〃 〃 ۳ (...... خیال چشم فتاں ہی رہا) ۴ شعر

یا علی مددکن ۴ (...... اِک رات بہا آنسو گرم) ۲۲ شعر ایک مصرعہ

ہو اللہ اکبر ۵ (...... دل تنگ نکالوں) ۷ شعر، شعرِ دوم کا پہلا مصرعہ ناتمام ہے۔

یا علی مدد ۶ (...... در سے اوپر ہیں) شعر ۳ ایک مصرعہ دو طرح سے لکھا ہوا ملتا ہے۔

ہو اللہ اکبر ۷ (...... کیا خاک ہم سر ہو) ۱۴ شعر آخیر کے دو شعروں کی رُشنائی بدلی ہوئی ہے

〃 〃 ۸ (...... زر کو دیکھتے ہیں) ۶ شعر

〃 〃 ۹ (...... ایمان نہ دیں رہا محفوظ) ۹ شعر

〃 〃 ۱۰ (...... زخم نئے تیغ زن نہیں دیتے) ۱۵ شعر

کا اضافہ کیا ہے۔ نسخۂ ویران میں اس کے ۲۱، اور دیوان مرتبہ آزاد میں ۲۲ شعر ملتے ہیں) تعجب ہوتا ہے کہ حافظ ویران ذوق کی خدمت میں حاضر باشی کے باوجود اِس قدر ناواقف شخص ہیں ..... یہ پچپن کا کلام سوائے بعض غزلوں کے ان مخصوص رنگوں میں نہیں ہے جس رنگ میں ان کا باقی کلام ہے۔ لہٰذا اس حصۂ کلام پر جس کے راوی تنہا مولینا آزاد ہیں شبہہ کی گنجایش نکل آتی ہے۔ (ہندستانی بحوالہ مقدمۂ کلیاتِ ذوق)

شیرانی مرحوم نے بڑی مناسب بات کہی ہے کہ جو کلام تنہا آزاد کی روایت سے ہم تک پہنچا ہے وہ مشکوک ہے۔ مندرجہ فہرست کی پہلی بیس غزلوں کو ڈاکٹر علوی نے بھی اس حصے میں درج کیا ہے جو بہ روایتِ آزاد ہے (گویا مشکوک ہے) اور ۱۲ غزلوں کو مستند حصۂ کلام میں جگہ دی ہے پروفیسر شیرانی کے قول پر ڈاکٹر علوی کا تبصرہ نقل کرنے سے پہلے یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فہرستِ مذکور کی پانچ غزلیں (۱۶ تا ۲۰) وہ ہیں جن کے مسودے شیرانی مرحوم کو مولانا آزاد کو قلم سے لکھے ہوئے ملے تھے۔ باقی ۲۷ غزلوں میں گیارہ غزلوں کے کچھ کچھ متفرق اشعار نسخۂ ویران میں موجود ہیں۔ گویا اب ۱۶ غزلیں مکمل طور پر مشکوک ٹھہریں۔ (جن غزلوں کے ایک ایک دو دو اشعار نسخۂ ویران میں ہیں اُن میں ترمیم و اضافے کی تفصیل ہم آگے چل کر پیش کریں گے۔ ۱۴ غزلوں کو پروفیسر شیرانی پہلے ہی الحاقی ٹھہرا چکے ہیں۔ گویا کُل تیس الحاقی غزلوں کی نشاندہی انھوں نے فرمائی (اُن میں بھی ایک کے لیے ڈاکٹر علوی صاحب نے دبی زبان سے احتجاج کیا ہے) اب شیرانی مرحوم کے قول پر علوی صاحب کے تاثرات ملاحظہ ہوں:

> اس روایت پر جس کے راوی تنہا مولینا محمد حسین آزاد ہیں بعض وجوہ سے شبہہ کرنے کی گنجایش ضرور نکل آتی ہے لیکن یہ پورا مسئلہ چھان بین اور فیصلہ دہی میں ضروری احتیاط کا تقاضہ کرتا ہے۔ حافظ ویران کے نسخہ میں کسی حصۂ کلام کے نہ ہونے کے یہ معنی نہیں ہوسکتے کہ اُسے ذوق کا کلام ہی نہ مانا جائے۔ ویران اور اس کے ساتھی ذوق کے تمام کلام سے اگر واقف بھی رہے ہوں تو وہ سب کا سب اُن کی دسترس میں نہیں تھا۔ ظہیر دہلوی کے مرتبہ نگارستانِ سخن میں شامل غزلیں اِس کے ثبوت کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں (جبکہ ظہیر دہلوی نسخۂ ویران کی ترتیب میں بھی شریک ہیں) ذوق کے متعدد قلمی ماخذ ایسے ہیں جن میں شامل کلام کا ایک

مندرجہ بالا چودہ غزلوں کے علاوہ شیرانی مرحوم نے مندرجہ ذیل غزلوں پر بھی شبہے کا اظہار کیا ہے:

۱۔ جل اُٹھا شمع نمط تارِ رگِ جاں میرا
۲۔ رکھتے تھے جو کشورِ کسریٰ و قیصر زیرِ پا
۳۔ دشمنِ جاں یک بہ یک سارا زمانہ ہو گیا
۴۔ کوہ کے چشموں سے اشکوں کو نکلتے دیکھا
۵۔ برنگِ گل صبا سے کب کھلا دل گیر دل میرا
۶۔ ان سے کچھ وصل کا ذکر اب نہیں لانا اچھا
۷۔ چاہے عالم میں فروغ اپنا تو ہو گھر سے جدا
۸۔ لختِ دل اور اشک تر دونوں بہم دونوں جدا
۹۔ لعلِ لب و دندانِ صنم کا دل نے جب سے خیال کیا
۱۰۔ ہجر میں کیا کیا مرض ہے سنگِ دل پیدا ہوا
۱۱۔ رکھ دل جلوں کی خاک پہ تو با فراغ پا
۱۲۔ ہم سے ظاہر و پنہاں جو اس غارت گر کے جھگڑے ہیں
۱۳۔ ہاتھ سینے پہ مرے رکھ کے کدھر دیکھتے ہو
۱۴۔ جو کھوے قدِ یار کی تصویر دکھا دو
۱۵۔ دمِ ذبح تیغِ جفا میں جب تری بہتا آبِ حیات ہو
۱۶۔ خدا نے میرے دیا سینہ لالہ زار مجھے
۱۷۔ مرضِ عشق جسے ہو اُسے کیا یاد رہے
۱۸۔ حد رقم سے وصفِ جبیں ہے صنم پرے
۱۹۔ خمِ ابرو ترا جب یار نظر آتا ہے
۲۰۔ مار کر تیر جو وہ دلبرِ جانی مانگے
۲۱۔ تجھ کو یوسف سے کیا حسن میں بہتر پیدا
۲۲۔ ترے ہاتھوں کوئی آوارہ اے گردوں نہ ٹھہرے گا
۲۳۔ دیوانہ ہوں تیرا مجھے کیا کام کروں گُل
۲۴۔ تمنا نہیں ہے کہ امداد دل کو تپش کا صلہ ہو کہ مژدہ قلق ہو
۲۵۔ جس ہاتھ میں خاتم لعل کی ہے گر اُس میں زلفِ سرکش ہو
۲۶۔ عبث تم اپنا زکاوٹ سے مُنہ بناتے ہو
۲۷۔ ہیں ترے رشکِ خطِ رخسار سے
۲۸۔ یاں کے آنے کا مقرر قاصدا وہ دن کرے
۲۹۔ کوئی کمر کو تری کچھ جو ہو کمر تو کہے
۳۰۔ کہتے ہیں لوگ موت تو سب جائے جائے ہے
۳۱۔ قفلِ صد خانۂ دل آیا جو تو ٹوٹ گئے
۳۲۔ کس کے مو شانے میں اے دستِ ہوس ٹوٹ گئے

یہ غزلیں دیوانِ ذوق مرتبہ مولانا آزاد میں بچپن کے کلام کے تحت پیش کی گئی ہیں۔ ہم نے یہ فہرست کلیاتِ ذوق مرتبہ ڈاکٹر علوی کے مقدمے سے نقل کی ہے البتہ اپنی سہولت کے لیے ترتیب میں معمولی سی ترمیم کر لی ہے۔ علوی صاحب نے اس پر شیرانی مرحوم کا یہ تبصرہ نقل کیا ہے:

> اِس فہرست کی اکثر غزلیں حافظ ویران کے اڈیشن میں نہیں ملتیں...... صرف گیارہ غزلوں کے ایک ایک دو دو یا زیادہ شعر ملتے ہیں سوائے غزل ۲۲ (مندرجہ فہرست میں ۲۷) جو اُن کے دیوان میں موجود ہے۔ (اس غزل میں بھی آزاد نے ایک شعر

پروفیسر شیرانی کی اِس تحقیق پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر تنویر احمد علوی مقدمۂ کلیاتِ ذوق میں لکھتے ہیں :

اِن سب غزلوں سے متعلق پروفیسر شیرانی مرحوم کے اس خیال کی تردید شاید ممکن نہ ہوسکے (؟) لیکن غزل نمبر ۱۲ سے متعلق یہ عرض کرنے کی گنجائش ہے کہ اس کا مسودہ بہ قلمِ ذوق ہنوز موجود ہے اور اس میں تقریباً یہ تمام غزل جسے مولانا آزاد کی فرمائیوں (کذا) سے منسوب کیا گیا ہے اور بجنسہٖ حالت میں مل جاتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مسودۂ ذوق میں اشعار کی تعداد ۱۵ اور آزاد کے یہاں اٹھارہ ہے۔ دونوں کی روایتوں میں بعض اختلافات بھی موجود ہیں۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی موجودہ دور کے ایک معتبر محقق ہیں اور راقم الحروف کے استاد بھی۔ اِس لیے اُن سے بصد عجز و ادب التماس ہے کہ وہ یہ فرمائیں کہ جسے وہ ذوق کا مسودہ کہتے ہیں اُس کے لیے اُن کے پاس ثبوت کیا ہے؟ اُن کی کتابیں "ذوق سوانح اور انتقاد" اور "کلیاتِ ذوق" (ہندستانی اور پاکستانی دونوں اڈیشن) راقم کی نظر سے گزری ہیں۔ اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھیں جتنے مسودے دستیاب ہوئے ہیں وہ سب آزاد کے ذخیرے اور آغا باقر کی تحویل میں ہیں۔ جتنے مسودوں کا عکس ہماری نظر سے گزرا ہے اُن میں اور آزاد کے قلم کے مسودوں کے عکس میں کوئی واضح فرق نظر نہیں آتا۔ جب تک ذوق کے ہاتھ کی کوئی تحریر کسی دوسرے ماٰخذ سے دستیاب نہ ہو تب تک یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ یہ ذوق کے ہاتھ کی تحریر ہے۔ استادِ محترم کو اس کا جواب دینے میں بھی شاید دقت پیش آئے کہ جب غزلِ مذکور کا مسودہ بہ قلمِ ذوق موجود تھا اور آزاد اُس میں ترمیم و اضافہ کر چکے تھے تو پھر انھیں دوسرا مسودہ ایک طالبِ علم کے امتحان کی کاپی پر تیار کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ نیز یہ کہ جب خود اُن کی دسترس میں مذکورہ غزل کا مسودہ بہ قلمِ ذوق موجود تھا تو انھوں نے اس غزل کو کلیات کے اُس حصے میں کیوں شائع کیا جس میں وہ کلام شامل کیا گیا ہے جو حرف بروایتِ آزاد ہے۔ اگر ہمارے پیشِ نظر دونوں مسودوں کا عکس موجود ہوتا تو کچھ عرض کیا جاسکتا تھا۔ یقین ہے کہ اگر ڈاکٹر صاحب دونوں مسودوں کا از سرِ نو بغور جائزہ لیں تو انھیں یقین آجائے گا کہ دونوں مسودے آزاد کے قلم سے ہیں۔ ہمارے خیال سے آج تک ذوق کے اپنے ہاتھ کی کوئی تحریر دستیاب نہیں ہوئی۔ جن تحریروں کو بہ یقین بہ قلمِ ذوق کہا گیا ہے اُن پر تبصرہ آیندہ سطور میں ہوگا۔

کا آغاز تو غالبؔ آغا باقر کی فرمایش سے ہوا تھا لیکن وہ شاید اِس سے خوش نہیں ہوئے۔ "ہندستانی" میں اس کی کُل سات قسطیں شائع ہوئی تھیں۔ بد قسمتی سے ہماری دسترس میں صرف پہلی پانچ قسطیں ہیں، بعد کے شمارے میسّر نہیں آئے۔ یہ پانچ قسطیں ۱۰۵ صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ مضمون مقالاتِ شیرانی ج ۳ میں شامل ہے، وہاں ضخامت ۱۹۰ صفحات ہے لیکن مقالاتِ شیرانی بھی ہماری دسترس میں نہیں ہیں۔ جن قسطوں میں شیرانی صاحب نے اُس کلام کی نشاندہی کی تھی جو مولانا آزاد کی تصنیف ہے (انھوں نے اُس کے عکس بھی شائع کروائے تھے) یا جس کلام کو پروفیسر شیرانی نے مشکوک قرار دیا تھا وہ حصّہ اُن دو اقساط میں تھا جو پیشِ نظر نہیں۔ چناں چہ اس سلسلے میں ہماری معلومات ثانوی ذرائع پر مبنی ہیں۔ شیرانی مرحوم نے بلا مبالغہ سیکڑوں اشعار میں آزاد کی تحریف و تصحیف کی مثالیں پیش کی تھیں۔ اُن کے علاوہ چودہ غزلوں کے مسودے پیش کیے تھے جو آزاد کی تصنیف ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ اُن میں بعض مسوّدوں کے کاغذ طالب علموں کی امتحانی کاپیوں سے لیے گئے ہیں۔ دو کاغذ نارتھ ویسٹرن ریلوے کے مطبوعہ فارموں پر ہیں جو جنوری ۱۸۸۸ء میں چھپے تھے۔ ایک کاغذ ڈائرکٹر تعلیمات پنجاب کے دفتر سے مارچ ۱۸۸۷ء کی تاریخ کی آزاد کے نام چٹھی ہے (بحوالہ محمد حسین آزاد، حصّہ ۲، صفحہ ۵۳۵) ظاہر ہے کہ اِن کاغذ کا وجود ذوقؔ کے زمانے میں نہیں تھا۔ مذکورہ ۱۴ غزلوں کے علاوہ شیرانی مرحوم نے ۲۲ غزلوں کو مشکوک قرار دیا تھا۔ ترمیم و تحریف شدہ کلام کی تفصیل پیش کرنا بے جا تکرار کا موجب ہوگا البتہ مشکوک اور الحاق کلام کی تفصیل ذیل میں پیش کی جارہی ہے تاکہ جب مزید مشکوک کلام کی نشاندہی کی جائے تو قارئین کو پوری صورتِ حال کا اندازا ہو سکے۔

۱۔ ہم سے ظاہر و نہاں جو اُس غارت گر کے جھگڑے ہیں
۲۔ خدا نے میرے دیا سینہ لالہ زار مجھے
۳۔ مرضِ عشق جسے ہو اُسے کیا یاد رہے
۴۔ چشمِ قاتل ہیں کیونکر نہ بھلا یاد رہے
۵۔ تدبیر نہ کر، فائدہ تدبیر میں کیا ہے
۶۔ پریرو کیا ستمگر بیشتر ایسے نہ ہوتے تھے
۷۔ نہ کھینچو عاشقِ تشنہ جگر کے تیر پہلو سے
۸۔ برق میرا آشیاں کب کا جلا کر لے گئی
۹۔ حد رقم سے وصفِ جبیں ہے صنم پرے
۱۰۔ ذکرِ مژگاں تیرا جس کے روبرو نکلا کرے
۱۱۔ خمِ ابرو ترا جب یار نظر آتا ہے
۱۲۔ دکھلا نہ خالِ ناف تو اے گُلبدن مجھے
۱۳۔ مار کر تیر جو وہ دلبرِ جانی مانگے
۱۴۔ نہ دیں گواہی جو داغِ کہن نہیں دیتے

نظرِثانی آزاد نے ڈیڑھ مہینے میں کی تھی۔ ڈاکٹر اسلم فرخی کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ آبِ حیات پر نظرِثانی کرنے میں آزاد نے نہ صرف اُس میں معتد بہ اِضافہ کیا بلکہ کئی لوگوں کا حال از سرِ نو لکھا گیا۔ پوری کتاب میں بے شمار لفظی تبدیلیاں کیں؛ کئی لوگوں کے احوال میں بہت سے واقعات بڑھائے۔ بہ قول اسلم فرخی "پہلے اڈیشن میں صفحات کی تعداد پانسو سات تھی۔ ہر صفحے پر اُنیس سطریں تھیں۔ اور ہر سطر میں کم و بیش سترہ اٹھارہ لفظ تھے۔" بعد کے اڈیشن اِسی اڈیشن کی نقل ہیں۔ چناں چہ فی الوقت تیسرا اڈیشن مطبوعہ ۱۸۸۷ء پیشِ نظر ہے۔ اِس میں صفحات کی تعداد پانچ سو چونسٹھ ہے۔ ہر صفحے میں بالعموم بیس سطریں ہیں۔ (جہاں حاشیوں میں باریک قلم استعمال کیا گیا ہے اُن میں سطر ۲۱-۲۵ سطری ہو گیا ہے) اور ہر سطر میں کم و بیش سترہ اٹھارہ الفاظ ہیں۔ اِس لحاظ سے ستاون صفحات کامل اور ۵۰۷ سطور یا کل ۸۶ اُنیس[۱۹] سطری صفحات کا اِضافہ ہوا ہے۔ اگر لفظی تبدیلیوں کو دیکھا جائے تو کوئی صفحہ رد و بدل سے نہیں بچا (اگر ان کی فہرست تیار کی جائے تو آبِ حیات کے حجم کے برابر ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے) اِس میں زبان و بیان اور مضامین و مطالب ہر قسم کی تبدیلیاں شامل ہیں۔ جن لوگوں کو کتابوں پر نظرِثانی کرنے کا اتفاق ہوا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ پوری کتاب کو از سرِ نو لکھنا آسان ہے لیکن نظرِثانی کا کام نہ صرف دِقت طلب ہے بلکہ (دقت) طلب بھی ہے۔ چنانچہ اِس سلسلے میں خود آزاد کا قول ہے: "آبِ حیات نے مجھے ہلاک کر دیا مجھ سے بے وقوفی یہ ہوئی ہے کہ دس مہینے کا کام تھا جو ڈیڑھ مہینے میں کیا ہے۔" (مکتوبات) مقصود صرف یہ دکھانا ہے کہ آزاد کس قدر مشقت کے عادی تھے اور ایک قلیل مدت میں کس قدر کام انجام دے سکتے تھے۔ اب اگر دیوانِ ذوق کی ترتیب پر دس مہینے کی شب و روز محنت کو مدِ نظر رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ آزاد نے کلام کو محض مُرتب ہی نہیں کیا بلکہ اُس پر نظرِثانی کی؛ ترمیم و اصلاح کی اور جتنا کلام ترتیب دیا کم و بیش اُتنا ہی کلام تصنیف بھی کر ڈالا، اور صلے میں جُنوں کا شکار ہو گئے۔

یہ نہیں کہ اِس قسم کے شُبہے کا اِظہار پہلی بار کیا جا رہا ہو۔ عہدِ آزاد میں کیے جانے والے زبانی شکوک و شبہات سے قطع نظر تقریباً نصف صدی پہلے اکتوبر ۱۹۲۴ء میں پروفیسر حافظ محمود شیرانی مرحوم نے رسالہ ہندستانی (سہ ماہی) میں ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا تھا۔ "شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد اور دیوانِ ذوق" جو اُن کے انتقال تک جاری رہا۔ اِس سلسلے

اِس بیان کو تردید بھی نہیں کہا جا سکتا۔ مولانا کو دُکھ ہے کہ اُن کے علم و فضل اور برگزیدگی کے باوجود لوگ اُنھیں شک و شُبہے سے بالا نہیں سمجھتے۔ اُنھیں ایسی غزلیں اپنے نام سے شائع کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اُنھیں تو ذوق کا کلام ضائع ہو جانے کا دُکھ تھا جو بہ قول اُن کے سمندر میں بوند بھی باقی نہیں بچا تھا۔ چناں چہ اُنھوں نے خاموشی سے اِس قطرے کو دریا کرنے کا بیڑا اُٹھایا ورنہ دس مہینے آنکھوں کا تیل ٹپکانے کی ضرورت نہیں تھی۔ بہ قول اُن کے اُن کے پاس "اُستاد" کا کلام محفوظ تھا؛ بس اِتنا تھا کہ بے ترتیب پڑا تھا۔ کوئی تنقیدی اڈیشن تو اُنھیں شائع کرنا نہیں تھا؛ نہ اِختلافِ نسخ کی ضرورت؛ نہ حوالے اور ماخذ کی۔ چند کہانیاں بیان کرنا تھیں جن سے یہ معلوم ہو کہ کس شعر یا غزل یا نظم کے ساتھ کیا واقعہ خاص پیش آیا، اور ایسی بیشتر کہانیاں وہ پہلے ہی تراش چکے تھے۔ (یہ محض اِتفاق یا حافظے کی لغزش نہیں ہے کہ وہ سب کہانیاں یا واقعات بے بُنیاد اور غلط ہیں۔) پھر دس مہینے دن رات دروازے بند کر کے آنکھوں کا تیل ٹپکانے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ بھی نہیں کہ اُنھوں نے کلام کو تاریخی ترتیب سے مُرتّب کیا ہو۔ صرف دو مقامات پر سنہ کا ذکر ہے؛ ایک ۱۲۴۵ھ، اور دوسرا ۱۲۶۰ھ۔ اور دونوں کے لیے اُنھوں نے کوئی سند پیش نہیں کی۔ ۱۲۴۵ھ کے آخر میں تو وہ پیدا ہی ہوئے تھے؛ لہٰذا اِس سنہ کے متعلق جو کچھ اُنھوں نے لکھا اُسے بغیر سند کے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۲۶۰ھ میں وہ تقریباً پندرہ برس کے تھے اور جن غزلوں کے ساتھ ۱۲۶۰ھ یا تیس ہزاری باغ کا حوالہ ملتا ہے وہ بھی مشکوک ہیں۔ اِس کے خلاف داخلی شواہد موجود ہیں جن کا ذکر حسبِ موقع کیا جائے گا۔ فی الوقت تو مقصود اِس شُبہے کا اظہار ہے کہ اگر کسی کے پاس کلام موجود ہو تو اُسے ترتیب دینے میں دس ماہ کی مدت کسی صورت نہیں لگ سکتی۔ خصوصاً جب کہ اِس ساری مدّت میں دن رات یہی ایک تالیفی کام کیا جاتے۔ خود آزاد کے ایسے اقوال موجود ہیں کہ اُنھوں نے دس مہینے کا کام صرف ڈیڑھ مہینے میں انجام دیا۔ سخن دانِ فارس اور طبعِ دوم کے لیے آبِ حیات کی

(حاشیہ جاری)

اُن کے جنوں کے زمانے میں ہوئی اور اُنھوں نے خاتمے کی عبارت عالمِ جنوں میں لکھی۔ خاتمے کی عبارت سے تو یہی نکلتا ہے کہ آزاد مسودہ پریس میں بھیجنے تک بہ قید ہوش تھے، نیز اِس خط سے گمان ہوتا ہے کہ وہ دیوان کی اشاعت کے بعد ہی دیوانے ہوئے۔

ہی میں مولینا آزاد نے دیوانِ ذوق چھپوایا ہے۔ مولینا آزاد کے اڈیشن کی نسبت ایک صاحب کہنے لگے کہ اس میں انھوں نے بہت سی غزلیں اپنی ملادی ہیں چنانچہ وہ کہتے تھے کہ میں اس کتاب خانے میں جو اکبری دروازے کے باہر تھا جایا کرتا تھا اور دیکھا کرتا تھا کہ مولوی صاحب اشعار گھڑ کر تمام غزلوں میں شامل کر دیتے تھے[1]

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے احمد حسین خاں نے آگے لکھا ہے "دروغ برگردن راوی۔ یہ بات قرین قیاس نہیں ع در ہر دہن تنگ نباتِ دگر است۔ مولوی محمد حسین کا انداز اور ہے اور شیخ مرحوم کا اور تھا"[2] احمد حسین صاحب نے راوی کا نام نہیں لکھا۔ یہ قول خود اُن کا بھی ہو سکتا ہے جسے ع خطائے بزرگاں گرفتن خطا است، کے پیشِ نظر انھوں نے کسی راوی سے منسوب کر دیا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ محمد حسین آزاد کا انداز اور ہے اور شیخ مرحوم کا اور تھا لیکن خان صاحب نے دونوں کا مقابلہ و موازنہ کرنے کی زحمت ہی گوارا کہاں کی ہے ورنہ انھیں اِس اختلاف کی بے شمار مثالیں مل جاتیں۔

اِس امر کا ثبوت موجود ہے کہ اِن شبہات کی بھنک مولانا آزاد کے کانوں میں پڑ چکی تھی ورنہ وہ اس درد و ناخوشی کا اظہار نہ فرماتے:

> میں نے اِس دیوان کو ترتیب دینے میں بڑی محنت کی ہے۔ دس ماہ تک دن رات آنکھوں کا تیل ٹپکایا ہے۔ الزام یہ ہے کہ میں خود غزلیں کہہ کر اُستاد کے نام سے شائع کرتا ہوں۔ اگر ایسا ہوتا تو خود اپنے نام سے شائع کرتا[3]

(حاشیہ جاری)

نہیں۔ ۱۸۶۳ - ۱۸۶۲ء ہونا چاہیے۔

[1] حیاتِ ذوق بحوالہ مقدمہ کلیاتِ ذوق، دہلی اڈیشن ص ۴۷، مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی۔

[2] بحوالہ محمد حسین آزاد حصہ ۲، ص ۵۳۴، از ڈاکٹر اسلم فرخی۔ اِسی سے ملتا جلتا ایک اور بیان بھی ہماری نظر سے گزر چکا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح مولانا آزاد کمرے کا دروازہ بند کر کے دیوان کے چار پانچ مسودے سامنے پھیلا کر اُستاد کا دیوان مکمل کیا کرتے تھے۔

[3] محمد حسین آزاد، از جہاں بانو نقوی، ص ۱۴۹، بحوالہ مقدمہ کلیاتِ ذوق ص ۴۷ مرتبہ ڈاکٹر علوی۔ یہ خط مولانا آزاد نے کوہ نور کے اڈیٹر کو لکھا تھا۔ اگر یہ خط جعلی نہیں ہے تو پھر ہمارا شبہہ درست اور ڈاکٹر اسلم فرخی کا یہ خیال غلط ٹھہرتا ہے کہ دیوانِ ذوق کی ترتیب کے بعد مولانا مجنوں ہو گئے تھے؛ اور اُس کی اشاعت

(باقی اگلے صفحے پر)

(۲)

اب تک ہم نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ مولانا آزاد ذوق کے شاگرد نہیں تھے؛ نیز انھیں یہ دعویٰ کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ انھیں اپنے شاعرانہ مرتبے کے لیے سندِ اعتبار کی ضرورت نہیں تھی، لیکن کلامِ ذوق میں اِصلاح (اِضافے) کے لیے انھیں یقیناً اِس کی ضرورت تھی۔ اگرچہ اِس سلسلے میں اُنھوں نے بہت پہلے سے پیش بندی شروع کر دی تھی۔ (اور اِسے اُن کی دُور اندیشی کہیے) تاہم اِس دعوے میں شدت تدوینِ کلامِ ذوق کے وقت پیدا ہوئی۔ چنانچہ یہ دعویٰ باقاعدہ طور پر دیوانِ ذوق کے مقدّمے میں ملتا ہے کہ مجھے بیس برس تک حضوریِ خدمت رہی ہے۔ جیسا کہ ثابت کیا جا چکا؛ بیس برس کی حضوری کا ذکر انور نے نسخۂ ویران کے مقدّمے میں حافظ ویراؔن کے سلسلے میں کیا ہے، مولانا آزاد نے اُسے اپنے سے منسوب کر لیا۔ اُنھوں نے اِس پر غور نہیں کیا کہ اِتنی طویل "حضوری" میں اُن کی کم عمری مانع ہے۔ بہرحال، اِس ساری داستان طرازی کا مقصد "قطرے کو سمندر" کرنا تھا۔ لیکن اُن کی یہ سعی اگر یکسر رائگاں نہیں گئی تو صد فی صد مشکور بھی نہیں ہوئی۔ اِدھر اُنھوں نے ذوق کا دیوان مرتب کیا۔ اُدھر اُس کے اِستناد پر شُبہے کا اِظہار کیا جانے لگا۔ چناں چہ اشاعتِ دیوان کے دو چار برس کے اندر ہی اندر مولانا کے ایک شاگرد احمد حسین خاں نے ۱۸۹۵ء میں حیاتِ ذوق شائع کی۔ اُس میں جہاں مولانا کے مختلف بیانات کو بلا تبصرہ و وضاحت بدل دیا گیا؛ وہاں دبی زبان سے اِس امر کا اظہار بھی کیا گیا:

دیوان غزلیات ذوق سنہ ۱۲۷۹ھ (۶۵–۱۸۶۲ء)[1] میں شائع ہوا تھا۔ اب حال

---

[1] معلوم نہیں قوسین میں سنہ عیسوی احمد حسین خاں نے لکھا ہے یا ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے لیکن یہ درست (باقی اگلے صفحے پر)

حصہ دوم

تدوینِ دیوان کی کوششیں

پس منظر

کے مزاج کو اس سے مناسبت نہیں تھی۔ تحقیق خاصا خشک فن ہے۔ مولانا شگفتگی و شوخی کے پتلے۔ وہ اس ریگ زار میں دو قدم بھی نہیں چل سکتے۔ اُن میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو ایک محقق میں ہونا چاہیے۔ محنت، لگن، مطالعہ، وسعتِ معلومات، قدرتِ بیان، بات کو مناسب ترین الفاظ میں کہنے کا ڈھنگ، لیکن اگر نہیں تو مزاج کی وہ دُرشتی، جو حق کی تلاش و حق گوئی کے لیے ہر عقیدت سے آنکھیں بند کر لیتی ہے ؟ ہر رشتے سے منہ موڑ لیتی ہے اور جو کچھ واقعات اسے بتاتے ہیں ان کا پوست کندہ بیان کر دیتی ہے۔ کسی کی تحقیق میں کیڑے ڈالنا محقق کا کام نہیں (ویسے آزاد جیسے اِنشا پرداز کی تحقیق میں کیڑے ڈالے ہی نہیں جا سکتے۔ اس کے لیے آزاد سے بڑا اِنشا پرداز ہونا ضروری ہے) لیکن اگر کسی تحقیق میں کیڑے کلبلاتے نظر آئیں تو محقق کا فرض آنکھیں بند کر لینا نہیں۔ تعبیر و تاویل بھی نہیں۔ بلکہ اُن کیڑوں کو چُن چُن کر نکال لینا اور باہر پھینک دینا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو رائج خامیاں ہمیشہ اوروں کو گمراہ کرتی رہیں گی۔ چناں چہ ہم نے کوشش کی ہے کہ جو خامیاں ذوق کے احوال میں راہ پا گئی ہیں، اُن کی نشاندہی کر دی جائے اور اگر اس میں کسی کو کیڑے ڈالنے والی بات نظر آئے تو اپنے دفاع میں سوائے اس کے کیا کہا جا سکتا ہے ع

اے روشنیٔ طبع تو بر من بلا شدی

مبالغے کی اجازت ہو تو ہم کہیں گے ہر فقرہ غلط ہے تو پھر ایک شاگردی کے دعوے کو درست کیوں سمجھا جائے؟

ہم ڈاکٹر اسلم فرخی کی اس رائے سے سو فی صدی متفق ہیں کہ "آب حیات کے...... تحقیقی مطالعے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ آزاد کی غلطیاں چُن چُن کر دکھائی جائیں، ان کی تحقیق میں کیڑے ڈالے جائیں اور ان کے کمال کی نفی کی جائے..... حقیقت کی تلاش سے عظمت کی نفی نہیں ہوتی۔ یہ صحیح ہے کہ آزاد کی تحقیق میں بہت سی خامیاں ہیں (اور خامیاں دُور کرنا ہی محقق کا فرض ہے۔ عابد) لیکن ان خامیوں کے باوجود، آب حیات کی حیثیت اُردو ادب میں مسلّم ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ آزاد نے تحقیق کو تخلیق کا روپ عطا کرنے کے لیے تخیّل کی رنگ آمیزیوں سے کام لیا مگر ان کی اس کوشش نے آب حیات کی مقبولیت اور دلچسپی میں اضافہ کر دیا۔" (ص ۲۲۱)

ہم تو اس سے بھی دو قدم آگے جانے کو تیار ہیں۔ ہمارے خیال میں آب حیات اُردو کی واحد تصنیف ہے جو پچھلے سو برس میں سب سے زیادہ چھپی اور سب سے زیادہ پڑھی گئی۔ اس کا کمال نہ اس کی تاریخی حیثیت میں ہے اور نہ تحقیق میں۔ اس کی مقبولیت تخیّل کی انھیں رنگ آمیزیوں میں ہے جن کی طرف خود آزاد نے اس کے مقدمے میں اشارہ کر دیا ہے۔ اس کی عظمت ان ناقدانہ آرا سے ہے، کئی مستقل کتابیں لکھی جانے کے باوجود، جن پر اب تک کوئی خاص اضافہ نہیں ہو سکا۔ اس تصنیف سے نہ صرف اُن لوگوں کو حیاتِ جاوید ملی جن کا اس میں ذکر ہے بلکہ اس کی تخلیق نے آزاد کے لیے بھی بقائے دوام کے دربار میں کرسی حاصل کر لی۔ آزاد کے پائے کا عالم ہمارے ادب میں کم ہی پیدا ہوا ہوگا۔ ان کے مرتبے کا انشا پرداز نہ پیدا ہوا اور نہ شاید ہوگا۔ صاحب طرز ادیب ہمارے یہاں بہت ہوئے ہیں اور اپنے اسلوب کی وجہ سے رہتی دنیا تک یاد کیے جائیں گے، لیکن الہامی طرز سوائے آزاد کے کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ شبلی نے ان کی تعریف یا تنقیص میں جو ایک فقرہ کہہ دیا ہے اس سے بہتر حاکمہ مکمل کتابوں میں بھی ممکن نہیں، جانتا ہوں آزاد تحقیق کے میدان کا مرد نہیں تاہم اگر اِدھر اُدھر کی گپ بھی ہانک دیتا ہے تو وحی معلوم ہوتی ہے۔ یہ الفاظ اس وقت بھی درست تھے جب شبلی نے کہے تھے، آج بھی درست ہیں اور آیندہ بھی رہیں گے۔ مختصر یہ کہ آزاد سے بڑا انشا پرداز نہیں۔ ان کے علم و فضل کا جواب نہیں۔ اُردو زبان و ادب تاقیامت ان کے احسان سے سر نہیں اُٹھا سکتے۔ یہ سب کچھ ہے، لیکن آزاد محقق نہیں تھے۔ ہو بھی نہیں سکتے تھے۔ ان

کا سبب پسند اور عقیدت ہو سکتا ہے۔ عقیدت ان کے والد کی دوستی کے سبب ہی نہیں تھی، اس کے اور بھی کئی اسباب ہو سکتے ہیں جن کی تفصیل میں جانے کی گنجایش نہیں۔ لہٰذا سرِ دست اسی پر اکتفا کیجیے۔ ان بیانات کی موجودگی میں آزاد کا ذوق کا تلمذ مشکوک ثابت ہوتا ہے۔ آخر میں ہم ایک بار پھر اپنے دلائل کا خلاصہ پیش کیے دیتے ہیں:۔

۱۔ ذوق کی زندگی میں آزاد کے شعر کہنے کا کوئی ثبوت نہیں۔ اگر ان کی زندگی کے بالکل آخری دنوں میں کچھ "غوں غاں" کرنے لگے ہوں تو بھی شرم، جھجک یا کسی اور سبب سے ذوق کو دکھا نہیں پائے ہوں گے۔

۲۔ چند معاصرین کے بیانات ان کے دعوائے شاگردی کی تردید کرتے ہیں اور آزاد نے اُن بیانات کو رد نہیں کیا۔ اس کے برعکس کسی نے اُن کو ذوق کا شاگرد نہیں لکھا۔

۳۔ بیس برس کی حضوری بھی تحقیق و تدقیق کی روشنی میں غلط ٹھہرتی ہے۔ حقیقت اس کی یہ ہے کہ انور نے دیوانِ ذوق کے مقدمے میں حافظ ویران کی ۲۰ برس کی حضوری کا ذکر کیا ہے اور آزاد نے ترتیبِ دیوان کے وقت انہیں کا فقرہ اپنے حق میں استعمال کر لیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاگردی کے اس طویل تعلق کا ذکر آبِ ؔ میں ہوتا بلکہ انتقالِ ذوق کے موقعے پر لکھی ہوئی نظم و نثر میں ہوتا۔

۴۔ ممکن ہے رُشد و ہدایت یا ظاہر و باطن کے فوائد آزاد نے ذوق سے حاصل کیے ہوں۔ لیکن شعر کہنا نہیں سیکھا۔ ورنہ غور فرمائیے بیس برس کی تربیت کے بعد بھی انہیں شاگردی کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی اور وہ ذوق کی وفات کے فوراً بعد حکیم آغا جان عیشؔ کی شاگردی کیوں کرتے؟ آزاد جیسے ذہین، فطین شخص کو دو ایک برس کی شاگردی بہت تھی۔ (واقعہ بھی یہی ہے۔ کم و بیش دو برس عیشؔ سے تعلق قائم رہا اور غدر کے بعد ختم ہو گیا۔ ورنہ بیس برس میں کچھ نہ سیکھ سکنے والا دو برس میں فارغ الاصلاح نہ ہو جاتا اور اپنے واقعی شعر گوئی کے دور میں کسی تیسرے استاد سے تعلق پیدا کر لیتا۔) یوں بھی ذوق جیسے استادِ شاہ سے نسبت کے بعد کسی اور (ان سے کم تر درجے کے شاعر) سے تعلق باعثِ شرم تھا۔ یہ شرم آزاد کو بھی محسوس ہوتی ہے۔ چناں چہ وہ عیشؔ کے سامنے ہی خود کو ذوق کا تلمیذِ خاص لکھتے ہیں۔

۵۔ اور آخری یہ کہ جب ذوق سے متعلق آزاد کا ہر بیان، ہر واقعہ، ہر اطلاع بلکہ اگر اک ذرا

ستمو صاحب یہ کچھ بُرا ماننے کی بات نہیں۔ آپ فاضل، آپ پروفیسر۔ آپ کی کتابیں سرکاری مدرسوں کی پڑھائی میں داخل، جب اتنی فضیلتیں آپ میں جمع ہیں اگر ایک شعر کہنا نہ آیا نہ سہی ... اور اگر ایسا ہی شاعر بننے کا شوق ہے تو استاد مرحوم کے بڑے بڑے شاگرد اب بھی موجود ہیں، شلاً حافظ ویران، نواب مرزاخان داغ، انہیں کو اپنا کلام دکھالیا کیجیے اور اگر یہ بھی نہیں تو مولوی فیض الحسن صاحب جن سے تم نے مدتوں دتی میں پڑھا ہے اور وہ لاہور میں موجود ہیں۔ (ذوق کا ایک ادنیٰ شاگرد (بحوالہ محمد حسین آزاد)

اس پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک معترض کا بیان ہے، لیکن ہم ڈاکٹر محمد صادق کے حوالے سے بیان کر چکے ہیں کہ خود آزاد کے بیٹے کا یہ قول ہے کہ انھوں نے ذوق کی وفات کے بعد مشاعروں میں شرکت اور شعر پڑھنا شروع کیا۔ بہرحال مولانا کا خیال ہے کہ یہ معترض انوار الحق ادیب اور حالی کے شاگرد تھے جو ان کے خلاف 'پنجابی' میں مضامین لکھا کرتا تھا۔ ڈاکٹر اسلم فرخی اس کا نام سیف الحق ادیب اور غالب کا شاگرد بتاتے ہیں۔ اس نے اپنی کسی تنقید کے آخر میں اپنا نام ایس۔ زیڈ۔ اے لکھا ہے۔ ان مخففات سے نہ انوار الحق بنتا ہے اور نہ سیف الحق۔ معترض خود کو ذوق کا شاگرد کہتا ہے اور گھر کا بھیدی معلوم ہوتا ہے۔ ہمیں فی الوقت اس کے دیگر اعتراضوں سے غرض ہے نہ غالب اور حالی کی شاگردی سے۔ سوال یہ ہے کہ اس نے علی الاعلان آشنا سنگین الزام عائد کیا اور مولانا نے اس کی تردید نہیں کی۔ نہ کسی اور نے ان کے حق میں کچھ لکھا۔ مولانا کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے انہیں ۳۔ ۴، ۴۔ ۴ صفحے کے مضامین لکھ کر معترض کے خلاف چھپوانے کا خیال آیا تھا لیکن پھر یہ ارادہ ترک کر دیا۔ مولانا ان تنقیدوں سے بددل ہوتے ہیں، اپنے خطوں میں ان کا ذکر کرتے ہیں لیکن ذوق کی شاگردی کے مسئلے پر ایک حرف نہیں لکھتے، کیوں؟ چلیے آخر میں ایک غیر معترض دوست کی یہ سند بھی دیکھ لیجیے۔ اس نے کس خوب صورتی اور نرمی سے آزاد کو ذوق کی شاگردی سے بے دخل کر دیا ہے :-

۴۔ جب میں دتی میں رہتا تھا میں نے کبھی آپ کو فکر سخن کرتے نہیں دیکھا، مگر استاد ذوق کا کلام اکثر آپ کی زبان پر رہتا تھا۔ (مقدمہ کلیات ذوق مرتبہ ڈاکٹر علوی)

مرتب کلیات کا کہنا ہے کہ یہ صہبائی کے شاگرد تھے۔ (ایک نجی خط) بہرحال یہ خط انہوں نے آزاد کو لکھا ہے۔ ہمارے سامنے پورا خط نہیں ہے لیکن "جب میں دتی میں تھا" کا فقرہ اہم ہے منشی دھرم نراین نے بڑی شائستگی سے آزاد کے تلمذ ذوق کی تردید کر دی ہے۔ کلام یاد ہونے

یہ عبارت مرزا سعیدالدین احمد خلف ضیاءالدین احمد خاں نے دیوانِ معروف کے مقدمے میں لکھی ہے۔ جھگڑا یہ ہے کہ مرزا سعیدالدین نے آب کی طبع اوّل میں معروف کو شاگردِ ذوق لکھنے پر اعتراض کیا تھا۔ آزاد نے جواب دیا کہ میرا مقصد مُردوں کو بدنام کرنا اور زندوں کو رنج پہنچانا نہیں۔ جب دلّی جاؤں گا تو تمہارے والد سے پوچھ کر طبع دوم میں درست کروں گا۔ جس ملاقات کا یہ ذکر ہے وہ طبع دوم (۱۸۸۳ء) سے پہلے کی ہے۔ قابلِ غور بیان ضیاءالدین احمد خان کا ہے، جنھوں نے اپنا ذکر معروف سے عزیز برداری کے ناتے کیا اور حافظ ویران سے استفسار کرنے کا مشورہ اس لیے دیا کہ حافظ ویران ذوق کے حاضر باش شاگردوں میں تھے۔ گویا آزاد نہ حاضر باشوں میں تھے اور نہ شاگردوں میں۔ (ویسے معروف کا انتقال آزاد کی ولادت سے پہلے ہو چکا تھا) اگر آزاد شاگردوں میں ہوتے تو خط کشیدہ جملوں کا انداز مختلف ہوتا۔

جب پنجاب میں نظمِ اُردو کے مشاعروں کا آغاز ہوا تو آزاد ان کے روحِ رواں تھے۔ اس میں آزاد کی مخالفت بھی بہت ہوئی۔ آزاد کی نظموں (مثنویوں) پر سخت تنقیدیں شائع کی گئیں، خصوصاً اخبار "پنجابی" میں۔ ایک تبصرے کا اقتباس پیش ہے۔ تبصرے سے پہلے اڈیٹر نے ایک نوٹ لگایا ہے جس کا آخری جملہ ہے: "اعتراض مذکور اس قسم کے ہیں کہ ان سے بے تامّل آزاد کی فصاحت اور بلاغت بلکہ علمیت پر حرف آتا ہے اور یہ بیان اس پر طرّہ ہے کہ آزاد شیخ مغفور کے شاگرد نہیں جن کی شاگردی سے ان کو فخر تھا۔" اب تبصرے کا متعلقہ حصّہ ملاحظہ ہو:

۲۔ اس سے پہلے کہ میں مثنوی پر کچھ لکھوں تھوڑا سا حال اپنا اور صاحب مثنوی کا گزارش کرتا ہوں۔ بندہ دلّی کا رہنے والا ہے اور شیخ محمد ابراہیم کا ایک ادنیٰ شاگرد ہے۔ برسوں اپنا کلام اُستاد مرحوم کو دکھایا ہے اور بڑے بڑے معرکے کے مشاعروں میں ان کے ساتھ رہا ہے۔ اُستاد کا کوئی نامی شاگرد نہیں ہے جس کو میں نہ جانتا ہوں۔ اُستاد کے طرزِ کلام سے بھی مجھ کو کسی قدر آشنائی ہے باوجود ان سب باتوں کے میں سچ کہتا ہوں کہ میں نے مولوی محمد حسین آزاد کو نہ کبھی اُستاد کے سامنے غزل لاتے دیکھا نہ ان کے ساتھ کبھی مشاعرے میں پڑھتے سُنا۔ یہ اور بات ہے کہ مولوی محمد باقر اُستاد کے بڑے گاڑھے دوست تھے۔ شاید اس لحاظ سے انہیں اپنا پیارا بھتیجا جانتے ہوں۔ مگر اُستاد کا بھتیجا ہونے سے لازم نہیں آتا کہ وہ ان کے شاگردِ رشید بھی بن جائیں ..... کاش مولوی صاحب کو شاعری سے کچھ مناسبت ہوتی تو اُستادی شاگردی کا دعویٰ ان کے چہرے پر کھل جاتا۔

معاصر تحریروں میں مل سکا ہے، پیشِ خدمت ہے۔

۱۔ جو قصائد اُستاد کے نئے دیوان میں چھپے ہیں ... (ان میں) آزاد نے بطورِ خود بعض جگہ بہت تصرف کیا ہے۔ (بحوالہ مقدمۂ کلیاتِ ذوق مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی)

یہ رائے داغ نے آزاد کے مرتبہ دیوان کے باب میں ظاہر کی ہے۔ داغ، ذوق کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ اس اقتباس میں انھوں نے آزاد کا ذکر سرسری اور ایک غیر شخص کی حیثیت سے کیا ہے، شاگردِ ذوق کی حیثیت سے نہیں۔ کہا جاسکتا ہے اس کا کوئی خاص موقع نہیں تھا۔

۲۔ حسبِ اتفاق اسی سال ستمبر کی چھٹیوں میں دلی آیا ہوا تھا کہ آزاد مرحوم بھی دلی تشریف لائے اور حضرت قبلہ وکعبہ ام سے ملنے آئے۔ میں بھی جا پہنچا اور ایک تمہید نکال کر یہی ذکر چھیڑ دیا۔ حضرت قبلہ وکعبہ ام نے آزاد مرحوم سے بجواب ان کے استفسار صاف صاف فرمایا کہ آپ نے بالکل واقعہ نگاری کے خلاف کیا کہ ایسی بات بغیر تحقیق کے چھاپ دی۔ آپ کو چاہیے تھا کہ مجھ سے دریافت کرتے ورنہ حافظ غلام رسول صاحب ویران سے جو ذوق مرحوم کے ارشد تلامذہ میں حاضر باش نفس ناطقہ بنے ہوئے تھے، دریافت کر لیتے۔

(بحوالہ محمد حسین آزاد ج ۱، مصنفہ ڈاکٹر اسلم فرخی)

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ :۔

ہیں چنانچہ دہلی اُردو اخبار ۲۴ رمئی ۱۸۵۰ء میں ان کی ایک نظم کے نیچے یہ عبارت درج ہے .... یہ وہی زمانہ ہے جب آزاد عیش سے استفادہ کر رہے تھے۔" اصلاح کا اعتراف آزاد کے اس بیان میں ہے جو انھوں نے حکیم آغا جان عیش کے سلسلے میں آبِ حیات میں درج کیا ہے۔" استاد مرحوم کے بعد ذوق اور ان کے کلام کی کشش نے کھینچ کر ان کی خدمت میں بھی پہنچا یا۔ یہ اس بیان میں "استاد مرحوم کے بعد ذوق" کا ٹکڑا خصوصاً قابلِ توجہ ہے۔ آزاد کو شاعری کا ذوق اُستاد (ذوق) کے بعد ہی پیدا ہوا اور اس وقت انھیں آغا جان عیش ہی صاحبِ کمال نظر آئے۔ یہ بھی غالباً اُن کے والد کے دوست تھے اور آزاد کو عیش اور ذوق کے رنگ میں مشابہت نظر آئی۔ (ملاحظہ ہو اس غزل کا واقعہ مع ستوڈی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے) کیا یہ واقعی حیرت ناک نہیں کہ ایک اُستاد کی موجودگی میں آزاد نے اخبار میں خود کو ذوق کا تلمیذِ خاص لکھا؟ سبب وہی ہے جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ دیوان کی من مانی ترتیب کے لیے ذوق کی سندِ شاگردی کی ضرورت۔

کہیں اصحابِ نظر اس ساری بحث کو محض قیاس آرائی نہ سمجھیں۔ اس لیے جو متواتر اہمیت ثبوت

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ :۔

اسماعیل کے ایک قطعے میں اُستاد کا لفظ موجود ہے۔ بیٹے ہونے کے علاوہ وہ ذوق کے شاگرد بھی تھے۔ ان کی پہلی تاریخ بھی "اُستادِ صاحبِ قدرت" ہے۔ ظفر نے بھی اپنی تاریخوں میں اُستاد کہا ہے۔ مطلب کہنے کا یہ ہے کہ تاریخِ وفات میں اُستادی کی طرف اشارہ کرنے کا مناسب ترین موقع تھا۔ مولانا نے اس کی طرف اشارہ تک نہیں کیا۔ کیوں؟ اسی لیے کہ وہ شاگرد نہیں تھے۔ ہمارے قیاس کو تقویت نثری نقروں سے بھی ہوتی ہے۔ شلاً یہ کہ اُردو کی طرف اس وقت تک مولانا کا رجحان نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے کئی مادّے تلاش کیے لیکن سب عربی یا ایک فارسی میں۔ اس وقت تک باقاعدہ شاعری نہ کرنے کو اس سے بھی تقویت پہنچتی ہے کہ آزاد نے صرف ایک مادہ نظم کیا ہے وہ بھی فارسی میں، باقی کو نظم نہ کر سکے۔ شاگرد اس لیے نہیں تھے کہ اگر نظم میں عدم قدرت کی بنا پر کہنا ممکن نہیں تھا تو نثر میں کہنے میں کیا رکاوٹ تھی۔ ذوقؔ سے خواہ انھیں جس قدر رشد و ہدایت کی سعادت نصیب ہوئی ہو، شعر میں اصلاح لینے کی سعادت یقیناً ان کے حصّے میں نہیں آئی ورنہ جہاں وہ ان کی بزرگانہ (والدانہ) شفقت کا ذکر کر سکتے تھے، شاگردی کا اقرار بھی غیر مبہم الفاظ میں کر سکتے تھے جو انھوں نے نہیں کیا۔ آخر کچھ تو سبب ہوگا۔ لیکن ۱۸۵۰ء تک پہنچتے پہنچتے انھیں شاگردی کا خیال آگیا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس سے پہلے وہ دیوان کی ترتیب کا کام شروع کر چکے تھے (یا ارادہ تھا) اور اس کے لیے سندِ اعتبار کی ضرورت انھیں محسوس ہونے لگی تھی۔ چنانچہ ۱۴ر مئی ۱۸۵۰ء میں ان کی جو فارسی نما نظم شائع ہوئی ہے، اس کے نیچے یہ عبارت ملتی ہے: "تصنیفِ مولوی محمد حسین المتخلص بہ آزاد تلمیذ خاص حضرت خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ اُستادِ حضور والا دام ملکہ و اقبالہ" یہاں نہ صرف تخلص موجود ہے بلکہ تلمیذِ خاص کی صراحت بھی موجود ہے جو ہمارے مندرجہ بالا قیاس کی تصدیق کے لیے کافی ہے۔ یہاں ایک بات اور توجہ طلب ہے۔ جس زمانے کی یہ تحریر ہے اس وقت آزاد، ذوقؔ کے تلمیذِ خاص تو کیا، تلمیذِ عام بھی نہیں تھے۔ اس وقت ان کے اُستاد زندہ تھے اور دہلی میں موجود تھے۔ دروغ گویم بررُوے تو، کی اس سے واضح مثال دوسری نہیں ملتی۔ اس عبارت پر ڈاکٹر اسلم فرخی کا تبصرہ ملاحظہ ہو: "آزاد کم و بیش دو برس تک عیش سے استفادہ کرتے رہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے یہ سلسلہ برہم کر دیا۔ یہ بات البتہ حیرت خیز ہے کہ اصلاحِ سخن کے واضح اعتراف کے باوجود اپنے آپ کو صرف تلمیذِ ذوقؔ ہی لکھنا پسند کرتے

صدا از بمگ و بارو گلشنِ عالم ہمی آید (کذا)   ز گلزار جہاں شد سوئے گلزار جناں بلبل
بدل چوں فکر کردم بہر تاریخ وفات او   خرد گفتا بگو آزاد رفت از بوستاں بلبل

اس کے علاوہ صاحبِ 'ذوق سوانح اور انتقاد' نے لکھا ہے:

اس سلسلے میں یہ عبارت بھی مولانا آزاد کی اپنی معلوم ہوتی ہے اور اردو زبان کے اس ادیبِ شہیر کی ابتدائے تحریر کا نمونہ ہے:-

"راقم آثم پر مثل والد ماجد شفقت فرماتے تھے اور ہر وقت ارشاد و ہدایت میں ساعی رہتے تھے۔ عین رنج اور جلسۂ ماتم میں ــــ برکت الناس قدسیہ (نقل کالاصل) تاریخ وفات جو کہ علیٰ سبیل الارتجال ہوئی ۔ ۔ ۔ ایک تاریخ یہ ہے: 'اقرب عند ملیک مقتدر' اور ایک تاریخ ہے 'کہ آمن من عذاب النار' اور ایک تاریخ 'مات ضاحکا'[1]"

---

[1] 'ذوق سوانح اور انتقاد' میں حوالہ لکھنے سے رہ گیا ہے۔ اغلباً یہ دہلی اُردو اخبار کی ۷ ار دسمبر ۱۸۵۴ء کی اشاعت سے منقول ہے۔) اگرچہ اتنے قلیل مواد سے نتائج اخذ کرنا نہیں چاہیے لیکن جب کافی مواد دستیاب نہ ہو تو مجبوری ہے۔ مندرجہ بالا قطعہ اور عبارت مولانا آزاد کے تلمذِ ذوق کے سلسلے میں اب تک دستیاب مواد میں اہم ترین مواد ہے۔ اس لیے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پہلے قطعۂ تاریخ کے عنوان کو لیجیے۔ اس میں دو چیزیں نہیں ہیں، مولانا کا تخلص اور تلمذ کی تصریح۔ پھر یہ قطعہ نومبر ۱۸۵۴ء کے تتمے میں بھی شامل نہیں ہوا جس میں بادشاہ وغیرہ کی کہی ہوئی تاریخیں ہیں۔ اس سے کئی نتیجے اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ اگر مولانا آزاد ذوق کے شاگرد تھے تو عنوان میں اس کی صراحت ہونا چاہیے تھی۔ اگر مولانا اس وقت تک باقاعدہ شعر کہتے ہوتے تو نام کے ساتھ تخلص بھی موجود ہونا چاہیے تھا۔ یہ قطعہ فارسی میں ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ اس وقت تک مولانا اُردو میں غالباً شعر نہیں کہتے تھے۔ فی الوقت یہ کہنا مشکل ہے کہ اس قطعے پر انہوں نے کسی سے مشورہ کیا یا نہیں۔ البتہ ان کی طبیعت میں موزونیت موجود تھی اور ایک شفیق بزرگ کی موت نے موزوں الفاظ کا روپ دھار لیا۔ مقطع میں آزاد موجود ہے۔ کیا یہ بے قصد برجستہ موزوں ہو گیا؟ اور اس کے بعد مولانا نے اسے تخلص کے طور پر اپنا لیا؟ ہم نے ابھی کہا ہے کہ عنوان میں شاگردی کی طرف اشارہ ہونا چاہیے تھا۔ اگر نہیں تھا تو قطعے میں اس کے اظہار میں کیا امر مانع تھا؟ اگرچہ یہ ذرا مشکل کام تھا (ابتدائی مصرع یوں بھی ہو سکتا تھا، چو رفت اُستاد ابراہیم ذوق از عالمِ فانی) اس سے بہتر موقع اقرارِ شاگردی کے لیے اور کون ہو سکتا تھا؟ خود خلیفہ

آگے چل کر "ہندوستانی صحافت (ہندوستانی اخبار نویسی کے عہد میں) کے حوالے سے دہلی اُردو اخبار بابت ۲۴ رمئی ۱۸۵۷ء سے آزاد کی ایک نظم "تاریخ انقلاب افزا" نقل کی ہے۔ آخری شعر ہے:

اسے واقعہ کی پائی یہ آزاد نے تاریخ　　　　دل نے کہا قل فاعتبرو یا اولی ابصار^

اس نظم پر فارسی کا گہرا اثر ہے۔ اکثر پورے کے پورے مصرعے فارسی میں ہیں۔ ڈاکٹر فرخی نے اس نظم پر مفصل تبصرہ کیا ہے جسے فی الوقت نظر انداز کیا جاتا ہے۔ البتہ ان کے یہ الفاظ توجہ طلب ہیں: "آزاد کی یہ نظم جسے فی الحال ہم ان کی سب سے قدیم نظم کہہ سکتے ہیں، اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ وہ اس سے پہلے مشقِ سخن کے خارزار سے گزر چکے ہیں کیوں کہ یہ قادر الکلامی ریاضی اور محنت کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتی۔" یہ درست ہے کہ قادر الکلامی ریاضت کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتی لیکن نظمِ مذکور میں ناپختگی کا ثبوت بھی موجود ہے۔ ابھی اُردو پر آزاد کی گرفت مضبوط نہیں ہوئی۔ ابھی ان کے ذہن پر فارسی چھائی ہوئی ہے۔ بالکل غالب کے ابتدائی دَور کی طرح چند لفظی لغزشیں بھی اس طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اس لیے ہمارا خیال ہے اس وقت تک اُن کی مشق بمشکل ۲-۳ سال ہوگی۔ البتہ اسے آزاد کی سب سے قدیم اُردو نظم کہا جاسکتا ہے۔ ہمارا خیال یہ بھی ہے کہ آزاد نے شعر گوئی کا آغاز فارسی سے کیا ہوگا اور فی الوقت ان کی سب سے قدیم دستیاب نظم اس قطعہ تاریخ کو کہا جاسکتا ہے جو ذوق کی وفات پر دہلی اُردو اخبار میں شائع ہوا تھا، ملاحظہ ہو:-

از نتائجِ طبع منشی محمد حسین پرنٹر اُردو اخبار

چو رحلت کرد ابراہیم ذوق از عالمِ فانی　　　　بباغ جاودانی رفت آں شیوہ بیاں بلبل

پریشاں بال آمد حرفِ آہ و نالہ و شیون　　　　زبستانِ فصاحت بوستاں در بوستاں بلبل

زیک سو بر سرِ سرو و صنوبر نوحہ گر قمری　　　　زیک جانب بدیوارِ گلستاں نوحہ خواں بلبل

---

^ اس سے ۱۲۷۲ھ برآمد ہوتا ہے، جو برابر ہے ستمبر ۱۸۵۵ء تا اگست ۱۸۵۶ء کے۔ یہ نظم ۲۴ رمئی ۱۸۵۷ء کو شائع ہوئی۔ چوں کہ یہ انگریزوں کی وقتی شکست سے متعلق ہے اس لیے ہمارا خیال ہے یہ ۱۸۵۷ء ہی میں کہی گئی ہوگی۔ عین ممکن ہے مادہ نقل کرنے میں کاتب سے ایک الف لکھنے سے رہ گیا ہو یعنی مادہ "قل فاعتبروا یا اولی الابصار" ہو۔ اس صورت میں اس سے ۱۲۷۳ برآمد ہوں گے۔

صرف ایک مشاعرے کا ذکر ہے اور آزاد نے اس کے علاوہ بہ صراحت کسی اور مشاعرے میں جانے کا ذکر نہیں کیا۔ للہٰذا اس سے یہ قیاس کرنا کہ وہ مشاعروں میں شریک ہونے لگے تھے، دُرست نہیں۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ خود فرخی صاحب نے لکھا ہے کہ: "آزاد نے صدرالصدور عبداللہ خاں کو اصغر علی خاں کا والد لکھا ہے، جو غلط ہے"۔ پھر آزاد کے بیان کو من و عن قبول کرنا کیا ضرور ہے۔ اس ضمن میں یہ عرض کرنا بے جا نہ ہوگا کہ آزاد نے اس قسم کے جتنے واقعات احوالِ ذوق کے باب میں لکھے ہیں، ہم دکھا چکے ہیں کہ وہ غلط ہیں۔ ایسی صورت میں اس بیان پر اعتبار کرنا مشکل ہے۔ یہ وقت پر سوجھ جانے والی ایک بات تھی۔ اس سے مقصود اپنے مشاعرے میں جانے کا ذکر نہیں بلکہ یہ ہے کہ نسیم مومن کے شاگرد تھے اور انہیں ساتھ لے کر اُستاد مرحوم کی خدمت میں شریکِ مشاعرہ ہونے کی استدعا لے کر حاضر ہوتے تھے۔ یہ آزاد نے مومن مرحوم سے اس اصرار و اعتراض کا بدلا لیا ہے جو آب کی طبعِ اول میں مومن کا ذکر نہ کرنے کے سبب ہوئے۔ چناں چہ انہوں نے دیوان میں یہ واقعہ درج کر کے حتی الامکان مومن کی تنقیص کی ہے۔ ہے یہ کہ آزاد نے اس واقعے کے لیے غالب، مومن اور ذوق کی ہم طرح غزلیں منتخب کیں اور اُن پر افسانہ بنا ڈالا۔ ذوق کی غزل "آسماں کے لیے" آب کی طبع دوم میں اسی لیے شامل کی گئی۔ (اگر واقعے میں صداقت ہوتی تو یہ غزل طبع اول میں آتی) اسی ضمن میں ذوق سے دو شعر (ہندو، بڑھے) پڑھوائے ہیں کہ انہیں دنوں ہوئے تھے۔ غرض یہ ہے کہ بالکل نہیں ہوئے تھے۔ صرف مطلع نسخۂ ویران میں ملتا ہے۔ (کلیات کے حواشی میں ڈاکٹر تنویر علوی نے دو اشعار کو نسخۂ ویران میں موجود بتایا ہے لیکن نسخہ اس کی تصدیق نہیں کرتا) اور آزاد نے وہیں سے لیا ہے۔ اب یہ معلوم نہیں کہ آب میں درج دوسرا شعر آزاد کو کہاں سے ملا؟ ممکن ہے یہ ذوق نے کہا ہو۔ بہر حال آب میں آزاد نے دو شعروں پر کہانی بنا ڈالی لیکن یہ کہنا بھول گئے کہ بعد میں غزل پوری ہوئی۔ ترتیبِ دیوان کے وقت اس میں تیرہ شعر بڑھائے اور بیاض میں لکھے اور درجِ دیوان کرتے وقت جو اسقام رہ گئے تھے، ان میں بہ خیالِ خویش اصلاح کر دی لیکن مرتبِ کلیات نے بیاض کے غلط متن کو مرجح سمجھا۔ بہر حال جس غزل کا اس وقت تک وجود میں آنا مشکوک ہے، اس پر گھڑا گیا واقعہ کہاں تک دُرست ہو سکتا ہے؟ چناں چہ ڈاکٹر صاحب کا نظر یہ قبول نہیں کیا جا سکتا بلکہ بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ آزاد ذوق کی زندگی میں کسی مشاعرے یا معرکے میں شریک نہیں ہوئے۔

کی کتابیں ہمارے سامنے ہیں۔ دوسرے لوگوں کے صرف حوالے ہماری نظر سے گزرے ہیں، کتابیں دسترس میں نہیں۔ تاہم حضراتِ مذکور نے اگلے محققوں کی تحقیق کو دیکھا ہے۔ اس لیے حسبِ ضرورت اِستفادہ بھی کیا ہوگا۔ اب آیئے دیکھیں کہ یہ حضرات اِس ضمن میں کیا کہتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد صادق محقق بھی ہیں مؤرخ بھی۔ اُنھوں نے انگریزی میں اردو ادب کی مبسوط تاریخ بھی مرتب کی ہے۔ ایک مؤرخ سے بجا طور پر دستیاب مواد کو 'مناسب تنقید و تجزیے اور چھان پھٹک کے بعد قبول کرنے کی توقع کی جا سکتی ہے لیکن اُن کی کتابوں سے توقع کماحقہٗ پوری نہیں ہوتی۔ ایسا لگتا ہے اُنھیں جیسا کچھ مواد ملا' اُنھوں نے کتابوں کے حوالے کیا۔ بہرحال انھوں نے اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے انگریزی مقالے" محمد حسین آزاد — حیات اور کارنامے" میں ایک مستقل باب بہ عنوان' (آزاد بہ حیثیت شاعر" لکھا ہے۔ اس میں آزاد کی شاعری کے اُس دَور سے بحث کی ہے جو اُن کے دورِ ملازمت (پنجاب میں) سے تعلق رکھتا ہے۔ اُس میں آزاد کے تلمذ کا ذکر نہیں۔ اَلبتہ خاندان اور ابتدائی زندگی کے عنوان سے پہلے ہی باب میں ضمناً اس کا ذکر آ گیا ہے۔ اگرچہ ان کا مآخذ آزاد کا محولہ بالا بیان ہے' پھر بھی اُنھوں نے کچھ ایسی باتیں کہی ہیں جن کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ اُنھیں کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے:

> Writes Azad ... I had the privilege of being in Zauq's company for twenty years, during which I improved myself inwardly, and what I had not seen was so vividly described to me that as if I had actually seen it. (P.11)

یہ تو خود آزاد کے الفاظ کا لفظی ترجمہ ہے (جو نادرست معلوم ہوتا ہے) لیکن اس سے آگے جو کچھ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے وہ گویا اس سے اخذ کردہ نتیجہ ہے:

> This part of Azad's education began early; for Azad's father and Zauq were often together, and the child had numerous occasions of being in Zauq's company. <u>There was a strong element of hero-worship in Baqir which his son inherited, and his constant praise of his friend's talent and character made a deep impression on the child's mind.</u>

ضائع ہو گئے تھے ؟) ذوقؔ بے چارے تو ایسے معصوم اور نسیان زدہ انسان اور متزلزل ذہن و فکر کے مالک تھے کہ ایک شعر کو کبھی کچھ پڑھتے تھے کبھی کچھ۔ بے چاروں کو لکھنا بھی نہیں آتا تھا۔ ایک ایک لفظ کو سو سو بار کاٹتے تھے اور پھر بھی شعر درست نہیں ہوتا تھا۔ لوگ ایسے نامعقول کہ اپنے پاس کچھ کا کچھ لکھ لیتے تھے۔ شاگرد ایسے نااہل کہ دیوان چھاپا تو اُس میں نہ صرف بہت سا کلام چھوڑ دیا، کئی غزلیں ناتمام درج کیں بلکہ متن بھی غلط چھاپ دیا۔ چناں چہ اب میں پُرانی حالتوں کا تصور باندھوں گا۔ اُس زمانے کے خیالات اور مطالب کو سوچ سوچ کر نکالوں گا اور پھر جو لکھوں گا، وہی اور صرف وہی دُرست ہوگا۔ میرے حافظے، قوتِ تخیل اور کلام کی درستی بیان خبردار کوئی شک نہ کرے۔ یہ سارا بیان خواہ کیسا ہی دل فریب اور نظر فریب کیوں نہ ہو، انشا پردازی کا کیسا ہی شاہکار کیوں نہ ہو، اسے اصلیت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ ذوقؔ شاعر تھے کہ متشاعر، جو ایک شعر کو کبھی کچھ پڑھتے تھے کبھی کچھ ؟ اس بیان سے شاگردی کی سند لینے والوں کو اس کے بین السّطور مفاہیم پر بھی توجہ کرنا تھا۔ اگر آزادؔ شاگرد ہی ہوتے اور دن رات کی حضوری اُنھیں نصیب ہوتی تو پیچھے جو کچھ آپ نے ملاحظہ فرمایا وہ سب کا سب غلط نہ ہوتا۔ اگر شاگردی کا دعویٰ درست ہوتا تو اُس کی سند ایک مختل الحواس شخص (ادبج) سے لینے کی ضرورت نہ تھی۔ ذوقؔ کو جگت اُستاد ہونے کے ناتے، اُستاد کہتے کہتے سچ مچ اپنا اُستاد سمجھنے لگے، ورنہ جن لوگوں سے اُنھیں شاگردی کی سند لینا چاہیے تھی اُنھیں خاموش نہ دِکھاتے۔ کوئی معتبر معاصر شاعر اِس کا ذکر کرتا، ذوقؔ کا کوئی شاگرد انھیں خواجہ تاش کہتا۔ کوئی تذکرہ نگار اُنھیں ذوقؔ کا شاگرد لکھتا تو کوئی بات بھی تھی۔ آزادؔ خود ہی اپنے تلمذ کی تشہیر کرتے ہیں اور بہ تکرار کرتے ہیں، اور اس کا مقصد اپنے پایۂ شاعرانہ کا اعتبار و استحکام نہیں۔ اُنھیں اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ مولانا نثار تھے، انشا پرداز تھے۔ ان کی نثری شاعری کے اُن کے دشمن بھی قائل ہیں۔ اُن کی شہرت کا ایوان اساطینِ نثر پر قائم ہے۔ اِس کے لیے اُنھیں شاعری کی بیساکھیوں کے سہارے کی ضرورت نہیں تھی۔ ذوقؔ کے معتبر محقق ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ اور ڈی۔ لٹ۔ دونوں کے لیے ذوقؔ کو چُنا۔ اِس سلسلے میں اُن سے رجوع کیا گیا تو اُنھوں نے جواباً لکھا: "آزادؔ خود کو ذوقؔ کا شاگرد کہتے ہیں۔ غالباً اصلاح کی نوبت کبھی نہیں آئی ہوگی۔ اب تک کوئی ایسا شعر، کوئی ایسی نظم سامنے نہیں آئی جو آزادؔ نے ذوقؔ کی زندگی میں کہی ہو۔ آزادؔ پر کئی محققوں نے کام کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد صادق اور ڈاکٹر اسلم فرخی

گویا ۱۸۲۵ - ۱۸۵۴ء تک کا زمانہ اُن کے ذوق کی خدمت میں حاضر ہونے کا ہے۔ چھُٹی کا دن ہفتے میں ایک بار آتا ہے۔ لہٰذا ۹ برکا چوتھائی ۲½ سال، گویا حضوری کی مُدّت سوا دو سال ہوئی۔ ہر وقت کی حضوری یوں غلط ہے کہ آزاد نے ہمیشہ نمازِ عصر کے وقت کا ذکر کیا ہے (ڈاکٹر اسلم فرخی نے کسی تسامح کی بنا پر یہ فرض کر لیا ہے کہ روزانہ عصر کے وقت حاضرِ خدمت ہوتے تھے اور چھُٹی کا سارا دن ذوق کے پاس گزارتے تھے۔) اگرچہ آزاد نے ہمیشہ کی بات کی ہے لیکن گذشتہ صفحات میں ہم اِسے غلط ثابت کر چُکے ہیں۔ بہر حال مُندرجہ جمع تفریق سے یہ ظاہر ہے کہ آزاد ذوق کی خدمت میں دو سوا دو سال سے زیادہ حاضر نہیں ہوئے، وہ بھی گاہ گاہ، نمازِ عصر کے بعد، کچھ دیر کے لیے۔ اب حضوری کا مقصد ملاحظہ ہو:

> اُن کے کلام کی ترتیب آسان کام نہیں۔ صدہا شعر ہیں کہ لوگوں کے پاس کچھ لکھے ہوئے تھے دیوان مروج میں کچھ چھپے تھے، اور اُن کی زبان سے کبھی کچھ سُنے کبھی کچھ سُنے۔ پھٹے پُرانے مسوّدے لڑکپن سے بُڑھاپے تک کی یادگار ہیں۔ والد مرحوم کے ہاتھ کی بہت تحریریں ہیں۔ بہت کچھ میری قسمت کے نوشتے ہیں کہ حاضر و غائب لکھتا اور جمع کرتا تھا، کٹے پھٹے اشعار کا پڑھنا، مٹے حرفوں کا اُجالنا، اُس زمانے کے خیالات کو سمیٹنا حالتوں کا تصور باندھنا، بھولے بسرے الفاظ و مطالب کو سوچ سوچ کر نکالنا، میرا کام نہ تھا۔ خدا کی مدد اور پاک روحوں کی برکت شاملِ حال تھی۔ میں حاضر اور خدا ناظر تھا۔ راتیں صبح ہوگئیں اور دن اندھیرے ہو گئے۔ جب یہ مہم سرانجام ہوئی۔ پہلے مرحوم و مغفور کا حال سوانح عُمری کے طور پر لکھتا ہوں، اور جس جس موقعے پر کوئی صورت خاص پیش آئی یا کوئی نظم کسی تقریبِ خاص سے لکھی گئی ... وہ بھی جا بجا درج کرتا ہوں۔ والدِ مرحوم اور اُن کا آغازِ تحصیل میں ساتھ ہوا تھا، ساتھ ساتھ پڑھتے تھے۔ ہر معرکہ میں شریکِ حال رہے۔ مجھے بیس برس تک اِس طرح حضوریِ خدمت رہی کہ ہر وقت پاس بیٹھ کر ظاہر و باطن کے فوائد حاصل کرتا تھا۔ جو حال نہیں دیکھے وہ بھی اِس طرح سُنے ہیں گویا سامنے گزرے ہیں۔

یہ سارا زورِ بیان اِن آخری فقروں کے لیے صَرف کیا گیا ہے۔ یعنی جو دیکھا نہیں وہ بھی گویا چشمِ تصوّر کے سامنے ہے۔ سبب، بلکہ ثبوت اِس کا بیس برس کی حضوریِ خدمت ہے۔ لہٰذا میں جو کچھ کہوں گا، جو بھی لکھوں گا، اُس پر سب کو، حرفِ حق سمجھ کر ایمان لانا چاہیے۔ آخر میں اِتنی محنت کروں گا۔ مٹے حرفوں کو اُجالوں گا؛ کٹے پھٹے مسوّدے پڑھوں گا (جو سب کے سب غدر میں

کہیں گے یہ سب سہی، لیکن پھر بھی کوئی سبب تو ہونا ہی چاہیے۔ اسباب کئی ہیں۔ اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو پھر یہ طویل مقدمہ طویل تر ہو جائے گا جس کی فی الحال گنجایش نہیں۔ لہٰذا فی الوقت مذکورہ تعلق ہی کو پرکھ لیا جائے۔

محققین نے آزاد کے تلمذ کی بُنیاد اُن کے اِس قول کو بنایا ہے:

مجھے بیس برس تک اس طرح حضوری خدمت رہی ہے کہ ہر وقت پاس بیٹھ کر ظاہر و باطن کے فوائد حاصل کرتا تھا۔

محققینِ ذوق و آزاد نے چوں کہ ادھورا قول نقل کیا ہے اس لیے ان سے نتیجہ نکالنے میں چُوک ہوئی ہے۔ اس میں زور نہ حضوری پر ہے نہ فوائدِ ظاہر و باطن حاصل کرنے پر۔ آزاد کا مقصد کچھ اور ہی ہے جس کا ذکر ہم بعد میں کریں گے، پہلے ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے بیس برس کی حضوری کو من و عن قبول کر لینا تحقیق و تدقیق کی آنکھیں بند کر لینے کے مترادف ہے۔ آزاد ۱۰ر جون ۱۸۳۰ء کو پیدا ہوئے۔ ذوق کا انتقال ۱۵ر نومبر ۱۸۵۴ء کو ہوا۔ اِس لحاظ سے ذوق کی وفات کے وقت اُن کی عمر ۲۴ سال ۵ مہینے اور ۵ دن ہوگی۔ اگر بیس برس کی حضوری کو درست مانا جائے تو یہ بھی ماننا ہوگا کہ ہر وقت پاس بیٹھ کر فوائدِ ظاہر و باطن حاصل کرنے کا یہ سلسلہ کم و بیش ۴ سال کی عمر سے شروع ہو گیا تھا، جو ممکن نہیں۔ اگر یہ مانیں کہ ۱۵-۱۶ برس کی عُمر سے آزاد ذوق کی خدمت میں حاضر ہونے لگے تو حضوری کی مدت گھٹ کر ۸-۹ سال رہ جائے گی۔ اب اگر آزاد کا یہ بیان نظر میں ہو کہ چُھٹی کے دن قریب عصر جایا کرتا تھا، تو دو باتیں سامنے آئیں گی۔ اوّل یہ کہ ذوق کی خدمت میں حاضر ہونا اُس زمانے کا واقعہ ہے جب آزاد دلّی کالج میں پڑھتے تھے۔ (ڈاکٹر محمد صادق نے کالج کی تعلیم کے آغاز کا زمانہ ۱۸۴۹ء لکھا ہے، جو درست نہیں) آزاد ۱۸۵۴ء میں ۹ سال کی تعلیم کے بعد کالج سے فارغ ہوئے۔

ــہ ذوق سوانح اور انتقاد میں اِس قول کو آبِ حیات ص ۴۹۹ کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے۔ خدا جانے مصنّف کے پیشِ نظر آبِ کا کون سا نسخہ ہے جس میں یہ قول درج ہے۔ یہ دراصل پہلی بار دیوانِ ذوق مرتّبہ آزاد کے مقدمے میں ص ۲ پر آیا ہے۔ آب میں ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا گیا، اور نہ ہی اُس وقت آزاد کو اس کی ضرورت تھی۔ بیس برس کی حضوری کی بات آزاد نے دیوانِ ذوق میں حافظ ویران کے لیے کہی تھی جسے آزاد نے خود سے منسوب کر لیا۔

غلط بیانی پر مجبور کیا ہو۔ لیکن دنیا میں ایسی مثالیں نایاب نہیں ہوں گی جہاں جھوٹ برائے جھوٹ بولا گیا ہو۔ اس کی اپنی ایک لذت ہوتی ہے۔ اس فن کارانہ انداز سے جھوٹ بولنا کہ سچ معلوم ہو اور لوگ اُس پر سچ کی طرح ایمان لے آئیں بذاتِ خود ایک مقصد ہے۔ یہ بالکل مقدمہ جیتنے کی طرح ہے۔ (ہمارے بیشتر وکلا جس انداز سے جھوٹ کو سچ ثابت کرتے ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں۔ حالاں کہ وہ جانتے ہیں کہ جھوٹ بول رہے ہیں لیکن اُن کا مقصد مقدمہ جیتنا ہوتا ہے اور جیت بجائے خود ایک مقصد ہے) پھر یہ اظہارِ کمال کا ذریعہ بھی ہے۔ آبِ حیات کی تصنیف سے آزاد کا مقصد تاریخ ادب مرتب کرنا نہیں تھا بلکہ ایک ایسی کتاب لکھنا تھا جس میں شعرا کی چلتی پھرتی، بولتی چالتی تصویریں پیش کرکے اُنھیں حیاتِ دوام بخشی جاسکے۔ (کچھ ایسا ہی مقصد دیوانِ ذوق کی ترتیب سے تھا اُنھیں بازار میں" فقط بکتے پھرتے دیوانوں" سے اطمینان نہیں، جن کے ساتھ کوئی بیان نہ ہو") یہ افسانہ اور ڈراما نگاری کا حصہ ہے، تاریخ دتنقید یا تحقیق کا نہیں۔ کتاب کی دلچسپی پر تاریخ و تحقیق کو قربان کر دینے والا بہت بڑا فن کار تو ہوسکتا ہے، مورخ و محقق نہیں۔ چناں چہ مولانا نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے بیشتر شعرا کے حالات میں" واقعات کو کم وبیش" کرنے سے دریغ نہیں کیا۔ اُن کا یہ جوہر سب سے زیادہ ذوق کے احوال میں کھلا۔ سوال یہ ہے کہ آخر ذوق میں ایسی کیا بات تھی جس کے لیے آزاد نے اتنی محنت بلکہ مشقت اُٹھائی (نتیجے میں ہوش و حواس سے بھی ہاتھ دھونا پڑا) ذوق سے ان کا کیا تعلق کیا رشتہ تھا؟ بعض لوگ جواب دیں گے اُستادی شاگردی۔ شاگردوں نے اپنے اُستادوں کی شہرت کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ لہٰذا اگر آزاد نے اُستاد کی شہرت میں چار چاند لگانے کی کوشش کی تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ لیکن ہم کہہ چکے ہیں کہ ہمیں یہ تعلق مشکوک لگتا ہے۔ اب جب کہ تعلق کی بنیاد ہی ختم ہوگئی تو پھر ذوق سے ان کی عقیدت کا سبب؟ عقیدت بھی محبت کی طرح ہے۔ محبت اندھی کہلاتی ہے۔ اس کے لیے اسباب و علل کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ جس طرح محبت ہو جاتی ہے، اُسی طرح عقیدت بھی ہو جاتی ہے۔ اس پر زور نہیں۔ آدمی اس میں بے اختیار ہوتا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ محبت کی بنیاد حُسن ہے لیکن حُسن کا معیار تو انفرادی ہے ورنہ یہ مثل کیوں کر وجود میں آتی: لیلا کو مجنوں کی آنکھوں سے دیکھو۔ بس آزاد کو بھی ذوق سے عقیدت ہوگئی۔ مگر ہمارے مشفق دوست

آزاد کے اس قسم کے فقروں کو من و عن قبول کر لینا گمراہ کُن بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً اُن کا ایک قول ہے: "یہ قصیدۂ مبارکبادی مرزا سلیم کی شادی میں لکھا تھا۔ بندۂ آزاد ان دنوں طفلِ مکتب بھی نہ تھا۔ جب حاضرِ خدمت ہونے لگا تو ..." یہاں طفلِ مکتب ... حاضرِ خدمت ہونے لگا' صریحاً مغالطہ انگیز ہے۔ طفلِ مکتب کیا آزاد اُس وقت تک پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔) اپنا مشتاق سمجھ کر بہت خوش ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ بس تم ہمارے کلام کو سمجھتے ہو۔ رستہ میں مل جاتے تو دس قدم دُور سے دیکھ کر کھڑے ہو جاتے اور جو نیا شعر کہا ہوتا اُسے وہیں سے اٹر کر پڑھتے۔ پھر شعر سُنتے سُناتے چلتے... غریب خانہ پر بھی تشریف لاتے تو پہر پہر سے کم نہ بیٹھتے تھے" ایسی دوستی اور تعلقات کے لیے عُمر کی پختگی ضروری ہے۔ اگر آزاد شوق میں مبتدی تھے تو یہ واقعہ ۱۸۵۰ء کے قریب کا اگر مبتدی شعر گوئی کے لیے آیا ہے ("شعر سُنتے سُناتے چلتے تھے" سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے) تو اسے ۱۸۵۴ء کے بھی بعد کا ہونا چاہیے۔ مؤخر الذکر قرینِ قیاس ہے، اس لیے کہ اگر اوج اساتذہ کے روشناس ہوتے تو معاصر تذکرہ نگاروں کا (جو سب شاعر تھے) اُن سے اور اُن کے حالات سے ناواقف رہنا ممکن نہیں۔ اوج کے اشعار میں آزاد نے یہ شعر بھی درج کیا ہے ؎

میں کالا پانی پڑا ناپتا ہوں مدّت سے ۔۔۔ زمیں کا گز ہے مرا کلک میل دریائی

کالا پانی ۱۸۵۷ء سے پہلے کا محاورہ نہیں۔ "دریائے شور" مشہور تھا، بعد میں کالا پانی ہو گیا۔ ویسے کالا پانی سمندر کے لیے بھی آتا ہے لیکن قلیل الاستعمال ہے۔

اب تک آبِ حیات میں ذوق سے منسوب کم و بیش سب روایات اور واقعات کی تفصیل پیش کر دی گئی ہے اور تحقیق و تدقیق کی کسوٹی پر کسنے کے بعد یہ ثابت کر دیا گیا ہے کہ یہ بیانات کاملاً یا جزواً یا تو غلط ہیں یا مشکوک۔ یہاں تک کہ جن کا آزاد کو بخوبی علم تھا یا جن کا علم ہو سکتا تھا یا حاصل کیا جا سکتا تھا، وہ باتیں بھی آزاد نے غلط لکھی ہیں۔ اس پر بھی آزاد نے ذوق سے تلمذ کا دعویٰ کیا ہے، اور اُسے عموماً تسلیم کیا گیا ہے۔ موجودہ محققین نے آزاد کی تحقیق اور تحقیقی صلاحیت پر بے شمار جگہ سوالیہ نشان لگایا ہے لیکن اس دعوے کو پرکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ ممکن ہے یہ اس لیے ہو کہ شک کرنے کی صورت میں انھیں اس غلط بیانی کے اسباب و علل نہ صرف تلاش کرنا پڑیں گے بلکہ بہ دلائل و ثبوت اپنے شبہات کو ثابت بھی کرنا پڑے گا۔ بظاہر ایسا کوئی مقصد نظر نہیں آتا جس نے آزاد کو اس

مگر اُستاد سب کہتے تھے؛ ایک شخص نہ صرف قلعے سے متعلق ہو بلکہ اکثر شہزادوں کا اُستاد بھی ہو، اور معاصرین اُس کے حالات سے بے خبر ہوں، تعجب انگیز ہے۔ حکیم قدرت اللہ قاسم جن کا اپنا تعلق قلعے سے تھا، جن کے بیٹے میر عزت اللہ عشق بھی اُستادِ شاہ تھے، اپنے تذکرے میں کئی ایسے شاعروں کا ذکر کرتے ہیں جنھیں قلعۂ شاہی سے کسی طرح اُستادی کا تعلق تھا، لیکن اوج کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ کیوں؟ کیا اوج کا زمانہ بعد کا تھا؟ محسن ان کے ذہن میں خلل بتاتے ہیں۔ ایسے شخص کا شہزادوں کا اُستاد ہونا قرینِ قیاس نہیں۔ دماغ کے خلل کا کچھ اندازا تو اُن اشعار سے بھی ہوتا ہے جو آزاد نے نقل کیے ہیں۔ البتہ یہ کہنا مشکل ہے کہ اُن میں کتنے اوج کے ہیں۔ عین ممکن ہے آزاد نے ان کی زبانی شعر سُنے ہوں اور انھیں یاد رہ گئے ہوں: ۳۰ - ۳۰ (۹ ۳۰ - ۳۵) برس ہو گئے۔ وہ چرچے نہ رہے۔ اکثر شعر یاد تھے۔ حافظے نے بے وفائی کی۔ - جو یاد ہے لکھ دیتا ہوں"۔ اس سے تو یہی نکلتا ہے کہ اوج کا زمانہ ۱۸۵۳ء کے آس پاس کا ہے۔ (ذکر طبع ثانی میں پہلی بار آیا ہے۔ ۱۸۸۳ء)

آزاد نے کچھ ایسے واقعات لکھے ہیں جن سے تقریباً زمانے کا تعین ممکن ہے۔ مثلاً مومن کو کنور اجیت سنگھ نے ہتھنی انعام میں دی، اوج نے کہا؛

جنتوں میں وہ مومن مکان لیتا ہے نجومی بن کے جو ہتھنی کا دان لیتا ہے

ہمیں یہ معلوم نہیں کہ یہ واقعہ کب کا ہے۔ البتہ مومن کا انتقال ۱۸۵۲ء میں ہوا۔ اُس سے بہر حال پہلے کا ہوگا (بشرطے کہ شعر اوج ہی کا ہو۔ ایسے شعر کا تذکروں میں جگہ نہ پانا مشکوک کرتا ہے۔) آزاد نے ایک اور واقعہ غالب سے متعلق بھی لکھا ہے: "ایک دن راستہ میں ملے۔ دیکھتے ہی کہنے لگے آج گیا تھا۔ انھیں بھی سُنا آیا ہوں۔ میں نے کہا کیا؟ کڑک کر کہا، ڈیڑھ جُز پر بھی تو ہے مطلع و مقطع غائب ؛ غالب آسان نہیں صاحبِ دیواں ہونا۔ غالب کا دیوان پہلی بار ۱۸۴۱ء میں شائع ہوا۔ (اس شعر میں دیوان کے اختصار پر طعن کیا گیا ہے، اس لیے دیوان کی طباعت سے پہلے کا نہیں ہو سکتا) لیکن آزاد نے طلائی کی فراہم کردہ اطلاع کی بنا پر ۱۸۴۹ء لکھا ہے۔ اس لحاظ سے یہ شعر ۱۸۴۹ء کے بھی بعد کا ہونا چاہیے۔ (کچھ اسی قسم کی بات غالب نے خطوط میں کہی ہے "غضب خدا کا ۹،۸ جُز کا رسالہ ۴ جُز میں منطبع ہو) ہمارا اندازا ہے کہ آزاد کو اوج کا علم یا اُس سے ملاقات ۱۸۵۴ء یا اُس کے آس پاس ہوئی ہوگی، کیوں کہ اُن کا قول ہے: "میں اُن دنوں مبتدی شوقین تھا، ویسے

پیشِ نظر اس وقت آبؔ کے دو اڈیشن ہیں۔ ایک تیسرا مطبوعہ ۱۸۸۷ء لاہور اور ایک مابعد کا بے سنہ، مطبوعہ لکھنؤ۔ اوّل الذکر سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اوجؔ کا ذکر کیوں آیا (یہ حاشیے میں ہے) البتہ مابعد کے اڈیشن میں غالبؔ کی تصانیف کے ذیل میں ایک فقرہ ملتا ہے "ساطع برہان کے اخیر میں چند ورق سید عبداللہ کے نام سے ہیں۔ وہ بھی مرزا صاحب کے ہیں" اور عبداللہ پر ٭ بنا کر حاشیے میں لکھا ہے: "دیکھیے ص ۵۶۶) اور ص ۵۶۶ کے حاشیے میں عبداللہ خاں اوجؔ کی داستان ملتی ہے جس میں ذوقؔ سے متعلق مندرجہ بالا فقرے درج ہیں۔ اس کا سیدھا سا مطلب تو یہ ہے کہ ساطع برہان کے آخر میں چند اوراق جن سید عبداللہ کے نام سے ہیں وہ عبداللہ خاں اوجؔ ہیں، لیکن اصلاً وہ اوراق مرزا غالبؔ کی تصنیف ہیں۔ فی الوقت ساطع برہان دسترس میں نہیں، ذکرِ غالب ــــ ہے۔ اُس میں ساطع برہان سے متعلق یہ فقرے ملتے ہیں: "قاطع برہان (تصنیفِ مرزا غالب) کے جواب میں دوسری کتاب ساطع برہان لکھی گئی۔ اس کے مصنف مرزا رحیم بیگ میرٹھی تھے...." (ص ۱۱۹) ہماری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ خود اپنے خلاف لکھی گئی کتاب میں مرزا نے چند اوراق اپنے ہی خلاف سید عبداللہ یعنی عبداللہ خاں اوجؔ کے نام سے کیوں لکھے۔ ویسے ہم یہ بھی تحقیق نہیں کر سکے کہ عبداللہ خاں اوجؔ سید بھی تھے فی الوقت زیادہ نہیں کوئی چار درجن تذکرے پیشِ نظر ہیں۔ سوائے دو کے سب اوجؔ کے ذکر سے خالی ہیں اور جن تذکروں میں اُن کا ذکر ہے اُن سے بھی پتا نہیں چلتا کہ اوجؔ کا زمانہ کیا ہے، اُن کی شاعری کی کیا کیفیت تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔

اوجؔ تخلص عبداللہ خاں باشندۂ سردھنا مقیم دہلی۔ ان کو عارضہ خللِ دماغ کا تھا۔

بہاتا ہے جوشِ عشقِ شیریں دہاں میں رونا ٭ ہے آبِ شورِ گریہ آبِ زلال اپنا

(سراپا سخن)

یہ شعر ایک لفظ کے تغیّر سے آبؔ میں بھی ملتا ہے۔

اوجؔ تخلص، اسمش عبداللہ خاں، ساکن قصبہ سردھنہ از حالاتش واقفیت نیست۔ از وست

(عمدۂ منتخبہ۔ انتخاب میں ایک شعر ہے)

دونوں تذکرے معاصر ہیں۔ ایک ابتدائی اور دوسرا آخری دَور کی تالیف ہے۔ لہٰذا انھیں تحقیق کے مواقع ہم سے زیادہ حاصل تھے، لیکن وہ اوجؔ سے ناواقفیت کا اظہار کرتے ہیں۔ آزادؔ کا قول ہے: "بعض اشخاص شہر اور قلعے کے اکثر مرشد زادے شاگرد تھے۔

آتا کہ "شاگرد" نے زندگی میں پہلی بار ایک مصرع کہا اور وہ بھی اُستاد نے چھین لیا۔ پھر اِسے آزاد کے کلام میں ہونا چاہیے لیکن غالباً نہیں ہے۔ پھر وہ غزل جو اُستاد نے بادشاہ کے لیے کہی تھی کہاں گئی ؟

۵۰۔ اِس مطلع پر حضور نے کئی دفعہ جال مارے مگر یہ ٹال گئے

یہ ذکر ہے " ایک طعمہ مچھلیاں دو کش مکش آپس میں ہے" کا۔ یہ مطلع ۱۲۲۴ھ کے آس پاس کہا جا چکا تھا۔ حضور ۱۲۵۳ میں بادشاہ بنے۔ آخر ۳۰ سال پہلے اُنھوں نے اس پر جال کیوں نہ مارے ؟

۵۱۔ بعض اشخاص شہر اور قلعے میں اکثر مرشد زادے (شہزادے) شاگرد تھے مگر اُستاد سب کہتے تھے۔ شعرائے باکمال کو جا کر سُناتے تھے اور تعریفوں کے فغاں و فریاد (کفنا) لے کر چھوڑتے تھے۔ کیوں کہ اسے اپنا حق سمجھتے تھے۔ ذوق مرحوم باوجود کم سخنی اور عادت خاموشی کے خوب۔ خوب۔ بہت خوب کہتے، اور مکرر پڑھواتے۔ مسکراتے تھے اور چہرہ پر سرور ظاہر کرتے تھے گویا شعر کی کیفیت میں بیٹھے ہیں۔

یہ بے ضرر حملے عبداللہ خاں اوج کو دادو دینے سے نقل کیے گئے ہیں۔ ان میں کوئی خلافِ معمول یا بعید از قیاس بات نہیں۔ اِنتہائی سادہ اور فطری بیان ہے۔ اس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس میں ذوق جیسے سنجیدہ شخص کی شخصیت سے بھی فطری شوخی کی کرنیں پھوٹتی نظر آتی ہیں اور یہیں سے شبہے کی بنیاد پڑتی ہے۔ اگرچہ آزاد ہی کے لفظوں میں " جیتی جان کے لیے بھی شگفتگی کا ایک وقت ضرور ہے" تاہم پتھر میں جونک لگتے دیکھیے تو حیرت ضرور ہوتی ہے۔ اِسی حیرت نے اِس بیان کو پرکھنے پر اُکسایا۔ نتیجہ اگرچہ خلافِ توقع نہیں نکلا، پھر بھی کچھ اچھا نہیں لگا۔ آزاد کے مزاج کا خاصہ ہے کہ بڑی معتبر شخصیتوں کو راوی بناتے ہیں تاکہ شبہہ پیدا نہ ہو۔ اِس کے ساتھ ہی واقعات کا جال ایسے لوگوں کے گرد بُنتے ہیں جن کا نام و مقام بھی کوئی نہیں جانتا۔ اگر آپ کبھی کتبِ تاریخ و تذکرہ میں انھیں تلاش کرنے لگیں تو سوائے مایوسی کے کچھ ہاتھ نہ لگے۔ مثلاً ناسخ کی غزل کے معرکے میں شہیدی کے دعوے میں شیخ حفیظ کا ذکر۔ اب آپ چراغ لے کر شیخ حفیظ کو ڈھونڈ ھیے۔ موجودہ قصّے کا مرکزی کردار عبداللہ خاں اوج ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم اوج کی تلاش میں نکلیں، یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ یہ "واہ واکی جنیں اور تعریفوں کے فغاں و فریاد" پہلے اڈیشن میں نہیں تھے۔ ہمارے

اس داستان پر یقین کرنے کے لیے ذوق کی سی سادہ لوحی کی ضرورت ہے جو اپنے نوکر کا اشارہ بھی نہیں سمجھتے۔ آخر نوکر نے بغیر اجازت تو شربت نہ گھولا ہوگا؟ اور اگر بے اجازت گھولا تھا تو پھر اُس نوکر کی مُستعدی اور مزاج شناسی قابلِ رشک ہے جسے مالک کے دل کا علم پہلے سے ہوجاتا ہے کہ اب اُنھیں پیاس لگنے والی ہے۔ پہلے آدمی کی شرم لکنے کے قائل تھے لیکن جب شربت گُھل گیا تو ایک نوعمر لڑکے کو اپنا یار بنالیا اور کھسیاہٹ مٹانے کے لیے فی البدیہہ مطلع بھی تصنیف فرمادیا۔

۴۹ ۔ ایک دن بادشاہ کی غزل کہہ رہے تھے تیر ہمیشہ، تصویر ہمیشہ۔ سوچتے سوچتے کہنے لگے تم بھی تو کچھ کہو۔ میں نے کہا کیا عرض کروں۔ فرمایا میاں اسی طرح آتا ہے۔ ہوں ہاں توں غاں کچھ تو کہو۔ کوئی مصرع ہی سہی۔ میں نے کہا ع سینہ سے لگائے تری تصویر ہمیشہ ذرا تامل کر کے کہا ہاں دُرست ہے

آجائے اگر ہاتھ تو کیا چین سے رہیے   سینہ سے لگائے تری تصویر ہمیشہ

معلوم نہیں یہ واقعہ کب پیش آیا۔ ہمارے حساب کے مطابق آزاد نے ذوق کی زندگی میں شعر نہیں کہے۔ اگر آغاز کیا بھی ہوگا تو ۱۸۵۴ء میں جس سال ذوق کا انتقال ہوا، اور اُنھیں شرم، جھجھک یا کسی اور سبب سے اصلاح لینے کا موقع نہیں ملا۔ وہ اسی سال کالج سے فارغ التحصیل ہوئے تھے۔ نثری مضامین تو کالج میں اُنھیں لکھنے پڑے لیکن شعر کہنے کا موقع نہیں آیا۔ اگر کچھ غوں غاں کرنے لگے ہوں تو وہ کالج چھوڑنے کے بعد ہی ہوا ہوگا۔ اب مندرجہ واقعے کو لیجیے اس میں بادشاہ کی غزل کہنے کا ذکر ہے۔ ظفر ۱۲۵۳ میں بادشاہ ہوئے۔ اُس وقت آزاد کی عمر آٹھ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس سے معاً پہلے ایک واقعہ بیان ہوا ہے "فرمایا کہ لوجی ۲۲ برس کے بعد آج اصلاح دینی آئی ہے۔ ۱۲۳۰ تک تو وہ خود شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ ۱۲۳۱ سے اُنھیں اُستاد فرض کر لیجیے۔ ۲۲ برس ۱۲۶۴ میں ہوں گے لیکن اُس وقت تک آزاد نہ مشاعروں میں جاتے تھے اور نہ شعر کہنا قرینِ قیاس ہے۔ اُن کی عمر ۱۳۔۱۴ برس سے زیادہ نہیں تھی۔ چناں چہ یہ واقعہ اور بعد کا ہوگا۔ البتہ ایک چیز ہمیں متامل کرتی ہے۔ ذوق بادشاہ کی غزل بہت کہتے تھے اور آزاد نے جب بھی بالتصریح بادشاہ کی غزل کہلوائی ہے وہ بادشاہ کے دواوین میں نہیں ملتی۔ چناں چہ اس غزل سے بھی بادشاہ کے چاروں دیوان خالی ہیں۔ یہ ذوق کے کلیات میں بھی نہیں اور ہونی بھی نہیں چاہیے تھی ورنہ اُستاد پر حرف

قصیدہ اکبر شاہ ثانی کی مدح میں ہے۔ بیچارے ذوق ایک تنگ و تاریک مکان میں کھری چارپائی پر بیٹھنے والے گوشہ نشین یہ کیوں کر جان سکتے تھے کہ ۱۷ رمضان تک شاہ عالم ثانی بادشاہ تھے۔ اکبر شاہ ثانی کا دور ۸ رمضان ۱۲۲۱ھ کے بعد شروع ہوا۔ اب بھی کوئی مذکورہ اشعار کو ذوق کی تصنیف سمجھے تو یہ اس کی اپنی صوابدید، ہم اس میں کیا کر سکتے ہیں۔ اصلیت یہ ہے کہ آزاد نے نسخۂ دیوان میں اس زمین کے چند متفرق اشعار دیکھے اور دیوانِ ناسخ میں ناسخ کی غزل اُن کی نظر سے گزری تو انھوں نے اُس پر ایک افسانہ بنا ڈالا[۱] اور اُسے صداقت کا رنگ دینے کے لیے ۹۸ شعر بھی تصنیف کر ڈالے۔

۴۸۔ شیخ مرحوم ضعفِ جسمانی سے روزہ نہ رکھتے تھے۔ (لڑکپن ہی سے اوراد و وظائف کا پابند اور روزہ نہ رکھے، تعجب انگیز ہے) مگر اس پر بھی کسی کے سامنے کھاتے پیتے نہ تھے۔ کبھی دوا یا شربت یا پانی پینا ہوتا تو یا کوٹھے پر جا کر یا گھر میں جا کر پی آتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا۔ کہا میاں خدا کے گنہگار ہیں۔ وہ عالم نہان و آشکار ہے۔ اُس کی تو شرم نہیں ہو سکتی بھلا بندے کی تو شرم رہے۔

اگر یہ بات ٹھیک ہے کہ وہ بندے کی شرم رکھتے تھے تو اس کے فوراً بعد آنے والے اِس واقعے سے کیا مراد ہے؟

رمضان کا مہینا تھا۔ گرمی کی شدت تھی۔ عصر کا وقت۔ نوکر نے شربت نیلوفر کٹورے میں گھول کر کوٹھے پر تیار کیا۔ اور کہا ذرا اوپر تشریف لے چلیے۔ چوں کہ وہ اس وقت کچھ لکھوا رہے تھے (آخر ایسی کیا چیز تھی جس کو دو منٹ کے لیے ملتوی کرنا گوارا نہ ہوا؟) مصروفیت کے سبب سے نہ سمجھے اور سبب پوچھا۔ اُس نے اِشارہ کیا۔ فرمایا کہ لے آ یہیں۔ یہ ہمارے یار ہیں۔ ان سے کیا چھپانا۔ جب اُس نے کٹورا لا کر دیا تو یہ مطلع کہا کہ فی البدیہہ واقع ہوا تھا۔

پلا مے آشکارا ہم کو کس کی ساقیا چوری خدا کی جب نہیں چوری تو پھر بندے کی کیا چوری

---

۱ حُسنِ اتفاق سے ہمارے شعبے میں دیوانِ شہیدی کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے۔ ہم نے احتیاطاً دیکھ لیا کہ شاید شہیدی نے بھی اس زمین میں طبع آزمائی کی ہو کہ آخر انھیں کی نظر میں ناسخ کی غزل لاجواب تھی، لیکن ہمیں مایوسی ہوئی۔

در آتے ہیں کہیں غزل کے۔ مندرجہ بالا شعر کہتے ہوئے آزاد کو یہ خیال نہیں رہا کہ یہ قصیدہ کسی کے غسلِ صحت کی تہنیت میں نہیں ہے۔ اگرچہ لکھا نہیں مگر یہ شعر قطعہ بند ہے اُس شعر سے جو کلیات میں پانچواں ہے اور شروع میں نقل ہو چکا ہے۔ اگر انہیں قطعہ بند نہ مانا جائے تو پھر اس شعر میں مذکور مژدۂ صحت باغ میں کون پہنچائے گا؟ یہ کام شعرِ مذکور کے مصرعِ اولیٰ کی "صبا" کا ہے جو "زرِ گل" (کلیات = رگِ گل) نثار کرنے کو لائی ہے۔

بہرحال ہم نے کئی مہمل اور بے محل اشعار نظرانداز کر دیے ہیں بلکہ اُس شعر سے آگے نہیں بڑھے جو کلیات میں ۵ واں اور دیوان میں ۵۰ واں ہے، اس خیال سے کہ شاید باقی کے ۱۲ شعر انھیں پچاس میں سے ہوں، ورنہ ابھی ۱۸ شعر اور باقی ہیں۔ اِن ۶۸ اشعار میں تکرارِ قوافی ہی نہیں، تکرارِ مضامین بھی بہت ہے۔ ایک ہی مضمون کو کئی کئی بار باندھا ہے اور ہر جگہ بے مزہ بلکہ مضحک۔ اِس خلفشار کو دیکھ کر مرتبِ کلیات کی اِس رائے سے اتفاق کرنے کو جی چاہتا ہے "آزاد کو قصیدہ گوئی سے ذوق نہ تھا" (ایک نجی خط) غرض اس طومار طرازی سے یہ ہے کہ شاخ کی غزل غلط، قصیدہ غلط، شہیدی سے معرکہ پیش آنا غلط، جب سب کچھ غلط ہے تو غزل کو دیوان اور کلیات میں شامل کرنا بھی غلط ہے۔ اس ضمن میں آخری لطیفہ اور سن لیجیے۔

ناسخ کی غزل کا دلی پہنچنا اور ذوق کا غزل (یا قصیدہ) کہنا سب عبداللہ خاں مشتاق کی وساطت سے ہوا تھا۔ ہم نے ابھی دکھایا ہے کہ جو شعر آزاد نے دیوان میں ذوق کے مسودے کے حوالے سے نقل کیے وہ قصیدے کے شعر ہیں اور قصیدہ کس کی تعریف میں ہے وہ اس سے ظاہر ہے:

لکھ ذوق اس کی مدح کہ جس کی ثنا سے ہے — سرسبز تیرے گلشنِ باغِ سخن کی شاخ
(گلشنِ باغِ سخن؟)

وہ کون؟ شاہِ اکبر ثانی کہ جس کو روز — مجرا کرے ہے جھک کے نہالِ چمن کی شاخ

(اس پر حیرت کی ضرورت نہیں۔ جس چمن کی یہ شاخ ہے اُس میں صرف ایک ہی نہال تھا اِس لیے مجرا گزاری کا کام ایک ہی شاخ کو کرنا پڑتا ہے) یہ تو معلوم ہے کہ ۱۲۲۱ھ میں ذوق مبتدی تھے اور یہ بھی کہ عبداللہ خاں مشتاق جن کی وساطت سے بہ قولِ آزاد "یہ سب گفت گوئیں ہوئیں" ۱۲۲۱ھ سے پہلے انتقال کر چکے تھے۔ اس کے باوجود ذوق کا

میں جھولے کی رسّی ڈالی گئی ہے وہ شاخ رسّی کی ممنون ہے لیکن پیچیدگی اور تعقید نے معنی خبط کر دیئے۔

جُز شمع استخوانِ صفا کیش زیرِ خاک
دیکھی نہ ہے کسی گُلِ صبحِ کفن کی شاخ

یہ گُلِ صبحِ کفن، کون سا گُل ہوتا ہے؟

چھوٹے جلانے والوں سے ہرگز مَرے بھی
انجن کے کام آئے اگر ہے ہرن کی شاخ

نہیں کہا جا سکتا کہ جلاتے کو جِلاتے کاتب نے کیا ہے یا خود آزاد نے مَرے کے مقابل جِلا باندھا ہے۔ ہرن کی شاخ انجن (سرمہ) کے کام کیوں کر آئے گی، معلوم نہیں۔ ممکن ہے آشوبِ چشم کا کوئی نسخہ ہو۔

باریک ہیں بتاتے ہیں جس کو تری کمر
یا کوئی موے تن ہے دیا موے تن کی شاخ

یہ دیا آزاد کا پسندیدہ لغت ہے۔ چناں چہ کئی اشعار میں نظر آتا ہے۔ ذوق کے مستند کلام میں ایک بار بھی نہیں آیا لیکن مشکوک کلام خصوصاً قصائد میں نظر آتا ہے۔ کلامِ ذوق کے محققوں کو اس طرف بھی توجہ دینا چاہیے۔ یہ اُس نظم میں بھی ہے جسے اسلم فرخی صاحب نے آزاد کی قدیم ترین نظم کہا ہے۔

یہ سیبِ باغِ خلد کو کیا کیا نہ سرکشی
جب سے مشابہت سے لگی اُس ذقن کی شاخ

(مطلب؟) ـــــ اِس شعر کی دوسری قرات آزاد نے جسے "ن" (نسخہ) کے تحت حوضے میں شائع کیا ہے، یہ ہے:

تھی سیبِ باغِ خلد کو اتنی اوجِ قدر (کذا)
لیکن مشابہت سے لگی اُس دہن کی شاخ

اور یہ بھی مہمل ہے۔ یہ دراصل ذوق کے اِس شعر کی ہیئت کذائی ہے:

شاخِ نبات کو نئے قلیاں نہ منہ لگائے
ایسی مصاحبت سے لگی اس دہن کی شاخ

اُس کی دعائے حرز پڑھے جوشِ غنچہ سے
تسبیح ایک لے کے عقیقِ یمن کی شاخ

جوشِ غنچہ سے دُعا پڑھنا کیا اور عقیقِ یمن کی شاخ کیسی؟ یہ پہلے تو روغنِ گُل بھینس کے انڈے سے نکال، قسم کے اشعار سے ہے جو آزاد نے آبِ حیات میں غالب کا مذاق اُڑانے کے لیے نقل کیے ہیں۔

پہنچائے اُس کا مژدۂ صحت جو باغ میں
سجدے میں بہرِ شکر جھکے نارون کی شاخ

اِس پورے قصیدے میں عجیب خلفشار کا عالم ہے۔ تشبیب میں کہیں مدح کے شعر

پریشان خیال تھے کہ غزل کہتے کہتے قصیدہ کہنے لگتے تھے اور پھر غزل میں لوٹ آتے تھے اور انھیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا تھا (یہ پریشان خیالی انشا کے ہاں ملتی ہے جس پر اگرچہ آزاد نے اعتراض کیا ہے لیکن خود اُس میں مبتلا ہو گئے ہیں۔)

سوفار کا دہن جو ہوا خونِ دل سے سُرخ   تیر اُس کا بن گیا ہے گُلِ خندہ زن کی شاخ

یہ پھر تشبیہ کا شعر ہے۔ مصرعِ ثانی غور طلب ہے۔ یہ بڑی دُور از کار نازک خیالی ہے۔ ذوق کا ذہن اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی غلط ہے۔ "ہے" حشوِ محض ہے چلیے اسے ضرورتِ شعری کے کھاتے میں ڈال لیے۔ لیکن یہ "گُلِ خندہ زن" کون سا گُل ہوتا ہے؟ یہ زخم کی تشبیہ ہے لیکن ناقص۔ گُلِ خنداں کا مقام تھا، اور ذوق اتنے عاجز بیاں نہ تھے۔ اگلا شعر پھر مدح کا ہے۔ کلیات کا متن ہے:

گر تیرا حفظ ہو وے چمن بندِ روزگار   آبِ مژہ سے سبز ہو سروِ چمن کی شاخ

ہماری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ حفظ کیوں کر چمن بند ہو سکتا ہے۔ پھر "چمن بندِ روزگار"! یعنی زمانے کے چمن کی حفاظت کرے۔ (آخر یہ کس معشوق کی صفت ہے؟) حفظ کا کام تو محافظت ہے۔ وہ تباہی سے بچا سکتا ہے۔ اگر بادشاہ زمانے کو اپنی امان میں لے لے تو نتیجہ کیا ہوگا؟ زمانہ تباہی سے محفوظ رہے گا۔ لیکن مصرعِ ثانی سے کچھ اور ہی نتیجہ نکلتا ہے۔ یعنی آبِ مژہ سے سروِ چمن کی شاخ سبز ہو جائے گی۔ پھر جب بادشاہ کی امان میسّر ہو تو رونے کی کیا ضرورت ہے؟ (ورنہ روئے بغیر آبِ مژہ کیسے حاصل ہوگا؟) کیا ذوق اتنے ہی مہمل گو تھے؟ دیوان کا متن اور زیادہ لغو ہے۔ ع گر تیرا حفظ ہو چمن بندِ روزگار۔ یہ اضافتیں خود آزاد کی لگائی ہوئی ہیں۔ (ان کے بغیر مصرع بے وزن ہو جائے گا) ہماری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ "اُستاد" ایسی مہمل شاعری کیوں کر کرتے تھے؟

یہ تھے وہ سات شعر جو مُرتّب نے کُلّیات میں شامل کیے ہیں لیکن خود اُن کے مطابق بیاض میں ۲۱ شعر ہیں (اور ۳۹ بھی۔ پاکستانی اڈیشن) ۱۴ منسوخ اشعار کی نشاندہی اُنھوں نے نہیں فرمائی۔ دیوان میں ۶۸ شعر ہیں (اس کی طرف بھی اُنھوں نے اشارہ نہیں کیا) کچھ اور اشعار دیکھیے، شاید کچھ بات بن جائے۔

جب سے پڑا ہے باغ میں جھولا ترے لیے   ممنون باغ میں ہے نہایت رسن کی شاخ

مصرعِ ثانی کا "باغ میں" حشو، "رسن کی شاخ" کیا؟ آزاد کہنا یہ چاہتے ہیں جس شاخ

سے اِن میں ایک شعر بھی ایسا نہیں جو کلیات میں شامل ہو، سوائے اُس ایک شعر کے جس کی تین قرأتیں آزاد نے دی ہیں اور دوسری خود ذوقؔ کی ہے، جو آزاد نے نسخۂ دیوان سے لی ہے اور اُس میں بھی ترمیم ضروری سمجھی۔ کیا اب بھی مرتّب کُلیات کے لیے اِس اصرار کی گنجائش ہے کہ بیاضِ مذکور، جس پر آزاد کی اور مرتّب نے کُلیات کی بُنیاد رکھی ہے، وہ ذوقؔ کے اپنے قلم سے لکھی گئی ہے؟)

دیوان ۲۱
ک ۳

صیادؔ مَیں چمن سے ہوں مایوس اِس لیے
چوبِ قفس بھی ہو تو نہالِ چمن کی شاخ

مُرتّبِ کُلیات نے "مایوس" کو سہوِ کتابت کہا ہے۔ اس کی جگہ "مانوس" چاہیے۔ غالباً یہ سہوِ کتابت خود بیاض میں ہے (حالاں کہ بہتر مایوس ہی ہے، شعر کے معنی پر غور شرط ہے) بہر حال یہ چوبِ قفس کیا ہے؟ آزاد کے ذہن میں "قفس کی تیلیاں" ہیں جو وہ شعر میں کھپا نہیں سکے۔ نہالِ چمن کی شاخ" بھی ہمیں تو عجیب لگتا ہے۔

د ۴۶
ک ۵۰

بہرِ تصدّق آئے زرِ گُل کو لے صبا
کرنے لگے نثار گہر یاسمن کی شاخ

کُلیات میں زرِ گُل کی جگہ رگِ گُل ہے اور ظاہر ہے کہ رگِ گُل تصدّق کرنا مہمل ہے۔ یہاں مرتّب نے زرِ گُل کو نہ سہوِ کتابت کہا ہے اور نہ یہ بتایا ہے کہ دیوان کا متن بہتر یا مختلف ہے۔ یہ شعر مدح کا ہے۔ تصدّق کے لیے زر و گہر ہی ہو سکتے ہیں۔ گُل کی رگیں نثار کرنا کیا ہوا؟ اگر یہ شعر ذوقؔ نے کہا تھا تو کم از کم مرتّبِ کلیات اسے لغزشِ قلم تو کہہ ہی سکتے تھے۔ آزاد نے پہلے جب یہ شعر کہا تھا تو جوشِ آمد میں رگِ گُل کہہ گئے تھے۔ ۱۸۹۰ء میں دیوان مرتّب کیا تو اُنھیں اِس "مہملیت" کا احساس ہو گیا۔ چناں چہ اُنھوں نے اِسے زرِ گُل سے بدل دیا۔ مرتّبِ کلیات کو اِس پر بھی شبہ نہیں ہوا کہ یہ شعر مدح کا ہے۔ غزل میں اس سے پہلے کوئی اشارہ، کوئی تصریحی شعر نہیں تو پھر اسے بے جوڑ اور مہمل ہی کہا جائے گا۔ ذوقؔ بڑے

؎ ہمیں بہ وجوہ یہ ماننے میں تامّل ہے کہ آزاد نے "۱۸۸۸ میں دیوان مرتّب کر لیا تھا (ڈاکٹر اسلم فرخی) لیکن اُس کی اشاعت ۱۸۹۱ء میں ہوئی۔ خاتمے کی عبارت اس کی تردید کرتی ہے۔ دتّی سے نکل کر ۳۴ برس ۱۸۹۱ میں ہوتے ہیں۔ دیوان کی تکمیل ۱۸۹۰ء کے شروع میں ہوئی ہوگی (وسط ۱۸۹۰ء میں آزاد دیوانے ہو گئے) اور ۱۸۹۱ء میں کسی وقت دیوان شائع ہوا ہوگا۔

کلیات کے آخری اور دیوان کے ۸ ویں شعر کی مختلف قرأتیں ملاحظہ ہوں :

آخر یہ دست گیریِ تیشہ نے پھل دیا　　　کی قطع نخلِ آرزوے کوہکن کی شاخ

یہ قرأت مرتبِ کلیات کے مطابق ذوق کی ہے (انھوں نے بیاض کے بیشتر اشعار کو ذوق کے ہاتھ کی تحریر مانا ہے) لیکن اس میں رعایتوں کو جس طرح ملحوظ رکھا گیا ہے وہ ذوق کے مزاج سے میل نہیں کھاتیں۔ ہے یہ کہ بیاض میں بھی غزل آزاد نے لکھی اور مسودۂ دیوان ذوق میں بھی۔ اب اگر بیاض کے متن کو انھوں نے چھیڑا تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ وہ ذوق کے قلم کی تحریر ہے۔ ترتیبِ دیوان کے وقت آزاد نے سوچا ہوگا کہ تیشے کے ساتھ پھل، قطع کرنا، نخل، شاخ، سب کچھ ہے لیکن "دست گیری" وہ مفہوم نہیں دیتی جو مقصود ہے۔ چناں چہ انھوں نے ایک دوسری قرأت پیش کر دی :

کہتی تھی چوبِ تیشہ مری طرح ایک دن　　　سوکھے گی نخلِ آرزوے کوہکن کی شاخ

شعر اچھا ہو گیا تھا لیکن وہ اس سے مطمئن نہیں ہوئے۔ یہاں تیشہ ہے، پھل نہیں، اور "دست" بھی۔ لہٰذا انھوں نے دیوان میں اس کے لیے ایک نسخہ بھی تجویز کر دیا : ؎

کہتی تھی چوبِ دستۂ تیشہ کی مری طرح۔ اب چوب کی تخصیص ہو گئی یعنی چوبِ دستۂ تیشہ۔ رہا پھل، تو وہ تیشے میں موجود ہے ہی۔ (یہاں ایک لطیفہ سن لیجیے۔ ہم نے یہ تبصرہ اُس وقت لکھا تھا جب نسخۂ ویران دسترس میں نہیں تھا۔ اب نسخۂ مذکور پیشِ نظر ہے اور اوپر ہم نے جس قرأت کو "شعر اچھا ہو گیا تھا" سے تعبیر کیا ہے وہ خود ذوق کا اصل متن ہے اور نسخۂ ویران میں موجود ہے۔ اس سے ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ کسی صاحبِ طرز ادیب کا دیوان مرتب کرنے کے لیے اُس کے طرز کا عرفان پیدا کرنا بھی ضروری ہے۔ ورنہ مصنف کے متن کو رد اور الحاقی متن کو قبول کر لینے کا اندیشہ باقی رہے گا جیسا کہ اِس شعر کے سلسلے میں مرتبِ کلیاتِ ذوق نے کیا ہے۔ بہرحال اب معلوم ہوا کہ نسخۂ ویران میں ۱۳ شعر ہیں نہ کہ دس جیسا کہ مرتب کلیات نے لکھا ہے۔ یہ ۱۳ شعر اگرچہ غزلوں میں درج ہیں تاہم ان کے چار حصے کیے گئے ہیں۔ ان کے ساتھ "ناتمام" کی صراحت بھی نہیں۔ گویا یہ کل ۱۳ شعر ہیں جو ذوق نے اس زمین میں کہے۔ پہلے حصے کا عنوان ہے : "ردیف خا مجمعہ اشعار سراپا" اس میں دو شعر ہیں۔ دوسرے حصے کا عنوان ہے : "اشعارِ تشبیہہ"۔ اس میں تین شعر ہیں۔ تیسرے حصے کا عنوان ہے "اشعار مجموع"۔ اس میں چھے شعر ہیں۔ چوتھے اور آخری حصے کا عنوان ہے : "اشعارِ قصیدہ" اتفاق

پرِ زغال زاغ ہے اور اُس کا شوخ چشم ہونا اس کے محبوب کے چہرے کو نشیمن بنانے میں مضمر ہے۔

دکھلائی اُس کے سرمۂ دُنبالہ دار نے آنکھوں سے ہم کو نرگسِ ہاروت فن کی شاخ

جن لوگوں نے ذوقؔ کا غیر مشتبہ کلام دیکھا ہے، جن کی نظر سے آزاد کی تحریفیں گزری ہیں، اور جن کو ذوقؔ کے رنگِ سخن کا عرفان ہے، انھیں اس کا اندازا ہوگا کہ ذوقؔ کے کلام میں پیچیدگی نہیں ہے۔ اُن کے کلام کا جوہر سادگی ہے، زبان کی بھی اور مضمون کی بھی۔ وہ بہت اونچے نہیں اڑتے، اڑ بھی نہیں سکتے۔ مریداں می پرانند کے مصداق آزاد انھیں بلند پرواز بناتے یا بنانے کے خواہش مند ہیں۔ آزاد کی نظر میں مومنؔ کی نازک خیالی اور غالبؔ کی پیچیدہ بیانی تھی۔ چناں چہ جہاں بھی انھوں نے ذوقؔ کو اصلاح دینا چاہی ہے یا جہاں اُن کے نام سے خود شعر تصنیف کیے ہیں، اُن میں کچھ مومنؔ اور غالبؔ کا پرتو نظر آتا ہے۔ سادہ بیانی کو آزاد بغیر شوخی کی پُٹ کے قبول نہیں کرتے اور ایسے موقعوں پر انشاؔ اور رنگینؔ کا سایہ پڑتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ ممکن ہے ذوقؔ نے تحصیلِ علمی میں خاصی کوشش کی ہو لیکن وہ آزاد کی طرح عالم نہیں تھے۔ اُن کا مختلف زبانیں جاننا (سوائے اردو، فارسی، عربی کے) مشکوک ہے۔ ذوقؔ نے عربی میں خاص مشق بہم پہنچائی ہو، اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ آزاد عربی کے پروفیسر رہے تھے۔ یوں بھی باقاعدہ عربی کی تعلیم پاتے ہوئے تھے۔ انھیں انشاؔ کے اردو کلام میں جابجا عربی نگینے جڑے دکھائی دیتے ہیں جن کی چمک اُن کی بصیرت کی آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے۔ چناں چہ اگر بہ غور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آزاد نے ذوقؔ کے نام سے جو کچھ تصنیف کیا ہے اس میں اُن کی عربی دانی اور عربی پسندی اپنا اثر دکھاتے بغیر نہیں رہتی کہ خود رنگ است۔ ذوقؔ کے یہاں غالبؔ کی طرح ترکیب تراشی کا رُجحان نہیں ملتا۔ اُن کے مزاج میں وہ اُپج سے ہی نہیں، لیکن آزاد جب ترکیب تراشی پر آتے ہیں تو بہت دُور کی کوڑی لاتے ہیں چناں چہ شعر ۲ پر غور کیجیے۔ اُس کی داستانی فضا دھو انشاؔ کی اُن غزلوں میں بہت نمایاں ہے جن کی زمین "توڑیے" ہے۔ نیز "شاخ" کی غزلیں بھی اس جھلک سے محروم نہیں۔ آزاد نے "نازک بدن" کا قافیہ انشاؔ ہی سے لیا ہے) ملاحظہ کیجیے۔ آنکھ میں جادو ہوتا ہے۔ نرگسِ جادو خود داستانی کردار ہے۔ ہاروت ماروت جادو میں ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ لہٰذا "ہاروت فن" سے جادوگری مراد لینا، یہ ... ممکن نہیں تھا۔ اُن کے یہاں ایسی پیچیدہ تراکیب کا فقدان ہے۔

کی کچھ تلافی ہو جاتی ہے لیکن آب میں ایک شعر بھی نہیں تھا۔ جس کا مطلب ہے اُس وقت تک غزل آزاد کے سامنے نہیں تھی۔ ترتیب دیوان کے وقت بہ قولِ خود اُنھیں اِس کا مسوّدہ ہاتھ آگیا جس پر نظرِ ثانی نہیں ہوئی" (یہ غلطیوں کی پردہ پوشی کے لیے ہے) لیکن اُن کے ذہن سے غزل نکل گئی اور اُنھوں نے قصیدہ نقل کر دیا جس میں ۶۸ شعر ہیں (یہ اور بات ہے کہ اسے غزلوں کے تحت درج کیا ہے۔ مرتّب کلیات نے جو سات شعر شامل کیے ہیں وہ مختلف مقامات کے ہیں اور پوری نظم سامنے نہ ہو تو انھیں غزل بھی کہا جا سکتا ہے۔ حیرت اِس امر پر ہے کہ مرتّب نے ۱۲ شعر بتا کر سات نقل کیے ہیں، نہ اس کا سبب بتایا اور نہ یہ بتایا کہ آزاد نے دیوان میں ۶۸ شعر درج کیے ہیں اور وہ قصیدے کے ہیں پاکستانی اڈیشن میں ایک جگہ ۳۹ شعر بھی لکھے ہیں) آخر وہ غزل کہاں گئی جس کے نظر سے گزرنے کی بشارت آزاد نے آب میں دی تھی؟

یوں تو دستیاب قصیدے یا غزل کے کئی اشعار مُضحک اور غلط ہیں لیکن فی الوقت اُنھیں سات شعروں کو لیجیے جو کلیات میں شامل کیے گئے ہیں۔ کلیات کے سات شعر دیوان کی ترتیب سے نہیں بلکہ کلیات کا پہلا اور دوسرا شعر دیوان کا بالترتیب تیسرا اور چوتھا شعر ہے۔ تیسرا، چوتھا، پانچواں اور چھٹا بالترتیب ۲۲ واں، ۲۷ واں، ۴۳ واں اور ۵۰ واں ہے۔ اور ۷ واں شعر دیوان میں ۸ واں ہے۔ اِس لحاظ سے شعر ۳ - ۶ مدح کے ہیں اور باقی تین شعر تشبیب کے ہیں۔ مرتّبِ کلّیات نے اس طرف اشارہ تک نہیں کیا۔ ہمیں یہ ماننے میں تامّل ہے کہ دیوان کی طبع اوّل (جو مرتّبِ کلّیات کے پیشِ نظر ہے) اور ہمارے پیشِ نظر اڈیشن (۱۹۳۲ء) کی ترتیب میں یا اشعار کی تعداد میں کوئی فرق ہو سکتا ہے، اِس لیے کہ دیوان کی ترتیب کے بعد آزاد دیوانے ہو گئے تھے اور اُسی عالم میں وفات پائی۔ دیوان اگرچہ اُن کی حیات میں شائع ہوا (آغا باقر نے شائع کروایا تھا) تاہم بیس سال بعد دوسرے یا بعد کے اڈیشنوں میں ترمیم یا اضافے کا انہیں ہوش ہی کہاں تھا؟

کلّیات اور دیوان کے متن میں بھی فرق ہے (ذکر آگے آتا ہے) بہرحال اُن سات شعروں کا جائزہ ملاحظہ ہو:

ابرو پہ اُس کے خال ہے کیا زاغ شوخ چشم ٭ سمجھا ہے اپنی شاخِ نشیمن ہرن کی شاخ

اِس پیچیدہ بیانی پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ آنکھ ہرن ہے، ابرو اُس کی شاخ، اُس

بیاض کو دوبارہ دیکھیں تو انھیں یقیناً اپنے پہلے نظریے میں ترمیم کی ضرورت محسوس ہوگی کہ ہم نے ضمناً کئی ایسی غزلوں کو آزاد کی تصنیف ثابت کر دیا ہے، جو بہ قولِ مرتّب ذوق کے قلم سے ہیں۔ یہی حال اس غزل کا بھی ہے۔ اگر یہ خود ذوق کے قلم سے لکھی ہوئی تھی تو اسے انہوں نے اُس حصّے میں کیوں شامل کیا جس کے راوی صرف آزاد ہیں۔ اِس سے زیادہ پریشان کُن مسئلہ یہ ہے کہ کلیات کے مقدّمے میں جہاں اُنھوں نے اِس غزل کی نشاندہی کی ہے اور اسے بہ قلمِ ذوق کہا ہے، وہاں اشعار کی تعداد ۲۱ لکھی ہے (یہ ایک بار نہیں دو بار ہوا ہے اِس لیے کتابت کی غلطی نہیں ہو سکتی۔ پاکستانی اڈیشن میں تعدادِ اشعار کے ساتھ ساتھ بیاض کے صفحے کا نمبر بھی ہے۔ ہندستانی اڈیشن میں مقدمہ غالباً دوبارہ لکھا گیا ہے اور اُس میں صرف تعدادِ اشعار پر ہی کفایت کی ہے۔ لیکن متن میں کُل سات شعر ہیں۔ آخر اُنھوں نے چودہ شعر کیوں چھوڑ دیئے؟ اس پر مُستزاد یہ کہ حصّہ اوّل کے حواشی لکھے ہیں جن میں ماخذ اور اختلافِ نسخ کی نشاندہی کی گئی ہے، لیکن حصّہ دوم کے حواشی لکھے ہی نہیں گئے۔ البتہ پاکستانی اڈیشن میں جو پہلا ضمیمہ ہے اُس میں دیوانِ ذوق مسودۂ آزاد پر نظر ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ آزاد نے کہاں کہاں ترمیم کی ہے یا کاغذ چپکا کر متن دوبارہ لکھا یا کہاں کہاں قطع بُرید کی ہے۔ اس ضمیمے میں اور سب کچھ ہے لیکن غزلِ زیرِ بحث کا ذکر نہیں۔ جس کا مطلب ہے اس میں آزاد نے کوئی ترمیم و تنسیخ نہیں کی۔ اگر یہ دُرست ہے، تو متن میں ۲۱ شعر ہونا چاہیے تھے لیکن ایسا نہیں ہے۔ سیب ۹ (کلیات کے پاکستانی اڈیشن میں مرتّب نے ایک جگہ حاشیے میں یہ اطلاع بھی ہے کہ اس غزل کے دس شعروں کی تصدیق نسخۂ ویران سے ہو جاتی ہے۔ پھر بھی انہوں نے کُل سات شعر کلیات میں شامل کیے لیکن اس کا سبب نہ لکھا۔ حواشی میں نسخۂ ویران کی طرف اشارہ تک نہیں آخر اسے کیا سمجھا جائے) اب ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں جس سے ہم یہ جان سکیں کہ جو ۱۴ شعر شاملِ اشاعت نہیں کیے گئے وہ کون سے تھے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ آزاد نے اس غزل پر نوٹ میں غزل کے علاوہ قصیدے کی بات بھی کی ہے اور اشعار بھی صرف قصیدے ہی کے درج کیے ہیں، غزل کا ایک بھی نہیں (البتہ گریز میں تخلّص آگیا ہے اور دُعائیہ میں بھی، جس سے دو الگ الگ غزلوں کا دھوکا ہوتا ہے)

سات شعر سے آزاد کا سیر قوافی غزل کہنے کا بیان غلط ٹھہرتا ہے۔ ۲۱ شعر سے اس

قوانی میں ناسخؔ نے اپنی پختگی ہی کے زمانے میں غزل کہی ہوگی۔ بہر حال اُس کی تصنیف ۱۲۲۱ھ سے پہلے کسی طرح ممکن نہیں (اس لیے کہ یہ آتشؔ کی غزل سے متاثر ہو کر کہی گئی۔ شہرت اور اپنی اُستادی کا لوہا منوانے کے لیے مشکل زمینوں میں اور اساتذہ کی غزلوں پر غزلیں کہنا ایک طرح سے محک و معیار تھا۔ ناسخؔ نے بھی یہی کیا۔ اس کا مزید ثبوت ہے کہ انشاؔ نے دو غزلہ کہا۔ ناسخؔ نے بھی دو غزلہ کہا۔ تعدادِ اشعار بھی وہی ہے۔ بہ ظاہر آزاد کو اس کا علم نہیں ورنہ وہ اس کی وضاحت ضرور کرتے کہ ناسخؔ کی کون سی غزل شہیدیؔ نے پڑھی تھی)
اب اگر شہیدیؔ نے زمانۂ تصنیف ہی میں غزل سُنی ہو (جو حالات کے پیشِ نظر ممکن نہیں) تو بھی اس کا دلی پہنچنا ۱۲۲۲ھ سے پہلے ممکن نہیں۔ اب جو غزل عبداللہ خاں کی وفات کے بعد وجود میں آئی ہو اُس پر معرکہ کیا اور مشاعرہ کیسا؟

اب آیئے دیوان میں اس غزل کی موجودگی کی طرف۔ اگر بہت اکھڑ لہجہ استعمال کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ خود آزاد نے تصنیف کر کے دیوان میں شامل کر دی، لیکن اس سلسلے میں کچھ اُلجھنیں بھی ہیں۔ پہلے اُن کی طرف توجہ ضروری ہے۔

مرتبِ کلیات نے مبینہ غزل کو کلیات کے پاکستانی اور ہندستانی دونوں اڈیشنوں میں شامل کیا ہے، لیکن صرف سات شعر۔ اُن میں ایک بھی مطلع نہیں۔ قاعدے سے اِسے ردیف خ میں ہونا چاہیے تھا، لیکن غزل مذکور ردیف ج کے تحت جو شعر ہیں اُن کے نیچے خط کھینچ کر شروع کر دی ہے۔ اُس کے بعد پھر ایک خط کھینچ کر ردیف د کا ایک شعر درج کیا ہے۔ اُس کے بعد ردیف ر کا عنوان ہے اور اُس کے تحت ر کی غزلیں ہیں؛ آخر کیوں؟ شاید یہ لغزش ہے۔ بہر حال کلیات کو دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصّے میں اُس کلام کو جگہ لی ہے جو دیگر ماٰخذ میں بھی موجود ہے۔ حصۂ دوم میں صرف وہ کلام ہے جس کے راوی صرف آزاد ہیں، اور یہ سات شعر اسی حصّے میں درج ہیں۔ گویا اس کے راوی صرف آزاد ہیں۔ مرتب نے اِس غزل کا ماٰخذ "بیاض" کو بتایا ہے اور ان کے خیال میں یہ وہ بیاض ہے جو آزاد دلی سے لے کر نکلے تھے۔ "یہ خود ذوقؔ کی بیاض ہے اور اِس میں بیشتر کلام ذوقؔ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔" مگر ہمارے خیال میں یہ قیاس مشکوک ہے۔ مرتب نے اِس بیاض کو اپنی طالب علمی کے زمانے میں (جب وہ پی۔ ایچ۔ ڈی کے اسکالر تھے) آغا باقر مرحوم کی تحویل میں دیکھا تھا، اور یہ رائے اُسی وقت قائم کی تھی۔ اگر وہ اُس

صرف عمدۂ منتخبہ میں ان کے متعلق ایک جملہ مل سکا ہے: "حفیظ تخلص، نام معلوم نیست، شاعرے ست در حیدرآباد، یک مطلع از وبہم رسیدہ"۔ اب بقیہ واقعے کی طرف آئیے۔

۱۔ شیخ حفیظ ایسے گم نام شاعر کے لیے شہیدی کا یہ کہنا کیوں کر ممکن ہے کہ آج تین شیخ ہیں ... شیخ حفیظ دکن میں۔

۲۔ شہیدی ذوق کے خواجہ تاش ہیں اور ناسخ سے رنجیدہ۔ وہ ناسخ کی تعریف کیوں کر کر سکتے تھے؟

۳۔ یہ سارے معاملے عبداللہ خاں مشتاق کی وساطت سے پیش آئے۔ عبداللہ خاں کا انتقال ۱۲۲۱ھ سے پہلے ہو چکا تھا، تاہم جنھوں نے عبداللہ خاں کے انتقال کا زمانہ بتایا ہے، ۱۲۲۱ میں ذوق کو نومشق بتاتے ہیں گویا ابھی ان کی شاعری گھٹنیوں چلتی تھی۔ آن کی شاعری کی جوانی کو ابھی کئی سال درکار تھے۔ ایک نومشق کا یہ دعویٰ مضحک ہے کہ قوافی کو (اور مضامین کو بھی) جس طرح اُس نے باندھ دیا ہے "کوئی اس سے بڑھ کر باندھے گا تو پھر میں دیکھوں گا۔"

آب اور دیوان کے بیانوں میں دیگر تضادات کو فی الوقت نظر انداز کر کے ہم براہِ راست غزل کی طرف آتے ہیں۔ ہرن کی شاخ، یاسمن کی شاخ کی زمین میں ناسخ کی غزل شہیدی نے سنائی۔ (ظاہر ہے زبانی) ایسی معرکۃ الآرا غزل خود آزاد نے آب میں منتخب نہیں کی۔ گویا اُس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ یا تو یہ کہیے ناسخ نے تب تک اس زمین میں غزل نہیں کہی تھی یا اُس میں کوئی شعر قابلِ انتخاب نہیں تھا۔ سوال یہ ہے کہ ناسخ نے غزلِ مذکور کب کہی؟ اس زمین میں انشا کا دوغزلہ موجود ہے اور اس کی تصنیف ۱۲۲۲ھ کے بعد کی نہیں (یہ کلام انشا کے اکثر نسخوں میں نہیں ہے البتہ اُس نسخے میں ہے جس کا متن ۱۲۲۱ھ تک اور حواشی ۱۲۲۳ تک لکھے جا چکے تھے۔) یہ دور ناسخ کا ابتدائی دور ہے اگرچہ ۱۲۲۴ھ تک بہ قولِ مصحفی انھوں نے اپنا منفرد اسلوب پیدا کر لیا تھا (دیباچہ دیوانِ ششم) اس کے باوجود اُس وقت ناسخ مشاعروں میں شعر نہیں پڑھتے تھے اور ان کی شہرت خود اُن کے محدود حلقۂ احباب سے آگے نہیں بڑھی۔ ان کی شہرت مرزا حاجی قمر کے مشاعروں میں شرکت سے شروع ہوئی۔ یہ زمانہ ۱۲۲۹ - ۱۲۳۰ کا ہے۔ ناسخ کی غزل دیوانِ اول میں ہے جس کی ترتیب ۱۲۳۲ھ میں ہوئی (دیوان ناسخ، تاریخ ہے۔) ظاہر ہے کہ اُن مشکل

شمار می آید۔ پارۂ جفر و رمل می دانست۔ ہوسِ کیمیا سازی بسیار داشت۔ اکثر خطوط را چوں خطِ زیبا و دل آویز۔ می نگاشت۔" آخری جملوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۴۸ - ۱۲۵۰ میں مشتاق زندہ نہیں تھے۔ (بہ قولِ آزاد شہیدی بہ لباسِ فقیری دلّی آئے تھے اور مزاج کی مناسبت نے نواب بھی طلایا۔ ایک ہوسِ کیمیا سازی میں گرفتار، دوسرا وارستہ مزاج اور آزاد، پھر مناسبتِ مزاج کیسی؟) عمدۂ منتخبہ میں ہے: "مشتاق تخلص، عبداللہ خاں نام، قوم افغان، اصلش از ایران است۔ خود تولد دریں جا گرفتہ۔ مُشارٌالیہ در سلکِ شعرائے حضور والا بود۔ بہ خطاب مشتاق علی خاں سرفراز گشتہ۔ در علمِ جفر و رمل و ہوسی مہارتے داشت۔ خط نستعلیق و ثلث و شفیعا خوب می نوشت... قریب ہفت سال شدہ کہ بہ جوارِ رحمتِ حق پیوست۔" عمدہ کی پہلی روایت ۱۲۱۹ اور دوسری ۱۲۲۴ھ تک مکمل ہو چکی تھی۔ اضافے ۱۲۴۶ تک ہوتے رہے۔ اب یہ کہنا مشکل ہے کہ مشتاق کا حال کب داخلِ تذکرہ ہوا۔ اگر شروع میں ہوا تو ان کا انتقال ۱۲۱۲ کے آس پاس ہونا چاہیے لیکن تذکرۂ ہندی (تکمیل ۱۲۰۹ھ) میں مصحفی نے لکھا: "عبداللہ خاں ولد ابوالحسن خاں المتخلص بہ مشتاق، قوم افغان یوسف زئی... بقوش جد و پدرش ہر دو شاعر بودند... خانِ مذکور از حضورِ معلّٰی حضرت ظلِّ سبحانی مشتاق علی خاں خطاب یافتہ۔ منصبِ پانصدی ذات و جاگیر ممتاز است و بہ اُستادیِ مرزا فرخندہ بخت بہادر مامور... در ابتدائے فکرِ سخن در الہ آباد شعرے خود را بہ شاہ محمد حیرت الہ آبادی نمودہ، در شاہجہان آباد از میر محمد تقی استفادہ نمودہ۔" مصحفی نے کئی باتیں نئی لکھی ہیں۔ وہ ذاتی طور پر مشتاق سے واقف ہیں۔ بہر حال ۱۲۱۴ھ تک مشتاق زندہ تھے (مصحفی نے صرف دو جگہ اضافہ کیا ہے اور وہ ۱۲۱۳ - ۱۲۱۴ھ کے بعد کا نہیں) اب یہ طے ہوا کہ مشتاق کا انتقال ۱۲۱۴ - ۱۲۲۴ کے درمیان ہوا ہوگا۔ خوش قسمتی سے قاسم نے مجموعۂ نغز میں مشتاق کا ذکر کیا ہے: "عبداللہ خاں، رحمۃ اللہ المنان کہ از پیش گاہِ خلافت بہ مشتاق علی خاں و در خواصانِ حضورِ پُر نور منسلک بود، و در زمرۂ شعرائے پائے تختِ خاقانی سرِ امتیاز باسمان می سود... سودائے خام ہوسی در سری بخت و ناں ہوس بہ تلاشِ نباتاتِ اکسیر بہ صحرا و دشت و جبل می رفت... از چندے داعیِ حق را لبیک گویاں اجابت فرمود۔ و بجوارِ رحمتِ ایزدی جا نمودہ...." معلوم ہوا کہ مشتاق کا انتقال ۱۲۲۱ سے کچھ پہلے (ذوق کے آغازِ شعر گوئی سے پہلے؟) ہو چکا تھا۔

تیسری شخصیت شیخ حفیظ سے متعلق ہماری معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ فی الوقت

آزادانہ زندگی بسر کرتے تھے اور گاہ گاہ دہلی آتے رہتے تھے۔ لیکن زمانے کا تعین نہیں ہوتا۔
خوش معرکۂ زیبا میں لکھا ہے "شاعرِ مُنتہی کرامت علی خاں شہیدی، ساکن بریلی، اگرچہ شاگردی اس کی مفصل معلوم نہیں لیکن شعرائے رام پور اور بریلی میں (اس کو) لکھا جاتا ہے۔ ایک مدت ہوئی عازم بیت اللہ کا ہوا تھا۔ پھر حال اس کا ظاہر نہ ہوا یا سایلِ مرگ کا لبیک گویا ہوا۔" (خوش معرکۂ زیبا ۱۲۶۲ھ) مرتب شمیم انہونوی نے حاشیے میں اضافہ کیا ہے کہ "... ضلع اُنّاؤ اودھ کے رہنے والے تھے۔ جوانی میں لکھنؤ گئے۔ شیخ ناسخ سے ملاقات کرنا چاہی لیکن وہ نہ ملے۔ جس سے بہت آزردہ ہو کر واپس چلے آئے۔ لوگوں نے ان کو شیخ ناسخ کا شاگرد مشہور کیا۔ صاحبِ خم خانۂ جاوید نے ان کو ابتدا میں مصحفی کا شاگرد اور بعد کو شاہ نصیر دہلوی کا بھی شاگرد بنایا ہے۔" یہ اضافہ خُم خانۂ جاوید سے ماخوذ ہے۔ خُم خانہ میں یہ بھی ہے کہ وہ ۱۲۵۵ھ میں حجاز گئے تھے "۴، صفر ۱۲۵۶ کو مدینہ کے قرب و جوار میں تھے کہ... رحلت فرمائی۔" اس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ وہ ناسخ سے آزردہ تھے اور لوگ انھیں ناسخ کا شاگرد مشہور کرتے تھے۔ نیز یہ کہ انھیں شاہ نصیر کے شاگردوں میں بھی شمار کیا جاتا ہے۔ دوسری یہ کہ اُن کا انتقال ۱۲۵۶ھ میں ہوا۔ اس سے دو نتیجے نکالے جا سکتے ہیں، (۱) یہ کہ اگر آزاد کا بیٔنہ واقعہ صحیح ہے تو اُسے ۱۲۵۶ھ سے پہلے پیش آنا چاہیے۔ (۲) اور اگر یہ ٹھیک ہے کہ وہ شاہ نصیر کے شاگرد تھے اور ناسخ سے رنجیدہ تو ذوق کے خواجہ تاش ہوئے اور کہ وہ ناسخ کی تعریف کر سکتے تھے اور نہ ذوق کو چیلنج۔

جلوۂ خضر میں ہے کہ "شہیدی (کرامت علی لکھنوی) ولد عبدالرسول خاں۔ یہ بڑے عروضی تھے اور مصحفی کے شاگردِ رشید (یہ درست نہیں، مصحفی کے کسی تذکرے میں ان کا ذکر نہیں) اور سخن شعرا میں شاہ نصیر کا شاگرد بھی لکھا ہے... انھوں نے اپنی زبان کو ناسخ کے طرز پر بدلا اور کلام کا انداز جرأت کے طرز پر رکھا... انتقال ان کا ۴ صفر ۱۲۵۶ ہجری مدینہ منورہ میں روبروئے روضۂ اقدس رسول صلعم ایک نظر دیکھ کر ہوا۔" اس سے دو باتیں طے ہو گئیں۔ یعنی ان کا انتقال ۱۲۵۶ میں ہوا اور یہ کہ سخن شعرا کی سند سے شاگردیِ شاہ نصیر ثابت ہوئی۔

اب آیئے عبداللہ خاں کی طرف۔ دیوان میں آزاد نے "خود بھی اچھا کہتے تھے" لکھ کر ان کے شاعر ہونے کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ ایک بار پھر رجوع بہ گلشنِ بے خار "مشتاق تخلص، عبداللہ خاں، المخاطب بہ مشتاق علی خاں، ایرانی نژاد است۔ بزمرۂ شعرائے پایۂ تخت

کو تیسرا درجہ دینے کا کیا باعث ہے۔ شہیدی نے شیخ ناسخ کی بہت تعریف کی اور شاگ کی غزل سنا کر کہا۔ اس غزل پر آج کون قلم اُٹھا سکتا ہے۔ نواب با اخلاق اُس وقت تو چپ ہو رہے مگر پھر اُستاد کو بلایا، حال بیان کیا اور غزل کی فرمایش کی۔ اُستاد نے کہا کیا حاصل! عبث کاوش ہے اور انجام کاہش ہے۔ جب نواب نے اصرار کیا تو اُستاد نے غزل کہہ کر مع قصیدہ جلسۂ خاص میں سُنائی اور خلوت میں اتنا بھی کہا کہ اِن قوافی کو اور ان کے مضامین کو دیکھیے جو ان سے بڑھ کر کہے گا تو پھر میں دیکھ لوں گا۔ نواب نے کہا ایک مشاعرہ کرتے ہیں، اس میں پڑھیے۔ (پہلے جلسۂ خاص میں قصیدہ اور غزل سنائی تو اس وقت شہیدی کہاں تھے؟) یہ سُن کر شہیدی مرحوم دہلی سے روانہ ہو گئے (گویا جس وقت نواب نے مشاعرے کی تجویز کی تھی اس وقت شہیدی موجود تھے، ورنہ سنتے کیسے؟) نواب نے سُن کر آدمی دوڑایا۔ وہ بریلی جا پہنچے تھے۔ آدمی نے جا کر پیغام پہنچایا اور ناکام پھر آیا۔ قسمت سے اُس زمانے کا ایک مسودہ میرے ہاتھ آ گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس پر نظرِ ثانی نہیں ہوئی۔ خیر یادگار تو ہے۔

دونوں بیانوں کا موازنہ کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی حد تک اشتراکِ مفہوم کے باوجود پوری عبارت ازسرِنو لکھی گئی ہے۔ خط کشیدہ الفاظ اور جملے پہلی بار دیوان میں ملتے ہیں۔ آبِ حیات میں نہیں تھے۔ آزاد نے سابقہ بیان میں اضافہ بھی کیا ہے اور اسے مربوط بنانے کی کوشش بھی کی ہے۔ حسبِ عادت یہاں بھی روایت اور شہادت کے لیے معتبر لوگوں کو چُنتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اُن کے بیان پر شُبہ نہیں ہوتا۔ خود مولانا کو بھی اس کا یقین تھا ورنہ یہ کہانیاں نہ بناتے۔ بہرحال مُندرجہ بالا بیان میں بہت سی باتیں پہلی بار کہی گئی ہیں۔ پہلے شہیدی دلی آئے تھے اور اب بہ لباسِ فقیری آئے۔ لیکن ایک فقیر کو بھگوڑا بناتے وقت آزاد کو یہ تضاد نظر نہیں آیا کہ واقعہ فقیروں کے مزاج سے بعید ہے۔ اس سے پہلے کہ غزلِ مذکور پر کچھ کہا جائے متعلقہ شخصیتوں کو دیکھ لیں کہ کون تھے، کیا تھے۔

شہیدی: "شہیدی تخلص کرامت علی نام باشندۂ لکھنؤ، طبع خوشے وارد و در عروض دستگاہی معقول و در حساب مکانتی مقبول۔ در بلادِ پنجاب و گجرات بیشتر بسر بُردہ۔ گاہ گاہ بدہلی وارد شدہ۔ ہنگامِ ورودِ دہلی بار اقم آثم بارہا برخوردہ۔ مردِ بے تکلف و وارستہ مزاج و وسیع المشرب است۔ آزادانہ میزید" (گلشنِ بے خار ۱۲۴۸-۱۲۵۰) معلوم ہوا شہیدی

آزادانہ زندگی بسر کرتے تھے اور گاہ گاہ دہلی آتے رہتے تھے۔ لیکن زمانے کا تعین نہیں ہوتا۔

خوش معرکۂ زیبا میں لکھا ہے "شاعر منتہی کرامت علی خاں شہیدی، ساکن بریلی، اگرچہ شاگردی اس کی منفصل معلوم نہیں لیکن شعرائے رام پور اور بریلی میں (اس کو) لکھا جاتا ہے۔ ایک مدت ہوئی عازم بیت اللہ کا ہوا تھا۔ پھر حال اس کا ظاہر نہ ہوا یا سایلِ مرگ کا لبیک گویا ہوا۔"

(خوش معرکۂ زیبا ۱۲۶۲ھ) مرتب شمیم انہونوی نے حاشیے میں اضافہ کیا ہے کہ "... ضلع اناؤ اودھ کے رہنے والے تھے۔ جوانی میں لکھنؤ گئے۔ شیخ ناسخ سے ملاقات کرنا چاہی لیکن وہ نہ ملے۔ جس سے بہت آزردہ ہو کر واپس چلے آئے۔ لوگوں نے ان کو شیخ ناسخ کا شاگرد مشہور کیا۔ صاحب خم خانۂ جاوید نے ان کو ابتدا میں مصحفی کا شاگرد اور بعد کو شاہ نصیر دہلوی کا بھی شاگرد بنایا ہے۔" یہ اضافہ خم خانۂ جاوید سے ماخوذ ہے۔ خم خانہ میں یہ بھی ہے کہ وہ ۱۲۵۵ھ میں حجاز گئے تھے "۴ رصفر ۱۲۵۶ کو مدینہ کے قرب وجوار میں تھے کہ... رحلت فرمائی۔" اس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ وہ ناسخ سے آزردہ تھے اور لوگ انھیں ناسخ کا شاگرد مشہور کرتے تھے۔ نیز یہ کہ انھیں شاہ نصیر کے شاگردوں میں بھی شمار کیا جاتا ہے۔ دوسری یہ کہ اُن کا انتقال ۱۲۵۶ھ میں ہوا۔ اس سے دو نتیجے نکالے جا سکتے ہیں؛ (۱) یہ کہ اگر آزاد کا بیت واقعہ صحیح ہے تو اُسے ۱۲۵۶ھ سے پہلے پیش آنا چاہیے۔ (۲) اور اگر یہ ٹھیک ہے کہ وہ شاہ نصیر کے شاگرد تھے اور ناسخ سے رنجیدہ تو ذوق کے خواجہ تاش ہوئے اور کہ وہ ناسخ کی تعریف کر سکتے تھے اور نہ ذوق کو چیلنج۔

جلوۂ خضر میں ہے کہ "شہیدی (کرامت علی لکھنوی) ولد عبدالرسول خاں۔ یہ بڑے عروضی تھے اور مصحفی کے شاگرد رشید (یہ درست نہیں مصحفی کے کسی تذکرے میں ان کا ذکر نہیں) اور سخن شعرا میں شاہ نصیر کا شاگرد بھی لکھا ہے... انھوں نے اپنی زبان کو ناسخ کے طرز پر بدلا اور کلام کا انداز جرأت کے طرز پر رکھا... انتقال ان کا ۴ رصفر ۱۲۵۶ ہجری مدینہ منورہ میں روبروئے روضۂ اقدس رسول صلعم ایک نظر دیکھ کر ہوا۔" اس سے دو باتیں طے ہو گئیں۔ یعنی ان کا انتقال ۱۲۵۶ میں ہوا اور یہ کہ سخن شعرا کی سند سے شاگردی شاہ نصیر ثابت ہوئی۔

اب آیئے عبداللہ خاں کی طرف۔ دیوان میں آزاد نے " خود بھی اچھا کہتے تھے" لکھ کر ان کے شاعر ہونے کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ ایک بار پھر رجوع بہ گلشن بے خار "مشتاق تخلص عبداللہ خاں، المخاطب بہ مشتاق علی خاں، ایرانی نژاد است۔ بزمرۂ شعرائے پایۂ تخت

کو تیسرا درجہ دینے کا کیا باعث ہے۔ شہیدی نے شیخ ناسخ کی بہت تعریف کی اور شاخ کی غزل سنا کر کہا۔ اس غزل پر آج کون قلم اُٹھا سکتا ہے۔ نواب باافلاق اُس وقت تو چپ ہو رہے مگر پھر اُستاد کو بلایا، حال بیان کیا اور غزل کی فرمائش کی۔ اُستاد نے کہا کیا حاصل؟ عبث کاوش ہے اور انجام کاہش ہے۔ جب نواب نے اصرار کیا تو اُستاد نے غزل کہہ کر مع قصیدہ جلسۂ خاص میں سُنائی اور خلوت میں اتنا بھی کہا کہ اِن قوافی کو اور ان کے مضامین کو دیکھیے جوان سے بڑھ کر کہے گا تو پھر میں دیکھوں گا۔ نواب نے کہا ایک مشاعرہ کرتے ہیں، اس میں پڑھیے۔ (پہلے جلسۂ خاص میں قصیدہ اور غزل سنائی تو اس وقت شہیدی کہاں تھے؟) یہ سُن کر شہیدی مرحوم دہلی سے روانہ ہو گئے (گویا جس وقت نواب نے مشاعرے کی تجویز کی تھی اس وقت شہیدی موجود تھے، ورنہ سنتے کیسے؟) نواب نے سُن کر آدمی دوڑایا۔ وہ بریلی جا پہنچے تھے۔ آدمی نے جا کر پیغام پہنچایا اور ناکام پھر آیا۔ قسمت سے اُس زمانے کا ایک مسودہ میرے ہاتھ آگیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس پر نظرِ ثانی نہیں ہوئی۔ خیر یادگار تو ہے۔

دونوں بیانوں کا موازنہ کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی حد تک اشتراکِ مفہوم کے باوجود پوری عبارت ازسرِنو لکھی گئی ہے۔ خط کشیدہ الفاظ اور جملے پہلی بار دیوان میں ملتے ہیں۔ آب میں نہیں تھے۔ آزاد نے سابقہ بیان میں اضافہ بھی کیا ہے اور اسے مربوط بنانے کی کوشش بھی کی ہے۔ حسبِ عادت یہاں بھی روایت اور شہادت کے لیے معتبر لوگوں کو چُنا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اُن کے بیان پر شُبہ نہیں ہوتا۔ خود مولانا کو بھی اس کا یقین تھا ورنہ یہ کہانیاں نہ بناتے۔ بہرحال مُندرجہ بالا بیان میں بہت سی باتیں پہلی بار کہی گئی ہیں۔ پہلے شہیدی دِتی آئے تھے اور اب بہ لباسِ فقیری آئے۔ لیکن ایک فقیر کو بھگوڑا بناتے وقت آزاد کو یہ تضاد نظر نہیں آیا کہ واقعہ فقیروں کے مزاج سے بعید ہے۔ اس سے پہلے کہ غزلِ مذکور پر کچھ کہا جائے متعلقہ شخصیتوں کو دیکھ لیں کہ کون تھے، کیا تھے۔

شہیدی: "شہیدی تخلص کرامت علی نام باشندۂ لکھنؤ، طبع خوشے دارد و در عروض دستگاہی معقول و در حساب مکانتی مقبول۔ در بلادِ پنجاب و گجرات بیشتر بسر بُردہ۔ گاہ گاہ بدہلی وارد شدہ۔ ہنگامِ ورودِ دہلی بارا قم آثم بارہا برخوردہ۔ مردِ بے تکلف و وارستہ مزاج و وسیع المشرب است۔ آزادانہ میزید" (گلشنِ بے خار ۱۲۴۸-۱۲۵۰) معلوم ہوا شہیدی

نے اُستاد مرحوم سے کہا۔ انھوں نے اس غزل پر ایک بڑی سیر قوافی غزل کہی اور یہ بھی کہا کہ اب جو کوئی اس طرح میں غزل کہے گا ہر ایک قافیہ کو جس جس پہلو سے میں نے باندھ دیا ہے اس سے اگے کرکے نہ باندھ سکے گا۔ نواب عبداللہ خاں کی فرمائش سے غزل اور انھیں کی وساطت سے یہ گفتگوئیں ہوئیں تھیں۔ انھوں نے تجویز کی کہ مشاعرہ میں برسر معرکہ غزلیں پڑھی جائیں۔ مگر شہیدی مرحوم بے اطلاع چلے گئے۔ نواب نے پیچھے آدمی دوڑایا اُس نے بریلی میں جا پکڑا۔ مگر وہ تشریف نہ لائے۔ غزل مذکور انشاء اللہ شائقین سخن کے ملاحظہ سے گزرے گی۔ خدا دیوان پورا کرے۔

اس بیان میں کئی باتیں غور طلب ہیں۔ ۱، دلی میں صدر الصدور، مفتی صدر الدین آزردہ تھے۔ ۲، ذوق نے سیر قوافی غزل کہی۔ آزاد مطلع تک نقل نہیں کرتے بلکہ غزل ملاحظہ سے گزرے گی "خدا دیوان پورا کرے" کہہ کر گزر جاتے ہیں۔ گویا جب دیوان پورا کریں گے تو اس زمین میں غزل بھی کہہ لیں گے۔ ۳، مولانا کے ذہن پر ہمیشہ معرکہ مسلط رہتا ہے، ورنہ غزل تو صرف ذوق نے کہی تھی، شہیدی مرحوم نے تو ناسخ کی غزل پڑھی تھی۔ کیا ذوق ناسخ کے مقابلے میں غزل پڑھتے ؟۔ ۴، شہیدی مرحوم کو نہ معرکے کی دعوت دی گئی اور نہ ان کے سامنے شاعرہ ہونا طے ہوا۔ پھر اگر وہ چلے گئے تو اُن کے پیچھے آدمی دوڑانے کی کیا تُک تھی شہر بس ہوتے تو ایک بات بھی تھی۔ وہ آدمی بھی خوب تھا جو بریلی تک دوڑا چلا گیا۔ ایسی مضحک کہانی پر خود آزاد بھی یقین نہیں کرسکتے تھے۔ چناں چہ جب انھوں نے "دیوان پورا کیا" تو وہاں مختلف نوٹ لگایا،

> اس غزل کا باعث تحریر یہ ہوا تھا کہ خوانین رام پور میں سے ایک نواب عبداللہ خاں ایک امیر دلی میں رہتے تھے۔ پھر میرٹھ میں صدر الصدور ہو گئے تھے۔ شعر و سخن کے شیدا تھے اور خود بھی اچھا کہتے تھے۔ اُستاد مرحوم کا عالم جوانی اور شاعری بھی جوان تھی۔ اکثر شعرا کی نشست نواب کے ہاں رہتی تھی۔ اُستاد کی ان سے شناسائی تھی مگر وہ انھیں اُستاد مانتے تھے۔ (عبداللہ خاں ذوق کو یا ذوق عبداللہ خاں کو اُستاد مانتے تھے ؟) شہیدی مرحوم بہ لباس فقیری دلی میں آئے اور مناسبت طبع نے نواب سے بھی ملا دیا۔ اپنے شعر سنائے اور اثنائے گفتگو میں کہا کہ معاصرانِ سخن کے نزدیک آج فنِ شعر میں تین شیخ ہیں۔ شیخ ناسخ لکھنؤ میں، شیخ حفیظ دکن میں، شیخ ابراہیم ذوق دہلی میں۔ نواب صاحب نے کہا کہ شیخ ابراہیم ذوق

سکتے تھے؟ یہ تو ایسا ہے جیسے کوئی اُستاد اپنے مُبتدی شاگرد کو اصلاح دے۔ خیر چھوڑیے۔ یہ سب اُلٹ پھیر آزاد کے ذہن کی اُپج ہے۔ ۱۹۲۱ھ کی ایک بیاض میں جس کے مرتب شاہ بہاالدین ہیں (مرتبِ کلیات کا خیال ہے کہ یہ شاہ بہاالدین بشیر بنیرۂ شاہ نصیر ہو سکتے ہیں) مندرجہ بالا شعر نقل کرنے کے بعد اصلاحِ مُنیر کے عنوان سے یہ شعر درج ہے ۔ بادام دو جو بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کر؛ ایما یہ ہے کہ بھیج دے آنکھیں نکال کر۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ نسخۂ ویران میں شعرِ ہذا کی یہی قرأت ملتی ہے۔ گویا ذوق نے یہ اصلاح قبول کر لی تھی۔

۴۵۔ "تیلیاں" والے مشاعرے کا معرکہ آزاد نے حاشیہ چڑھا کر بلکہ غلط رنگ میں پیش کیا ہے، اور عاصی کا شعر عمداً مُنیر کے نام سے نقل کر دیا ہے۔ اگرچہ حاشیے میں یہ بھی کہا ہے کہ "بعض بزرگوں سے سُنا کہ گھنشیام داس عاصی نے پڑھا تھا" اگر یہ بزرگوں سے سُنا تھا تو کیا مُنیر کو خود پڑھتے دیکھا تھا؟ ورنہ مصنّف کا نام بدلنے کی کیا ضرورت تھی۔؟ (کلامِ عاصی میں پوری غزل موجود ہے) مشاعرۂ مذکور منشی فیض پارسا نے قائم کیا تھا جو دلّی کالج میں ریاضی کے اُستاد تھے۔ "گلستانِ سخن" میں، جو معاصر تذکرہ ہے، اُس مشاعرے کی تفصیل موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ نصیر کی غزل سُن کر بعض شاعروں نے اپنے شاگردوں سے اِس زمین میں غزل کہہ کر اگلے مشاعرے میں پڑھوائی۔ (بعض کا اشارہ صریحاً ذوق کی طرف انگشت نُما ہے کیوں کہ صابر نے خیرالدین یاس کا ایک شعر بھی نقل کر دیا ہے جو ذوق کے شاگرد تھے) مولانا آزاد نے گلستانِ سخن کا ذکر تک نہیں کیا، شاید اصلیت کھل جانے کے اندیشے سے۔

۴۶۔ تذکرۂ سرور کے سلسلے میں بیان کی گئی داستان من گھڑنت ہے۔ "دریائے اعظم" تذکرے کی تاریخ نہیں بلکہ مثنوی سبعۂ سیار کی تاریخ ہے (کہ ذوق ایں مثنوی در صفت بحرات بگو تاریخ ہم "دریائے اعظم") لہٰذا فی البدیہہ کہنے کا افسانہ غلط۔

۴۷۔ شہیدی مرحوم دلّی آئے۔ اُمرائے شہر سے ملاقاتیں ہوئیں۔ نواب عبداللہ خاں صدالصدور شعر کے عاشق تھے۔ اُن سے ایک جلسہ میں میاں شہیدی نے کہا کہ آج ہندوستان میں تین شیخ ہیں۔ لکھنؤ میں ناسخ، دلّی میں ذوق، دکن میں حفیظ۔ انھوں نے کہا، ناسخ کی اوّلیت کا سبب؟ جواب میں شہیدی نے چمن کی شاخ، یاسمن کی شاخ، کی غزل پڑھی۔ خان موصوف

جو اُستاد نے باندھا ہے جائز نہیں۔ مگر تجاہل کر کے کہا کہ ہاں حقیقت میں بات کے کڑے کے
کا آپ نے خوب ترجمہ کیا اور استملاے میں ذکر سے میری طرف دیکھ کر ہنسے اور کہا کہ
بھئی واہ شاگرد تھے ہماری بات ہی بگاڑ دی۔

خدا جانے اس قصّے کی تصنیف سے آزاد کا مقصد ذوق کے مطلعے کی خامی پر پردہ ڈالنا ہے یا اپنی
شاگردی کی سند حاصل کرنا؟ ہمیں فی الوقت صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ یہ قصہ بلکہ آدج کا ذکر
تک آبِ حیات کی طبع اوّل میں نہیں تھا۔ یہ سب باتیں آزاد کو طبع دوم کے وقت سوجھیں۔ لہٰذا
انھوں نے آدج سے اپنی شاگردی کی سند حاصل کرلی۔ بھلا ایک فرضی اعتراض دور کرنے
کے لیے خود مل کر شعر سنانے، اعتراض سننے اور پھر جاہلانہ اپنی غلطی کی تاویل پیش کرنے میں
کیا تُک ہے۔

۴۳۔ ایک دفع (دکنا) طبعِ موزوں نے نیا گُل کھلایا....

یہ گُل اس غزل کے لیے ہے جس کا مطلع آبِ حیات میں یہ ہے،

جس ہاتھ میں خاتمِ لعل کی ہے گر اس میں زلفِ سرکش ہو
پھر زلف بنے دستِ موسیٰ جس میں اخگرِ آتش ہو

دیوان میں آزاد نے روایت بدل دی ہے۔ اس اُلٹ پھیر اور نئی ایجاد پر پروفیسر شیرانی مرحوم
تفصیل سے روشنی ڈال چکے ہیں۔ لہٰذا اعادے کی ضرورت نہیں۔ صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ
اس زمین میں منیر کی غزل موجود ہے۔ لہٰذا اس واقعے میں اگر کوئی صداقت ہے تو یہ واقعہ
بہت بعد میں پیش آیا ہوگا۔ یہ ذوق کے آغازِ شعر گوئی کے دور کی غزل نہیں ہے۔

۴۴۔ ایک دفعہ شیخ مرحوم نے مشاعرہ میں غزل پڑھی، مطلع تھا،

نرگس کے پھول بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کر
ایما یہ ہے کہ بھیج دے آنکھیں نکال کر

شاہ صاحب نے کہا میاں ابراہیم پھول بٹوے میں نہیں ہوتے یہ کہو ۔

نرگس کے پھول بھیجے ہیں دونے میں ڈال کر ، انھوں نے کہا۔

دونے میں دکھنا ہوتا ہے ڈالنا نہیں، یوں کہیے ، بادام ہم جو بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کر....

اس واقعے میں ذوق کا لہجہ بہت گستاخانہ ہے جو ایک سعادت مند شاگرد (جیسا کہ آزاد
نے انھیں دکھایا ہے) سے بعید ہے۔ بھلا "یوں کہیے" کا حکم ذوق اپنے اُستاد کو دے

محترم ہیں کم سے کم ایک سلام ضرور کہتے تھے۔ (یہاں آزاد اپنا یہ فقرہ بھول گیا: اکبر شاہ کو شعر سے کچھ رغبت نہیں تھی! شیخ مرحوم بھی اسی کو اپنی سعادت اور عبادت سمجھتے تھے۔
یا دلِ ناخواستہ ایک صنف کے لیے اعتراف کیا بھی کہ کہنے کا موقع نہیں ملا تو اس میں بھی یہ بیخ لگادی کہ شیخ مرحوم بھی اُسی کو اپنی سعادت اور عبادت سمجھتے تھے۔ گویا اس صنف میں جو کچھ بادشاہ نے کہا وہ ذوقؔ کا کہا ہوا ہے (پھر موقع کیوں کر نہ ملا؟ البتہ اپنے نام سے کہنے کا موقع نہ ملا ہوگا۔)

۴۰۔ ہزاروں گیت، ٹپّے، ٹھمریاں، ہولیاں کہیں۔ وہ بادشاہ کے نام سے عالم میں مشہور ہوئیں۔

"ہزاروں" پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اگر کسی ایسی نظم کے طبع اول میں تین شعر تھے تو بعد کو پانچ ہو گئے۔ (شاید "اُستاد" نے آپ کی طبع ثانی کے لیے جنت سے بھجوائے تھے)

۴۱۔ وہ اپنی غزل بادشاہ کو نہ سناتے تھے۔ اگر کسی طرح اس تک پہنچ جاتی (کیا جاسوس لگا رکھے تھے؟) تو وہ اُسی غزل پر خود غزل کہتا تھا۔ اب اگر نئی غزل کہہ کر دیں اور وہ اپنی غزل سے پست ہو تو بادشاہ بچّہ نہ تھا۔ ۷۰ سال کا سخن فہم تھا۔ اگر اس سے چُست کہیں تو اپنے کہے کو آپ مٹانا بھی کچھ آسان کام نہیں۔ ناچار اپنی غزل میں اُن کا تخلص ڈال کر دے دیتے تھے۔ بادشاہ کو بڑا خیال رہتا تھا کہ وہ اپنی چیز پر زور طبع خرچ نہ کریں۔ جب ان کی (؟ کے) شوقِ طبع کو کسی طرف متوجّہ دیکھتا تو برابر غزلوں کا تار باندھ دیتا کہ جوشِ طبع ہو ادھر ہی آجائے۔

مقصد تو اس بیان کا وہی کانٹا ہے جو دلِ آزاد میں ہمیشہ کھٹکتا رہتا ہے کہ بادشاہ کے چار دیوان ہیں اور "اُستاد" کا ایک بھی نہیں لیکن اندازِ بیان کے پیچ نے بادشاہ کے ساتھ ساتھ ذوقؔ کو نہ صرف "پست ہمت" بنا ڈالا بلکہ آدمیت کے رتبے سے بھی گرا دیا۔

۴۲۔ ایک دن میں آوجؔ سے ملا اور اُستاد مرحوم کے مطلع کا ذکر کیا ؎

مقابل اُس رُخِ روشن کے شمع گر ہو جائے ٭ صبا وہ دھول لگائے کہ بس سحر ہو جائے

کئی دن کے بعد جو راستے میں ملے تو دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور کہا:

یاں جو برگِ گُل خورشید کا کھڑکا ہو جائے ٭ دھول دستارِ فلک میں لگے تڑکا ہو جائے

اور کہا دیکھا! محاورہ یوں باندھا کرتے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ طنز کرتے ہیں کہ سحر ہو جائے

اس سے پہلے کہ اس داستان پر تبصرہ کیا جائے، ذوق کے آخری ایام کی یہ تفصیل دیکھ لیجیے :

الغرض جب کہ قصیدۂ تہنیت عید قرباں دربار شاہی میں پڑھا اور حضور پُرنور نے دو جاگیر بطور التمغا نسلاً بعد نسلٍ مرحمت ہوا تو ایک مثنوی مدت ہائے دراز سے ناتمام پڑی تھی اُس کی تکمیل شروع ہوئی۔ اس کی تکمیل ابھی باقی تھی کہ بتاریخ ۱۵ ماہ صفر ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸ اکتوبر (۹ نومبر) سن حال (کذا - ۱۸۵۴ء) عارضۂ بخار میں مبتلا ہوئے۔ تین دن کے بعد بخار سے افاقہ ہو گیا لیکن مرض پیچش کہ عارضۂ معتادان کا تھا، لاحق ہوا..... آخر ۲۲ شب ماہ صفر ۱۲۷۱ شب آخر چہار شنبہ کو پہر رات گئے جان بحق تسلیم کی۔

(دہلی اردو اخبار، بحوالہ ذوق سوانح اور انتقاد)

یہ معاصر بیان ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تکمیلِ مثنوی کی کوشش بالکل آخری دنوں کا واقعہ ہے اب آزاد کے مندرجہ بالا بیان خصوصاً خط کشیدہ جملوں پر غور فرمایئے، حقیقت کھل جائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کہانی آزاد نے ناتمام مثنوی کے اشعار اور اخبار کا بیان دیکھ کر بنائی۔ یہ مثنوی (کُل ۵۰ شعر) نسخۂ ویران میں موجود ہے۔ آزاد نے اپنے مرتبہ دیوان میں نہ صرف اکثر مصرعوں میں لفظی ترامیم روا رکھی ہیں بلکہ موقعے موقعے سے ۲۲ شعر اپنی طرف سے کہہ کر شامل کر دیے ہیں۔ مثنوی بہت معمولی ہے۔ اور اس میں کوئی ایسی خوبی نہیں جن کی فہرست آزاد نے اپنے بیان کے آخر میں ٹانک دی ہے۔ آزاد کو خیال آیا ہوگا کہ اتنا بڑا شاعر اور اس کے کلام میں کوئی مثنوی نہیں سوائے چند شعر کی ناتمام مثنوی کے اور وہ بھی نہایت معمولی۔ گلزار نسیم اور سحر البیان کی شہرت اُن کے سامنے تھی۔ اب ذوق مثنوی کہیں تو اُن سے دو قدم تو آگے ہو۔ چناں چہ انھوں نے مثنوی کا کوئی جُز نہیں چھوڑا جو اس مثنوی میں نہ ہو (بلکہ ایسے اجزا بھی شامل کر لیے جو کسی ایک مثنوی میں دیکھنے میں نہیں آئے) پھر معنوی نزاکتیں، لفظی لطافتیں اور انداز کی شوخیاں اُس پر مستزاد۔ (آزاد نے یہ نہیں سوچا کہ ان کی بنائی ہوئی تصویر میں شوخی کی گنجایش نہیں) اُن سے ذرا چوک ہو گئی کہ انھوں نے دیوان میں نقل کرتے وقت اِسی معمولی مثنوی پر نوٹ چپکا دیا: "یہ وہی مثنوی ہے جو حامد علی خاں مرحوم کی فرمایش سے کہی تھی۔" اگر انھیں اپنا یہ بیان یاد ہوتا کہ خلیفہ اسماعیل کے ساتھ وہ مثنوی بھی گئی، اور اشعار کی تعداد (۵۰۰ سے زیادہ) بھی ذہن میں ہوتی اور اس پر وہ مذکورہ نوٹ نہ لکھتے (ورنہ ۷۰ سے بجائے ۷۲ شعر

تصنیف کرتے) تو ایک ناموجود مثنوی کی بے شمار خوبیاں ذوق کو بڑے مثنوی نگاروں میں شمار کروادیتیں ۔ موجودہ صورت میں آزاد کے سات شعر کے اضافے کے باوجود مثنوی میں کوئی خوبی پیدا نہیں ہوسکی ۔

۳۸ ۔ کئی مخمس تھے ۔ کئی رباعیاں تھیں ۔ صدہا تاریخیں تھیں ۔ تاریخوں کی کمائی بادشاہ کے حصے میں آئی ۔ کیوں کہ بہت بلکہ کُل تاریخیں انھیں کی فرمایش سے ہوئیں اور انھیں کے نام سے ہوئیں ۔

تھوڑی دیر کے لیے مان لیجیے کہ صدہا تاریخیں تھیں اور کُل کمائی بادشاہ کے حصے میں آئی لیکن وہ تاریخیں ہیں کہاں ؟ بادشاہ کے چاروں دیوان تو موجود ہیں ۔ اُن میں صدہا تو کیا " درجن ہا " تاریخیں بھی نہیں ۔ ایک " خانۂ زینت محل " تو صدہا کے برابر نہیں ہوسکتی ۔ شاید آزاد کو یہ یاد نہیں رہا " اے ذوق بگو سہ بار توبہ (اگر یہ تاریخ ذوق نے کہی ہے تو) خود اپنے لیے کہی ہوگی ۔ " دریاے اعظم " سرور کی فرمایش سے تھی ۔ تسبیح زمرد کی دو تاریخیں (ان کا انتساب بھی ذوق سے مشکوک ہے) دیوانِ ذوق میں قطعے کا عنوان توجہ طلب ہے : " اشعار در تاریخ دیوانِ نواب الٰہی بخش خاں معروف " شاید ایسے ہی سہو و اسقام کے پیش نظر محققین نے آزاد کے جنوں کی آڑلی ہے) اگر ذوق نے کہی تھیں تو معروف کی فرمایش سے کہی ہوں گی ۔ اگر مرزا جہانگیر کی شادی کا قصیدہ ذوق نے کہا ہے تو اس میں شامل تاریخ شاہ ظفر کی فرمایش سے نہیں کہی جاسکتی ۔ خود آزاد کا تاریخی نام " ظہور اقبال " اگر واقعی ذوق نے رکھا تھا تو اس میں مولوی باقر یا سپران کی اپنی خواہش کو دخل ہوگا ۔ " علی گڑھ کے ایک فرانسیسی کے خاندانی قبرستان میں ایک لوح مزار پر کندہ " قطعۂ تاریخ اگر شیخ ابراہیم ذوق کا ہے : پرسید چو ذوق سالِ تاریخ وفات ، ہاتف زدر بیخ گفت اے وائے غضب ؛ تو اپنے تعلقات کی بنا پر کہا ہوگا ۔ ٹیلر صاحب (پرنسپل دلی کالج) کی انگلستان روانگی کا قطعہ " کرد عزم انگلستان ٹیلر منصف بجگت " بھی اگر ذوق نے کہا تو مولوی باقر کی فرمایش سے کہا ہوگا کہ ٹیلر ان کے دوست تھے اور انھیں ٹیلر صاحب کے بلوے میں مارے جانے کے صلے میں اُنھیں سؤلی ملی تھی ۔

مخمس بھی دو ایک سے زیادہ نہیں ، محض چند رباعیاں ہیں اور ان میں بھی کچھ الحاق کے شبہے سے بالا نہیں ، تو پھر وہ سیکڑوں ہزاروں اشعار کیا ہوئے ؟

۳۹ ۔ مرثیہ سلام کہنے کا انھیں موقع نہیں ملا ۔ بادشاہ کا قاعدہ تھا کہ شاہ عالم اور اکبر شاہ کی طرح

اِس سے پہلے کہ اِس داستان پر تبصرہ کیا جائے' ذوق کے آخری ایام کی یہ تفصیل دیکھ لیجیے :

الغرض جب کہ قصیدۂ تہنیت عید قُرباں دربارِ شاہی میں پڑھا اور حضور پُر نور سے "جاگیر بطور التمغا نسلاً بعد نسلٍ مرحمت ہُوا تو ایک مثنوی مُدت ہائے دراز سے ناتمام پڑی تھی' اُس کی تکمیل شروع ہوئی ۔ اس کی تکمیل ابھی باقی تھی کہ بتاریخ ۱۵ ماہ صفر ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸ اکتوبر (۹ نومبر) سن حال (کذا ۔ ۱۸۵۴ء) عارضۂ بُخار میں مبتلا ہوئے۔ تین دن کے بعد بُخار سے افاقہ ہو گیا لیکن مرض پیچش کہ عارضۂ معتاد ان کا تھا' لاحق ہوا ۔۔۔ آخر ۲۴ شب ماہ صفر ۱۲۷۱ شب آخر چہار شنبہ کو پہر رات گئے جاں بحق تسلیم کی ۔

(دلی اردو اخبار' بحوالہ ذوق سوانح اور انتقاد)

یہ معاصر بیان ہے ۔ اس سے معلوم ہُوا کہ تکمیلِ مثنوی کی کوشش بالکل آخری دنوں کا واقعہ ہے اب آزاد کے مندرجہ بالا بیان خصوصاً خط کشیدہ جُملوں پر غور فرمایئے' حقیقت کھُل جائے گی ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کہانی آزاد نے ناتمام مثنوی کے اشعار اور اخبار کا بیان دیکھ کر بنائی ۔ یہ مثنوی (کُل ۳۰ شعر) نسخۂ دیوان میں موجُود ہے ۔ آزاد نے اپنے مرتبہ دیوان میں نہ صرف اکثر مصرعوں میں لفظی ترامیم روا رکھی ہیں بلکہ موقعے موقعے سے ۲۸ شعر اپنی طرف سے کہہ کر شامل کر دیے ہیں ۔ مثنوی بہت معمولی ہے ۔ اور اس میں کوئی ایسی خوبی نہیں جن کی فہرست آزاد نے اپنے بیان کے آخر میں ٹانک دی ہے ۔ آزاد کو خیال آیا ہوگا کہ اتنا بڑا شاعر اور اس کے کلام میں کوئی مثنوی نہیں سوائے چند شعر کی ناتمام مثنوی کے اور وہ بھی نہایت معمولی ۔ گلزارِ نسیم اور سحر البیان کی شہرت اُن کے سامنے تھی ۔ اب ذوق مثنوی کہیں تو اُن سے دو قدم تو آگے ہو ۔ چناں چہ انھوں نے مثنوی کا کوئی جُز نہیں چھوڑا جو اس مثنوی میں نہ ہو (بلکہ ایسے اجزا بھی شامل کر لیے جو کسی ایک مثنوی میں دیکھنے میں نہیں آئے) پھر معنوی نزاکتیں' لفظی لطافتیں اور انداز کی شوخیاں اُس پر مستزاد ۔ (آزاد نے یہ نہیں سوچا کہ ان کی بنائی ہوئی تصویر میں شوخی کی گنجایش نہیں) اُن سے ذرا چوک ہو گئی کہ انھوں نے دیوان میں نقل کرتے وقت اِسی معمولی مثنوی پر نوٹ چپکا دیا : "یہ وہی مثنوی ہے جو حامد علی خاں مرحوم کی فرمایش سے کہی تھی ۔" اگر انھیں اپنا یہ بیان یاد ہوتا کہ خلیفہ اسماعیل کے ساتھ وہ مثنوی بھی گئی' اور اشعار کی تعداد (۵۰۰ سے زیادہ) بھی ذہن میں ہوتی اور اس پر وہ مذکورہ نوٹ نہ لکھتے (ورنہ ۷ سے بجائے ۷۰ شعر

اِتفاق کہ اُنھیں دنوں رمضان آگیا۔ اور اِتفاق پر اتفاق یہ کہ بادشاہ نے روزے رکھنے
شروع کیے۔ اس سبب سے غزل کہنی موقوف کردی۔ خیر ان کی زبان کب رہ سکتی تھی۔ اِس
کے علاوہ اِس نئے چمن کی ہُوا کھانے کو جی چاہتا تھا۔ (یہ چمن نیا کیوں کر ہُوا؟ حامد علی خاں
سے آشنائی تو عہدِ شاہی میں ہوئی، عہدِ ولی عہدی میں مرزا سلیم کو شادی کے موقعے
پر کہی ہوئی مثنوی کیا کوئی دوسری صنفِ سخن تھی؟) انھوں نے وہ نامہ لکھنا شروع کیا۔
اس نے ایسا طول کھینچا کہ تخمیناً ۲۰۰ شعر اس کے ہو گئے۔ اِس عرصہ میں تین تختیاں اس
کی سیاہ ہوئیں تھیں۔ مگر اُدھر رمضان ہو چکا تھا۔ بادشاہ کی غزلیں پھر شروع
ہو گئیں۔ مثنوی وہیں رہ گئی۔ بیچ میں کبھی کبھی پھر طبیعت میں اُمنگ اُٹھی۔ مگر کبھی ایک
دن کبھی دو دن۔ ۲۰۔ ۲۵ شعر ہوئے پھر رہ گئی۔ میں نے جب ہوش سنبھالا اور ہر وقت
پاس رہنے لگا تو کئی دفعہ اس کے مُختلف ذکر کرتے اور جا بجا کے شعر پڑھا کرتے تھے۔ ایک
دن وہ تختیاں اور کاغذی مسودے نکلوائے۔ بہت کم تھا جو کچھ کہ پڑھا جاتا تھا (ذوق ایسے
ہی تو بدخط تھے!) آخر فرصت کے وقت نکال نکال کر اُن سے پڑھواتا گیا اور لکھتا گیا
کُل پانچ سو سے زیادہ شعر زیادہ ہوئے۔ اگرچہ نامہ ناتمام تھا مگر ایک ایک مصرع
سونے کے پانی سے لکھنے کے لائق تھا۔ میرے صاف کیے ہوئے مُسوّدے بھی اُنھیں
متفرق غزلوں میں تھے جو خلیفہ صاحب کے پاس جا کر صاف کیا کرتا تھا۔ (کیا غزلوں کے
جُنگ کی کہانی فرضی تھی؟) اس کا نام نامۂ جانسوز تھا۔ اوّل حمد و نعت تھی۔ پھر ساقی نامۂ
پھر القابِ معشوق، اُسی میں اُس کا سراپا، اُس کے بعد یادِ ایّام۔ اُس میں چاروں موسموں
کی بہار، مگر اس کے معنوں کی نزاکت، لفظوں کی لطافت، ترکیبوں کی خوبیاں، اندازوں
کی شوخیاں، سامری کے جادو اور طلسم اس کے آگے دُھواں ہو کر اُڑے جاتے تھے۔

۱

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ سے آگے

مدحِ حاضر کے لیے حاضرِ دربار ہو ذوق ٭ تو ہے خاقانیِ ہند اور وہ ہے خاقانِ زماں
(یاد رہے کہ مرزا سلیم کی شادی کے موقع پر بہ قولِ آزاد، ذوق نے صرف مثنوی کہی تھی) ہے یوں کہ قصیدے
تصنیف کرتے وقت آزاد کو یہ خیال نہیں ہو سکتا تھا کیوں کہ وہ تو ذوق کو ۱۹ برس کی عمر میں خاقانیِ ہند بنوا چکے تھے جو
۱۲۲۲ (اور آزاد کے حساب سے ۱۲۲۳) تھا۔

تھی۔ بادشاہ کی متواتر فرمائشیں یہاں ایسے کاموں کے لیے کب فرصت دیتی تھیں۔ مگر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ سے آگے) "ذوق سوانح اور انتقاد" لکھی تو قصیدہ مذکور کے دو شعر نقل کرنے کے بعد لکھا: "اس شعر سے قصیدے کی پیش کش کی تاریخ نکلتی ہے ،

۳۲

کہوں لبِ بستہ سے شادیِ فرزند ؛ مبارک آپ کو ہو اے شہِ سپہر وقار

۱۱۹۳ ۱۲۲۵

(ہمیں متعلقہ کتبِ تواریخ باوجود کوشش کے نہیں مل سکیں ورنہ شادی کے صحیح سنہ کا علم ہوجاتا)

اور اس پر حاشیہ لکھا: "تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو بہادر شاہ ظفر' ص ۴۷۔ مگر اس موقع پر مولوی امراحمد صاحب کا یہ خیال صحیح نہیں کہ ذوق اس قصیدے کو پیش کرنے سے پہلے خاقانیِ ہند بنائے جاچکے تھے۔" تاہم مرتب نے یہ نتیجہ تو نکال ہی لیا کہ ذوق ۱۲۲۵ تک قلعے میں پہنچ چکے تھے۔ لیکن انھوں نے تاریخی شعر کی ناموزونیت اور مصرعے کی غیر معقولیت پر توجہ نہیں دی۔ اوّل تو موجودہ صورت میں مصرعِ اولیٰ ناموزوں ہے۔ لب بستہ کے ۳۲ عدد کس حساب سے ہوں گے ؟ دیوان مرتبہ آزاد میں مصرعِ اوّل یوں ہے ، کہو مرلبِ بستہ سے شادیِ فرزند اب اگر "لب بستہ" کو ایک لغت فرض کیا جائے اور لب کو اُس کا سر (جو غلط ہے) تو لب کے ۳۲ عدد ہوں گے اور مصرعِ ثانی کے ۱۱۹۳۔ اس طرح ۳۲ + ۱۱۹۳ = ۱۲۲۵ ہوں گے۔ تاریخ کہنے کے لیے کوئی اشارہ ضرور کیا جاتا ہے جو اس شعر یا پورے قصیدے میں موجود نہیں۔ (عموماً تاریخ آخری شعر یا مصرعے سے نکالی جاتی ہے۔ یہاں اس کے بعد ایک شعر اور ہے) اب اگر یہ مانیں کہ ۱۲۲۵ میں یہ قصیدہ ذوق نے کہا تھا تو ان غلط اور مضحک اشعار کی کیا توجیہ ہوگی ؛

ہے اُس کے نام کا لینا بھی یوں تو بے ادبی ؛ کہ چشم پاس نہ دریا نہ ابرِ گوہر بار

سو میں زباں کو گیا لے کے دل کے دریا میں ؛ مذاقِ آبِ گہر میں ہلا لیا کئی بار

پہلا مصرع لغو ہے۔ آزاد یہ کہنا چاہتے ہیں کہ بے وضو اُس کا نام لینا بے ادبی ہے (یہ مضمون آزاد نے اپنے نام سے کہے ہوئے ایک اور قصیدے میں باندھا ہے) دوسرے مصرع میں ابر کی اِضافت خود مصنف کی لگائی ہوئی ہے۔ اگر ابر بے اِضافت ہوتا تو پانی کا حصول ممکن تھا لیکن ابر سے وضو کیوں کر ہوگا ؟ آخری مصرعے میں "مذاقِ آبِ گہر" میں ہلانا کیا ؟ آبِ گہر میں بھی ہلانا اگرچہ ممکن نہیں مگر تھوڑی دیر کے لیے دُرست مان لیجیے۔ تاہم "مذاق" میں زبان ہلا لینا صرف آزاد ہی سے ممکن تھا۔ کیا ذوق اس مصرع بے ربطی اور "مہملیت" سے بے خبر تھے ؟ اور آخری یہ کہ اگر صاحبِ "ذوق سوانح اور انتقاد" کی یہ رائے تسلیم کر لی جائے کہ ذوق کا اس سے پہلے خاقانیِ ہند بنا دیا جانا صحیح نہیں تو پھر شہزادہ سلیم کی شادی والے قصیدے کے اس شعر کی کیا توجیہ ہوگی ؛ (باقی اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ سے) کی شادی پر پیش کیا گیا قصیدہ کسی معاصر یا مابعد تذکرے میں موجود نہیں، بلکہ اس کا ذکر تک نہیں۔ (۲) مرزا جہانگیر کی شادی ۱۲۲۵ کے آس پاس ہوئی۔ اُس وقت تک ذوق کا قصیدہ کہنا مشکوک ہے (۳) ذوق ۱۲۳۰ - ۱۲۳۱ کے درمیان کسی وقت دربارِ ولی عہدی سے متوسل ہوئے ہوں گے۔ اس سے پہلے اس امر کا کوئی ثبوت نہیں۔ (۴) دیوان میں قصیدے کا عنوان قصیدہ ۲ ہے۔ آزاد نے پہلے لکھا ہے: "اس قصیدے پر بھی نظرِ ثانی نہیں ہوئی۔ اکبر شاہ مرحوم کی تعریف میں ہے۔" اس میں مرزا جہانگیر کی شادی کی تہنیت کا ذکر نہیں لیکن چند شعر کہنے کے بعد آزاد کو خیال آگیا لہٰذا ۲۸ ویں شعر کے بعد پینترا بدلا اور کہا

مُجا ہوں لے کے میں حاضر یہ تہنیت کے پھول — کہ اور پاس نہ رکھتا تھا کچھ برائے نثار

شبِ طرب ہے آج اُسی شاہزادے کی شادی — جہاں میں جو ہے جہانگیر شاہ نیک اطوار

(شہزادے کا نام مرزا جہانگیر ہے جہانگیر شاہ نہیں)۔ اشعار کے بیچ بیچ میں کہیں کہیں کچھ عبارتیں بھی ہیں مثلاً ۲۴ ویں شعر کے بعد: "(کئی شعر اور نہ پڑھے گئے)" ۲۸ ویں شعر کے بعد: "(یہاں سے کئی سطریں پڑھی نہیں گئیں آگے چند متفرق شعر آتش بازی کے ہیں)"، ۴۹ ویں شعر کے بعد: "(کئی شعر اور نہ پڑھے گئے)" "ان عبارتوں کو دیکھ کر "مکمل شرح کلامِ غالب" مصنفہ آسی کا خیال آگیا۔ مولانا آسی نے بھی غالب کے چند شعر خود تصنیف کیے اور لکھا کہ ایک قدیم بیاض میں یہ اشعار ملے۔ جعل کو صداقت کا رنگ دینے کے لیے کہیں مصرع، کہیں نیم مصرع، کہیں کوئی لفظ چھوڑ کر نقطے لگا دیے کہ پڑھے نہیں گئے اور لوگوں نے اُن اشعار کو غالب کی تصنیف مان لیا۔ ایسا ہی مہاپنڈت راہل سانکرتیاین نے "سنگھ سیناپتی" میں کیا تھا اور یہی مولانا آزاد نے کیا ہے۔ مرتبِ کلیات کے مطابق مسودہ خود آزاد کا لکھا ہوا ہے۔ کاٹ چھانٹ بھی سب آزاد ہی کے ہاتھ سے ہے۔ پھر "پڑھے نہ گئے" سے کیا مُراد ہے (اگر آزاد نے کہیں سے نقل کیا ہے تو وہ مسودہ کہاں ہے؟) کلیاتِ ذوق کے متن میں مرتب نے یہ عبارتیں بغیر کسی وضاحت کے نقل کر دی ہیں جس سے گُمان ہوتا ہے کہ مختلف مقامات پر مرتب سے اشعار پڑھے نہیں گئے۔ حالاں کہ یہ فقرے آزاد کے ہیں اور انھوں نے اپنے لیے لکھے ہیں۔ ہمیں اس حقیقت کا علم دیوانِ ذوق مرتبہ آزاد دیکھنے کے بعد ہُوا — مزید وضاحت پاکستانی اڈیشن کا ضمیمہ دیکھ کر ہو گئی۔ بہ ہر حال آخر تک پہنچتے پہنچتے آزاد کو خیال ہُوا کہ اگر کسی مصرعے سے تاریخ نکال دی جائے تو قارئین کو پختہ یقین ہو جائے گا کہ قصیدہ ذوق ہی کا کہا ہوا ہے۔ چناں چہ اُنھوں نے ایک جگہ جمع تفریق کر کے جدولوں میں تاریخ درج کر دی حالاں کہ کسی شعر میں تاریخ کہنے کا اشارہ تک نہیں۔ ستم یہ ہے کہ مرتبِ کلیات نے بیس برس پہلے

بہ قولِ آزاد، ظفر کو بیٹا ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ آزاد کو یہ بھی معلوم نہیں کہ اُسی باپ کے کہنے سے ظفر نے اگرچہ حقوقِ ولی عہدی سے دست برداری کی تحریر لکھ دی تھی لیکن خفیہ طور پر انگریزوں کو یہ بھی لکھ بھیجا تھا کہ مجھ سے یہ تحریر دباؤ کے تحت حاصل کی گئی ہے۔ ان سب باتوں کے ہوتے وہ اپنی مدح کے قصیدے میں باپ کا نام کس دل سے ڈلواتے ہوں گے ؟) عالمِ جوانی کی طبع آزمائی کے برباد ہونے کا سوال اس لیے نہیں اُٹھتا کہ خود آزاد نے مرزا سلیم اور مرزا جہانگیر کی شادی پر کہے گئے مبینہ قصائد شاملِ دیوان کیے ہیں اور یہ ذوق کے بالکل ابتدائی زمانے کے واقعات ہیں۔ؔ

ــہ اسی سے ہمارے خیال میں اِن قصائد کا ذوق سے اِنتساب مشکوک ہے۔ مثلاً موجودہ کلیات میں قصیدہ ۱۰، قلم جو صفحۂ کاغذ پہ ہووے نکتہ نگار۔ دیوان مرتبۂ آزاد میں اس کا نمبر ساتواں ہے۔ مرتبِ کلیات نے قصیدہ ۱۰ کے لیے حواشی میں لکھا ہے " قصیدہ ۶، ۱۱ اشعر، ویران" مرتب کا قاعدہ یہ ہے کہ پہلے قصیدے کا نمبر، اُس کے بعد اشعار کی کل تعداد، اور اُس کے بعد ماخذ کی تفصیل، یعنی قصیدۂ مذکور کس نسخے میں ہے۔ اگر اختلافِ نسخ ہوں تو ماخذ کے حوالے اور شعر کے نمبر کے ساتھ اُنھیں بھی اِسی ذیل میں درج کیا گیا ہے۔ لیکن ان حواشی میں اِنتشار بہت ہے، اور اکثر منشائے مرتب کو سمجھنے میں الجھن ہوتی ہے۔ مثلاً اِسی قصیدے سے متعلق حواشی سے تو یہ نکلتا ہے کہ اس میں کُل ۱۱ اشعر ہیں اور نسخۂ ویران سے لیے گئے ہیں لیکن متن میں ۴۵ شعر درج ہیں۔ یہ گڑبڑ اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ مرتب نے اُن قصائد کو جو آزاد کے علاوہ دوسرے ماخذ میں بھی موجود ہیں، پہلے حصے میں درج کیا ہے قصیدہ ۱۰ صرف ۱۱ اشعر کا ہے اور وہ نسخۂ ویران میں موجود ہے (وہاں اگرچہ یہ قصائد کے حصے میں درج ہے لیکن اُس پر قصیدے کا نمبر نہیں ہے۔ بلکہ اسے " قطعہ در جشن تہنیت " کہا گیا ہے، اور اس امر کی تصریح حواشی میں نہیں کی گئی) کلیات کے پاکستانی اڈیشن میں دوسرے حصے کے حواشی " حواشی حصہ دوم " کے عنوان سے درج نہیں ہیں، ہندستانی اڈیشن میں ہیں (اصلاً یہ بھی پہلے حصے کے حواشی ہیں، عنوان دھوکا دیتا ہے) لیکن اِن میں خاصی گڑبڑ ہے۔ پاکستانی اڈیشن میں کئی ضمیمے شامل ہیں۔ اُن میں ضمیمہ الف ہے " مسودۂ دیوانِ ذوق مرتبہ آزاد" یہ بھی ایک طرح سے حواشی ہیں۔ آپ تعلیقات کہہ لیجیے۔ اس میں غزلیات، قصائد یا اشعار کے نمبر شمار درج کرنے کا اِلتزام نہیں۔ اِس میں ساتویں قصیدے کے چند اشعار کی مختلف روایتیں یا قراتیں (آزاد نے ایک ایک مصرعے کو کئی کئی بار اور کئی کئی طرح لکھا ہے) درج ہیں۔ معلوم ہوا یہ قصیدہ صرف آزاد کے مرتبہ دیوان میں ہے۔ ہم نے اوپر کہا ہے کہ ذوق سے اِس قصیدے کا اَنتساب مشکوک ہے۔ دلائل یہ ہیں، (۱) شاہزادے

صرف آزاد کی روایت سے کلیات میں شامل کیے گئے ہیں وہ شبہے سے بالا نہیں۔ ڈاکٹر محمد صادق نے اپنی انگریزی کتاب کے آخر میں کئی ضمیمے شامل کیے ہیں۔ ایک میں انھوں نے تقریباً دو درجن غزلوں اور تین قصیدوں کو آزاد کی تصنیف مانا ہے۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ کچھ غزلیں کُلی نہیں تو جزوی طور پر آزاد کی تصنیف ہیں۔ ایک ہی غزل کے دو مسودے بھی چھاپے ہیں اور دونوں آزاد کے قلم سے ہیں اور خاصے کٹے پھٹے ہونے کے باوجود دونوں کا متن مختلف ہے) اکثر غزلیں داخل ہو جائیں گی (اور اُن اکثر غزلوں میں بیشتر اُن کی اپنی تصنیف ہیں) یا ناتمام غزلیں پوری ہو جائیں گی (آخر ناتمام غزلوں کو پورا کون کرے گا، آپ خود نا! اور یہی ہوا بھی ہے) مگر تصنیف کے دریا میں پیاس بھر پانی نہیں۔" ظاہر ہے کہ حوصلہ نہیں نکل سکا ع مری نگاہ میں ہے جمع خرچ دریا کا) اتنے سے پیاس نہیں بجھی تو معروف کا دیوان بھی ذوق کی جھولی میں ڈال دیا۔ اس سے بھی تسکین نہ ہوئی تو بے شمار غزلیں (مکمل یا نامکمل) کہہ کر ذوق کے کلام میں شامل کر دیں (۱۴ غزلوں کی نشاندہی ۱۹۴۴ء کے آس پاس شیرانی مرحوم نے کر دی تھی۔ کچھ اور پر شبہے کا اظہار کیا تھا۔ اب اُن کو پرکھنا موجودہ محققین کا کام ہے۔)

۳۶۔ جب تک اکبر شاہ زندہ تھے تب تک ان کا دستور تھا کہ قصیدہ کہہ کر لے جاتے اور اپنے آقا یعنی ولیعہد بہادر کو سُناتے۔ دوسرے دن ولیعہد ممدوح اُس میں اپنی جگہ بادشاہ کا نام ڈلوا کر لے جاتے اور دربار شاہی میں سُنواتے۔ افسوس کہ عالمِ جوانی کی طبع آزمائی سب برباد ہوئی۔ جو کچھ ہیں بڑھاپے کی ہمت کی برکت ہیں۔

اس قسم کے بیانات دیتے وقت مولانا معقولیت کی آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ قصیدہ کیا غزل ہوتا ہے کہ مقطعے میں تخلص بدل دیا اور نصاب پورا ہوا۔ اُس میں مدح کا حصہ عموماً طویل ہوتا ہے اور اہم بھی۔ ولی عہد کے قصیدے میں اگر بادشاہ کا نام ڈالا جائے گا تو پیوند صاف نظر آ جائے گا۔ مولوی ذکاءاللہ کا وہ خط آزاد ہی کی تحویل میں تھا جس میں کسی وجہ سے غالب کو بہت بُرے رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ اُس میں منجملہ اور الزاموں کے ایک یہ بھی ہے کہ ایک ایک قصیدے کو کئی کئی ممدوحوں کے نام کرتا تھا" آزاد نے یہ نہ سوچا کہ اُن کے اس بیان سے ذوق پر بھی اُسی بے دیانتی کا الزام وارد ہو جائے گا۔ اس سے ذوق و ظفر دونوں کی شخصیت پر دھبا لگتا ہے (یہاں آزاد کو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ اُنھوں نے ظفر سے گلہ کروایا ہے کہ استاد اب جو قصیدے تم ہمارے لیے کہتے ہو ہمارے بعد اور کے لیے کہو گے۔ کہا جا سکتا ہے کہ باپ اور نہیں ہوتا۔ مگر اُسی باپ نے،

تو ایک آدھ صاحب دیوان شاگرد کا نام لیتے۔ آزاد کے ذہن میں ظفر اور صرف ظفر تھے جن کے چاروں دیوان آزاد سے پہلے ظہیر و انور وغیرہ ذوق کی جھولی میں ڈال چکے تھے (ڈاکٹر اسلم فرخی اسی لیے مولانا کو اس الزام کا قصوروار نہیں سمجھتے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس حقیقت پر غور نہیں فرمایا کہ اول تو سب سے پہلے اس جرم کا مرتکب دلی اردو اخبار ہے، اُس کے بعد انور وغیرہ۔ مگر ایک اخبار دوسرے شاعر۔ وہ ایسی باتیں لکھیں تو کچھ ایسی قابلِ اعتراض بات نہیں۔ مولانا ادب کے مورخ تھے اور مورخ کا فرض ذرا مختلف ہوتا ہے۔) آزاد کو ظفر کا نام لے کر انھیں ادنیٰ شاگرد کہنے کی جرأت نہ ہوئی، اس لیے بات گول کر دی، لیکن جب ترتیب دیوان کے ارادے کا اعادہ کیا تو فرمایا، "چناں چہ یہ تذکرہ (آبِ) چھپ لے تو اس پر توجہ کروں بسبب لااسباب سرانجام کے اسباب عنایت فرمائے۔ جو غزلیں اپنے تخلص سے کہیں تھیں (کذا) اگر جمع کی جاتیں تو بادشاہ کے چاروں دیوانوں کے برابر ہوتیں"۔ ظاہر ہوا کہ ان کی آنکھوں میں بادشاہ کے چاروں دیوان کھٹک رہے ہیں ورنہ ذوق کے کلام کی مقدار جتنی ہے وہ کم نہیں۔ (یہاں ذرا اس امر پر غور فرمائیے کہ اپنے تخلص کی غزلیں" اگر جمع کی جاتیں تو بادشاہ کے چاروں دیوانوں کے برابر ہوتیں" اور وہ جو کئی مہینے آزاد نے باطمینان کام کیا۔ اس دوران کیا کرتے رہے؟) غالب ذوق سے عمر میں چھوٹے تھے۔ اُن سے ۵۔ ۶ سال بعد شعر کہنا شروع کیا لیکن ۱۵ برس بعد تک کہتے رہے۔ اُن کا سارا اردو کلام تقریباً ۱۸۰۰ شعر ہے۔ کسی کے بڑے اور چھوٹے ہونے کا انحصار کلام کی مقدار پر نہیں ہوتا۔ آزاد یہ بھی بھول گئے کہ فنافی الشعر کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ آدمی ہر وقت شعر کہتا رہے۔ خود غالب شعر کی روٹی کھاتے تھے۔ ساری زندگی اور کوئی کام نہیں کیا۔ لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہر وقت فکرِ شعر میں غرق رہتے تھے۔ دراصل ذوق کے کلام کی کمی آزاد کے ان دعووں کی تکذیب کرتی ہے کہ فی البدیہہ کہتے تھے؛ فوراً اور بے تامل شعر کہتے تھے؛ بہت جلد اصلاح دیتے تھے؛ فی البدیہہ قصائد موزوں کر لیتے تھے۔ حالاں کہ اگر مختلف بیانات کو یک جا کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہو کہ بہت سوچ سوچ کر شعر کہتے تھے؛ ایک ایک غزل اور قصیدے کی تصنیف میں مہینوں صرف ہو جاتے تھے۔ اس کے باوجود آزاد کو یہ قلق ہے کہ کلام بہت کم ہے۔ چناں چہ انھوں نے آبِ میں اعلان فرما دیا (جس کی معنویت اہلِ نظر سے مخفی رہی) "میرے پاس بعض قصیدے ہیں (حالاں کہ صرف غزلوں کا جُنگ بغل میں مار کر گھر سے نکلے تھے۔ چناں چہ جو قصائد

یہ ساری مرثیہ خوانی ابتدا و اخیر کے خط کشیدہ جملوں کی خاطر ہے

قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوق وگرنہ ؛ سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

ذوق کے اس شعر کے مصرعِ ثانی نے آزاد کو انھیں ہر فن میں طاق دکھلانے پر مائل کیا اور دیوان کے اختصار نے پہلے مصرعے کی صداقت پر صاد کیا۔ جس شخص سے اتنی عقیدت ہو، جو ہر فن میں طاق ہو، جو شخص فنا فی الشعر ہو اور ساری زندگی اس کی نذر کر دے، جو اپنی حیات میں اپنے معاصرین میں سب سے ممتاز مرتبے کا مالک ہو، اس شخص کی عمر بھر کی کمائی کچھ تمام و ناتمام غزلیں اور چند قصیدے کیوں کر ہو سکتی ہے ؟ چناں چہ شروع ہی سے آزاد نے جو کمی "استاد" سے رہ گئی تھی اُسے پورا کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ انتقال کے فوراً بعد اُن کے فرزندِ جسمانی کے ساتھ مل کر کلام کی ترتیب کی طرف متوجہ ہوئے (اَمرا و مرزا انور کا اس کے خلاف بیان پیچھے نقل ہو چکا ہے) دردمندی کا دل تو قلیل مقدارِ کلام کو دیکھ کر جبھی خون ہو گیا تھا اور اس میں حتی الامکان قولاً اور فعلاً اُسی وقت سے اضافہ شروع ہو گیا تھا۔ چناں چہ تصور میں غزلوں کے بستے ، کئی بڑی بڑی پوٹلیں، بے شمار تھیلیاں اور مٹکے وجود میں آ گئے۔ (یہ بھی انور کے بیان کا مبالغہ آمیز عکس ہے) تصور ہی کے کرشمے نے اُس میں بہت سی متفرق غزلیں بادشاہ کی اور بہتیری غزلیں شاگردوں کی شامل کر دیں۔ اب انھیں الحاقی کلام سے الگ کرنے میں کئی مہینے لگ گئے۔ ذوق کا انتقال وسط نومبر ۱۸۵۴ء میں ہوا۔ چند دن کا وقفہ آخر سال تک مان لیجیے۔ ۱۸۵۵ء سے وسط ۱۸۵۷ء تک تقریباً ڈھائی سال کی مدت ہوتی ہے جسے آزاد نے کئی مہینے سے تعبیر کیا ہے۔ یہ یاد رہے کہ قصائد اور غزلیں چھانٹ لینے کے بعد صرف غزلوں کو صاف کرنے کا کام باطمینان کیا گیا۔ گویا سب غزلیں صاف ہو گئیں۔ ظاہر ہے کہ ڈھائی سال میں صرف نقل نہیں ہوئی ہوں گی بلکہ ناتمام کے اتمام میں بھی وقت صَرف ہوا ہو گا۔ (جو کمی رہ گئی وہ بعد کو ترتیبِ دیوان کے وقت پوری ہو گئی) اور نسخہ ظاہرہ جُنگ تیار ہو گیا جسے بغل میں مار کر، بقولِ خود، آزاد گھر سے بلکہ شہر سے نکلے تھے۔ پھر ناسازیِ حالات اور مصروفیت نے موقع نہ دیا کہ ۸۔ ۹ سال کے عرصے میں اوپر تلے ویران اور ظہیر کے مُرتبہ دیوان اور انتخاب سامنے آ گئے۔ مگر یہ تو تصنیف کے دریا میں بوند بھر پانی تھا۔ عقیدتِ آزاد کی قلزم آشامی اس سے کیوں کر مطمئن ہو سکتی تھی۔ ایک بار پھر دل کو چوٹ لگی جس کا اظہار اس طرح ہوا :

"جس نے ادنیٰ ادنیٰ شاگردوں کو صاحبِ دیوان کر دیا......" اگر اس میں کوئی حقیقت تھی

ہو جائے گا۔ حسرتوں کے خون بہہ جائیں گے۔ دل کے ارمان دل ہی میں رہ جائیں گے۔ دفعتہً ۱۸۵۷ء کا غدر ہو گیا۔ کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا۔ چناں چہ افسوس ہے کہ خلیفہ محمد اسمعیل ان کے فرزندِ جسمانی کے ساتھ ان کے فرزندِ روحانی بھی دنیا سے رحلت کر گئے۔ میرا یہ حال ہوا کہ فتح یاب لشکر کے بہادر دفعتہً گھر میں گھس آئے اور بندوقیں دکھائیں کہ جلد یہاں سے نکلو۔ دُنیا آنکھوں میں اندھیر تھی۔ بھرا ہوا گھر سامنے تھا اور میں حیران کھڑا تھا کہ کیا کیا اُٹھا کر لے چلوں۔ اُن کی غزلوں کے جُنگ پر نظر پڑی (جو خلیفہ اسماعیل کے ساتھ ہی کوچ کر چکا تھا؟) یہی خیال آیا کہ محمد حسین اگر خدا نے کرم کیا اور زندگی باقی ہے تو سب کچھ ہو جائے گا۔ مگر اُستاد کہاں سے پیدا ہوں گے جو یہ غزلیں پھر آ کر کہیں گے۔ اب اُن کے نام کی زندگی ہے اور ہے تو ان پر منحصر ہے۔ یہ ہیں تو وہ مر کر بھی زندہ ہیں۔ یہ گئیں تو نام بھی نہ رہے گا۔ وہی جُنگ اٹھا بغل میں مارا۔ سجے سجائے گھر کو چھوڑ۔ گھر سے بلکہ شہر سے نکلا ..... حافظ غلام رسول ویران کہ محبت کے لحاظ سے میرے شفیق دوست اور حضرت مرحوم کی شاگردی کے رشتے سے روحانی بھائی ہیں ..... حافظ موصوف کو خود بھی حضرت مرحوم کا کلام بہت کچھ یاد ہے اور خدا نے ان کی بصیرت کی آنکھیں ایسی روشن کی ہیں کہ بصارت کی آنکھوں کے محتاج نہیں ..... انھوں نے اس مہم کا سرانجام کیا۔ اور اپنی یاد کے علاوہ نزدیک بلکہ دُور دُور سے بہت کچھ بہم پہنچایا۔ سب کو سمیٹ کر ۱۲۷۹ھ میں ایک مجموعہ جس میں اکثر غزلیں تمام اور اکثر ناتمام۔ بہت سے متفرق اشعار اور چند قصیدے چھاپ کر نکالا، مگر دردمندی کا دل پانی پانی ہو گیا اور عبرت کی آنکھوں سے لہو ٹپکا۔ کیونکہ جس شخص نے دنیا کی لذتیں، عمر کے مختلف موسم اور موسموں کی بہاریں، دن کی عیدیں رات کی شب براتیں، بدن کے آرام، دل کی خوشیاں، طبیعت کی اُمنگیں، سب چھوڑ دیں اور ایک شعر کو لیا، جس کی انتہا تمنا یہ ہوگی کہ اس کی بدولت نیک نام باقی رہے گا، تباہ کار زمانہ کے ہاتھوں آج اس کی عمر بھر کی محنت نے یہ سرمایہ دیا اور جس نے ادنے ادنے شاگردوں کو صاحب دیوان کر دیا، اُس کو یہ دیوان نصیب ہوا۔

کئی باتیں توجہ طلب ہیں۔ راوی ذوق کے خوارقِ عادات اور علوے مرتبت کا نقش اپنے قارئین کے دلوں پر ثبت کرنا چاہتا ہے۔ لہذا اُس نے ایک واقعہ تراش لیا۔ جس شعر پر اُس کی بنیاد ہے اُس کے بارے میں اس نے ہر بات غلط کہی ہے۔ یعنی "بلغ العُلا بکمالہ" ایک مصرع نہیں نصف مصرع ہے۔ رُباعی کا نہیں بلکہ ایک شعر کا ہے۔ (خود آزاد نے انشا کے ذکر میں ع حویلی علی نقی خان بہادر کی، کو رُباعی کہا ہے) اور اس سے ۱۲۷۱ نہیں ۱۲۶۲ برآمد ہوتے ہیں۔ تعمیے کا سوال نہیں کہ ایک مصرے کو کانی وددانی بتایا گیا ہے۔

بہرحال جب عقیدت کا یہ عالم ہو تو حقیقت کا کھُلنا معلوم۔ اصلیت یہ ہے کہ ذوق کا مذہب آزاد کے اپنے مسلک سے مختلف تھا، اگرچہ مولانا متعصب ہیں نہ کٹر۔ اُن کی تعلیم کا آغاز شیعہ دینیات سے ہوا، تکمیل سُنّی دینیات سے ہوئی۔ اس کے باوجود ان کا دل گوارا نہیں کرتا کہ اپنا پیرو مرشد یا پیرِ مختلف عقیدہ رکھے۔ اب اُس کے عقیدے کو یکسر بدل دینا توان کے لیے ممکن نہیں تھا لیکن اُسے مشکوک تو کیا ہی جا سکتا تھا۔ اس کا محاسبہ کرنے والا کون تھا؟ ذوق زندہ تھے نہ ذوق کے فرزند خلیفہ اسماعیل۔

۳۸۔ اس میں کسی کو کلام نہیں کہ انھوں نے فکرِ سخن اور کثرتِ مشق میں فنائی الشعر کا مرتبہ حاصل کیا اور انشا پردازی ہند کی روح کو شگفتہ کیا۔ مگر فصاحت کا دل گھُلا جاتا ہوگا جب ان کے مختصر دیوان پر نگاہ کرتی ہوگی۔ اس کا سبب بیان کرنا ایک سخت مصیبت کا افسانہ ہے اور اس کی مرثیہ خوانی میرا فرض ہے۔ اُن کی وفات کے چند روز بعد میں نے اور خلیفہ اسمٰعیل نے کہ وہ بھی باپ کی طرح اکلوتے بیٹے تھے چاہا کہ کلام کو ترتیب دیں۔ متفرق غزلوں کے بستے اور بڑی بڑی پوٹلیں تھیں بہت سی تھیلیاں اور مٹکے تھے کہ جو کچھ کہتے تھے گویا بڑی احتیاط سے ان میں بھرتے جاتے تھے۔ ترتیب اس کی پسینے کی جگہ خون بہاتی تھی کیوں کہ بچپن سے لے کر دمِ واپسیں (تک) کا کلام انھیں میں تھا۔ بہت سی متفرق غزلیں بادشاہ کی تھیں، بہتیری غزلیں شاگردوں کی ملی ہوئی تھیں۔ چناں چہ اوّل ان کی اپنی غزلیں اور قصیدے انتخاب کر لیے۔ یہ کام کئی مہینے میں ختم ہوا۔ غرض پہلے غزلیں صاف کرنی شروع کیں۔ اس خطا کا مجھے اقرار ہے کہ کام میں نے جاری کیا مگر با اطمینان کیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس طرح یکایک زمانہ کا ورق اُلٹ جائے گا۔ عالم تہ و بالا

کی نیکی اور نیک خواہی سے انکار کرنے کی ضرورت نہیں۔ مقصود صرف اس حیرت کا اظہار ہے کہ آزاد نے اُن کی دعائیں اور دعا مانگنے کے انداز اور اوقات کی تفصیل میں باریک سے باریک جزئیات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ کوئی گھر کا فرد ہی کر سکتا ہے۔ بہ قولِ خود وہ نمازِ عصر کے وقت ہمیشہ ذوقؔ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ اُن کے والد آدھی رات کے وقت ذوقؔ کو دعائیں مانگتے دیکھتے تھے بلکہ اس کی تفصیل آزاد کو بھی بتاتے تھے اور نہ انھیں علم کیوں کر ہوتا ؟) اس کے باوجود ذوقؔ کے مذہب کا حال کسی پر نہ کھلا۔ اب یا تو یہ سمجھیے کہ ذوقؔ نے کبھی نماز نہیں پڑھی یا آزاد نے انھیں کبھی نماز پڑھتے نہیں دیکھا ' یا پھر آزاد پر تعصب کا وہ الزام مان لیجیے، جو بعض بزرگوں نے اُن پر لگایا ہے۔ ہمارے خیال میں حقیقت کچھ بین بین ہے۔ آزاد متعصب نہیں ہیں۔ البتہ یہ ہے کہ جسے وہ پسند کرتے ہیں اور ہیرو مانتے ہیں ' غیر شعوری طور پر ' اُن کا دل اُسے مختلف مسلک کا پیرو ' ماننے سے انکار کرتا ہے۔ ایک صریح حقیقت کو جھٹلانا اُن کے مقدور میں نہیں۔ چناں چہ وہ ایسے موقعوں پر بات ہی گول کر دیتے ہیں۔ ذوقؔ ان کے ہیرو، پیر و مرشد اور" استادِ ظاہر و باطن تھے۔ صرف آزاد ہی کے نہیں بلکہ معلوم ہوتا ہے مولوی باقر والدِ آزاد کے بھی پیر تھے ' اور ذوق پرستی آزاد کو ورثے میں ملی تھی۔ ایک واقعہ سُنیے جو دہلی اردو اخبار میں ذوقؔ کی وفات کے چار دن بعد شائع ہوا۔

> یہ امر بھی خوارق و علوے مرتبت سے جناب مرحوم کے جاننا چاہیے کہ ایک روز جلسے میں کچھ ذکر پیش گوئی تاریخ وفات اساتذۂ سابقین کا قریب زمان مرض الموت کے ایک شاگرد نے کیا۔ اور شدہ شدہ اُس جلسے میں رباعی شیخ سعدی شیرازی اتفاقاً کسی کی زبان پر گزری۔ آپ نے مسکرا کر فرمایا کہ اس میں ایک مصرع ہماری تاریخ کی جگہ پر کافی ووافی ہے۔ اُس وقت کسی کو کچھ خیال عدد وغیرہ کا نہ آیا۔ ظاہر ہے کہ عدد جو مصرع اولیٰ رباعی مذکور کے دیکھے جاتے ہیں تو فی الحقیقت ۱۲۷۱ھ ہیں یعنی مصرع
> بلغ العلا بکمالہٖ۔

یہ اقتباس " ذوق سوانح اور انتقاد " میں بلا تبصرہ نقل کیا گیا ہے۔ بہ ظاہر یہ عبارت اڈیٹر کی طرف سے معلوم ہوتی ہے کہ کسی نامہ نگار وغیرہ کی تصریح نہیں۔ یوں بھی یہ ایسے جلسے کا ذکر ہے جس میں کوئی قریبی شخص ہی شریک ہو سکتا ہے۔ مولوی محمد باقر کے ذوقؔ سے قریبی تعلقات تھے اور جب تک کوئی برعکس شہادت موجود نہ ہو ' اس بیان کو مولوی باقر سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ اس بیان میں

ذوق سے منسوب نہیں کیے جاسکتے۔) ایک شعر دیکھیے، بات واضح ہوجائے گی:

جس طرح دیکھے قفس سے باغ کو مرغِ اسیر جھانکتا ہے دل تجھے یوں دیدۂ صد چاک سے

یہ غزل اُس بیاض میں ہے جسے اُستاد کی غزلوں کا جُنگ لکھا ہے۔ مرتب کلیات نے اس کے بیشتر حصے کو بہ قلمِ ذوق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، جو شک و شبہے سے بالا نہیں۔ ہمارے خیال میں اُس کا بیشتر حصہ خود آزاد کا لکھا ہوا ہے اور نصف سے زیادہ خود اُن کی تصنیف بھی۔ بہرحال بیاض میں شعرِ مذکور کے مصرعِ ثانی کا آخری ٹکڑا دیدۂ صد چاک سے "ہے۔ آزاد نے پہلے دل کو صد چاک فرض کیا، پھر ان چاکوں کو دیدہ مان کر شعر کہہ دیا (ذوق کے یہاں ایسی پیچیدہ اُپج نہیں ملتی) دیوان مرتب کرنے لگے تو خیال آیا "دیدۂ صد چاک" لغو ترکیب ہے، خواہ وہ دیدۂ دل ہی کیوں نہ ہو۔ چناں چہ انھوں نے اسے "سینۂ صد چاک" بنا دیا۔ مرتبِ کلیات نے چوں کہ غزل بیاض سے لی ہے، اس لیے دیوان کی ترمیم کو آزاد کی تحریف سمجھ کر قبول نہیں کیا۔ حالاں کہ آزاد نے خود اپنی ایک غلطی کی اصلاح کی تھی۔ یہ ہرحال یہ صرف ایک شعر کا حال ہے، باقی شعر صاحبِ نظر قارئین خود دیکھ لیں۔ (اس سے ہمارا خیال ہے جس کلام کو مرتب کلیات نے بہ قلمِ ذوق مانا ہے اُس پر از سرِ نو غور کرنے کی ضرورت ہے۔ آزاد کے ذریعے سے جو کچھ بھی ملا ہے اُسے ذوق کے اپنے قلم سے تب تک نہیں مانا جاسکتا جب تک ذوق کی کوئی تحریر کسی دوسرے ماخذ سے ہاتھ نہ آجائے۔)

> ۲۴۔ ان کا معمول تھا کہ رات کو کھانے سے فارغ ہو کر بادشاہ کی غزل کہتے تھے۔ آدھی بجے تک (کذا) اُس سے فراغت ہوتے تھے۔ پھر وضو کرتے اور وہی ایک لوٹے پانی سے کُلیاں کر کے نماز پڑھتے۔ پھر وظیفہ شروع ہوتا..... وظیفہ پڑھ کر دعائیں شروع ہوتیں تھیں یہ گویا ایک نمونہ تھا اُن کی طبیعت کی نیکی اور عام نیکخواہی کا..... فقرا اور بزرگانِ دین کے ساتھ اُنھیں ایسا دلی اعتقاد تھا کہ اُس کی کیفیت بیان نہیں ہوسکتی۔ علما اور اساتذۂ سلف کو ہمیشہ با ادب یاد کرتے تھے۔ اور کبھی اُن پر طعن و تشنیع نہ کرتے تھے۔ اس واسطے اُن کے مذہب کا حال کسی پر کھلا۔

پہلے فقرے سے آزاد جو کچھ ظاہر کرنا چاہتے ہیں، اُس پر پروفیسر شیرانی اور دیگر حضرات اظہارِ خیال کر چکے ہیں۔ اس کا ایک مقصد اور بھی ہے جو حسبِ موقع بیان ہوگا۔ یہیں ذوق کی طبیعت

گئی دو شعر ہیں جن سے آزاد کو نہ صرف قصہ بنانے کی ترغیب ملی بلکہ غزل مکمل کرنے کی تحریک بھی ہوئی) لہٰذا اس پر کہانی بنانا ضرور تھی، چناں چہ گھڑ لی۔ ورنہ چند سال بعد ترتیبِ دیوان کے وقت ترمیم کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی؟

> اُستاد کا قاعدہ تھا کہ وضو کے بعد ایک لوٹے پانی سے برابر کُلّیاں کرتے تھے: بچپن میں دیکھتا تھا تو ہنسی آتی تھی۔ جب بڑا ہُوا تو ایک دن میں نے سبب پوچھا۔ فرمایا دیکھتے ہو زبان سے کیا کیا نکل جاتا ہے؟ خیر یہ بھی ایک بات ہے۔ پھر ذرا تامّل کیا اور یہ مطلع پڑھا۔ میں نے لکھ لیا۔ اُس دن تو مطلع ہی طلوع ہُوا تھا پھر غزل ہو گئی۔

معلوم ہُوا ہمیشہ نمازِ عصر کے وقت حاضر ہونا غلط۔ پہلے جب کُلّیاں کرتے دیکھتے تھے، اُسی زمانے میں سوال کر لیا، لیکن ترتیبِ دیوان کے وقت چوں کہ شاگردانہ تعلق ثابت کرنے میں شدت پیدا ہو چکی تھی لہٰذا بچپن میں کلّیاں کرتے دیکھ کر ہنستے تھے اور بڑے ہو کر سبب پوچھا۔ (ایک تیر سے دو شکار ہو گئے۔ یعنی اب یہ بھی ثابت ہو گیا کہ "مجھے بیس برس تک دن رات حضوری رہی ہے"۔ اس بیان سے دُور رس نتائج اخذ کرنے والے محققین متوجہ ہوں) پہلے بیان میں مُتاسفانہ طور پر جواب پایا۔ دوسرے بیان کے وقت "اُستاد" کا تاسّف دُور ہو چکا تھا۔ پہلے ہزلیات مُنہ سے نکل جانے کا تاسّف تھا، بعد میں "کیا کیا منہ سے نکل" جانے کا ذکر ہے تو تاسّف کی کیا ضرورت تھی؟ ہزلیات کا لفظ آزاد کو کھٹکا ہو گا کہ یہ دونوں طرف مار کرتا ہے، چناں چہ نکال دیا۔ پہلے مطلع اُسی وقت کہہ کر پڑھا (اور آزاد نے لکھا نہیں) بعد میں یہ تخصیص اُڑ گئی اگرچہ آخری فقرے کا مطلب وہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آزاد نے مذکورہ مطلع نسخۂ دیوان میں دیکھا (کہ یہ صرف اُسی میں ملتا ہے) اُس پر ایک کہانی گھڑی، بعد میں کم زور لگی تو روایت بدل دی لیکن کہانی درج ضرور کی (اس کی لغویت کی طرف آزاد کی نظر نہیں گئی۔ شعر میں ذکرِ خدائے پاک سے وہاں کو صاف رکھنے کی بات کہی گئی ہے، لوٹے بھر پانی کی کُلّیاں کرنے کی نہیں۔ اس کے لیے آزاد کو شعر بھی تصنیف کرنا تھا) پہلے صرف مطلع کہہ کر پڑھا تھا اور آزاد کے ذہن میں غزل مکمل کرنے کا خیال نہیں تھا۔ دیوان مرتّب کرنے بیٹھے تو طبیعت لڑ گئی۔ سوچا لاؤ پانچ سات شعر بھی کہہ دیں۔ چناں چہ غزل طلوع ہو گئی۔ سوائے پہلے دو شعروں کے یہ غزل خود آزاد کے ذہن کی اُپج ہے۔ یہ پیچیدہ اور مُتکلّف اندازِ بیان ذوق کے انداز سے میل نہیں کھاتا۔ (ایسے صریح اغلاط

ہو سکتا ہے؟ کیا آزاد یہ بھول گئے کہ اس سے فوراً پہلے وہ قصیدے پر ہاتھی کا انعام ہونا لکھ چکے ہیں۔ وہ یہ بھی لکھ چکے ہیں کہ گانو جاگیر میں ملنے کے علاوہ بادشاہ نے مکان اور باغ اور خدا جانے کیا کیا دیا، اس پر بھی وہ اُسی تنگ و تاریک مکان میں بیٹھے رہے اور بادشاہ کی امارت و سخاوت کا مذاق اُڑاتے رہے۔ بہ ظاہر آزاد یہ بھی بھول گئے ہیں کہ وہ خود ذوق سے روایت کر چکے ہیں کہ پڑوس میں ایک مکان بک رہا تھا، ہم نے خرید لیا۔ کیا اس میں ہاتھی باندھتے تھے؟ معاصر اخباروں میں یہ بیان بھی موجود ہے کہ جس قصیدے پر ہاتھی انعام ہوا تھا اُس کے ساتھ چار سپاہی بھی ملے تھے کہ ہمیشہ ان کے ساتھ رہیں، گویا باڈی گارڈ تھے۔ آخر وہ کس لیے تھے؟ میلا اور عید اور موسم سے کسی شخص کا بے نیاز رہنا ممکن ہے لیکن دنیا کی شادی و غم سے جسے کوئی سروکار نہ ہو، وہ سب کچھ ہو سکتا ہے ایک عام انسان نہیں ہو سکتا۔ آزاد نے میر کو سب سے بڑا صاحب کمال مانا ہے اور مزاج کی یہ بے نیازی انھیں بخشی ہے (حالاں کہ اس میں تضحیک کا پہلو نمایاں تھا) ذوق اُن کے ہیرو تھے اور اس لحاظ سے میر سے آگے نہیں تو کسی طرح کم بھی نہیں تھے۔ لہٰذا جب میر پائین باغ کی کھڑکی کھول کر نہیں دیکھتے تو ذوق مکانوں اور باغوں کو نظر انداز نہ کریں تو میر سے زیادہ صاحب کمال کیوں کر ثابت ہوں گے؟ بس فرق اتنا ہے کہ اس جرم بے نیازی میں آزاد نے میر کو بے دماغ بلکہ بد دماغ ثابت کر دیا اور ذوق کی عالی دماغی پر حرف نہیں آنے دیا۔ اسے انشا پردازی کا کمال کہیے۔ "لکھے جانا" اس لیے ہے کہ آزاد کو ذوق کے کلام کی مقدار میں بہرحال اضافہ کرنا تھا، اور "کتاب دیکھے جانا" اس لیے ہے کہ آزاد انھیں اپنے دَور کا سب سے بڑا عالم ثابت کرنا چاہتے تھے۔

۲۲۔ نمازِ عصر کے وقت میں ہمیشہ حاضر خدمت ہوتا تھا (اسی لیے وفات کے وقت موجود نہ تھے۔ بعد میں خیال آگیا تو ایک قصہ اپنی موجودگی کا گھڑ کر طبع دوم میں شامل کر دیا) نہا دھو کر وضو کرتے تھے اور ایک لوٹے سے برابر کلیاں کیے جاتے تھے۔ ایک دن میں نے سبب پوچھا۔ متاسفانہ طور سے بولے کہ خدا جانے کیا کیا ہزلیات زبان سے نکلتے ہیں۔ خیر یہ بھی ایک بات ہے۔ پھر ذرا تامل کر کے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور یہ مطلع اُسی وقت کہہ کر پڑھا،

پاک رکھ اپنا دہاں ذکرِ خدائے پاک سے
کم نہیں ہرگز زباں منہ میں ترے مسواک سے

اس واقعے کی صداقت صرف اتنی ہے کہ آزاد کو مطلع ہاتھ آگیا (نسخۂ دیوان میں "ناتمام" کے تحت

کر دیں گے۔ مئے دو سالہ..... الخ۔ اسی عرصے میں میں گیا تو جو شعر پڑھوں پڑھتے
اُنھیں ترتیب دیا تھا، سُنائے۔ انھیں میں قطعہ پڑھا: ہوا ہے مدرسہ.....الخ
میری طرف دیکھ کر فرمایا اب بھی وہ شعر؟ میں نے کہا اب کیا ضرورت رہی۔
آنکھیں بند کر کے فرمایا یہ اُدھر ہی کا فیضان ہے۔

آب اور یہاں محض اختصار ہی نہیں واقعے کی نوعیت بھی بدل گئی ہے۔ اگر واقعہ فرضی نہیں تھا تو ترمیم کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ پہلے راوی حافظ ویران تھے۔ اب ذوق کی تمہیدی تحریر جو وجودِ خارجی سے محروم ہے۔ اس کے علاوہ آب میں ایک غلطی نہیں تھی، یعنی بادشاہ کی بیماری کا تعین نہیں تھا لیکن یہاں بہ صراحت ۱۸۵۱ء بتایا گیا ہے اور یہ غلط ہے۔ یہ قصیدہ ۱۸۵۲ء کے آخر میں کہا گیا اور جبھی پیش ہوا۔ اس کے صلے میں ذوق کو ہاتھی وغیرہ کا انعام ہوا تھا جس کی اطلاع دلّی اردو اخبار کی ۱۴ر دسمبر ۱۸۵۲ء کی اشاعت میں دی گئی ہے۔

۳۲۔ ان کی طبیعت کو خدا تعالیٰ نے شعر سے ایسی مناسبت دی تھی کہ رات دن اس
کے سوا کچھ خیال نہ تھا۔ اور اسی میں خوش تھے۔ ایک تنگ و تاریک مکان تھا
جس کی انگنائی اس قدر تھی کہ ایک چھوٹی سی چارپائی ایک طرف بچھتی تھی۔ لکھے
جاتے تھے یا کتاب دیکھے جاتے تھے۔ گرمی جاڑا برسات تینوں موسموں کی بہاریں
وہیں بیٹھے گزر جاتی تھیں۔ اُنھیں کچھ خبر نہ ہوتی تھی۔ کوئی میلہ کوئی عید اور کوئی موسم
بلکہ دنیا کی شادی و غم سے اُنھیں سروکار نہ تھا۔ جہاں اوّل روز بیٹھے وہیں بیٹھے
اور جبھی اُٹھے کہ دُنیا سے اُٹھے۔

یہ بہت عام سا اور بہت سادہ سا بیان ہے۔ اس میں کوئی تحقیقی خامی کیا ہو سکتی ہے لیکن جب ایک بار کسی کی صداقت مشکوک ہو جائے تو پھر اُس کا ہر فقرہ بلکہ ہر لفظ مشکوک لگنے لگتا ہے۔ یہی اِس اقتباس کو یہ کھنے کا سبب ہوا۔ اس بیان سے آزاد کا مقصد ذوق کی فطری سادگی اور بے نیازی یا استغنا کا نقش اُبھارنا معلوم ہوتا ہے۔ بہ ظاہر وہ اس میں کامیاب ہیں لیکن اگر ذرا غور سے دیکھیے تو یہ بیان انتہائی مضحک لگنے لگتا ہے اور اس سے بجائے سادگی کے ذوق کا سڑی پن جھلکنے لگتا ہے۔ شعر سے طبیعت کی مناسبت کسی کو بہت اچھا شاعر تو بنا سکتی ہے، لیکن وہ کسی کو سڑی اور خبطی بھی بنا سکتی ہے یہ اِسی بیان سے کھلا۔ بھلا ایک تنگ و تاریک مکان میں بیٹھے رہنے اور مر کے اٹھنے والا آدمی صحیح الدماغ کیوں کر

ہوسکتا ہے؟ کیا آزاد یہ بھول گئے کہ اس سے فوراً پہلے وہ قصیدے پر ہاتھی کا انعام ہونا لکھ چکے ہیں۔ وہ یہ بھی لکھ چکے ہیں کہ گانو جاگیریں ملنے کے علاوہ بادشاہ نے مکان اور باغ اور خدا جانے کیا کیا دیا، اس پر بھی وہ اُسی تنگ وتاریک مکان میں بیٹھے رہے اور بادشاہ کی امارت وسخاوت کا مذاق اُڑاتے رہے۔ بظاہر آزاد یہ بھی بھول گئے ہیں کہ وہ خود ذوق سے روایت کر چکے ہیں کہ پڑوس میں ایک مکان بک رہا تھا، ہم نے خرید لیا۔ کیا اس میں ہاتھی باندھتے تھے؟ معاصر اخباروں میں یہ بیان بھی موجود ہے کہ جس قصیدے پر ہاتھی انعام ہوا تھا اُس کے ساتھ چار سپاہی بھی ملے تھے کہ ہمیشہ ان کے ساتھ رہیں، گویا باڈی گارڈ تھے آخروہ کس لیے تھے؟ میلا اور عید اور موسم سے کسی شخص کا بے نیاز رہنا ممکن ہے لیکن دنیا کی شادی وغم سے جسے کوئی سروکار نہ ہو، وہ سب کچھ ہوسکتا ہے ایک عام انسان نہیں ہوسکتا۔
آزاد نے میرؔ کو سب سے بڑا صاحبِ کمال مانا ہے اور مزاج کی یہ بے نیازی انھیں بخشی ہے (حالاں کہ اس میں تضحیک کا پہلو نمایاں تھا) ذوق اُن کے ہیرو تھے اور اس لحاظ سے میرؔ سے آگے نہیں تو کسی طرح کم بھی نہیں تھے۔ لہٰذا جب میرؔ پائین باغ کی کھڑکی کھول کر نہیں دیکھتے تو ذوق مکانوں اور باغوں کو نظر انداز نہ کریں تو میرؔ سے زیادہ صاحبِ کمال کیوں کر ثابت ہوں گے؟ بس فرق اتنا ہے کہ اس جرمِ بے نیازی میں آزاد نے میرؔ کو بے دماغ بلکہ بددماغ ثابت کر دیا اور ذوق کی عالی دماغی پر حرف نہیں آنے دیا۔ اسے انشا پردازی کا کمال کہیے۔ "لکھے جانا" اس لیے ہے کہ آزاد کو ذوق کے کلام کی مقدار میں بہرحال اضافہ کرنا تھا، اور "کتاب دیکھے جانا" اس لیے ہے کہ آزاد انھیں اپنے دَور کا سب سے بڑا عالم ثابت کرنا چاہتے تھے۔

۲۲- نمازِ عصر کے وقت میں ہمیشہ حاضرِ خدمت ہوتا تھا (اسی لیے وفات کے وقت موجود نہ تھے۔ بعد میں خیال آگیا تو ایک قصہ اپنی موجودگی کا گھڑ کر طبع دوم میں شامل کر دیا) نہا دھو کر وضو کرتے تھے اور ایک لوٹے سے برابر کُلّیاں کیے جاتے تھے۔ ایک دن میں نے سبب پوچھا۔ متاسفانہ طور سے بولے کہ خدا جانے کیا کیا ہزلیات زبان سے نکلتے ہیں۔ خیر یہ بھی ایک بات ہے۔ پھر ذرا تامّل کر کے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور یہ مطلع اسی وقت کہہ کر پڑھا:

پاک رکھ اپنا دہاں ذکرِ خدائے پاک سے ۔۔۔ کم نہیں ہرگز زباں مُنہ میں ترے مسواک سے

اس واقعے کی صداقت صرف اتنی ہے کہ آزاد کو مطلع ہاتھ آگیا (نسخۂ دیوان میں "ناتمام" کے تحت

کردیں گے ۔ میرے دو سال ..... الخ ۔ اسی عرصے میں میں گیا تو جو شعر پرچوں پر تھے
اُنھیں ترتیب دیا تھا، سُنائے ۔ انھیں میں قطعہ پڑھا؛ ہوا ہے مدرسہ ..... الخ
میری طرف دیکھ کر فرمایا اب بھی وہ شعر؟ میں نے کہا اب کیا ضرورت رہی ۔
آنکھیں بند کرکے فرمایا یہ اُدھر ہی کا فیضان ہے ۔

آب اور یہاں محض اختصار ہی نہیں واقعے کی نوعیت بھی بدل گئی ہے ۔ اگر واقعہ فرضی نہیں تھا تو ترمیم کی ضرورت کیوں پیش آئی ۔ پہلے راوی حافظ ویران تھے ۔ اب ذوق کی تمہیدی تحریر جو وجود خارجی سے محروم ہے ۔ اس کے علاوہ آب میں ایک غلطی نہیں تھی، یعنی بادشاہ کی بیماری کا تعین نہیں تھا لیکن یہاں بصراحت ۱۸۵۱ء بتایا گیا ہے اور یہ غلط ہے ۔ یہ قصیدہ ۱۸۵۳ء کے آخر میں کہا گیا اور جبھی پیش ہوا ۔ اس کے صلے میں ذوق کو ہاتھی وغیرہ کا انعام ہوا تھا جس کی اطلاع دلی اردو اخبار کی ۴ر دسمبر ۱۸۵۳ء کی اشاعت میں دی گئی ہے ۔

۴۲ ۔ ان کی طبیعت کو خدا تعالٰے نے شعر سے ایسی مناسبت دی تھی کہ رات دن اس کے سوا کچھ خیال نہ تھا ۔ اور اسی میں خوش تھے ۔ ایک تنگ و تاریک مکان تھا جس کی انگنائی اس قدر تھی کہ ایک چھوٹی سی چارپائی ایک طرف بچھتی تھی ۔ لکھے جاتے تھے یا کتاب دیکھے جاتے تھے ۔ گرمی جاڑا برسات تینوں موسموں کی بہاریں وہیں بیٹھے گزر جاتی تھیں ۔ اُنھیں کچھ خبر نہ ہوتی تھی ۔ کوئی میلہ کوئی عید اور کوئی موسم بلکہ دنیا کی شادی و غم سے اُنھیں سروکار نہ تھا ۔ جہاں اوّل روز بیٹھے وہیں بیٹھے اور جبھی اُٹھے کہ دُنیا سے اُٹھے ۔

یہ بہت عام سا اور بہت سادہ سا بیان ہے ۔ اس میں کوئی تحقیقی خامی کیا ہو سکتی ہے لیکن جب ایک بار کسی کی صداقت مشکوک ہو جائے تو پھر اُس کا ہر فقرہ بلکہ ہر لفظ مشکوک لگنے لگتا ہے ۔ یہی اِس اقتباس کو پرکھنے کا سبب ہوا ۔ اس بیان سے آزاد کا مقصد ذوق کی فطری سادگی اور بے نیازی یا استغنا کا نقش اُبھارنا معلوم ہوتا ہے ۔ بہ ظاہر وہ اِس میں کامیاب ہیں لیکن اگر ذرا غور سے دیکھیے تو یہ بیان انتہائی مضحک لگنے لگتا ہے اور اس سے بجائے سادگی کے ذوق کا سِڑی پن جھلکنے لگتا ہے ۔ شعر سے طبیعت کی مناسبت کسی کو بہت اچھا شاعر تو بنا سکتی ہے لیکن وہ کسی کو سِڑی اور خبطی بھی بنا سکتی ہے یہ اِسی بیان سے کھلا ۔ بھلا ایک تنگ و تاریک مکان میں بیٹھے رہنے اور مر کے اٹھنے والا آدمی صحیح الدماغ کیوں کر

برسرت ہیں صغیرہ کبیر۔ میری طرف دیکھ کر فرمایا اب بھی؟ میں نے عرض کی سبحان اللہ! اب اس کی کیا ضرورت رہی؟ آنکھیں بند کرکے فرمایا ادھر ہی کا فیضان ہے۔

پتا نہیں اس واقعے سے آزاد کا مقصود ذوق کی قوتِ شعرگوئی کی تعریف ہے یا کچھ اور۔ "اُدھر ہی کا فیضان ہے" کا اشارہ ظفر کی طرف ہے یا خواجہ حافظ کی طرف۔ لیکن یہ قصہ بہ وجوہ مشکوک ہے: "انھوں نے مبارک باد کا قصیدہ کہا" گویا کام مکمل ہو چکا۔ "میں حاضر ہوا اور" وہ اُس وقت قصیدہ ہی لکھ رہے تھے" گویا کام جاری ہے۔ ایک لڑکے کی تعریف پر مسکرانا اور خوش ہو ہو کے شعر سناتے جانا اس لیے مشکوک ہے کہ آزاد موقع بے موقع شعر سنانے لگنے کو اچھا نہیں سمجھتے۔ اس کا اظہار وہ کئی شعرا کے باب میں کر چکے ہیں مثلاً معروفؔ، مومنؔ، ناسخؔ وغیرہ۔ یہ تو محض عقیدت ہے کہ "رنگینی اور یہ زور" اس میں کوئی رنگینی نہیں۔ ظہوری کا ساقی نامہ اِس "مدرسانہ" (مدرسانہ نہیں) شعر سے کیوں کرمات ہو سکتا ہے۔ یہ تعریف سُنی تو "چُپ ہو گئے" اوّل تو چپ کیوں ہو گئے اور اگر چپ ہی ہو گئے تھے تو "پھر" اور "کہا" کا کیا مطلب؟ پھر ذوق نے جو کچھ کہا، اُن کی سنجیدگی اور شرافت سے میل نہیں کھاتا۔ یہ تو مزاج کی خباثت ہے اور یقیناً آزاد کا مقصد "اُستاد" کو ذلیل کرنا نہیں ہو سکتا۔ حافظ ویران نے بیان کیا "اشعارِ بہاریہ کے لکھنے میں دو تین دفعہ فرمایا" اِس کا مطلب ہے قصیدے کی تصنیف کے وقت آزاد موجود نہیں تھے اور یہ گفتگو اُن سے ہوئی بلکہ بعد کے زمانے میں کسی وقت خواجہ حافظ کے شعر کی تضمین کی بات حافظ ویران نے آزاد کو بتائی تھی۔ پھر آزاد کا ایک دن جانا اور ذوق کا خواجہ حافظ کا ذکر نکال کر اپنے قطعے کی داد چاہنا تعجب انگیز ہے۔ (مذکورہ دو شعروں کو قطعہ آزاد ہی کہہ سکتے ہیں، ان میں کوئی ربط نہیں۔ دونوں آزاد شعر ہیں۔ ثبوت یہ بھی ہے کہ آزاد کے علاوہ جتنے نسخے دیوان کے شائع کیے گئے ہیں کسی میں ان اشعار کو قطعہ بند نہیں کہا گیا) اس کے علاوہ جب معاملہ آزاد سے پیش آیا ہی نہیں تو آزاد کا یہ کہنا بے معنی ہے کہ "اب اس کی کیا ضرورت رہی؟" آزاد جانتے تھے کہ ان کے افسانے میں جھول ہے۔ چناں چہ جب دیوان ترتیب دیا تو واقعے کی نوعیت بدل گئی۔ ملاحظہ ہو:

> ۱۸۵۱ء میں بادشاہ بیمار ہو کر اچھے ہوئے۔ بڑی خوشی ہوئی کہ اس بڑھاپے میں خدا نے دوبارہ زندگی دی۔ غسل صحت کا جشن قریب تھا۔ اُستاد نے مبارک باد کا قصیدہ شروع کیا۔ تمہید کی تحریر میں کہا تھا کہ خواجہ حافظ کا شعر بھی اس میں تضمین

نباشد والا ہے۔ فغاں کے احوال میں آزاد کے قلم سے ایک ایسا فقرہ نکل گیا ہے جو غدر میں
ضائع ہو جانے کے قیاس کو رد کرتا ہے بلکہ اس سارے افسانے کو رد کرتا ہے: "ان کے
جس دیوان سے میری آنکھیں روشن ہوئیں میرے استادِ ظاہر و باطن شیخ ابراہیم ذوق کے
لڑکپن کا لکھا ہوا تھا" معلوم ہوا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد اور تصنیفِ آبِ حیات کے وقت کوئی ایسا
دیوان موجود تھا۔ آزاد کے کاغذ کا تو ایک ایک پرزہ محفوظ ہے۔ بلکہ لوگوں نے تو دیواریں توڑ
کر غیر مطبوعہ مواد کے دفتر برآمد کر لیے ہیں۔ پھر ذوق کے لڑکپن کا لکھا ہوا وہ دیوان کہاں گیا؟
تاہم اگر کبھی یہ دستیاب بھی ہو جائے تو محض ایک دیوان ہوگا' باقی ۴۹، ۹ یہاں یہ بھی لنظر میں
رہے کہ آزاد دلی سے صرف ذوق کی غزلوں کا جُنگ لے کر نکلے تھے ہمیں یقین ہے کہ یہ فقرہ
آب کی طبع دوم میں بڑھایا گیا ہوگا۔ اور آزاد کے ذہن سے یہ بات نکل گئی کہ وہ "استاد" کے
ہر کاغذ کو غدر میں تلف کر چکے ہیں سوائے غزلوں کے جُنگ کے جس پر تحقیقی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے

۳۱۔ ایک دفعہ بادشاہ بیمار ہو کر اچھے ہوئے۔ غسلِ صحت کا جشن قریب تھا۔ انھوں نے
مبارکبادیں قصیدہ کہا۔ میں حسبِ معمول خدمت میں حاضر ہوا۔ اور وہ اُس وقت قصیدہ
لکھ رہے تھے۔ چناں چہ کچھ اشعار سنانے لگے۔ مطلع تھا:

زہے نشاط اگر کیجیے اسے تحریر — عیاں ہو خامہ سے تحریر نغمہ جائے صریر

اس سے آگے شعر سناتے جاتے تھے۔ میں تعریف کرتا جاتا تھا۔ وہ مسکراتے
جاتے تھے اور پڑھتے جاتے تھے۔ (جب یہ شعر پڑھا)

ہوا پہ دوڑتا ہے اس طرح سے ابرِ سیاہ — کہ جیسے جائے کوئی فیلِ مست بے زنجیر

بے اختیار میری زبان سے نکلا سبحان اللہ رنگینی اور یہ زور۔ ظہوری کا ساقی نامہ
مات ہو گیا۔ چُپ ہو گئے اور کہا (۹) کہ اس میں زور آتا جاتا ہے میں گھلا جاتا
ہوں۔ اس کی جوانی ہے اور میرا بڑھاپا ہے (۹) حافظ ویران مرحوم نے بیان کیا
اشعارِ بہاریہ کے لکھنے میں دو تین دفعہ فرمایا کہ خواجہ حافظ کا شعر بھی اس میں موقع
سے تضمین کر دیں گے۔

مے دو سالہ و معشوق چار دہ سالہ — ہمیں بس است مرا صحبتِ صغیر و کبیر

ایک دن جو میں گیا تو جو شعر پرچوں پر پریشان تھے انھیں ترتیب دیا تھا چناں چہ
سناتے سناتے پھر شعر مذکور پڑھا؛ بعد اس کے قطعہ پڑھا کہ خود کہا تھا: ہوا ہے...

سرست ہیں منیر دکبیر - میری طرف دیکھ کر فرمایا اب بھی؟ میں نے عرض کی سبحان اللہ ابھی اس کی کیا ضرورت رہی؟ آنکھیں بند کر کے فرمایا اِدھر ہی کا فیضان ہے۔

پتا نہیں اس واقعے سے آزاد کا مقصود ذوق کی قوتِ شعرگوئی کی تعریف ہے یا کچھ اور۔ "اُدھر ہی کا فیضان ہے" کا اشارہ ظفر کی طرف ہے یا خواجہ حافظ کی طرف۔ لیکن یہ قصہ بہ وجوہ مشکوک ہے۔ انھوں نے مبارک باد کا قصیدہ کہا" گویا کام مکمل ہو چکا۔ میں حاضر ہوا اور "وہ اُس وقت قصیدہ ہی لکھ رہے تھے" گویا کام جاری ہے۔ ایک لڑکے کی تعریف پر مسکرانا اور خوش ہو ہو کے شعر سُنانے لگنے کو اچھا نہیں سمجھتے۔ اس لیے مشکوک ہے کہ آزاد موقع بے موقع شعر سُناتے جانا۔ اِس کا اظہار وہ کئی شعرا کے باب میں کر چکے ہیں مثلاً معروفؔ، مومنؔ، ناسخؔ وغیرہ۔ یہ تو محض عقیدت ہے کہ "رنگینی اور یہ زور" اس میں کوئی رنگینی نہیں۔ ظہوری کا ساقی نامہ اِس "مذبرسانہ" (مذبرسانہ نہیں) شعر سے کیوں کرامات ہو سکتا ہے۔ یہ تعریف سُنی تو وہ "چُپ ہو گئے" اوّل تو چپ کیوں ہو گئے اور اگر چپ ہی ہو گئے تھے تو پھر" اور کہا" کا کیا مطلب؟ پھر ذوق نے جو کچھ کہا، اُن کی سنجیدگی اور شرافت سے میل نہیں کھاتا۔ یہ تو مزاج کی خباثت ہے اور یقیناً آزاد کا مقصد "اُستاد" کو ذلیل کرنا نہیں ہو سکتا۔ "حافظ ویران نے بیان کیا اشعارِ بہاریہ کے لکھنے میں دو تین دفعہ فرمایا" اِس کا مطلب ہے قصیدے کی تصنیف کے وقت آزاد موجود نہیں تھے اور نہ یہ گفتگو اُن سے ہوئی بلکہ بعد کے زمانے میں کسی وقت خواجہ حافظ کے شعر کی تضمین کی بات حافظ ویران نے آزاد کو بتائی تھی۔ پھر آزاد کا ایک دن جانا اور ذوق کا خواجہ حافظ کا ذکر نکال کر اپنے قطعے کی داد چاہنا تعجب انگیز ہے۔ (مذکورہ دو شعروں کو قطعہ آزاد ہی کہہ سکتے ہیں، ان میں کوئی ربط نہیں۔ دونوں آزاد شعر ہیں۔ ثبوت یہ بھی ہے کہ آزاد کے علاوہ جتنے نسخے دیوان کے شائع کیے گئے ہیں کسی میں ان اشعار کو قطعہ بند نہیں کہا گیا) اس کے علاوہ جب معاملہ آزاد سے پیش آیا ہی نہیں تو آزاد کا یہ کہنا بے معنی ہے کہ "اب اس کی کیا ضرورت رہی؟" آزاد جانتے تھے کہ ان کے افسانے میں جھول ہے۔ چناں چہ جب دیوان ترتیب دیا تو واقعے کی نوعیت بدل گئی۔ ملاحظہ ہو!

۱۸۵۱ء میں بادشاہ بیمار ہو کر اچھے ہوئے۔ بڑی خوشی ہوئی کہ اس بڑھاپے میں خدا نے دوبارہ زندگی دی۔ غسلِ صحت کا جشن قریب تھا۔ اُستاد نے مبارک باد کا قصیدہ شروع کیا۔ تمہید کی تحریر میں کہا تھا کہ خواجہ حافظ کا شعر بھی اس میں تضمین

نباشد والا ہے۔ فغاں کے احوال میں آزاد کے قلم سے ایک ایسا فقرہ نکل گیا ہے جو غدر میں ضائع ہو جانے کے قیاس کو رد کرتا ہے بلکہ اس سارے افسانے کو رد کرتا ہے: "ان کے جس دیوان سے میری آنکھیں روشن ہوئیں میرے استادِ ظاہر و باطن شیخ ابراہیم ذوق کے لڑکپن کا لکھا ہوا تھا"۔ معلوم ہوا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد اور تصنیفِ آبِ حیات کے وقت کوئی ایسا دیوان موجود تھا۔ آزاد کے کاغذ کا تو ایک پرزہ محفوظ ہے۔ بلکہ لوگوں نے تو دیواریں توڑ کر غیر مطبوعہ مواد کے دفتر برآمد کر لیے ہیں۔ پھر ذوق کے لڑکپن کا لکھا ہوا وہ دیوان کہاں گیا؟ تاہم اگر کبھی یہ دستیاب بھی ہو جائے تو محض ایک دیوان ہوگا' باقی ۹۔۷۹؟ یہاں یہ بھی نظر میں رہے کہ آزاد دلی سے صرف ذوق کی غزلوں کا جُنگ لے کر نکلے تھے! ہمیں یقین ہے کہ یہ فقرہ آب کی طبع دوم میں بڑھایا گیا ہوگا۔ اور آزاد کے ذہن سے یہ بات نکل گئی کہ وہ "استاد کے ہر کاغذ کو غدر میں تلف کر چکے ہیں سوائے غزلوں کے جُنگ کے جس پر تحقیقی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

۲۱۔ ایک دفعہ بادشاہ بیمار ہو کر اچھے ہوئے۔ غسلِ صحت کا جشن قریب تھا۔ انھوں نے مبارکباد میں قصیدہ کہا۔ میں حسبِ معمول خدمت میں حاضر ہوا۔ اور وہ اُس وقت قصیدہ لکھ رہے تھے۔ چناں چہ کچھ اشعار سنانے لگے۔ مطلع تھا:

زہے نشاط اگر کیجیے اسے تحریر   عیاں ہو خامہ سے تحریرِ نغمہ جائے صریر

اس سے آگے شعر سناتے جاتے تھے۔ میں تعریف کرتا جاتا تھا۔ وہ مسکراتے جاتے تھے اور پڑھتے جاتے تھے۔ (جب یہ شعر پڑھا)

ہوا پہ دوڑتا ہے اس طرح سے ابرِ سیاہ   کہ جیسے جائے کوئی فیلِ مست بے زنجیر

بے اختیار میری زبان سے نکلا سبحان اللہ رنگینی اور یہ زور۔ ظہوری کا ساقی نامہ مات ہو گیا۔ چُپ ہو گئے اور کہا (؟) کہ اس میں زور آتا جاتا ہے میں گھلا جاتا ہوں۔ اس کی جوانی ہے اور میرا بڑھاپا ہے (؟) حافظ ویران سلمہٗ نے بیان کیا اشعارِ بہاریہ کے لکھنے میں دو تین دفعہ فرمایا کہ خواجہ حافظ کا شعر بھی اس میں موقع سے تضمین کر دیں گے۔

مے دو سالہ و معشوق چاردہ سالہ   ہمیں بس است مرا صحبتِ صغیر و کبیر

ایک دن جو میں گیا تو جو شعر پرچوں پر پریشان تھے انھیں ترتیب دیا تھا چناں چہ سناتے سناتے پھر شعرِ مذکور پڑھا: بعد اس کے قطعہ پڑھا کہ خود کہا تھا: ہو لے ہے ...

رنڈیاں اپنے آقاؤں پر جوتیاں نہیں برسایا کرتیں۔ یہاں آزاد نے غیر شعوری طور پر (یا شعوری طور پر؟) مُغل بیگ سے ذوقؔ پر ڈھائے گئے مظالم کا بدلا لیا ہے جو آزاد کے خیال میں انھوں نے استاد کی تنخواہ ۴، ۵ اور ۷ روپے ماہانہ مقرر کر کے اُن پر ڈھائے تھے۔ آخری جملوں سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذوقؔ کے پاس کوئی عمل تھا جس سے وہ اس قسم کی خفیہ باتیں معلوم کر لیتے تھے۔ مثلاً کوئی موکّل تب تک عامل کے قبضے میں رہتا ہے جب تک وہ تسخیر سے پہلے کی گئی شرائط کا پابند رہتا ہے۔ جہاں اُس میں قصور ہوا، قوت و قبضہ زائل ہوا۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوتا معلوم ہوتا ہے۔ جوں ہی ذوقؔ نے گوشت کی بوٹی بتا کر بادشاہ کی بند مٹھی کھلوائی اُن کی اپنی مٹھی ہمیشہ کے لیے کھل گئی، اور عمل کی تاثیر جاتی رہی۔ انگوٹھی انعام میں کیا ملی، جن ہمیشہ کے لیے قبضے سے نکل گیا۔ اُس کے بعد حساب لگاتے رہے لیکن وہ بات نہ ہوئی نجوم ستاروں کا علم ہے — یہاں زور علم پر ہے — اور علم اس طرح یکایک زائل نہیں ہوا کرتا. جب تک نجومی کا ذہن کام کرتا ہے وہ حساب لگانے سے معذور نہیں ہو سکتا۔ اس داستان سے تو آزاد نے ذوقؔ کے نجوم سے دل برداشتہ ہو جانے کی بات بھی غلط کر دی۔ یہاں تو علم ہی چھن گیا ہے اور چھن جانے کو تائب ہونا نہیں کہہ سکتے۔ مقصد اس گفتگوے لاطائل سے یہ ہے کہ یہ سارے واقعات مولانا آزاد کے زرخیز ذہن کی پیداوار ہیں، اور بس۔ ذوقؔ سے انھیں کوئی تعلق نہیں۔

۲۹ - صاحب دانائے فرنگ کا مذاق اُڑانے کا واقعہ طبع اوّل میں نہیں تھا۔ اِن صاحب کے پردے میں ڈاکٹر لائٹنر ہیں جن سے آزاد کو دورانِ ملازمت بہت دُکھ پہنچا تھا۔ ہم اس پر "اِنشا کے حریف و حلیف" میں اظہارِ خیال کر چکے ہیں۔

۳۰ - فرماتے تھے میں نے ساڑھے تین سو دیوان اساتذہ سلف کے دیکھے اور ان کا خلاصہ کیا. قطع نظر اس سے کہ یہ ساڑھے تین سو دیوان، ترتیب دیوان کے وقت ساڑھے سات سو ہو گئے، ہمیں صرف یہ عرض کرنا ہے، اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ مان لیجیے کہ ساڑھے سات سو دیوان کسی ایک جگہ موجود بھی ہوں، تو اُن کا خلاصہ کرنے کے لیے خاصی فراغت اور طویل عمر کی ضرورت ہے، جو مولانا کے فراہم کردہ حالات کے مطابق ذوقؔ کو داخلِ دربار ہونے سے پہلے میسّر نہیں آئی۔ ہم یہ بھی مانے لیتے ہیں کہ ہمارے اندازے کے برعکس یہ دونوں چیزیں ذوقؔ کو حاصل تھیں، آخر وہ سارے خلاصے کہاں گئے؟ کہیں غدر میں ضائع ہو گئے، لیکن معاملہ دہی حافظ

اُس نے کہنا شروع کیا کہ حضور انھیں نجوم میں بڑا دخل ہے۔ (حالاں کہ خدشہ تھا کہ اُس سے ملتے نہ ہوں) ایک دن اُستاد گئے۔ بادشاہ محل میں تھے (پہلے شاید کہیں اور ہوتے تھے) خبر ہوئی۔ باہر آئے۔ (ذوقؔ ایسے ہی تو شاہِ عالم تھے کہ اُن سے ملاقات کے لیے بادشاہ کو باہر آنا پڑا۔ آزادؔ کو شاید یہ معلوم نہیں کہ نوکروں کو دربار میں جانے کی اجازت ہوا کرتی تھی نہ کہ جب جی چاہا بادشاہ کی ملاقات کو پہنچ گئے۔ شاہی محل نہ ہوا مسافر خانہ ہو گیا) مُٹھی سامنے بند کر کے ان سے پوچھا بھئی میاں ابراہیم اپنے نجوم سے حساب کر کے بتاؤ ہاتھ میں کیا ہے۔ وہ دل میں شرمندہ ہوئے۔ مگر حساب کر کے عرض کی کہ گوشت کی بوٗ معلوم ہوتی ہے ہنس پڑے اور مُٹھی کھول کر دکھا دی۔ وہی تھی۔ ہاتھ میں ایک سونے کی انگوٹھی تھی۔ وہ مرحمت فرمائی۔ انھوں نے اُس دن سے توبہ کی۔ پھر کبھی موقع آ ہی جائے تو حساب کر کے دیکھ لیتے تھے، وہ بات نہیں تھی۔

اس داستان کی غیر معقولیت ظاہر ہے لیکن اس پر یا ایسے ہی دوسرے واقعات پر دوسرے ناقدوں یا محققوں نے اظہارِ خیال نہیں کیا۔ اس لیے کچھ باتوں کی طرف توجہ دلانا لازم ہوا۔ مثلاً ابتدا میں ولی عہدی کا زمانہ تھا اور واقعہ اسی عہد سے متعلق، لیکن انجام تک پہنچتے پہنچتے عہدِ شاہی میں داخل ہو گیا ورنہ آزادؔ بادشاہ کو محل سے برآمد نہ کرتے۔ (یہ لغزش آزادؔ سے وہاں بھی ہوئی ہے جہاں ایک طعمہ مچھلیاں دو...... کا ذکر ہے) اور اگر بادشاہ سے مُراد اکبر شاہ ہیں تو یہ بھی مشکوک ہے کہ ان کے ہاتھ میں ایک سونے کی انگوٹھی تھی وہی ذوقؔ کو انعام میں دے دی۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نے اپنی کتاب میں ایک انگریز جوڑے کے بادشاہ کی ملاقات کو جانے کا ذکر کیا ہے، اور اُس کی زبانی بادشاہ کی تصویر کھینچی ہے۔ اُس میں بتایا ہے بادشاہ کے ہاتھ میں کئی انگوٹھیاں جگمگا رہی تھیں۔ آزادؔ کا فقرہ صریحاً ایک انگوٹھی پر دلالت کرتا ہے، اور یہ غلط ہے۔ اس سے قطع نظر کہ اس سے ذوقؔ کی سنجیدگی پر چھچھورپن کے سائے لہراتے نظر آتے ہیں، آزادؔ کو یہ خیال نہیں آیا کہ اس قسم کے احکام کو نجوم سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ سحر، جنتر منتر بلکہ تنتر (آپ جفر کہہ لیجیے) کے ذیل میں آتے ہیں۔ یہ ہٹھ یوگ کے شعبدے تانترک ہی معصوم لوگوں کو پھانسنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ آزادؔ کو اس کا بھی خیال نہیں رہا کہ رنڈیاں تنخواہ دار ملازم ہوتی تھیں اور یہ شغل روٗسا کا تھا۔ جب روشن بیگ کی ایک رنڈی تھی تو وہ رئیسوں میں شامل ہوئے، اور

سے پہلے کچھ ایسے غیر معمولی واقعات درج کر دیے جن سے نہ صرف پہلے واقعات کی تغلیط پر مہر تصدیق ثبت ہوگئی بلکہ ذوق کی سنجیدہ شخصیت میں چھچھورپن کا عنصر بھی شامل ہوگیا۔

۲۸ ۔ آبِ حیات میں آزاد نے ذوق سے موسیقی اس لیے چھڑوادی کہ " ابراہیم اگر بڑا کمال پیدا کیا تو ایک ڈوم ہوگئے۔ سپاہی زادے سے ڈوم بننا کیا ضرور ؟ " لیکن نجوم ورمل سے دل بُرداشتگی کے اسباب میں، ایک ایک ستارے کے حال اور خواص معلوم کرنے کے لیے ،، برس کی ضرورت ہوئی۔ شاید آزاد کو یہ سبب کچھ کم زور معلوم ہوا۔ چناں چہ دیوان کے مقدمے میں مندرجہ بالا واقعات کو تو ذوق کے طبیعی حالات اور عادات کے ذیل میں رہنے دیا اور موسیقی اور نجوم کے شوق کا ذکر ان کے علم و معلومات کے ساتھ کر دیا اور وہاں لکھا :

نجوم چھوڑنے کا سبب یہ بھی ہوا کہ ولی عہدی کا زمانہ تھا۔ مرزا مغل بیگ کا بھائی روشن بیگ اور بھائی بندوں کی طرح بے علم و بے تربیت جاہل تھا۔ غریبی سے بھائی کی بدولت آسودہ ہوگیا تھا۔ وضع کو تراشتا تھا۔ سرکار میں صاحب خدمت تھا۔ کاروبار میں دخیل تھا۔ یہی لوگ اجزائے دربار تھے۔ (یاد رہے کہ مغل بیگ کا سارا خاندان بہ روایتِ آبِ حیات اُن کے دورِ وزارت میں قلعے میں بھر گیا تھا۔ اب ولیعہدی میں یہی لوگ اجزائے دربار ہوگئے) اُستاد جاتے انھیں میں بیٹھنا اور وقت گزارنا پڑتا۔ اُن دنوں جوانی کا عالم تھا۔ اُس سے ہنسا کرتے اور دل بہلایا کرتے۔ (آزاد کے سارا زورِ بیان صَرف کرنے کے باوجود ذوق کی تصویر کسی زاہدِ خشک سے مختلف نہیں بن پائی۔ ہنسی تو شاید ان کے لیے عجوبہ تھی) اُس کی ایک رنڈی بھی تھی۔ اُستاد کبھی کبھی کہتے کہو تمھاری وہ کیسی ہیں ؟ وہ کہتا خوب ! اُن دنوں احکام نجوم کی مشق چڑھی ہوئی تھی۔ کبھی گھر سے کبھی وہیں حساب لگا کر دیکھ لیتے اور کہتے کیوں جی آج رات تو جوتی چلتی رہی۔ (یہ غالبًا معروف کے اُس فقرے کا اثر ہے جو آزاد نے ان سے میرزا خانی کے حق میں کہلوایا ہے) کبھی معلوم ہوتا تو کہتے کیوں رات تو مزے میں تھے۔ کیوں جی وہ عطر ہی پر بگڑی تھی یا اور بات پر۔ روشن بیگ سوچتا کہ انھیں کہاں سے خبر ہو جاتی ہے۔ اُسے وہم یہ تھا کہ شاید اس سے ملتے نہ ہوں۔ گھبراتا اور شرماتا۔

مُرتّب نے حاشیے میں لکھا ہے کہ یہ شعر انشا اور یہ شعر ناسخ کا ہے، اس کے باوجود انھیں شامل متنِ کُلیاتِ ذوق کیا گیا ہے۔ لیکن مذکورہ شعر کلیات میں بھی نہیں۔

مولانا نے اگرچہ واقعۂ زیرِ بحث کو سرسری بنا کر قلم بند کیا ہے لیکن اصلاً اُن کا مقصد اس کے برعکس ہے ورنہ اِن جُملوں کا کیا مطلب: "میرا مطلب یہ نہیں کہ انھیں کرامات تھی یا وہ غیب دان تھے۔ ایک حسنِ اتفاق تھا، اہلِ ذوق کے لطفِ طبع کے لیے لکھ دیا" (اس "اہلِ ذوق" کے انتخاب کی داد کچھ وہی لوگ دے سکتے ہیں جو مولانا کے اسلوب سے بخوبی واقف ہیں۔ یہاں ذوق عَلَم ہے جس طرح اِس فقرے میں "انھیں میں سے ایک صاحب کے الطاف وکرم کا شکر گزار ہوں" یہ فقرہ آب کی طبعِ اوّل میں مومن کا ذکر قلم انداز ہو جانے کی معذرت میں ہے۔ الطاف کا اشارہ مولانا الطاف حسین حالی کی طرف ہے جنھوں نے مومن کے حالات فراہم کیے تھے لیکن کلام پر رائے نہیں لکھی تھی، ورنہ یہ لطف وکرم ہوتا) اگر محض "اہلِ ذوق" کے لطفِ طبع کے لیے تھا تو اگلے واقعے کی کیا ضرورت تھی جس پر زورِ ابتدا کے اس فقرے سے دیا: "اس سے بڑھ کر یہ کہ ......" مطلب یہ کہ اس سے پہلے مذکور واقعہ بہت معمولی تھا، ذیل کا واقعہ اس سے بڑھ کر ہے اور پھر شمشیر کھنچ جانے کے قصّے ہیں صداقت اس فقرے سے پیدا کرنا چاہی: "ایسے معاملے کتبِ تواریخ اور تذکروں میں اکثر منقول ہیں" بڑا نظر فریب بلکہ "ذہن فریب" فقرہ ہے۔ آزاد اپنے سادہ دل قاری کو یہ باور کرواتے ہیں کہ تاریخ اور تذکروں میں گویا ایسے واقعات ذوق کی پیش گوییوں کے ساتھ درج ہیں۔ اب تصدیق کے لیے کون تاریخ اور تذکروں کی ورق گردانی کی کھکھیڑ اُٹھائے گا۔ اور جب ورق گردانی سے پہلو بچائے گا تو پھر مُصنّف کے بیان کو بے حیل وحُجّت قبول کرلے گا۔

یہ دو واقعات ذوق کی غیب دانی کا نقش بٹھانے کے لیے کافی تھے لیکن ابھی آزاد کی طبیعت نہیں بھری تھی۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ مبادا قاری کی دلچسپی کم ہو جائے اور اس کا ذہن بھٹک کر کچھ اور سوچنے پر مائل ہو۔ لہٰذا فرمایا: "طولِ کلام کے خیال سے قلم انداز کرتا ہوں" اب قاری کا ذہن کچھ دوسرے واقعات سننے کے لیے تیار ہو گیا۔ لیکن آزاد نے موضوع بدلنے کی بجائے اِسی قبیل کا ایک واقعہ خواب کے پردے میں بیان کر دیا۔ اس کے باوصف آزاد کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال کھٹکتا رہا کہ قاری کو مرعوب کرنے کے لیے یہ تین واقعات بہت کم ہیں۔ چناں چہ جب دیوان مرتّب کیا تو اِن واقعات کو تو اپنی جگہ رہنے دیا لیکن اِس

آزاد غیر معمولی واقعات بڑی چابک دستی سے تراشتے ہیں۔ قاری ان پر یقین کرے اس کے لیے وہ بہ تکرار انھیں معمولی کہہ کر ان کی "غیر معمولیت" کو اس حد تک کم کر دیتے ہیں کہ قاری انھیں عام اور روز مرّہ کی باتیں سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مولانا نے یہی ان واقعات میں کیا ہے۔ حسبِ معمول راوی نہایت معتبر چُنا ہے۔ تاہم فرضی واقعات میں کہیں نہ کہیں چوک جانا فطری ہے۔ لہٰذا آزاد سے بھی چوک ہوئی۔ یہاں اِس اعتراف کے ساتھ کہ مندرجہ بالا واقعات کچھ ایسے بعید از امکان بھی نہیں، ایسے واقعات پیش آسکتے ہیں اور پیش آتے رہتے ہیں، پھر بھی ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اِن میں کوئی صداقت نہیں۔ یہاں مصنّف کے مقصدیاتیت پر غور کرنا ضروری ہے۔ اِن کے تراشنے سے مقصد یہ ہے کہ ذوق کو نہ صرف نجوم میں "دستگاہ" تھی بلکہ وہ غیب داں بھی تھے۔ بہرحال اِن کے فرضی ہونے کے دلائل ہم سے سُن لیجیے۔

پہلا واقعہ راوی کے معتبر ہونے کے باوجود اس لیے غلط ہے کہ جس شعر پر یہ واقعہ تراشا گیا ہے وہ ذوق کا نہیں خود مولانا آزاد کا کہا ہوا ہے۔ ثبوت یہ ہے کہ اس کے راوی حافظ ویران ہی نے سب سے پہلے دیوان مرتب کیا تھا، اور اُس میں یہ شعر نہیں ہے۔ (جیسا کہ ذکر ہوا یہ شعر غلط ہے اگرچہ غلطی کا امکان ذوق سے بھی ہے) تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لیجیے کہ ترتیبِ دیوان کے وقت یہ شعر ویراں کے ذہن سے اُتر گیا (حالاں کہ ایسے اشعار جو کسی واقعے سے متعلق ہوں اور استاد کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوں، وہ مشکل ہی سے بھولتے ہیں، خصوصاً عقیدت مند شاگردوں کو) لیکن مولانا آزاد کو تو یہ شعر یاد رہنا ہی چاہیے تھا۔ سب سے پہلے یہ شعر آب میں نقل ہوا ہے۔ اس کا بھی ثبوت موجود ہے کہ ترتیبِ دیوان کے وقت مطبوعہ آبِ حیات آزاد کے پیشِ نظر تھی۔ اس کے باوجود یہ شعر متن میں نہ غزلوں کے تحت درج ہے نہ متفرقات کے ذیل میں۔ موجودہ زمانے میں ہمارے ایک اُستاد نے کلیاتِ ذوق مُرتّب کیا جو پاکستان سے دو جلدوں میں اور ہندستان سے ایک جلد میں شائع ہُوا ہے۔ اُس میں مُرتّب نے یہ التزام کیا ہے کہ جو شعر ایک بار ذوق سے منسوب ہو گیا خواہ وہ ذوق کا نہ بھی ہو، اُسے کُلیات میں ضرور شامل کیا جائے۔ چناں چہ وہ بے شمار اشعار جن کا علم صرف مولانا آزاد کی روایت سے ہوا، سب شاملِ کلیات ہیں (وہ اشعار بھی جو بہ قول شیرانی مرحوم اسکولی کاپیوں کے کاغذوں پر لکھے گئے ہیں اور آزاد کے اپنے قلم سے ہیں) ان کے علاوہ اُستاد ناسخ وغیرہ کے وہ مطلعے جن کے لیے

ابرو کی اُس کے بات ذرا چل کے تھم گئی   تلوار آج ماہ لقا چل کے تھم گئی

(یہ شعر غلط ہے۔ لہٰذا ذوق سے اِس کا اِنتساب مشکوک ہے۔ پہلے مصرعے میں ضمیر غائب ہے اور دوسرے مصرعے میں مخاطب خود محبوب ہے لیکن دیوان کی ترتیب کے وقت آزاد کو یہ شعر یاد نہیں رہا۔ اُن کے بعد تنویر علوی صاحب نے کلیاتِ ذوق مرتب کیا۔ جہاں انھوں نے دوسروں کے نام سے کہے ہوئے ذوق کے اشعار اُس میں شامل کر لیے، اس شعر کو نظر انداز کر دیا۔ اگر کسی دوسرے نسخے یا تذکرے میں ہوتا تو کلیات میں شامل ہو جاتا۔)

دو تین شعر ہوئے تھے کہ خلیفہ اسمٰعیل دربار سے پھر کر آئے اور کہا اس وقت عجیب معرکہ دیکھا . . . کہ جب میں بھوانی شنکر کے چھتے کے پاس پہنچا تو کھاری باولی کے رُخ پر دیکھا کہ دو تین آدمی کھڑے ہیں اور آپس میں تکرار کر رہے ہیں۔ باتوں باتوں میں ایسی بگڑی کہ تلوار کھنچ گئی دو تین آدمی زخمی بھی ہوئے۔ یہاں چوں کہ غزل کے اشعار حافظ ویران سُن رہے تھے ہنس کر بولے کہ حضرت آپ کیا وہاں موجود تھے۔ آہستہ سے فرمایا کہ یہیں بیٹھے بیٹھے سب کچھ ہو جاتا ہے۔ اِس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ انھیں کرامات تھی یا وہ غیب داں تھے (اگر یہ مطلب نہیں تھا تو پھر "یہیں بیٹھے بیٹھے . . ." کا کیا مطلب ہے ؟) ایک حسنِ اِتفاق تھا اہلِ ذوق کے لطفِ طبع کے لیے لکھ دیا۔

ب : اس سے بڑھ کر یہ کہ ایک دن حضور میں غزل ہوئی جس کا مطلع تھا :

آج ابرو کی تری تصویر کھنچ کر رہ گئی   سُنتے ہیں بھوپال میں شمشیر کھنچ کر رہ گئی

پھر معلوم ہوا اُسی دن بھوپال میں تلوار چلی تھی۔ ایسے معاملے کتبِ تواریخ اور تذکروں میں اکثر منقول ہیں (کیا ذوق کے نام کے ساتھ ؟) طولِ کلام کے خیال سے قلم انداز کرتا ہوں۔

قلم انداز کرنے کے باوجود ایک واقعہ اور لکھا :

ج : ایک دفعہ دوپہر کا وقت تھا۔ باتیں کرتے کرتے سو گئے۔ آنکھ کھلی تو فرمایا کہ ابھی خواب دیکھا کہیں آگ لگی ہے۔ اتنے میں خلیفہ صاحب آئے اور کہا۔ پیر بخش سوداگر کی کوٹھی میں آگ لگ گئی تھی۔ بڑی خیر ہوئی کچھ نقصان نہیں ہوا۔

ہے۔ لہٰذا ان کی تاریخ وفات آزاد نے ذوق سے منسوب کر دی۔ یہی نہیں تاریخ ولادت کے سلسلے میں بھی آزاد نے یہی رویہ اپنایا ہے۔ مثلاً ذوق کی تاریخ ولادت کا علم نہیں صرف سنہ معلوم ہوتا ہے اور وہ بھی دہلی اردو اخبار سے۔ خود آزاد کے بیشتر کچھ واقعات اس سنہ کی تصدیق کرتے ہیں۔ آبِ حیات میں تاریخِ پیدایش کا ذکر نہیں۔ آزاد نے صرف سنہ لکھا ہے اور وہ بھی غلط، یعنی ۱۲۰۴۔ ذوق کی ولادت ۱۲۰۳ھ میں ہوئی جو دہلی اردو اخبار میں موجود ہے لیکن آزاد نے اس پر توجہ نہیں دی۔ جب دیوان مرتب کیا تو بھی ۱۲۰۴ھ لکھا لیکن بہ قول صاحب "ذوق سوانح اور انتقاد" دیوان کی ترتیب کے وقت مولانا نے آبِ حیات کے مطبوعہ نسخے کو سامنے رکھا ہے اور اس کے حاشیے میں بغیر کسی حوالے کے یہ تصریح بڑھا دی "۱۲ ذی الحج ۱۲۰۴ھ میں شیخ محمد رمضان کے گھر یہ مبارک چاند نکلا جو آسمانِ سخن پر عید کا چاند ہو کر چمکا۔" ڈاکٹر علوی کو خود مولانا کی تاریخِ پیدایش یاد نہیں تھی، ورنہ انھیں حوالے کی کمی نہ کھٹکتی۔ اپنی تمام تر پریشانیوں کے باوجود آزاد نے ایک کامیاب زندگی بسر کی۔ آبِ حیات کی تصنیف سے دیوانِ ذوق کی تدوین تک کے زمانے میں ان کی شہرت اپنے عروج پر تھی۔ انھوں نے ناسخ کی زبانی سرکارِ انگلشیہ سے خطاب ملنے کی جس حسرت کا اظہار کروایا ہے، اُن کی وہ حسرت بھی پوری ہوئی اور اپنے ساتھیوں میں سب سے پہلے وہی شمس العلما ہوئے۔ اُن کا تاریخی نام "ظہورِ اقبال" تھا جو بہ قول آغا محمد باقر خود ذوق کا رکھا ہوا تھا۔ لہٰذا آزاد کی نظر میں اپنی تاریخِ پیدایش سے زیادہ مبارک کون سی تاریخ ہو سکتی تھی؟ چناں چہ انھوں نے اپنی تاریخ ولادت ۸ ار ذی حجہ میں دانستہ یا نادانستہ ایک ہفتے کا فرق ڈال کر "استاد" کو بخش دی۔

۲۷۔ متفرق واقعات

قوتِ حافظہ کے ذیل میں ذوق کی زبانی بستر میں بلی گھس آنے کا واقعہ بیان کر کے لکھا ہے کہ جب ذوق نے اپنی والدہ سے اس واقعے کی تصدیق چاہی تو انھوں نے نہ صرف اُس کی تصدیق کی بلکہ یہ بھی فرمایا "فی الحقیقت اُس وقت تیری عمر برس دن سے کچھ کم تھی" اور یہ ممکن نہیں۔ نجوم اور رمل سے متعلق آب میں صرف اتنا لکھا تھا "نجوم و رمل کا بھی شوق کیا۔ اُس میں دستگاہ پیدا کی" پھر کچھ واقعات تراشے:

الف: حافظ ویران کہتے ہیں ایک دن عجیب تماشا ہوا۔ آپ بادشاہ کی غزل کہہ رہے تھے۔ مطلع ہوا کہ:

ـــہ کہتے ہیں آج ذوقؔ ...... (آزاد نے قطعیت سے موت سے تین گھنٹے پہلے کر دیا)
اس بیان میں بھی اگرچہ انگریزی تاریخ غلط ہوگئی ہے (تفصیل آگے آتی ہے) تاہم ہجری تاریخ درست ہے۔ یہ معلوم ہوا کہ صرف ۸ دن بیمار رہے تھے۔ (۷ رہوتے تو ہم ۷ ارکو کتابت کی غلطی سمجھ لیتے) تین دن کے بعد بخار سے افاقہ ہوا تھا لیکن پیچش کا پُرانا مرض عود کر آیا اور وہی جان لیوا ثابت ہوا۔ ایک شاگرد کو جو اُسی شہر میں تھا اور ہر وقت کا حاضر باش تھا، کم از کم مرض کی کیفیت اور مدت تو معلوم ہونا ہی چاہیے تھی۔

اب رہی تاریخ وفات، آزاد لکھتے ہیں ۲۴ر صفر ۱۲۷۱ھ جمعرات کا دن تھا، اور گلستانِ سخن، جو ۱۲۷۱ھ میں مکمل ہوا، اُس میں لکھا ہے "چہارشنبہ کے روز جنازہ اُس عظمت و شان سے اٹھا کہ حاضرین کو گماں تھا تختۂ تابوت پر تختِ سلیماں کا" (بحوالہ ذوق سوانح اور انتقاد) اب اگر انتقال جمعرات (پنج شنبہ) کو ہوا تو جنازہ چار شنبے کو اٹھایا جانا مشکوک ہے۔ خود دہلی اردو اخبار جو آزاد کے والد نے جاری کیا تھا اور اُس زمانے (اپریل ۱۸۴۹ء) میں خود آزاد کا نام مہتمم کی حیثیت سے اخبار پر آنے لگا تھا، میں جو تفصیل شائع ہوئی ہے وہ یقیناً آزاد کے علم میں ہوگی لیکن آزاد نے اُس سے انحراف کیا ہے، "... خاقانیِ ہند شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ اُستادِ حضور والا نے شب ۲۳ر صفر شبِ آخر چہارشنبہ ۱۲۷۱ھ مطابق پندرہ نومبر ۱۸۵۴ء عالمِ فانی سے بسوئے عالمِ جاودانی رحلت کی" (تتمہ ۱۸ر نومبر ۱۸۵۴ء بحوالہ ذوق سوانح اور انتقاد) یہ تاریخ درست ہے۔ یہاں ہجری تاریخ عیسوی سنہ سے مطابق ہے۔ اس لحاظ سے ذوقؔ کا انتقال شب چہارشنبہ بہ وقتِ آخر شب بتاریخ ۲۳ر صفر ۱۲۷۱ھ ہوا۔ اب سوال یہ ہے کہ آزاد نے غلط تاریخ اور دن کیوں لکھا؟ جواب ہے جوشِ عقیدت۔ آزاد نے کوشش کی ہے کہ جتنی سعادتیں ممکن ہیں وہ سب استاد ذوقؔ کے حصے میں آجائیں۔ کوئی ایسی خوبی اور ایسی سعادت نہ ہو جس سے ذوقؔ محروم رہ جائیں۔ ظاہر ہے کوئی انسان تمام تر خوبیوں اور اچھائیوں کا مُرقع نہیں ہوسکتا، لیکن مولانا کو اس سے غرض نہیں۔ چناں چہ اُن کی نظر میں ذوقؔ شاعر ہیں تو لاثانی؛ عالم ہیں تو بے بدل، مُورخ ہیں تو عدیم المثال۔ مُنجم بھی ہیں موسیقار بھی، اور صوفی بھی (تصوف میں ایک عالم خاص تھا") بہ حیثیت انسان اُن کا کوئی جواب نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں بہ گمانِ خویش جہاں کوئی سعادت نظر آئی، اُنھوں نے اُسے ذوقؔ سے منسوب کر دیا۔ ۲۴ر صفر اور جمعرات کے دن اُس دَور کے سب سے بڑے صوفی شاعر کا انتقال ہوا تھا۔ ہماری مراد خواجہ میر درد سے

۲۶۔ جس رات کو صبح ہوتے انتقال ہوا قریب شام میں بھی موجود تھا کہ انھیں پیشاب کی حاجت معلوم ہوئی۔ خلیفہ صاحب نے اُٹھایا۔ چوکی پاٹنی لگی ہوئی تھی۔ ہاتھ کا سہارا دیا اور انھوں نے کھسک کر آگے بڑھنا چاہا۔ طاقت نے یاری نہ دی تو کہا آہ ناتوانی۔ خلیفہ صاحب نے فرمایا شاعروں ہی کا ضعف ہوگیا۔ حافظ ویران بھی بیٹھے تھے۔ وہ بولے کہ آپ نے بھی ضعف کے بڑے بڑے مضمون باندھے ہیں۔ مسکرا کر فرمایا کہ اب تو کچھ اُس سے بھی زیادہ ہے۔ میں نے کہا سبحان اللہ اس عالم میں بھی مُبالغہ قائم ہے۔ خدا اسی مبالغے کے ساتھ توانائی دے۔ میں رخصت ہوا۔ رات اُسی حالت میں گزری۔ صبح ہوتے کہ ۲۴ صفر ۱۲۷۱ جمعرات کا دن تھا، ۱۷ دن بیمار رہ کر وفات پائی۔ اس سے تین گھنٹے پہلے یہ شعر کہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔

اِس سارے بیان میں صداقت صرف اِتنی ہے کہ ذوق کا اِنتقال صفر ۱۲۷۱ھ میں ہوا تھا۔ باقی سب آزاد کے ذہن کی پیداوار ہے۔ ایک قریبی عزیز یا عزیز شاگرد کا اُستاد کے مرض الموت میں پاس ہونا معمولی اور فطری بات ہے۔ بہ ظاہر اس میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں، لیکن اگر آزاد کے مزاج کی اُفتاد پر نظر ہو تو اُن کا بیان کردہ ہر واقعہ مشکوک لگنے لگتا ہے۔ مثلاً ہمارا خیال ہے کہ آزاد ذوق کے شاگرد نہیں تھے۔ اس لیے اُن کی دن رات کی حضوری بھی مشکوک ہے۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ آزاد ذوق کے اِنتقال کے وقت یا اُس سے پہلی رات وہاں موجود نہیں تھے۔ اگر موجود ہوتے تو اِس واقعے کا ذکر آب کی طبع اوّل میں آتا۔ معلوم ہوا کہ طبع دوم کے وقت آزاد نے ایک واقعہ تراشا اور داخلِ کتاب کر دیا تاکہ شاگردی مُسلّم ہوجائے۔ حق تو یہ ہے کہ آزاد کو ذوق کی بیماری کی تفصیل کا علم ہے اور نہ صحیح دن اور تاریخ وفات کا۔ ۱۷ دن کی بیماری بھی خلافِ واقعہ ہے، لیکن یہ مبالغہ ضعفِ بدن دکھانے کے لیے کم از کم اتنی علالت تو ضروری تھی۔ ذوق کے آخری ایّام سے متعلق صاحب " ذوق سوانح اور اِنتقاد " نے (غالباً دہلی اردو اخبار) سے یہ بیان نقل کیا ہے ؛

> بتاریخ ۵ ماہ صفر ۱۲۷۱ء (؟ ہجری) مطابق ۱۸ اکتوبر سن حال (کذا) عارضہ بخار میں مبتلا ہوئے۔ تین دن کے بعد بخار سے افاقہ ہوگیا۔ لیکن مرض پیچش کہ عارضہ معتاد اُن کا تھا، لاحق ہوا۔ انجام کو عارضہ بواسیر کی شکایت زیادہ تھی۔ لیکن بدمزگی و ضعف اِس شدت سے تھا کہ بیان سے باہر ہے۔ اس حالت میں یہ مقطع کہا تھا۔

تفاخر ؎ شب کو میں اپنے سر بستر راحت' میں نمایاں ہے۔ اور اس میں بھی لہجہ نہایت منکسرانہ بلکہ فدویانہ معلوم ہوتا ہے۔ اگر اُن میں جذبۂ رشک و رقابت شدید ہوتا اور اُنھیں اپنے کلام کا اتنا ہی دعویٰ ہوتا جتنا آزاد نے دکھانا چاہا ہے' تو اُن کے کلام میں بہ تواتر اس کا اظہار ہوتا۔ اُن کے مقابلے میں اُنکے معاصرین مثلاً مومن اور غالب کے یہاں تفاخر کی لے بہت بڑھی ہوئی ہے' اور وہ شاعرانہ تعلّی کو معمولی بات سمجھتے ہیں۔ اس ضمن میں اُن کا لہجہ بھی بہت بلند آہنگ اور شدید ہے مثلاً مومن بخدا سحر بیانی کا جبھی تک بہ ہر ایک کو دعویٰ ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا لیجے کی یہ تندی ذوق کو نہیں ملی۔ غالب کے کلام میں تو فخر و تعلّی کا اظہار طرح طرح سے ہوا ہے۔ ذوق تو معرکوں میں بھی بہت منکسر نظر آتے ہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آزاد کو مرزا مغل بیگ سے کیا ناراضگی تھی۔ اُنھوں نے صاحب نسبت فقیر کے سامنے ذوق کی زبانی جو کچھ کہلوایا ہے اُس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ "الف کے نام ب نہیں جانتے" تھے یعنی لکھنے پڑھنے سے یکسر معذور تھے۔ خدا جانے ایسا شخص برسوں مختار اور چندے وزیر شاہی کیوں کر رہا ؟ آزاد نے ذوق کو سو روپے مہینے تک پہنچایا ہے لیکن اس سے مطمئن نہیں۔ اس پردے میں آزاد اپنے دل کا دُکھ بیان کر رہے ہیں۔ اپنی تمام تر محنت اور علم و فضل کے باوجود اُن کی تنخواہ ڈیڑھ سو روپے سے آگے نہیں بڑھی' اور یہ ساری بے اطمینانی اس کی ہے ورنہ ذوق کو ایسی کوئی شکایت نہیں تھی۔ ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ اُن کا علم و فضل آزاد کا مقابلہ نہیں کرتا۔ اُنھیں اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں نہ وہ محنت کرنا پڑی اور نہ مشقتیں اٹھانا پڑیں۔ اُن کا کام تو "نظم میں حضور کو دُعا کرنا" تھا۔ اس کے برعکس آزاد نے کیا کیا نہیں کیا۔ (تفصیل محمد حسین آزاد' ج ۱' میں دیکھی جا سکتی ہے) پھر اگر یہ دُرست ہے کہ ذوق کے سو روپے مہینا ہو گئے تھے تو اُس زمانے کے لحاظ سے بہت تھے۔ اس میں شکایت یا بے اطمینانی تو تب پیدا ہوتی جب تنخواہ اُن کے اخراجات کو کفایت نہ کرتی۔ غالب کو اتنا کچھ ملتا ہے۔ اس کے باوجود وہ " بھوکا ننگا" نظر آتا ہے۔ ذوق کا خرچ ہی کیا تھا۔ ساری زندگی ایک تنگ و تاریک مکان میں ٹوٹی پھوٹی چھوٹی سی چارپائی پر بیٹھے گزاردی۔ نہ شراب پئیں اور نہ جُوا کھیلیں۔ نوکروں میں لے دے کے ایک بوڑھا ملازم۔ نہ شان و شوکت سے رہنا نہ شوق اظہار۔ اُن کی سب سے بڑی عیاشی' تو حقہ منہ سے لگائے رہنا ہے۔ پھر وہ بے چارے شکایت کس بات کی کرتے۔ یہ آزاد کے دل کا کرب ہے جو روپ بدل کر ذوق کی زندگی میں جلوہ گر ہُوا ہے' اور بس۔

یوں پھریں اہلِ کمال آشفتہ حال افسوس ہے   اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

(یہ شعر ذوق کے کلام میں نہیں ملتا۔ دیوان مرتبۂ آزاد میں بھی نہیں)

یہ خود مولانا نے اپنے غم و غصے کا اظہار کیا ہے، اس کو ذوق سے کیا تعلق؟ اس کے راوی بھی آزاد، مصنف بھی وہی۔ آخر بڑی سے بڑی ترقی یا انعام کے ایسے کون سے موقعے آئے جن کا فائدہ استادِ شاہی کو نہ پہنچا۔ اگر یہ بیان درست ہے تو پھر ان بیانوں کو کیا سمجھا جائے گا جن میں خطابات بھی ہوئے، انعام بھی ملے اور ان کا تعلق عہدِ ولی عہدی سے بھی ہے اور بادشاہی سے بھی۔ بہرحال اس کے بعد آزاد نے میاں عبدالعزیز خاں صاحب ایک مرد بزرگ صاحب نسبت فقیر کے سامنے ذوق سے شکایت پیش کروائی ہے۔ اس کے آخر میں لکھتے ہیں:

"شیخ مرحوم نے اُن کی ہدایت کو تسلیم کیا اور پھر کبھی شکایت نہ کی۔

چند روز کے بعد مرزا مُغل بیگ کی تُرکی تمام ہوگئی۔ تمام کُنبا قلعہ سے نکالا گیا۔

حامد علی خاں مرحوم مختار ہوگئے۔ جب اُستادِ شاہی کا سو روپیا مہینا ہُوا۔ ہمیشہ عیدوں اور نوروزوں کے جشنوں میں قصیدے مبارک باد کے پڑھتے تھے اور خلعت اور اعزاز پاتے تھے۔"

ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ استادِ شاہ کو اعزاز و اکرام سے نوازا نہیں جاتا ہوگا یا اُن کی ترقیاں نہیں ہوئی ہوں گی، لیکن مذکورہ تفصیل مشکوک ہے۔ اس کی تصدیق کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہوتی۔ مثلاً اس بیان سے اندازا ہوتا ہے کہ ظفر ولی عہدی اور شاہی میں بھی اپنے مختار مرزا مُغل بیگ یا حامد علی خاں کے دستِ کرم کے محتاج تھے۔ نہ ولی عہدی میں اور نہ ہی بادشاہی کے بعد اپنی مرضی سے اپنے اُستاد کی تنخواہ ۔۔۔ اضافہ کر سکتے تھے۔ اگر وہ مختاروں کو حکم دیتے تو یہ ناممکن تھا کہ اس کی تعمیل نہ ہوتی۔ اس میں تاخیر اور لیت و لعل ممکن ہے لیکن یکسر عدول حکمی ممکن نہیں۔ ۔۔ روپے تو آزاد نے ملک الشعرائی کے چار ستون قائم کرنے کے لیے لکھا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ یہ رقم ولی عہد اور شاہ کے استاد کے لیے بہت کم ہے۔ کسی دربان یا سپاہی کے لیے ہو تو ممکن ہے۔ اس کے علاوہ کلامِ ذوق کا بالاستیعاب مطالعہ بتاتا ہے کہ اس میں شکوہ و شکایت کا عنصر نہ ہونے کے برابر ہے۔ شاعرانہ تفاخر و تعلّی سے بھی انھیں کوئی خاص بہرہ نہیں۔ ان کی شدید ترین تعلّی اس سے آگے نہیں بڑھی ۔

جس کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سنا دو اُس کو   دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخن ور سہرا ، اور

کا پرچہ نکلا تھا جس میں ساچق کا مضمون بقلم ذوق موجود تھا تو پھر "شعر اب تک یاد ہیں" کے کیا معنی؟

۲۵۔ خاقانیِ ہند کے خطاب پر پرچوں کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ (یہاں اس امر کا اظہار بے جا نہ ہوگا کہ ذوق کا خطاب ملک الشعرا کی بجائے سلطان الشعرا تھا۔ دہلی اردو اخبار سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ مرزا غالب نے بھی ایک جگہ انھیں سلطان الشعرا ہی لکھا ہے۔ مصنفِ "ذوق سوانح اور انتقاد" نے اس کا ذکر تو کیا ہے تاہم انھیں ہمیشہ ملک الشعرا ہی لکھا ہے اُن کی دلیل یہ ہے کہ معاصر تذکروں میں اکثر انھیں ملک الشعرا کہا گیا ہے۔ نیز مغل درباروں میں سلطان الشعرا کی روایت نہیں ملتی۔ لہٰذا ملک الشعرا درست قرار پایا۔ تنویر علوی صاحب نے اس پر غور نہیں فرمایا کہ دہلی اردو اخبار نہ صرف معاصر ہے بلکہ اُس کے مالک و مدیر ذوق کے قریبی دوست اور مولانا آزاد کے والد تھے۔ اُنھوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ غالب بھی معاصر شہادت ہے اور دونوں کو غلط بیانی کی ضرورت نہیں تھی۔ تذکروں میں ملک الشعرا کا لکھا جانا ـــــ حالاں کہ معاصر تذکروں میں یہ ہے نہیں شیفتہ نے صرف خاقانیِ ہند لکھا ہے۔ اس کے بعد کے تذکروں کی سند قابلِ قبول نہیں ـــــ بھی اسی سبب سے ہے کہ مغل درباروں میں سلطان الشعرا کی روایت نہیں ملتی، اور تذکرہ نگاروں نے عادتاً ملک الشعرا لکھ دیا ـــــ جب معاصر شہادتیں سلطان الشعرا کی ہیں تو علوی صاحب کو اسی کو ترجیح دینا تھی۔ اگر اتفاقاً ایک غلط لفظ کو شہرت ہوگئی تو وہ درست تو نہیں ہو جاتا۔) یہاں فقط اتنا عرض کرنا ہے کہ آزاد نے جس قصیدے پر خاقانیِ ہند کا خطاب ملنا بتایا ہے، وہ درست نہیں۔

۲۶۔ "مبارک ہو شاگرد بادشاہ ہوا" کے تحت آزاد نے استادِ شاہ کی تنخواہ و ترقی کے پردے میں دوسروں خصوصاً مرزا مغل بیگ کی کینگی کو ابھارنا چاہا ہے، ملاحظہ ہو:

> اگرچہ مرزا ابوظفر انھیں دل سے عزیز رکھتے تھے اور دلی رازوں کے لیے مخزنِ اعتبار سمجھتے تھے مگر ولی عہدی میں مرزا مغل بیگ مختار ہوئے۔ جب کبھی بڑی سے بڑی ترقی یا انعام کے موقعے آئے تو اُستاد کے لیے یہ ہوا کہ للعہ مہینے سے صر ہوگئے۔ جب بادشاہ ہوئے اور مغل بیگ وزیر ہوئے تو وزیر شاہی کا سارا کنبہ قلعہ میں بھر گیا۔ مگر اُستادِ شاہی کو سہ مہینا۔ پھر بھی اُنھوں نے حضور میں اپنی زبان سے ترقی کے لیے عرض نہیں کی ... چُناں چہ اُن دنوں جب کوئی عالی مضمون چُستی اور دُرستی کے ساتھ موزوں ہوتا تو اُس کے سرور میں آسمان کی طرف دیکھتے اور کہتے پھرتے ؎

اکیس یا بائیس اور مثنوی تصنیف مرزا سودا جس کا مطلع ہے،

یارو خدا ایک ہے دوسرے برحق نبی   صورت لوح و قلم جس کے لیے خلق کی

اس میں بھی ہر ایک مصرع تیئس یا چوبیس حروف کا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اور بھی
مثنویاں ہیں۔ ہاں اتنا ہے کہ اکثر استادوں نے نظامی کی پانچوں مثنویوں پر مثنویاں
کہی ہیں۔ لہٰذا اُن پانچ وزنوں میں بہت مثنویاں ہیں۔

معلوم ہوا کہ آزاد کو گلِ کُشتی کا علم ۱۸۷۴ء میں ہوا اور ذوق کے انتقال کو اُس وقت بیس برس
ہو چکے تھے۔ میر نجات فارسی کے شاعر تھے۔ کبھی کبھی منہ کا مزا بدلنے کے لیے اردو میں بھی کہہ لیتے
تھے۔ شیفتہ نے گلشن بے خار میں اُن کا ذکر اس طرح کیا ہے جیسے وہ حیات ہوں۔ عمدۂ منتخبہ میں
بھی اُن کا ذکر موجود ہے، ملاحظہ ہو،

نجات تخلص، میر زین العابدین، وطنش قصبۂ سہارن پور است۔ شاگردے ولایت
زاے است۔ شاعر فارسی گو۔ گاہے تفنناً طبع شعر ریختہ ہم می گوید۔ با مولف آشنا
است۔ از کلام اوست؛

یاں تلک سر کو پٹک ہجر میں توڑے پتھر   کہ نہیں دامن کہسار میں چھوڑے پتھر
آنکھیں پتھرا گئیں تس پر ہیں ٹپکتے آنسو   بل بے ہجراں تری قدرت کہ نچوڑے پتھر

مذکورہ دونوں تذکروں میں گلِ کُشتی کا ذکر نہیں، اگرچہ یہ اُن کی مشہور تصنیف ہے۔ معلوم ہوا کہ میر نجات
ذوق کے معاصر شعرا میں تھے۔ اُن کے جو دو شعر اوپر نقل ہوئے ہیں، انشا کی زمین میں ہیں۔ ایک
معروف مصرع ہے؛ ہر جو پتھر تو اسے کوئی نچوڑے پتھر۔ انشا کا انتقال ۱۲۳۳ھ میں ہوا۔ یعنی
ممکن ہے گلِ کُشتی ۱۲۵۰ھ کے بعد کی تصنیف ہو۔ بھلا ذوق اُس کی سند کیوں کر پیش کر سکتے تھے؟
(اگر معاصر تصنیف بھی ہو تو بھی اس کا حوالہ دینا ذوق کے لیے ممکن نہیں۔ آزاد کے بیان سے محسوس
ہوتا ہے جیسے وہ بہت بڑے شاعر تھے اور اُن کا تعلق ماضی سے تھا) یہ امر بھی کم حیرت ناک نہیں
کہ آزاد نے جب کسی مشکل موقعے پر ذوق کو مشورہ دلوایا ہے تو غیر شاعروں سے، جنھیں شعر سے
براہِ راست کوئی تعلق نہیں۔ ایک عالم دین نے انھیں قصیدے کے صحت و سقم سے آگاہ فرما کر
اُن کا دل قوی کیا تھا اور ایک حکیم نے مثنوی کی معمولی بحروں کے خلاف تقریر فرمائی۔ اصل یہ ہے کہ
یہ ترقی پسندانہ خیالات آزاد کے ہیں، ذوق کے نہیں۔ جو دو شعر سابق کے بیان میں انھوں
نے درج کیے ہیں وہ خود ان کے ذہن کی پیداوار ہیں (ثبوت آگے پیش ہوگا) ورنہ جب مسودے

یہی بتایا ہے کہ وہ آٹھ بحریں کون کون سی ہیں۔ البتہ معمولی بحروں کا فقرہ اُن کے ذہن پر مسلط ہے۔ اس کا ذکر اُنھوں نے دوسری جگہ بھی کیا ہے، مثلاً :-

> اہلِ نظر یہ بھی دیکھیں گے کہ آزادؔ کی آزادؔ نے اس میں کسی قسم کی قیدوں کو توڑا ہے۔ ان میں سے ایک یہ مثنوی ہے مگر جو معمولی بحریں مثنوی کی رائج ہیں ان سے قدم بڑھائے ہوئے ہے ... ساتھ اس کے یہ کہ جو معمولی بحریں مثنوی کی خاص ہیں اُنھیں کسی مذہب نے خاص نہیں کیا۔ اب کہ ہمیں علی العموم ہر قسم کے مضمون کا نظم کرنا ہے پس کچھ گناہ نہ ہوگا اگر ہم قصیدے یا غزل کی بحریں مثنوی کہہ دیں۔
>
> (محمد حسین آزاد از ڈاکٹر اسلم فرخی)

یہ اقتباس نظمِ اُردو کے مشاعروں کے افتتاحی اجلاس میں پڑھے گئے لکچر کا حصہ ہے اور یہ زمانہ آبِ حیات طبعِ اوّل سے ۸ سال اور طبعِ دوم سے ۱۱ سال پہلے کا ہے۔ بہ قول ڈاکٹر اسلم فرخی، آزاد کے لکچر کا یہ حصہ خاص طور سے اعتراضات کا نشانہ بنا تھا لہٰذا طباعت کے وقت اسے حذف کردیا گیا۔ اب اگر ذوقؔ پہلے سے اس قید کو توڑ چکے تھے اور میر نجات کی گل کشتی ان کی دیکھی ہوئی تھی تو مندرجہ اقتباس میں آزاد کو یہ کہنے کی ضرورت نہ تھی کہ اُن کی مثنوی معمولی بحروں سے قدم بڑھائے ہوئے ہے، اور کہ آزاد نے پہلے پہل اس قید کو توڑا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ 'گل کشتی' کا علم ذوقؔ کو نہیں تھا، اور نہ ہی مرزا سلیم کی شادی کے موقع پر انھوں نے کوئی مثنوی کہی تھی۔ چناں چہ مثنوی کے جو دو شعر آزاد نے ان سے منسوب کیے ہیں وہ خود آزاد کے نتائجِ فکر ہیں۔ اس قیاس کے اسباب یہ ہیں :

> پروفیسر صاحب فرماتے ہیں کہ میری مثنوی جو معمولی بحریں مثنوی کی رائج ہیں اُن سے قدم بڑھائے ہوئے ہے اور سبب اس کا یہ ہے کہ اُن بحروں میں گنجائش کم ہے ... پس کچھ گناہ نہ ہوگا اگر ہم قصیدے یا غزل کی بحریں مثنوی کہہ دیں۔ کمترین اعتراض کرتا ہے کہ مثنوی یا غزل اور قصیدہ اور قطعہ اور ترکیب بند، ترجیع بند و مسمط و مستزاد کے واسطے کوئی بحر یا خاص وزن مقرر نہیں۔ صرف رُباعی کے واسطے چوبیس وزن بحرِ ہزج سے خاص ہیں بلکہ بعض مثنوی پروفیسر صاحب کی مثنوی سے بھی قدم بڑھائے ہوئے ہیں۔ مثلاً 'گل کشتی'، میر نجات، کیوں کہ اس میں ہر ... ایک مصرع میں بیس (؟ تیئس) یا چوبیس حروف ہیں اور پروفیسر صاحب کی مثنوی میں

جو مثنوی انھیں آٹھ بحروں میں منحصر ہو گئی ہے ورنہ طبع سلیم پر کون حاکم ہے جو روکے۔
جس بحر میں چاہو لکھو۔ استاد کے مسودوں میں ایک پرچے پر چند شعر اس کے نکلے
تھے۔ اُن میں ساجن کا مضمون تھا۔ شعر اب تک یاد ہیں۔

مرزا سلیم کی شادی کے وقت تک ذوق کی دربارِ شاہی تک رسائی اور مثنوی کہنا دونوں مشکوک
ہیں۔ مندرجہ بالا بیان کے فوراً بعد یہ بیان ملتا ہے:

چند سال کے بعد انھوں نے ایک قصیدہ اکبر شاہ کے دربار میں کہہ کر سُنایا۔۔۔
اس پر بادشاہ نے خاقانیِ ہند کا خطاب عطا کیا۔ اُس وقت شیخ مرحوم کی عمر
۱۹ برس کی تھی۔

گویا مثنوی مذکور کے چند سال بعد ذوق کی عُمر ۱۹ سال کی تھی۔ چند برس کی یہ مدت اگر زیادہ نہیں
صرف تین برس بھی ہو تو مثنوی کی تصنیف کے وقت اُن کی عُمر ۱۶ برس ہونی چاہیے۔ لیکن اُس
عمر میں تو اُن کا شعر کہنا بھی مشکوک ہے چہ جائے کہ مثنوی و قصیدہ کہہ کر خاقانیِ ہند ہو جانا (اُس
وقت بادشاہ بھی شاہ عالم تھے نہ کہ اکبر شاہ ثانی) "اُس کی بحر مثنوی کی معمولی بحروں سے.....ا،"
ذوق نہیں آزاد کا پسندیدہ فقرہ ہے۔ خدا جانے مولانا کے ذہن میں آٹھ بحریں کیوں کر سما گئیں۔
اس سلسلے میں عموماً سات بحروں کا ذکر پڑھنے میں آیا ہے۔ اُردو، فارسی کی مقلّد ہے۔ فارسی میں
نظامی نے اپنا خمسہ ۵ بحروں میں لکھا، اور وہی پانچ بحریں مثنوی سے مخصوص سمجھی جانے لگیں۔
خسرو نے خمسے کا جواب لکھا تو وہی پانچ بحریں استعمال کیں۔ بعد ازاں اُن پر دو بحروں کا اضافہ
ہوا۔ اور فارسی میں مثنوی انھیں سات بحروں میں محصور رہی۔ اُردو والوں نے دو اور بحروں کا اضافہ
کیا۔ چناں چہ میر نے متدارک مثمن مخبون، مومن نے متقارب مثمن مقبوض میں بھی مثنویاں لکھی ہیں۔
کُل ملا کر ۹ بحریں ہوئیں۔ سعادت یار خاں رنگین نے جہاں خود کو علامہ ثابت کیا ہے اُس کے
اسباب میں ایک بات یہ بھی کہی ہے کہ آج تک کسی نے ۱۱ بحروں میں مثنویاں نہیں کہیں، میں
نے کہی ہیں۔ صرف مولانا جامی نے سات بحروں میں مثنویاں کہی ہیں، اوروں نے سات بحروں
میں بھی مثنویاں نہیں کہیں۔ اِن تمام حوالوں کے باوجود ہمارا خیال ہے کسی فردِ واحد کے لیے
ممکن نہیں کہ ہر مثنوی اُس کی نظر سے گزری ہو۔ اگر سات بحروں کے علاوہ کسی نے کوئی اور بحر
استعمال کی بھی ہو تو عین ممکن ہے کہ "علامہ رنگین" نے دیکھی ہی نہ ہو۔ آزاد کی مبینہ آٹھ بحروں
کے لیے اُن کا ماخذ معلوم نہیں۔ نہ کہیں اُنھوں نے اُن آٹھ بحروں کی تفصیل ہی لکھی ہے اور نہ

ذوق کو ایک ہی استاد کا شاگرد لکھا ہے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نے غالباً آزاد ہی کے بیان سے اخذ کر کے مولوی باقر کو مولوی عبدالرزاق کا شاگرد قرار دیا ہے۔ (حالاں کہ ذوق نے تعلیم کا آغاز مولوی غلام رسول شوق کے مکتب سے کیا تھا) اگر مولوی باقر اور ذوق دونوں ہم سبق تھے (جو ممکن نہیں) تو وہ واقعہ بہت پہلے کا ہونا چاہیئے اور اُس زمانے میں ذوق کا مولوی صاحب موصوف کا درس ترک کر دینا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ مولوی باقر راجا صاحب رام کے بیٹے کی شراکت میں مولوی عبدالرزاق کے شاگرد رہے ہوں گے کہ اُن کی غریبی کا کوئی ثبوت نہیں۔ پھر یہ بھی عجیب ہے کہ ذوق مولوی صاحب کے ساتھ راجا صاحب رام کے بیٹے کے درس میں گئے تو اُنھوں نے اُنھیں ہمیشہ درس میں شریک رہنے کے لیے کہا۔ اگر اُس وقت تک ان کی تیزیِ طبع کا شہرہ ہو چکا تھا تو بے علمی کے باوصف نہ ہُوا ہوگا۔ اگر ذوق مولوی صاحب کے ساتھ راجا صاحب رام کے یہاں جا سکتے تھے تو اپنے طور پر اُن سے تحصیلِ علم بھی کر سکتے تھے۔ عجیب تر یہ کہ اگر ذوق "شغل" یا کام کے سبب نہ جا سکتے تھے تو فرزند راجا صاحب رام کا درس بھی ملتوی رہتا، سبب؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ محض کہانی ہے۔ آزاد کو ذوق کی تکمیلِ علمی (کسی سبب سے) مولوی عبدالرزاق صاحب سے کروانی تھی لہٰذا انھوں نے "تکمیلِ علوم کے قدرتی سامان" کا ایک افسانہ تراش لیا۔ قطع نظر ان شکوک سے مندرجہ اقتباس کا پہلا خط کشیدہ جملہ غور طلب ہے۔ راجا صاحب رام کو آزاد نے املاکِ شاہ اودھ کا مختار لکھا ہے۔ اودھ میں شاہی غازی الدین حیدر کے زمانے میں ہوئی۔ ناسخ کی تاریخ، بگو ناسخ کہ ظل اللہ گردید موجود ہے جس سے ۱۲۳۴ برآمد ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے املاکِ شاہِ اودھ کی مختاری شاہی کے بعد ہی وجود میں آئی ہوگی، اگرچہ قطعی سنہ کا تعین فی الوقت ممکن نہیں (صاحب رام کے حالات تاریخ اودھ ج ۲، میں دستیاب نہیں ہوئے۔ اس جلد میں سعادت علی خاں سے نصیر الدین حیدر تک کے عہد کا بیان ہے۔ نصیر الدین حیدر کی تخت نشینی کے موقعے پر البتہ کسی صاحب رائے کے تین قطعات تاریخ اس میں ہیں) بہر حال اگر یہ واقعہ درست ہے تو ۱۲۳۴ھ کے بعد ہی کا ہو سکتا ہے

۲۴۔ کہا کرتے تھے کہ جب بادشاہِ عالم ولیعہدی میں تھے تو مرزا سلیم کے بیاہ کی تہنیت میں ایک مثنوی ہم نے لکھی تھی۔ اُس کی بحر مثنوی کی معمولی بحروں سے الگ تھی۔ لوگوں نے چرچا کیا کہ جائز نہیں۔ میر نجات کی گل کشی ہم نے دیکھی ہوئی تھی۔ مگر حکیم مرزا محمد صاحب رحمہم اللہ زندہ تھے...... وسعتِ معلومات اور حصولِ تحقیقات کی نظر سے ہم نے اُن سے جا کر پوچھا۔ اُنہوں نے فرمایا رواج اتفاقی ہے

نامکمل غزلوں اور قصیدوں کے ساتھ "ناتمام" لکھ کر اس امر کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ نسخۂ دیوان کے آخری صفحات میں ذوقؔ کا متفرق کلام درج ہے۔ اُس میں اگر قصیدے کے اشعار ہیں تو "اشعارِ قصیدۂ ناتمام" اور اگر غزل کے اشعار ہیں تو "ناتمام" لکھ کر اس کی صراحت کر دی گئی ہے۔ مذکورہ دونوں شعر نسخے کے سب سے آخری اشعار ہیں۔ ان کے ساتھ ایسی کوئی صراحت نہیں۔ بلکہ "فرد" کا عنوان دے کر مطلع درج کیا گیا ہے۔ اُس کے بعد پھر فرد کا عنوان ہے اور دوسرا شعر درج ہے۔ اِس کا مطلب صاف ہے کہ ذوقؔ نے اِن کے ساتھ اِن قوافی میں اور کچھ نہیں کہا تھا ورنہ "ناتمام" کے تحت درج ہوتے۔ (حال ہی میں راقم کو دیوانِ ذوقؔ کا ایک مخطوطہ اپنے شعبے کے کتب خانے میں ملا ہے جو ۱۲۸۰ھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس کا مفصل تعارف کسی مناسب موقع پر کروایا جائے گا یہاں صرف اِتنا لکھنا کافی ہے کہ اُس میں بھی یہ دونوں اشعار "فرد" ہی کے تحت درج ہیں۔)

آخر میں اِس ضمن میں ایک لطیفہ سُن لیجیے۔ کُلیاتِ شاہ نصیرؔ ج ۱، مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی میں شاہ نصیرؔ کی ایک ۹ شعر کی غزل موجود ہے لیکن قوافی نہ "پر، گر" ہیں اور نہ "پوجنا" بلکہ "ہم، بہم، کم، غم" وغیرہ ہیں۔ اگر آزادؔ کی داستان پر یقین کیا جائے تو یہ بھی ماننا ہوگا کہ ایک غزل اُدُ تین معرکے کے قصیدے کہنے والا یہ بھی نہیں جانتا تھا جس کے مقابلے میں وہ اُستادی کا دعویٰ کر رہا ہے اُس کی غزل کے قوافی کیا ہیں۔ اب بھی کوئی ان دو "افراد" کو معرکے سے وابستہ کرے اور اِنھیں قصائد اور غزل کا حصہ سمجھے تو اُس کی اپنی صوابدید۔

۲۳ ؎ اُس دن سے اُنھیں تکمیلِ علوم اور سیرِ کتب کا شغل واجب ہُوا۔ قدرتی سامان اس کا یہ ہُوا کہ راجہ صاحب رام جو املاکِ شاہِ اودھ کے مختار تھے۔ اُنھیں یہ شوق پیدا ہُوا کہ اپنے بیٹے کو کتبِ علمی کی تحصیل تمام کروائیں۔ مولوی عبدالرزاق کہ شیخ مرحوم کے قدیمی اُستاد تھے وہی ان کو پڑھانے پر مقرر ہوئے۔ اِتفاقاً ایک دن یہ بھی مولوی صاحب کے ساتھ گئے۔ چوں کہ ان کی تیزیِ طبع کا شہرہ ہو گیا تھا راجہ صاحبِ رام نے اُن سے کہا کہ میاں ابراہیم تم ہمیشہ درس میں شریک رہو۔ چناں چہ نوبت یہ ہو گئی کہ اگر یہ کبھی شغل یا ضرورت کے سبب وہاں نہ جاتے تو راجہ صاحب کا آدمی انھیں ڈھونڈھ کر لاتا۔ اور نہیں تو اُن کا سبق ملتوی رہتا۔

یہ کہانی بھی مشکوک ہے۔ آزادؔ مولوی عبدالرزاق کو شیخ مرحوم کا قدیمی اُستاد بتاتے ہیں۔ اس کے باوجود اُس اُستاد سے پہلے تحصیل و تکمیلِ علمی نہیں ہوئی، کیوں ؟ آزادؔ نے اپنے والدِ

کرولی عہد بہادر کی بے یقینی پر یقین آجاتا ہے۔ نیز یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ شعر کے صحت وسقم کو پرکھنا کسی عالم دین کا کام نہیں۔ یہ کسی شاعر ہی کو زیب دیتا ہے۔ آزاد نے جوش عقیدت میں "اُستاد" کو تو رُسوا کیا ہی تھا، نادانستگی میں شاہ عبدالعزیز صاحب کی رُسوائی کا سامان بھی فراہم کردیا۔ اب وہ دونوں شعر ملاحظہ ہوں :

کوہ اور آندھی میں ہوں گر آتش و آب وخاک وباد   آج نہ چل سکیں گے پر آتش وآب وخاک وباد

تاکہ بہ گبراور ہنود طاق پرست پون باز   چھوڑدیں شرک پوجنا آتش وآب وخاک وباد

مطلعے میں قوافی گر اور پر ہیں لیکن دوسرے شعر میں سرے سے قافیہ ہے ہی نہیں۔ ظاہر ہے گر اور پر کا قافیہ پوجنا نہیں ہوسکتا۔ آزاد نے داستان طرازی کے شوق میں ذوق کی بے خبری کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ ہے یہ کہ مندرجہ دونوں شعر ذوق نے مختلف اوقات میں کہے ہوں گے (ثبوت آگے آتا ہے)۔ مطلعے کے اسقام پر اُن کی نظر نہیں گئی۔ (ترتیب دیوان کے وقت ایک حد تک آزاد کی نظر ضرور گئی ورنہ وہ مقدمے میں اس کی اصلاح کی کوشش کیوں کرتے؟ مقدمے میں مصرعِ اولیٰ اس طرح ہے، صرصرِ کوہ میں ہوں گر......، اِس سے مصرع چست ہوگیا ہے لیکن متن میں درج کرتے وقت آزاد کو اپنی اِصلاح کا خیال نہیں رہا اور متن میں ایک بار پھر وہی مصرع درج ہوگیا ہے) مصرعِ اولیٰ میں دو خامیاں ہیں۔ اور "کچھ اس طرح بندھا ہے اور" آندھی" کی ی اِس بُری طرح دبتی ہے کہ مصرعے میں سکتہ بلکہ مصرع ناموزوں محسوس ہوتا ہے مصرعے میں لفظی کے علاوہ معنوی اسقام بھی ہیں جن پر ذوق کی نظر نہیں گئی ورنہ شاید وہ اُنھیں دُور کرنے کی کوشش کرتے۔ مثلاً آندھی میں آگ نہیں ہوتی اگرچہ وہ آگ میں روانی ضرور پیدا کرسکتی ہے۔ آندھی خود" باد" ہے لہٰذا آندھی میں" باد" ہونے کے کوئی معنی نہیں۔ اس کے علاوہ قافیے میں "گر" کی جگہ "گو" یعنی اگرچہ کا مقام ہے۔ گویا قافیہ بھی غلط ہے اور ردیف بھی۔ دوسرے شعر میں جیسا کہ ذکر ہوا قافیہ ہے ہی نہیں۔ دوسرے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ یہ دو اشعار مختلف قوافی میں ہیں اور دو الگ الگ نظموں کے ہیں۔ اگر مکمل غزل یا قصیدہ موجود ہوتا تو کسی معرکے سے اُن کا تعلق ممکن تھا۔ بہ صورتِ موجودہ اس کا اِمکان نہیں۔ اِس ضمن میں مزید ثبوت و دلائل حسبِ ذیل ہیں :

کسی معرکے کے لیے کہے گئے اشعار میں شاعر مصرعوں کو ٹھوک بجا کر دیکھ لیتا ہے مُبادا کوئی سُقم رہ جائے اور باعثِ رُسوائی ہو۔ یہ دونوں شعر نسخۂ ویرآن میں موجود ہیں، لیکن غزلوں کے ذیل میں ہیں نہ قصیدوں کے ذیل میں۔ نسخۂ ویران کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اُس میں

اشعار کسی دوسرے ماخذ میں نہیں ملتے، اُنھیں آزاد ہی کا کلام ماننا ہوگا) لیکن اس زمین میں قصیدہ فراہم کرسکے نہ غزل۔ خود ان کا بیان ہے کہ ۱۲۷۱ میں ذوق کے اِنتقال کے بعد اُنھوں نے خلیفہ اسماعیل کے ساتھ مل کر دیوان کی ترتیب شروع کی (دیوانِ ذوق مرتبہ حافظ ویران کے مقدمے سے اس کی تردید ہوتی ہے: "...... کانسنہ ناگوار زہر سرشار اجل را در ۱۲۷۱ ہجری بمذاق جان گوارا فرمودہ باعشِر نوحہ و ماتم سخن و اہلِ سخن گردید۔ زیں پس کسی را از شاگردان و نیز صاحبزادۂ آن مغفور را عوارض و لواحق روزگار دست نداد کہ بہ فراہمیِ مسوداتِ متفرقہ کمرِ ہمت بر بندد و پایۂ سعادتِ خود از نگاشتہ بتالیف و ترتیبِ دیوانِ پرداز" مقدمہ ص ۱۴۔ اگر اس کے بعد بھی کوئی آزاد کے قول کا قائل ہو تو اُسے یہ ماننا ہوگا کہ آزاد کا شمار ذوق کے شاگردوں میں نہیں تھا۔) اوّل قصیدے اور غزلیں انتخاب کی تھیں اور یہ کام کئی برس میں ہوا تھا۔ دلّی سے نکلے تو کُل اثاثہ "اُستاد" کی غزلوں کا جُنگ تھا جسے وہ بغل میں مار لائے تھے۔ بعد میں اُسی سے دیوان مُرتّب ہوا اور یہ عجیب اِتفاق ہے کہ آزاد نے اُنھیں غزلوں میں سے قصیدے بھی برآمد کرلیے' اور ذوق اور آزاد کے معتقدوں نے اُنھیں ذوق کا کلام مان لیا۔ بہرحال یہ قصیدہ یا قصیدے (مع غزل) اُس جُنگ میں بھی نہ نکلے۔ حافظ ویران نے ذوق کے اِنتقال کے بعد اُن کے دو عزیز شاگردوں کی مدد سے اُستاد کا دیوان مُرتّب کیا تھا۔ اُس میں بھی اِس زمین میں کوئی غزل یا قصیدہ موجود نہیں۔ معرکوں کی خبر آزاد سے زیادہ ویران کو ہونی چاہیے تھی کہ ہر وقت کے حاضر باش اور اُستاد کے ساتھ مشاعروں اور معرکوں میں شریک ہوتے تھے۔ اُسی سال (۱۲۷۹ھ۔ یہ سنہ نسخۂ ویران کے مقدمے اور کچھ قطعات میں ملتا ہے لیکن دیوان شاید ۱۲۸۰ میں چھپا ہو) ظہیر دہلوی نے نگارستانِ سخن شائع کیا اور اُس میں ایسا کلام بھی شائع کیا جو نسخۂ ویران میں نہیں۔ اِس کے باوجود اُس میں بھی اِس زمین کا کوئی شعر نہیں ملتا۔ آخر ایسے "معرکتہ الآرا" اشعار کیا اِتنے ہی پوچ تھے کہ کسی کی نظرِ انتخاب میں نہیں چڑھے۔

آزاد نے ۱۸۹۰ء کے آس پاس جب دیوان مُرتّب کیا تو آب میں درج مطلع پر ایک شعر کا اضافہ کیا۔ اور ایک غزل اور تین قصیدوں میں سے کُل دو شعر اُنھیں ہاتھ آئے۔ یہ دونوں شعر آزاد نے ایک قصیدے کے طور پر چھاپے ہیں! جو ممکن نہیں۔ حیرت مرتب کلیاتِ ذوق پر ہے جنھوں نے نسخۂ ویران پیشِ نظر ہوتے ہوئے بھی آزاد کی روایت کی پیروی کی، اور اِس طرح ذوق کو غلط گو بلکہ ملحِ قافیہ سے اُن کی بے خبری پر مہرِ تصدیق ثبت فرمادی۔ بہ صورتِ موجودہ اِن دو شعروں کو دیکھ

کے اُلٹ پھیر میں معرکے کا خاتمہ کر دیا "۔ اس وقت اعتراضوں کا پورا سرانجام نہیں ہو سکتا"
جب اعتراض لکھے ہی تھے تو ایک ہی اعتراض میں تھک کیوں گئے ؟ کچھ اور اعتراض
بھی دکھائے ہوتے ۔ آزاد کا اصل مقصد تو شاہ نصیر اور ذوق کا یہ مکالمہ تھا " انھوں نے
کہا ۔ جب تک کسی اُستاد کے کلام میں نہ ہو جائز نہیں ہو سکتی ۔ شیخ علیہ الرحمۃ نے کہا ،
آپ نے وہ شعر کی غزل پڑھ کر فرمایا تھا کہ اس طرح میں کوئی غزل کہے تو ہم اُسے اُستاد
جانیں ۔ میں نے تو ایک غزل اور تین قصیدے لکھے ؛ اب بھی اُستاد نہ ہوا " کیوں نہ ہوئے ؛
یقیناً اُستاد ہوئے ورنہ ایک ہی اعتراض کے اُلٹ پھیر میں ایک سے تین قصیدے کیوں کر
ہو جاتے ؟ آزاد نے ایک ہی جھٹکے میں ایک قصیدے کے تین ٹکڑے کر دیے ۔ تین
قصیدے زیادہ نہیں تو سات سات شعر کے تو ہوں گے ہی ۔ نہ اُن قصیدوں میں اور کوئی
قابلِ اعتراض بات نکلی اور نہ آزاد کو سوائے ایک کے کوئی اور شعر ہی ملا ۔

ح : پہلے اِس بیان کا آخری فقرہ دیکھ لیجیے پھر ہم اپنے دعوے کے حق میں دلیلیں پیش کریں
گے " اُس دن سے اُنھیں تکمیلِ علوم اور سیرِ کُتب کا شغل واجب ہوا " گویا اس سے پہلے نہ
سیرِ کُتب تھی نہ تکمیلِ علوم ، اور ذوق کی تحصیلِ علمی اس کے بعد کا واقعہ ہے ۔ اس کے باوصف
کُتبِ تواریخ اور عہدِ ہوشنگ کی بات کرتے ہیں ، محسن تاثیر سے سند لاتے ہیں ۔ ظاہر ہے یہ
آزاد کی سیرِ کُتب کا مظاہرہ ہے ۔ ذوق نے تحصیلِ علمی کی طرف بعد کے زمانے میں توجہ
کی تھی ۔

اب رہی یہ بات کہ " آتش و آب و خاک و باد " میں نہ ذوق نے غزل کہی ، نہ قصیدہ ،
نہ قصیدے اور نہ ہی اس پر معرکہ ہوا ۔ یہی ایک غلط شعر آزاد کو مل سکا جسے آبِ حیات میں
انھوں نے ایک فرضی داستان کے ساتھ پیش کر دیا ۔ اگر ذوق نے واقعی اس زمین میں
کچھ کہا ہوتا تو معاصر تذکروں میں کوئی شعر تو ملتا ۔ گلشنِ بے خار اُس وقت کا تذکرہ ہے
جب ذوق نہ صرف قلعے میں پہنچ چکے تھے بلکہ خاقانیِ ہند بھی ہو چکے تھے ۔ ایسے معرکۃ الآرا
قصیدے یا غزل ہی کا کوئی شعر اُس میں ہوتا ۔ بعد کے جتنے تذکروں میں ذوق کا ذکر ہے اُن
میں سے بھی کسی میں اس زمین کا کوئی شعر منتخب نہیں ہوا ۔ آزاد نے آبِ حیات میں ذوق
کو مشاعرے میں قصیدہ پڑھتے دکھایا ہے ۔ قصیدہ بھی لکھا ہوا تھا اور اعتراض بھی ۔ آزاد نے
دیوانِ ذوق مرتب کیا تو سیکڑوں شعر خود کہہ کر دیوان میں شامل کر دیے (جب تک ایسے

شاہ نصیر سے لے کر تمام حاضرینِ محفل تک خواہ کیسے ہی صاحبِ علم ہوں کم از کم اردو زبان
سے ناواقف تھے۔ مثلاً "آج نہ چل سکیں گے" پہ "آتش و آب و خاک و باد" میں چلنے سے
واقعی چلنا یعنی حرکت کے معنی مُراد لینا یقیناً حیرت ناک ہے۔ "آج آپ کے چیلے حوالے نہ
چل سکیں گے۔" اب اِس فقرے میں کوئی چیلے کی حرکت کا ثبوت طلب کرے تو اُسے کیا
کہیے گا؟ خود اِس قصّے میں آزاد نے لکھا ہے، "تاریخ شعر میں نہیں چلتی" کیا یہاں بھی
چلنا سے مُراد حرکت کرنا ہے؟ معلوم ہُوا کہ ذوق بھی اِتنے ہی غیر شاعر تھے کہ وہ واقعی چلنے
کا ثبوت فراہم کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ یہ اور بات ہے کہ سند میں پیش کیے گئے شعر
اور مصرعے میں پتھر میں آگ کی موجودگی کا ثبوت ہے، روانی کا نہیں۔ کیا آزاد اپنے
قاری کو اتنا ہی معصوم سمجھتے ہیں کہ وہ سوال گندم جواب جَو سے راضی ہو جائے گا۔ اغلباً
آزاد کا مقصد "اُستاد" کو اِتنا معصوم ثابت کرنا نہیں تھا۔ اب معترض کی مزید بوکھلاہٹ
ملاحظہ ہو۔ پہلے تو اُس نے پتھر میں آگ کے چلنے کا ثبوت مانگا، گویا اُسے پتھر میں
آگ کی موجودگی تسلیم ہے۔ لیکن جب چلنے کا ثبوت فراہم کر دیا گیا (جو دراصل موجودگی کا
ثبوت ہے) تو اُس نے یہ اعتراض جڑ دیا کہ سنگ میں آتش کا ثبوت چاہیے۔ بھلا
"آتش بہ سنگ بود" یا "ہر سنگ میں شرار ہے" میں اُسے یہ ثبوت نظر نہیں آیا؟
بہرحال اگر ایسا ہی کرنا تھا تو پہلے پتھر میں آگ کا ثبوت مانگنا تھا اور بعد میں حرکت کا۔ اُس
دَور کے اساتذہ کیا ایسے ہی معصوم تھے کہ جو اَول فَول جی میں آتا، بک دیتے تھے؟ یہ
اعتراضات چوں کہ خود آزاد کے ذہن کی پیداوار ہیں، اس لیے وہ واقعی اعتراض کروا ہی
نہیں سکے۔ (یہ اُن کا مقصد بھی نہیں تھا۔ اُن کا مقصد تو ذوق سے تڑاق سے سند دِلوانا
تھا اور بس، خواہ وہ سند غلط ہی کیوں نہ ہو) دوسروں کی جہالت ثابت کرنا تھی اِس
لیے وہی اعتراض تراشے جن کا جواب ممکن تھا۔ ہم سوچتے ہیں اگر کوئی خدا کا بندہ برسرِ
مشاعرہ اُستاد ذوق سے آندھی میں آگ کی موجودگی کا ثبوت مانگ لیتا تو اُن پر کیا گزرتی؛
اور وہ کیا جواب دیتے؟ پتھر میں آگ کا ثبوت پیش کرنے کے لیے ذوق کو محض تاثیر
تک جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ پتھر اُٹھا لیتے اور اُنھیں ایک دوسرے سے ٹکرا کر
چنگاری سب کو دکھا دیتے اور آیندہ سے ہمیشہ کے لیے معرکوں سے توبہ کر لیتے۔ بہرحال
اب چوں کہ آزاد کو اس وقت کوئی اور شعر نہ سوجھ سکا، اس لیے اُنھوں نے ایک ہی شعر

شعر کے صحت و سقم کے لیے ایک عالمِ دین سے رجوع کرنا عجیب ہے۔ کیا کوئی مذہبی فتویٰ مقصود تھا؟ اسے بھی چھوڑیے، ولی عہد بہادر کو بھی اپنے اُستاد کی مشق و قوتِ شعرگوئی پر اعتماد نہیں۔ اور ان کی نظر بھی کسی شاعر کی بجائے عالمِ دین ہی پر پڑتی ہے، اور وہ اپنے شُقّے کے ساتھ قصیدہ شاہ عبدالعزیز کے پاس دوبارا بھیجتے ہیں۔ اُن کی بے اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ شاہ صاحب قصیدہ ملاحظہ فرما چکے ہیں، تحریری فتویٰ لینا ضروری ہوا۔ (وہ خود بھی صاحبِ دیوان تھے۔ ذوقؔ سے زیادہ مشق بھی رکھتے تھے لیکن قصیدۂ مذکور کے باب میں کوئی رائے قائم کرنے سے قاصر تھے؟) مزید حیرت اس پر ہے کہ جب شیخ مرحوم کو شاہ صاحب نے قصیدہ پڑھنے کی اجازت دے دی تھی تو ان کا دل کچھ زیادہ قوی نہ ہوا لیکن جب اُنھوں نے ازسرِ نو تحریری اجازت مرحمت فرمائی تو اُن کا دل اور بھی قوی ہو گیا، اور اُنھوں نے قصیدہ دربارِ شاہی میں پڑھ دیا۔ بات یہیں ختم ہو جانی چاہیے تھی لیکن اب تک تو مولانا نے صرف تمہید ہی باندھی تھی۔

و: "اس کے بڑے بڑے چرچے ہوئے" یہ فقرہ دونوں طرف کاٹ کرتا ہے۔ چرچے تعریف میں ہوئے یا تنقیص میں؟ غالباً اس کے اتمام کے چرچے ہوئے ورنہ اس کے کیا معنی: "اور کئی دن بعد سُنا کہ اس پر اعتراض لکھے گئے"۔ (قصیدہ دربارِ شاہی میں پڑھا گیا تھا۔ اُس موقعے پر عوام کی رسائی بعیدِ قیاس ہے۔ پھر اعتراض لکھنے والوں نے قصیدہ پیشِ نظر نہ ہونے کے باوجود اعتراض لکھے، کیا زبانی؟) اعتراضات کے چکر میں آزادؔ یہ بھی بھول گئے کہ پورے باب بلکہ پوری کتاب میں انھوں نے ذوقؔ کو نہایت سنجیدہ، شریف و متین دکھایا ہے کسی کی ہجو بھی نہیں کہی۔ معرکہ آرائی ان کے مزاج سے میل نہیں کھاتی لیکن دربار میں پڑھنے کے بعد قصیدہ مشاعرے میں اس غرض سے لے گئے کہ "برسرِ معرکہ فیصلہ ہو جائے" یہ بیان مُضحک ہے کہ مشاعرے میں قصیدہ پڑھتے ہی شاہ نصیر نے ایک مُستعد طالب علم کو (جس کو بہ ظاہر علم سے کوئی علاقہ نہیں معلوم ہوتا ورنہ اتنے بودے اعتراض نہ کرتا) کھڑا کیا کہ اُنھوں نے کچھ اعتراض لکھے ہیں۔ کیا اعتراض گھر سے لکھ کر لائے تھے؟ اگر وہیں بیٹھ کر لکھے تھے تو پھر شاہ صاحب کو اُنھیں پیش کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ خود بھی اپنے شکوک و شبہات کا اظہار کر سکتے تھے۔ خیر چھوڑیے، اب اعتراضات کی طرف آئیے۔

ز: معترض کا پہلا اعتراض یہ ہے کہ سنگ میں آتش میں جلنے کا ثبوت چاہیے۔ ایسا لگتا ہے کہ

یہ سارا بیان طرح طرح کی رنگ آمیزیوں، غلط بیانیوں اور تضادوں کا مُرقع ہے۔ ہم نے کہیں کہیں خط کھینچ دیے ہیں تاکہ قارئین اُن مقامات کی طرف متوجہ ہوں۔ بہرحال اب شروع سے اس کے مُشتملات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

الف: ابتدائی فقروں میں آزاد نے دانستہ شاہ نصیر کو ذوق سے بہت پست کر کے دکھانا چاہا ہے۔ کئی برس کے بعد اُن کا واپس آنا اگرچہ ذوق کی مشقوں کا زوروں پر چڑھ جانا ثابت کرتا ہے، وہیں اس سے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ شاہ نصیر کی مشق رُو بہ زوال تھی۔ ورنہ ۹ شعر کی غزل کہنے کی تخصیص بے کار ہوتی۔ بین السطور میں وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ شعر شاہ نصیر نے بڑی مُشکل سے کہے تھے۔ یہ بات کُھل کر اُس وقت سامنے آتی ہے جب ذوق کہتے ہیں کہ آپ نے ۹ شعر کی غزل ......الخ (کئی سال بعد پر نظر رہے۔ یہ ذوق کو اُستاد پر ثابت کرنے کے لیے ہے)

ب: اُستاد والے فقرے کا حاشیہ اس لیے قابلِ قبول نہیں کہ تب تک ذوق شاگرد ہی تھے اور اُستاد ہونے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔ پیچھے کہیں بیان ہو چکا ہے کہ اُن کا قلعے میں پہنچنا اور ولی عہد کی اُستادی کے فیض سے جگت اُستاد ہو جانا ۱۲۳۰ھ سے پہلے کا واقعہ نہیں ہو سکتا۔

ج: دوسرے مشاعرے میں جب ذوق نے غزل پڑھی تو شاہ صاحب کی طرف سے اُس پر بجائے خود اعتراضات ہونا اس لیے مشکوک ہے کہ اس سے پہلے نزاع کا کوئی واقعہ یا ثبوت آزاد نے فراہم نہیں کیا۔ اُستاد کی عُمر پر نظر رہے (اندازاً ساٹھ برس) وہ کئی برس کے بعد دکن سے واپس آئے تھے۔ آتے ہی خود اپنے شاگرد پر اعتراض جڑ کر اُن کی عزت میں کیا اضافہ ہو جاتا؟ کسی اُستاد کو للکارتے تو کچھ بات بھی ہوتی۔

د: جشن قریب تھا اور ذوق نے بادشاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ اِسی طرح میں لکھا چوں کہ ایسی کوئی بات نہیں ملتی اس لیے آزاد یہ نہیں بتاتے کون سا جشن قریب تھا۔ یہاں تھوڑی دیر کے لیے ہمارے اس دعوے کو قبول کر لیجیے کہ ذوق نے اس طرح میں غزل کہی اور نہ قصیدہ لکھا۔ دلیل بعد میں پیش کر دی جائے گی۔

ہ: حیرت ناک امر یہ ہے کہ ذوق قصیدہ لے کر کسی شاعر کے پاس نہیں بلکہ ایک عالمِ دین مولوی شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں ـــــ گئے کہ وہ اُس کے "صحت وسقم" سے آگاہ فرمائیں

لکھے ہیں (گویا گھر سے لکھ کر لائے تھے) شیخ علیہ الرحمۃ نے عرض کی کہ میں آپ کا شاگرد ہوں اور اپنے تئیں اس قابل نہیں سمجھتا کہ آپ کے اعتراضوں کے لیے قابلِ خطاب ہوں۔ انھوں نے کہا مجھے کچھ تعلق نہیں۔ انھوں نے کچھ لکھا ہے۔ شیخ مرحوم نے کہا کہ خیر تحریر تو اُسی وقت ہے کہ فاصلۂ دوری درمیان ہو۔ جب آمنے سامنے موجود ہیں تو تقریر فرمائیے قصیدہ کا مطلع تھا:

کوہ اور آندھی میں ہوں گر آتش و آب و خاک و باد

آج نہ چل سکیں گے پر آتش و آب و خاک و باد

معترض نے اعتراض کیا کہ سنگ میں آتش کے چلنے کا ثبوت چاہیے۔ انھوں نے کہا مشاہدہ۔ اس نے کہا کتابی سند دو۔ انھوں نے کہا تاریخ سے ثابت ہے کہ ہوشنگ کے وقت آگ نکلی تھی۔ اُس نے کہا شاعری میں شعر کی سند درکار ہے۔ تاریخ شعر میں نہیں چلتی۔ حاضرینِ مشاعرہ اِن سوال و جواب کی اُلٹ پلٹ کے تماشے دیکھ رہے تھے اور اعتراض پر حیران تھے کہ دفعتہً شیخ علیہ الرحمۃ نے یہ شعر محسن تاثیر کا پڑھا: ...... آتش بہ سنگ بود ...... سنتے ہی مشاعرہ میں غل سے ایک ولولہ پیدا ہوا اور ساتھ سودا کا مصرع گذارنا (کذا) ہر سنگ میں شرار ہے ..... (ان دونوں اسناد میں آگ چلی کہاں ہے؟) اسی طرح اکثر اشعار پر سوال و جواب ہوتے۔ شاہ صاحب بھی بیچ بیچ میں کچھ دخل دیتے جاتے تھے۔ اخیر میں ایک شعر پر اُنھوں نے یہ اعتراض کیا کہ اس میں ثبوت روانی کا نہیں۔ (شروع میں بھی روانی کا ثبوت مانگا گیا تھا۔ مولانا تو ایسے ذکر کر رہے ہیں جیسے اخیر میں کوئی بہت انوکھی بات پوچھ لی گئی ہو۔ آخر وہ اشعار کون سے تھے جن پر ہر پھر کر ایک ہی اعتراض وارد ہوتا تھا؟) شیخ علیہ الرحمۃ نے کہا کہ تغلیب ہے۔ اُس وقت خود شاہ صاحب نے فرمایا کہ یہ تغلیب کہیں آئی نہیں۔ انھوں نے کہا تغلیب کا قاعدہ عام ہے۔ اُنھوں نے کہا جب تک کسی اُستاد کے کلام میں نہ ہو جائز نہیں ہو سکتی۔ شیخ علیہ الرحمۃ نے کہا آپ نے ۹ شعر کی غزل پڑھ کر فرمایا تھا کہ اِس طرح میں کوئی غزل کہے تو ہم اُسے اُستاد جانیں۔ میں نے تو ایک غزل اور تین قصیدے لکھے اب بھی اُستاد نہ ہوا۔ معترض نے کہا کہ اس وقت مجھ سے اعتراضوں کا پورا سرانجام نہیں ہو سکتا۔ کل پر منحصر رکھنا چاہیے۔ اور جلسہ برخاست ہوا۔ اُسی دن سے انھیں تکمیلِ علوم اور سیرِ کتب کا شغل واجب ہوا۔

واقعات لکھے ہیں۔ آخری واقعہ وہ ہے جس کے بعد تعلقات یکسر منقطع ہو گئے۔ ہم اُسی ایک واقعے کو پرکھ لیتے ہیں۔ اس سے باقی واقعات کی حقیقت بھی کھل جائے گی۔ البتہ یہاں یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ آزاد نے اِن واقعات کا جو زمانہ درج کیا ہے، وہ صریحاً غلط ہے۔ یہ واقعات ۱۲۳۰ھ سے پہلے کسی طرح پیش نہیں آسکتے۔ اب واقعۂ مذکور ملاحظہ ہو:

کئی برس کے بعد شاہ نصیر مرحوم دکن سے پھرے اور اپنا معمولی مشاعرہ جاری کیا۔ شیخ علیہ الرحمۃ کی مشقیں خوب زوروں پر چڑھ گئی تھیں... شاہ صاحب نے دکن میں کسی کی فرمایش سے ۹ شعر کی ایک غزل کہی تھی آتش و آب و خاک و باد۔ وہ غزل مشاعرہ میں سُنائی اور کہا اس طرح میں جو غزل لکھے میں اُسے اُستاد مانتا ہوں۔ (اس پر آزاد نے حاشیہ لکھا ہے: "یہ طنز شیخ مرحوم پر ہے کہ ولی عہد بہادر اور نواب الٰہی بخش خاں کی غزل بناتے تھے، اور اُستاد کہلاتے تھے۔" اگر یہ واقعی طنز ہے تو بہت بے تُکا ہے۔ اُس وقت ذوق نہ ولی عہد کی غزل بناتے تھے اور نہ معروف کی۔ وہ قلعے میں خود اُستاد ہو جانے کے بعد ہی پہنچے ہوں گے) دوسرے مشاعرے میں انھوں نے اس پر غزل پڑھی۔ (غنیمت ہے اسی مشاعرے میں نہیں پڑھی) شاہ صاحب کی طرف سے اُس پر بجائے خود کچھ اعتراض ہوئے جشن قریب تھا (کون سا جشن؟) شیخ علیہ الرحمۃ نے بادشاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ اس طرح میں لکھا۔ مگر پہلے مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب کے پاس لے گئے کہ اس کے صحت و سقم سے آگاہ فرمائیں۔ انھوں نے سُن کر پڑھنے کی اجازت دی۔ مگر ولی عہد بہادر نے اپنے شقہ کے ساتھ پھر بادشاہ (؟ شاہ صاحب) کے (پاس) بھیجا۔ انھوں نے جو کچھ کہا تھا وہی جواب میں لکھ دیا، اور شعر بھی لکھا،

بود بگفتۂ من حرفِ اعتراض چناں ؎ کسے بدیدۂ بینا فرو بُرد انگشت

شیخ مرحوم کا دل اور بھی قوی ہو گیا۔ اور دربار شاہی میں جا کر قصیدہ سُنایا۔ اس کے بڑے بڑے چرچے ہوئے۔ اور کئی دن کے بعد سُنا کہ اس پر اعتراض لکھے گئے ہیں شیخ مرحوم قصیدۂ مذکور کو مشاعرہ میں لے گئے کہ وہاں پڑھیں اور روبرو بربر معرکہ فیصلہ ہو جائے (مولانا کو یہ خیال نہیں رہا کہ اعتراض بربر معرکہ فیصلے کے لیے جانے والے پر وارد ہوتا ہے، دوسروں پر نہیں) چناں چہ قصیدہ پڑھا گیا۔ شاہ نصیر مرحوم نے ایک مُستعد طالب علم کو کہ کُتبِ تحصیلی اُسے خوب رواں تھیں، جلسہ میں پیش کر کے فرمایا کہ انھوں نے اِس پر کچھ اعتراض

مقدمہ اِس کا گورنمنٹ میں دائر کر رکھا تھا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اکبر شاہ نے شہزادہ سلیم کی ولی عہدی کی کوشش نہیں کی۔ مرزا جہانگیر کی ولی عہدی کی کوشش ضرور کی۔ لیکن مقدمہ اس کا جب گورنمنٹ میں دائر تھا وہ زمانہ بعد کا ہے۔ بہ قولِ صاحب "محمد حسین آزاد" اُس زمانے میں اکبر شاہ نے مرزا ابوظفر پر یہ الزام لگایا تھا کہ شاہ عالم کے زمانے میں ابوظفر نے اکبر شاہ کی ایک بیوی سے ناجائز تعلقات قائم کر رکھے تھے (جسے بہ قولِ آزاد، ظفر کو فرزند ماننے سے اِنکار کہ لیجیے) یہ لارڈ منٹو کا عہد ہے۔ بادشاہ نے اپنا نمایندہ (شاہ حاجی) کلکتے بھیجا جس نے ولی عہدی کا مسئلہ از سرِ نو چھیڑا، لیکن مسموع نہ ہوا۔ اکبر شاہ نے مرزا جہانگیر کو آفتاب گیر مقرر کر دیا جو ولی عہد کا حق سمجھا جاتا تھا۔ لیکن یہ تقرر بھی انگریزوں کو متاثر نہ کر سکا۔ انگریزی حکومت نے مزید گفتگو سے اِنکار کر دیا۔ اس لیے ایک اور نمایندے پران کشن کو کلکتے روانہ کیا گیا تاکہ وہاں سے شاہی نمایندے کی حیثیت سے انگلستان جائے لیکن انگریزی حکومت نے اُسے خاصا رسوا کیا، اور اُس کے کاغذات واپس دلّی کے رزیڈنٹ کے پاس بھیج دیے۔ بہ قول ڈاکٹر اسلم فرخی اِس واقعے سے متعلق پرسیول اسپیر نے مغلوں کی شام میں لکھا ہے کہ مغلوں کی سفارتی مہارت انگریزی عیاری کا مقابلہ نہ کر سکی۔ اکبر شاہ کی والدہ قدسیہ بیگم نے اِس سلسلے میں یہ کیا کہ مرزا جہانگیر کو لے کر لکھنؤ چلی گئیں۔ (نجم الغنی مرزا جہانگیر کے لکھنؤ جانے کا دوسرا ہی سبب بتاتے ہیں۔ عابد) اور نواب وزیر سے اعانت چاہی۔ اس پر انگریزوں نے بادشاہ کے ذاتی اضافے کی ادائگی روک لی اور انھیں مجبور کیا کہ وہ اِس سلسلے میں ہر کوشش ترک کر دیں۔" آزاد کے فقرے "مقدمہ اس کا گورنمنٹ میں دائر تھا" سے یہی زمانہ مُراد ہو سکتا ہے۔ مولوی نجم الغنی نے تاریخ اودھ' جلد ۳' میں "شہزادہ جہانگیر کی لکھنؤ میں آمد" کے تحت لکھا ہے: "شاہزادہ اکبر شاہ ثانی بن شاہ عالم ثانی کے ... بیٹے تھے ... انگریزوں نے ان کو دہلی چھوڑنے پر مجبور کیا ۳ر صفر ۱۲۲۷ کو بڑے ساز و سامان کے ساتھ لکھنؤ کے ارادے سے دہلی سے روانہ ہوتے اور بعد قطعِ منازل رونق افروزِ لکھنؤ ہوئے۔ نواب سعادت علی خاں نے کوئی دقیقہ اُن کی ... پاسداری میں فروگذاشت نہ کیا۔" گویا مرزا جہانگیر ۱۲۲۷ھ میں لکھنؤ کو گئے۔ ظاہر ہے کہ ذوق اُس کے بعد ہی دربارِ ولی عہدی میں پہنچے ہوں گے۔

۲۲۔ شاہ نصیر اور ذوق کے معرکوں اور انقطاعِ تعلق کے ضمن میں کئی متضاد اور ناقابلِ قبول

پیغام کیسے بھجوایا کہ خود آکر اپنے شعر سنا جائیں؟

ب ، ظفر کے دربار میں آزاد نے شعرا کا جمگھٹ دکھایا ہے جس کی "لگی" نے ذوق کو اپنی طرف
کھینچا تھا۔ اس فہرست میں کم از کم دو، مرزا عظیم بیگ اور میر قمرالدین منت خود ظفر کے
والد (اکبر شاہ) کی ولی عہدی میں انتقال کر چکے تھے۔ منت عہد شاہ عالم میں پورب کو سفر
کر گئے تھے اور ۱۲۲۱ھ سے پہلے ان کا کلکتے میں انتقال ہو گیا تھا۔ عظیم بھی ۱۲۲۱ھ سے پہلے
انتقال کر چکے تھے۔ اس صورت میں شعرا کا جمگھٹ کیا اور اس کی کشش کیا؟

ج ، شاہ نصیر ظفر کی غزل بناتے تھے۔ وہ دکن گئے تو یہ خدمت کاظم حسین بے قرار کے سپرد
ہوئی۔ جب وہ سندھ چلے گئے تو ذوق کی رسائی ظفر تک ہوئی۔ شاہ نصیر کا پہلا سفر دکن ۱۲۱۹ھ
میں بتایا جاتا ہے لیکن ۱۲۲۱ھ میں وہ دلی میں موجود تھے۔ (اور یہی وہ زمانہ ہے جب آزاد
کے مطابق ذوق ظفر کے دربار میں داخل ہوئے) اس لیے میر کاظم حسین بے قرار سے اصلاح
لینا مشکوک۔ پھر یہ بھی کہ مولانا کے مطابق کاظم حسین بے قرار ذوق کے ہم سن تھے اور شاہ نصیر
کے شاگرد۔ ظاہر ہے کہ اس دور میں وہ خود مبتدی ہوں گے (جیسا کہ قاسم اور سرور کے
بیانات سے ظاہر ہوتا ہے۔ مصحفی اور شیفتہ نے ان کا ذکر تک نہیں کیا۔ ایسے معمولی شاعر کا
استاد ولی عہد ہونا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔) پھر ولی عہد کی استادی کیا معنی۔ کاظم حسین بیقرار
کے سفر سندھ کو صاحبِ "ذوق سوانح اور انتقاد" نے ۱۲۲۴ کا واقعہ بتایا ہے۔ فی الوقت
متعلقہ کتبِ تواریخ دسترس میں نہیں۔ تاہم اگر یہ سنہ ٹھیک ہے (ڈاکٹر اسلم فرخی نے غالباً ۱۸۰۸ء
لکھا ہے جو ۱۲۲۳ - ۱۲۲۴ کے مطابق ہے) تو تب تک ذوق کا داخلِ دربار ہونا مشکوک ہے اس
لیے کہ اس وقت تک ان کی عمر صرف ۲۱ سال تھی اور وہ خود ابھی شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔
استاد ہونے میں کچھ تو وقت لگتا ہے۔ ذوق کا آغازِ شعرگوئی ۱۸ - ۱۹ کی عمر سے پہلے کسی
طرح ممکن نہیں۔

د ۔ جب ذوق قلعے پہنچے اس وقت ظفر تیر اندازی کی مشق کر رہے تھے۔ شکایت کے فوراً بعد
جیب سے غزل نکال کر بنانے کو دی۔ اس زمانے میں شاہوں کی قبا میں جیبوں کا وجود
ہی مشکوک ہے، تو غزل کا جیب سے نکالنا کیا معنی؟

ھ ۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ممتاز محل کی خاطر سے اکبر شاہ کبھی مرزا سلیم، کبھی مرزا جہانگیر وغیرہ شاہزادوں
کی ولی عہدی کے لیے کوشش کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ ابوظفر میرے بیٹے ہی نہیں۔

کاظم حسین ان کی غزل بنانے لگے۔ انھیں دنوں میں جان الفنسٹن صاحب شکارپور سندھ وغیرہ سرحدات سے لے کر کابل تک عہدنامے کرنے چلے گئے ... چند روز کے بعد ایک دن شیخ مرحوم ولیعہد کے ہاں گئے تو دیکھا تیراندازی کی مشق کر رہے ہیں۔ انھیں دیکھتے ہی شکایت کرنے لگے کہ میاں ابراہیم استاد تو دکن گئے۔ میر کاظم حسین اُدھر چلے گئے۔ تم نے بھی ہمیں چھوڑ دیا؟ غرض اسی وقت ایک غزل جیب سے نکال کر دی کہ ذرا اسے تو بنا دو۔ یہ وہیں بیٹھ گئے اور غزل بنا کر سنائی۔ ولیعہد بہادر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ بھئی کبھی کبھی تم آکر ہماری غزل بنا جایا کرو۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ممتاز محل کی خاطر سے اکبر شاہ کبھی مرزا سلیم کبھی مرزا جہانگیر وغیرہ شاہزادوں کی ولیعہدی کے لیے کوشش کرتے تھے اور کہتے تھے کہ مرزا ابوظفر میرے بیٹے ہی نہیں۔ مقدمہ اس کا گورنمنٹ میں دائر تھا۔ آخرکار کو سرکار ولیعہدی سے للہ روپے مہینا بھی ہوگیا تھا۔ اُس وقت لوگوں کے دلوں میں بادشاہ کا رعب وداب کچھ اور تھا چناں چہ کچھ ولیعہدی کے مقدمے پر خیال کرکے کچھ تنخواہ کی کمی پر نظر کرکے باپ نے اکلوتے بیٹے کو اس نوکری سے روکا۔ لیکن ادھر تو شاعروں کے جمگھٹ کی دل لگی نے اُدھر کھینچا اُدھر قسمت نے آواز دی کہ للہ نہ سمجھنا۔ یہ ایوانِ ملک الشعرائی کے چار ستون قائم ہوتے ہیں۔ موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ چناں چہ شیخ مرحوم ولیعہد کے اُستاد ہوگئے۔

اِس اقتباس میں اگرچہ کئی واقعات کا ذکر ہے تاہم یہ سب چوں کہ ذوقؔ کی دربارِ ولی عہدی میں رسائی اور ظفرؔ کی اُستادی کے زمانے سے متعلق ہیں اس لیے بیک وقت سب کو پرکھنا لازم آیا۔ البتہ یہ نظر میں رہے کہ ولی عہد کی استادی عہد ولی عہدی ہی میں ممکن ہے، اُس سے پہلے نہیں۔

الف: آزاد کہتے ہیں کہ اکبر شاہ کو شعر سے کچھ رغبت نہیں تھی۔ اِس کا اگر یہ مطلب ہے کہ انھیں ظفرؔ کے مقابلے میں شعر سے کم رغبت تھی، تو درست ہوسکتا ہے۔ ورنہ اگر شعر سے رغبت نہ تھی تو پھر ذوقؔ کو خاقانیِ ہند کا خطاب دینا کیا معنی رکھتا ہے؟ اکبر شاہ خود شاعر تھے اور اپنے والد کے تخلص آفتاب کی رعایت سے شعاعؔ تخلص کرتے تھے۔ اگر انھیں شعر سے رغبت نہ تھی تو پھر آزادؔ نے ایک مقام پر ذوقؔ کو اکبر شاہ کی طرف سے یہ

"قاصد اوہ دن کرے" والی غزل دیکھیے۔ اگر اس غزل کو ذوق کے ہاتھ کی تحریر مانا جائے تو یہ بھی ماننا ہوگا کہ وہ نہایت غلط اور پوچ گو تھے۔ مقدمۂ کلیات ذوق از ڈاکٹر تنویر علوی سے یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ غزل مولوی باقر والدِ آزاد کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ یہ قابلِ قبول نہیں۔ آخر مولوی باقر کو ایسے غلط اشعار لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ ہے یوں کہ بیاض میں اس غزل کی پہلی روایت ہے اور خود مولانا آزاد کے قلم سے ہے۔ اُس وقت بیشتر مصرعے بے ربط اور شعر مہل تھے۔ آزاد نے دیوان میں درج کرتے وقت اصلاح کردی۔ اس سے ایک نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ یا تو مرتب کلیات ذوق کو آزاد اور مولوی باقر کے خط میں امتیاز کرنے میں تسامح ہوا ہے یا پھر وہ جن دوسرے مسودوں کو ذوق کے قلم سے سمجھتے ہیں، وہ بعد کی تحریر ہیں۔ عابد) اور دیوانِ ذوق مرتبہ ظہیر و دیران "نگارستان سخن" (جس کی ترتیب میں ظہیر کا ہاتھ رہا ہے اور جس میں ذوق کی بعض ایسی غزلیں شامل ہیں جو دیگر مطبوعہ دواوین میں نہیں ملتیں) کا دامن بھی اِس غزل سے خالی ہے۔ (نگارستان کا پایۂ اِستناد بھی مشکوک ہے۔ سبب اوپر کہیں بیان ہوا ہے۔ عابد) ایسی صورت میں یہ واقعہ اور اِس غزل کا ذوق سے منسوب ہونا تحقیق طلب ہو جاتا ہے" (ذوق سوانح اور انتقاد) [اس کے باوجود ڈاکٹر علوی نے اس غزل کو کلیاتِ ذوق میں شامل کیا ہے۔] *

۲۱۔ اکبر شاہ بادشاہ تھے۔ اُنھیں تو شعر سے کچھ رغبت نہ تھی۔ مگر مرزا ابوظفر ولی عہد کہ بادشاہ ہو کر بہادر شاہ ہوئے شعر کے عاشقِ شیدا تھے۔ اور ظفر تخلص سے ملکِ شہرت کو تسخیر کیا تھا۔ اس لیے دربارِ شاہی میں جو جو کہنہ مشق شاعر تھے مثلاً حکیم ثناءاللہ خاں فراق، میر غالب علی سیّد، عبدالرحمان خاں احسان، برہان الدین زار، حکیم قدرت اللہ قاسم، ان کے صاحبزادے حکیم عزت اللہ خاں عشق، میاں شکیبا شاگردِ میر تقی مرحوم، مرزا عظیم بیگ شاگردِ سودا، میر قمر الدین منّت، ان کے صاحبزادے میر نظام الدین وغیرہ، سب شاعر آکر جمع ہوتے تھے ... شیخ مرحوم کو خیال ہوا کہ اس جلسہ میں طبع آزمائی ہوا کرے تو قوتِ فکر کو خوب بلند پروازی ہو۔ لیکن اس عہد میں کسی امیر کی ضمانت کے بعد بادشاہی اِجازت ہوا کرتی تھی، جب کوئی قلعے میں جانے پاتا تھا۔ چناں چہ میر کاظم حسین کی وساطت سے یہ قلعہ میں پہنچے اور اکثر دربارِ ولیعہدی میں جانے لگے۔

شاہ نصیر کے (؟ کہ) ولیعہد کی غزل کو اِصلاح دیا کرتے تھے دکن چلے گئے۔ میر

* ڈاکٹر محمد صادق کو آزاد کے خطاطی میں جو سودے ملے تھے یہ غزل انہیں شامل ہے۔ گویا الحاقی ہے (عابد)

باہرکس نقاری (کذا) دارد و خود را ملک الشعرا پندارد" اگر یہ درست ہے کہ نصیر، سودا اور میر تک کو خاطر میں نہیں لاتے تھے (کلیاتِ شاہ نصیر اس پر مختصر شہادت ہے) تو پھر ذوق کو سودا کی غزل پر غزل کہنے سے منع کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ اس سلسلے میں ایک لطیفہ بھی سنتے چلیے۔ آزاد نے مذکورہ کہانی اس لیے گھڑی کہ قدما عموماً اساتذہ کا احترام کرتے تھے اور اُن کی غزلوں پر غزلیں کہنے سے یہ کہہ کر منع کرتے تھے کہ یہ بے ادبی ہے (طرح مصرعوں پر غزل کہنے کی بات دوسری ہے) چناں چہ ہمیں یقین ہے کہ آزاد سے پہلے اور خود ان کے عہد میں بھی یہی دستور تھا جس کی بنیاد پر انھوں نے شاہ نصیر کی خفگی کا افسانہ تراشا۔ اب یہ قصہ دیکھیے:

> لکھنؤ سے شیخ ناسخ کی غزل اس طرح میں آئی۔ شہر میں چرچا ہوا کہ ان شعروں پر شعر نہیں ہو سکتے۔ شاہ نصیر مرحوم اُستادِ وقت تھے۔ (خود ناسخ بھی اُستادِ وقت تھے جاہد) اُن کی صحبت میں یہ باتیں پہنچیں۔ اُستاد مرحوم کی اصلاح بند ہو چکی تھی۔ مگر آدابِ شاگردانہ کی آمد و رفت جاری تھی۔ یہ اُن کی خدمت میں گئے۔ اُنھوں نے فرمایا میاں ابراہیم تم نے بھی وہ غزل دیکھی۔ یہ لوگ کیا کہتے ہیں۔ عرض کی حضرت سُنتا ہوں۔ ایسی تو نہیں جیسی لوگ کہتے ہیں۔ فرمایا پھر تم نہیں کہتے؟ کہا جو ارشاد ہو۔ انھوں نے فرمایا ہم بھی کہیں گے۔ تم کیوں نہیں کہتے؟ دیکھو تو وہ کیا کہتے ہیں۔ جبھی اُستاد نے یہ غزل کہی تھی۔ وہ غزلیں بھی لکھنؤ گئیں وہاں بھی تعریفیں ہوئیں۔
>
> (دیوان مطبوعہ ۱۹۳۲ء)

یہ دورنگی ملاحظہ فرمائی آپ نے۔ مذکورہ قصہ گھڑتے وقت آزاد یہ بھول گئے کہ انھوں نے ایک اُستاد کی غزل پر غزل کہنے کی بنیاد پر اُستاد شاگرد میں قطع تعلق کروایا تھا، اب وہی اُستاد بہ اصرار سابقہ شاگرد سے ایک اُستاد کی غزل پر غزل کہلوا رہا ہے۔ کہیے اسے کیا کہتے ہیں؟

اس سلسلے میں آخری بات یہ ہے کہ "دوش نقش پا، آغوش نقش پا" والی غزل ذوق کی ہے ہی نہیں بلکہ خود مولانا کی زائیدۂ فکر ہے۔ اس غزل کو دیوان میں پیش کرتے ہوئے مولانا آزاد نے لکھا: "یہ غزل ہے جس پر شاہ نصیر سے قطع تعلق ہوگیا" لیکن: "اس غزل کے متعلق یہ عرض کردینا ضروری ہے کہ ذوق کی اتنی اہم اور معرکۃ الآرا غزل نہ اُن کے نام سے کُلّی یا جزوی طور پر کسی معاصر تذکرے میں شاملِ انتخاب کی گئی۔ نہ اُس قلمی بیاض میں شامل ہے جس کا ایک بڑا حصہ خود ذوق کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے" (یہ مشکوک ہے۔ بڑا حصہ خود آزاد کا لکھا ہوا ہے۔ تصدیق کے لیے

جہ مشاعرہ ہوتا تھا۔ اشتیاق نے بے قرار کرکے گھر سے نکالا۔ مگر غزل بے اصلاح تھی دل
کے ہراس نے روک لیا کہ ابتدائے کار ہے۔ احتیاط شرط ہے۔ قریب شام افسردگی
اور مایوسی کے عالم میں جامع مسجد تک آ نکلے۔ آثار شریف میں فاتحہ پڑھی۔ حوض پر
آئے۔ وہاں میر کلو حقیر بیٹھے تھے۔ چوں کہ مشاعرہ کی گرم غزلوں نے روشناس کر دیا
تھا اور سن رسیدہ اشخاص شفقت کرنے لگے تھے، میر صاحب نے انھیں پاس بٹھایا
اور کہا کیوں میاں ابراہیم آج کچھ مکدر معلوم ہوتے ہو۔ خیر ہے؟ جو کچھ ملال دل پر تھا
انھوں نے بیان کیا۔ میر صاحب نے کہا بھلا وہ غزلیں ہمیں بھی تو سناؤ۔ انھوں
نے وہ غزل سنائی۔ میر صاحب کو اُن کے معاملہ پر درد آیا۔ کہا کہ جاؤ بے تامل غزل
پڑھ دو۔ کوئی اعتراض کرے گا تو جواب ہمارے ذمہ ہے۔ اور ہاتھ اٹھا کر دیر تک
اُن کے لیے دُعا کرتے رہے۔ اگرچہ میر صاحب کا انداز قدیمانہ تھا مگر وہ ایک کہن
سال شخص تھے۔ بڑے بڑے باکمال شاعروں کو دیکھا ہوا تھا اور مکتب پڑھایا کرتے
تھے۔ اس لیے شیخ مرحوم کی خاطر جمع ہوئی اور مشاعرہ میں جا کر غزل پڑھی۔ وہاں
بہت تعریف ہوئی۔ چناں چہ غزل مذکور یہ ہے .....

اس کے بعد سات شعر کی مذکورہ غزل درج کی ہے۔ اس قصے میں کئی باتیں مشکوک ہیں۔ تذکروں
سے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ میر کلو حقیر کا انتقال کب ہوا ورنہ کوئی قطعی فیصلہ کرنا آسان ہو جاتا۔ آزاد
نے ابتدائے کار کے ہراس کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے، " اُس دن سے جرأت زیادہ ہوئی
اور بے اِصلاح مشاعرے میں غزل پڑھنے لگے" گویا اس کے بعد شاہ نصیر سے یکسر قطع تعلق ہو گیا
لیکن یہ قطع تعلق اُس وقت ہوا تھا جب ذوق کی مشق سخن کم از کم ۱۲-۱۳ برس کی ہو چکی تھی۔
پھر ہراس و وسواس کا کیا مقام تھا؟ شروع میں بتایا ہے کہ مرزا رفیع کی زمین میں غزل کہی لیکن
جب حقیر سے واقعہ بیان کیا تو انھوں نے فرمایا، " بھلا وہ غزلیں ہمیں تو سناؤ" لیکن معاً بعد
غزل پھر ایک ہو گئی۔ شاہ نصیر اِس لیے بگڑے کہ " اب تو مرزا رفیع سے بھی اونچا اُڑنے لگا۔ اُستاد
کی غزل پر غزل کہتا ہے"۔ یہ ملحوظ رہے کہ شاہ نصیر کی عمر اُس وقت ساٹھ سال سے زیادہ تھی۔ یہاں
شاہ نصیر کے باب میں تذکرۂ قاسم کے یہ فقرے دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے، " بیشترے از نو آموزان
گفتۂ خود بہ اِصلاح وے رسانند۔ خیال شاعری چناں در دماغش جا گرفتہ کہ تا سر آمد سخن سنجانِ فصاحت
آما مرزا رفیع سودا و نکتہ پردازے بے نظیر میر تقی میر در نظرش نمی سنجد تا بدیگراں خود چہ رسد۔ بے ہیچ

(تذکرۂ ہندی میں بھی اُن کا ذکر تھا لیکن اُس میں شاہ نصیر کو کو نومشق بتایا گیا تھا) اور لکھا ہے کہ جب لکھنؤ آئے تھے اور طرحی مشاعروں میں شریک ہوئے تھے اُس وقت ان کی عمر تخمیناً ساٹھ سال تھی۔ (شاہ نصیر کی صحیح عُمر کا علم نہیں لیکن شیفتہ نے ۱۲۴۸ - ۱۲۵۰ میں اُن کی مشق ساٹھ سال بتائی ہے۔ اگر آغازِ شعر گوئی پندرہ برس کی عمر میں کیا ہو تو ۱۲۵۰ میں ۷۵ برس کے ہوں گے۔ آزاد نے تاریخ وفات "چراغِ گل" لکھی ہے۔ اگرچہ وفات کے وقت عمر نہیں لکھی لیکن ۸۰ سے کیا کم ہوگی) یہ زمانہ ۱۲۲۹ — ۱۲۳۰ کا ہے۔ (تفصیل عبدالقادر چیف رام پوری کے روزنامچے میں ملے گی جس کا ذکر مولانا عرشی مرحوم نے دستور الفصاحت کے خاتمے میں کیا ہے۔) دوسرا سبب یہی ہے کہ مصحفی نے منیر کو نوجوان بتایا ہے (عمرش تخمیناً بست سالہ خواہد بود) اور انتخاب میں صرف ایک شعر دیا ہے۔ لیکن شعر منیر کا نہیں ذوق کا ہے —

رخصت اے زنداں جنوں زنجیر در کھڑکائے ہے ؛ مژدہ خارِ دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے

یہ شعر ذوق نے ۱۲۳۰ کے آس پاس کہا ہوگا۔ پہلی مرتبہ یہ شعر تذکرۂ آزردہ میں منتخب ہوا ہے جو ۱۲۲۰ سے پہلے کی تصنیف نہیں۔ اِس میں انشا کے لیے لکھا ہے، "دریں ایام مسموع شد کہ جنوں در گرفتہ" انشا ۱۲۳۰ھ کے قریب مجنون ہوتے) ان تمام اعداد و شمار سے اندازا لگانا غلط نہیں ہوگا کہ ۱۲۲۱- ۱۲۲۲ میں منیر سے معرکہ پیش نہیں آسکتا۔ اِن حقائق سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ شاہ نصیر سے ذوق کے معرکے ۱۲۳۰ کے بعد اور ۱۲۴۸ سے پہلے وقوع پذیر ہوتے ہوں گے' اور اِسی نسبت سے ذوق قلعۂ معلیٰ میں اِس سنہ کے بعد پہنچے ہوں گے۔ شیفتہ نے منیر کے انتقال کو اُن کے شباب کا واقعہ بتایا ہے۔ جن قصائد کی بُنیاد پر ذوق کو اس سے پہلے دربار ولیعہدی میں پہنچایا گیا ہے، ذوق سے اُن کا انتساب مشکوک ہے۔ موقع ملا تو انشاء اللہ حصہ دوم میں ذوق کے الحاقی کلام پر بھی قلم اٹھایا جائے گا)

۱۹۔ اگرچہ ان کی طبیعت حاضر و فکر رسا، بندش چُست اس پر کلام میں زور سب کچھ تھا مگر چوں کہ یہ ایک غریب سپاہی کے بیٹے تھے نہ دنیا کے معاملات کا تجربہ تھا نہ کوئی ان کا دوست ہمدرد تھا اس لیے رنج اور شکستگی حد سے زیادہ ہوتی تھی۔ اِسی قیل و قال میں ایک دن سودا کی غزل پر غزل کہی، 'دوشِ نقشِ پا'، 'آغوشِ نقشِ پا' شاہ صاحب کے پاس لے گئے۔ انھوں نے خفا ہو کر غزل پھینک دی کہ استاد کی غزل پر غزل کہتا ہے۔ اب تو مرزا رفیع سے بھی اونچا اُڑنے لگا۔ اُن دنوں میں ایک

کی غزل اس زمین میں ہو نہیں سکتی۔ اسباب یہ ہیں :
ذوق کا معرکۃ الآرا مطلع اغلباً اُس وقت کی تخلیق ہے جب منیر کا انتقال ہو چکا تھا (منیر کا
انتقال ۲۱ ذی قعدہ ۱۲۴۲ھ کو ہوگیا تھا۔ اُس وقت اُن کی عمر اندازاً ۲۶ - ۲۲ سال کے درمیان
ہوگی) یہ مطلع اور مقطع سب سے پہلے دیوان مرتبہ ویران و انور میں آیا ہے۔ ۱۲۲۱ھ میں ذوق جُند
تھے۔ مجموعۂ نغز میں ان کے کُل دو شعر ہیں۔ عمدۂ منتخبہ میں اگرچہ انتخاب طویل ہے لیکن وہ بعد کا
اضافہ معلوم ہوتا ہے' اس لیے کہ حالات لکھتے وقت سرور نے ذوق کو شوق کا شاگرد لکھا ہے۔ عمدہ
میں اضافے ۱۲۴۶ھ تک ہوتے رہے لیکن ذوق کا یہ مطلع اُس میں نہیں ہے۔ (عمدہ کے نسخۂ لاہور
میں شروع کے اوراق جن میں ذوق کا ذکر آیا ہے' کسی دوسرے کا فذیر اور دوسرے کاتب کے
ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں اگرچہ نسخے کی کتابت ۱۲۲۴ھ کی ہے) نواب شیفتہ کا گلشن بے خار ۱۲۴۸-
۱۲۵۰ کی تالیف ہے۔ اوّلاً اُس میں ذوق کے صرف ۴۱ شعر منتخب ہوئے تھے۔ ۱۲۵۹ھ میں اُس کا
دوسرا اڈیشن شائع ہوا تو اہلِ مطبع نے ۱۶۱ شعر کا اضافہ کیا، اُن میں بھی شعر مذکور نہیں ہے۔ (یہاں
یہ ذکر بھی نامناسب نہ ہوگا کہ شاہ نصیر کی غزل اس زمین میں ہے تاہم اب تک کے مذکورہ تذکروں
میں ان کی غزل کا کوئی شعر نہیں ہے۔) اس کا مطلب یہ ہوا کہ ذوق نے یہ دو شعر ۱۲۵۹ - ۱۲۷۱ کے
درمیان تصنیف کیے ہوں گے۔ (نسخۂ ویران میں اگرچہ غزلِ مذکور کا مطلع اور مقطع "ناتمام" کے
تحت درج ہے تاہم آزاد کے فراہم کردہ ۹ شعروں میں سات خود اُن کی اپنی تصنیف ہیں۔)
اب ذرا منیر کے حال پر بھی نظر ڈال لی جائے۔ مولانا آزاد کے مطابق ذوق نے ابتدائی ایام
میں شاہ نصیر سے اصلاح لی۔ چونکہ مجموعۂ نغز میں انھیں شاگردِ شاہ نصیر لکھا گیا ہے اس لیے یہ واقعہ
۱۲۲۱ھ ہی کا ہوگا (ذوق کا حال تکمیلِ تذکرہ کے بعد تکملے میں لکھا گیا ہے) لیکن ۱۲۲۱ھ تک منیر بہت
چھوٹے رہے ہوں گے۔ مجموعۂ نغز میں اُن کا ذکر نہیں۔ چوں کہ شاہ نصیر کا ذکر موجود ہے اس لیے اگر
منیر شعر کہتے ہوتے تو ان کا ذکر نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ عمدہ میں اگرچہ منیر کا ذکر موجود ہے
لیکن یہ بعد کا اضافہ ہوگا، خصوصاً اس لیے کہ اُس کی پہلی روایت ۱۲۱۹ تک مکمل ہو چکی تھی اور خود
بہ قولِ مصنف قاسم نے اپنے تذکرے کی ترتیب میں اُس سے استفادہ کیا تھا۔ اب اگر اُس وقت
عمدہ میں منیر کا ذکر موجود ہوتا تو قاسم کو اُنھیں نظرانداز کرنے کی ضرورت نہیں تھی مصحفی نے ریاض الفصحا
میں منیر کا ذکر کیا ہے۔ ریاض کی تالیف کا زمانہ ۱۲۲۱ - ۱۲۳۶ھ ہے۔ مصحفی نے منیر کا تذکرہ ۱۲۳۰ کے
اس پاس لکھا ہوگا۔ اس قیاس کے دو سبب ہیں: اس تذکرے میں مصحفی نے نصیر کا ذکر بھی کیا

خوشی سہو کاتب ہے لیکن ۱۸۸۷ء کے اڈیشن میں بھی یہی ہے) خود بخود میری زبان
سے دو شعر نکلے اور یہ فقط حسن اتفاق تھا کہ ایک حمد میں تھا ایک نعت میں .... مگر ان
دو شعروں کے موزوں ہو جانے سے جو خوشی دل کو ہوئی اُس کا مزہ اب تک نہیں
بھولتا۔ انھیں کہیں اپنی کتاب میں کہیں جابجا کاغذوں پر رنگ برنگ کی روشنائیوں
سے لکھتا تھا۔ ایک ایک کو سُناتا تھا اور مارے خوشی کے پھولوں نہ سماتا تھا۔

وہ اشعار جو سب سے پہلے موزوں ہوتے ہوں اور جنھیں بے شمار مرتبہ رنگ برنگ روشنائیوں
سے لکھا گیا ہو؛ اور بے شمار لوگوں کو سُنائے گئے ہوں؛ بہ آسانی ذہن سے محو نہیں ہوتے۔
آزاد سے ذکر کرتے وقت آخر وہ اشعار ذوق نے مولانا کو سُنائے کیوں نہیں؟ جب کہ کئی مرتبہ
انھوں نے آزاد کو اپنے شعر سُنائے اور داد بھی وصول کی! یا وہ کاغذ کیوں نہ دکھائے؟ آخر
تو ہر کاغذ مٹکے میں بھر دیتے تھے۔

غرض اُن (وجیہہ الدین مُنیر) سے اور شیخ مرحوم سے بمقتضائے سن اکثر تکرار
ہو جاتی تھی اور مباحثے ہوتے تھے۔ ایک دفعہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ شیخ علیہ الرحمۃ
نے فرمایا کہ گھر سے کہے ہوئے شعر صحیح نہیں۔ شاید آپ استاد سے کہلوا لاتے
ہوں گے۔ ہاں ایک جلسہ میں بیٹھ کر ہم اور آپ غزلیں کہیں۔ چناں چہ اس معرکہ
کی مُنیر مرحوم کی غزل نہیں ملی۔ شیخ علیہ الرحمۃ کی غزل کا مطلع مجھے یاد ہے ؎

یاں کے آنے کا مقرر قاصد وہ دن کرے ؛ تو جو مانگے گا دہی (؟ تجھے) دوں گا خدا وہ دن کرے

ذوق سے عقیدت کے جوش میں مولانا آزاد نے شاہ نصیر اور ان کے بیٹے کی کردار کشی میں کوئی
کسر اٹھا نہیں رکھی۔ واقعۂ مذکور بھی اُسی کوشش کا نتیجہ ہے۔ لیکن یہاں آزاد سے شعر کے
انتخاب میں چوک ہو گئی اور نتیجے میں ساری داستان کی خامیاں سامنے آ گئیں۔ معرکے کا جو شعر
آزاد نے نقل کیا ہے اُس کے لیے کہا ہے "منیر مرحوم کی غزل نہیں ملی" ملتی بھی کیسے؟ مُنیر

(بقیہ حاشیہ صفحہ سے آگے) مزید رنگ چڑھایا، "میاں ابراہیم نے جب دیکھا کہ شاعری وہ ہے جس کی بدولت
سُبحان اللہ اور واہ واہ کی ہر دم بوچھاڑ رہتی ہے تو اُن کو بھی شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا اور رفتہ رفتہ شوق کا یہ عالم
ہوا کہ درگاہوں اور مزاروں پر دُعائیں مانگا کرتے تھے اور منتیں مانتے تھے کہ الٰہی مجھے شعر کہنا آ جائے"
(ذوق سوانح اور انتقاد)

میں آغازِ تعلیم کرنا قرینِ قیاس نہیں۔ دونوں کا ہم محلہ ہونا بھی ثابت نہیں۔ پھر آزاد کا یہ بیان کیونکر درست ہو سکتا ہے؟ اِس میں شک نہیں کہ مولوی باقر اور ذوق میں دوستی تھی۔ اِس دوستی کی بُنیاد کب پڑی۔ بہ یقین کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم یہ دونوں کے بچپن یا لڑکپن کا واقعہ نہیں ہو سکتا۔

۱۷۔ شیخ مرحوم کے والد شیخ محمد رمضان ایک غریب سپاہی تھے.... شیخ علیہ الرحمتہ ان کے اِکلوتے بیٹے تھے کہ ۱۲۰۴ میں پیدا ہوئے۔

شیخ رمضان سپاہی نہیں 'دربان تھے' انھیں سپاہی مولانا آزاد نے بنایا۔ غالباً اِس لیے کہ سپاہی پیشہ کو عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اکلوتے بیٹے ہونا گو درست ہو لیکن سنہ ولادت ۱۲۰۴ غلط ہے حیرت اس پر ہے کہ جو شخص دن رات کی حضوری کا مُتدعی ہے اور ایسی ایسی باتیں روایت کرتا ہے جن کے ذکر کی کوئی تقریب' قرینہ یا اِمکان نہیں' اُس نے "اُستاد" سے اُس کی تاریخ ولادت تک نہ پوچھی۔ اور نہیں تو اپنے والد کے اخبار ہی میں ۱۲۰۳ھ دیکھ لیتے۔ یہ ناممکن ہے کہ وہ اخبار مولانا کی نظر سے نہ گزرے ہوں (اُس زمانے میں وہ خود پرنٹر اور پبلی شر تھے) کیوں کہ اور بہت سے بیانات مولانا نے وہیں سے لیے ہیں۔ اِس پر مُستزاد یہ کہ دیوانِ ذوق کی ترتیب کے وقت مولانا نے "تاریخ پیدائش کی تصریح بھی کی ہے۔

> ۱۱ ذی الحج ۱۲۰۴ھ میں شیخ محمد رمضان کے گھر وہ مبارک چاند نکلا جو آسمانِ سخن پر چاند ہو کر چمکا۔

اِس بیان پر "ذوق سوانح اور انتقاد" کے مصنف نے یہ حاشیہ لکھا ہے؛

> مسودۂ دیوانِ ذوق کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مولینا آزاد نے اِس حصّے کی ترتیب کے وقت آبِ حیات کے مطبوعہ اوراق کو سامنے رکھا ہے اور اس کے حاشیے پر یہ تاریخ (بغیر کسی حوالے کے) بڑھا دی ہے۔

ڈاکٹر تنویر علوی کو اگر مولانا آزاد کی تاریخِ ولادت یاد ہوتی تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ مولانا نے جہاں اپنا علم و فضل ذوق کی جھولی میں ڈال دیا' وہاں اپنی تاریخ ولادت بھی اُنھیں بخش دی۔ مولانا ۸ ذی الحجہ کو ... تھے۔ اب یہ معلوم نہیں کہ سات دن کا یہ فرق سہواً ہے یا اُنھوں نے عمداً روا رکھا ہے۔

دل میں شوق تھا اور خدا سے دعائیں مانگتا تھا کہ
دن خوشی میں (ہمارا خیال تھا کہ یہاں جوش کی جگہ
استاد کا یہ بیان کچھ پھیکا معلوم ہوا، چناں چہ اُس نے اِس بیان پر

نے آبِ حیات میں تقریباً ۱۵ بار ذوق کا ذکر کیا ہے؛ کہیں نام سے؛ کہیں محض تخلص سے شعر نقل کر دیا ہے۔ کہیں شیخ علیہ الرحمۃ کہا ہے اور کہیں اُستاد ذوق۔ کہیں اُستاد اور کہیں اُستاد مرحوم۔ اکثر جگہ استاد' استادِ شاہ اور جگت استاد ہونے کی رعایت سے آیا ہے۔ کہیں کہیں صریحاً تلمّذ کا قرینہ نکلتا ہے' لیکن بیشتر واقعات طبعِ دوم میں داخل ہوئے ہیں' طبعِ اوّل میں نہیں تھے مثلاً عبداللہ خاں اوج کے ذکر میں یہ جملہ آیا ہے ؛" آخر شاگرد تھے' ہماری بات ہی بگاڑ دی" یہ طبعِ اوّل میں نہیں تھا۔ ایسے موقعے بھی ہیں جہاں تلمیذ کہلوانے کا مقام تھا لیکن آزاد نے اُن موقعوں پر ذوق کو استاد بھی نہیں کہا۔ اگرچہ دیوانِ ذوق مرتب کرنے کا خیال اُنھیں بہت پہلے سے تھا اس لیے اُنھوں نے پیش بندی شروع کر دی تھی' لیکن طبعِ دوم کے وقت سے ان کی یہ لگن کچھ زیادہ ہی پختہ ہو گئی تھی۔ چناں چہ اُنھوں نے خُود کو تلمیذِ ذوق مشتہر کرنے کی مہم تیز تر کر دی تھی تاکہ کل کلاں کو اگر وہ کوئی ایسی بات کہیں جو مشکوک ہو' تو کوئی اُن سے سند طلب نہ کرے۔ لہٰذا طبعِ ثانی میں ذوق کا حال از سرِ نو لکھا گیا۔ چوں کہ طبعِ اوّل پیشِ نظر نہیں' اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اُس میں کیا صورت تھی۔ البتہ احوالِ ذوق کے سارے لطائف اور بیشتر واقعات طبعِ دوم کا اضافہ ہیں' اِسی لحاظ ناقابلِ اعتبار۔ بہرحال مذکورہ روایات کے لیے ذوق کی زبانی یا ذوق سے متعلق بہت سے واقعات بھی آزاد نے بیان کیے ہیں اور وہ سب جزوی یا کُلی طور پر غلط ہیں' ملاحظہ ہو:

> ۱۶ ـ کیسا مبارک زمانہ ہوگا جب کہ شیخ مرحوم اور میرے والدِ مغفور ہم عمر ہوں گے۔ تحصیل علمی اُن کی عمروں کی طرح حالتِ طفولیت میں ہوگی۔ صرف ونحو کی کتابیں ہاتھوں میں ہوں گی اور ایک استاد کے دامنِ شفقت میں تعلیم پاتے ہوں گے۔

یہ بیان ہر لحاظ سے مشکوک ہے۔ ایک روایت کے مطابق مولوی باقر کی ولادت ۱۷۸۰ء کی ہے اور دوسری کے مطابق ۱۸۱۰ء کی۔ (اسلم فرخی صاحب نے پہلی روایت کو درست مانا ہے) ذوق ۱۲۰۳ھ (۱۷۸۸ - ۱۷۸۹ء) میں پیدا ہوئے' لہٰذا ہم عمری غلط۔ اگر وہ ۱۷۸۰ء میں پیدا ہوئے تو ذوق سے بڑے تھے اور ذوق کی ولادت تک ان کی تعلیم کا آغاز ہو چکا تھا۔ اور اگر ۱۸۱۰ء میں پیدا ہوئے تو بہت چھوٹے' اور کم از کم ذوق کے ہم مکتب نہیں ہو سکتے۔ اِس کے علاوہ یہ بھی نظر میں رہے کہ مولوی باقر کا خاندان' امیر خاندان تھا۔ اِس لیے اُن کی تعلیم کا انتظام ان کے والدین کر سکتے تھے وہ ذوق کو کسی طرح مُیسّر نہیں آسکتا۔ ذوق حافظ غلام رسول شوق کے مکتب میں تعلیم پاتے تھے (بہ قولِ آزاد' یہ ان کے محلّے میں تھا) مولوی باقر کا اس محلّے کے مکتب

۱۵۔ اِتفاق

فرماتے تھے ایک دن بادشاہ نے غزل کا مسودہ دیا۔ اور فرمایا اسے ابھی درُست کرکے دے جانا۔ موسم برسات کا تھا۔ ابر آرہا تھا۔ دریا چڑھاؤ پر تھا۔ میں دیوانِ خاص میں جاکر اُسی رُخ پر ایک طرف بیٹھ گیا، اور غزل لکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد پاؤں کی آہٹ معلوم ہوئی۔ دیکھا تو پُشت پر ایک صاحب دانائے فرنگ کھڑے ہیں۔ مجھ سے کہا آپ کیا لکھتا ہے؟ میں نے کہا غزل ہے۔ پوچھا کون ہے؟ میں نے کہا نظم میں حضور کی دُعا گوئی کیا کرتا ہوں۔ فرمایا کس زبان میں؟ میں نے کہا اُردو میں۔ پوچھا آپ کیا کیا زبانیں جانتا ہے؟ میں نے کہا فارسی عربی بھی جانتا ہوں (غالباً آزاد کے ذہن سے ۱۸ زبانوں والا فقرہ نکل گیا ورنہ خود اُستاد کی زبان سے تصدیق کا اچھا موقع تھا) فرمایا اُن زبانوں میں بھی کہتا ہے؟ میں نے کہا کوئی خاص موقع ہو تو اُن میں بھی کہنا پڑتا ہے ورنہ اُردو ہی میں کہتا ہوں کہ یہ میری اپنی زبان ہے۔ جو کچھ انسان اپنی زبان میں کر سکتا ہے غیر میں نہیں کر سکتا۔ پوچھا آپ انگریزی جانتا ہے؟ میں نے کہا نہیں۔ فرمایا کیوں نہیں پڑھا؟ میں نے کہا ہمارا لب و لہجہ اُس سے موافق نہیں۔ وہ ہمیں آتی نہیں ہے۔ صاحب نے کہا ول یہ کیا بات ہے۔ دیکھیے ام آپ کا زبان بولتے ہیں۔ میں نے کہا پختہ سالی میں غیر زبان نہیں آسکتی۔ بہت مشکل معاملہ ہے اُنھوں نے کہا۔ ول ہم آپ کی تین زبانیں ہندوستان میں آکر سیکھا۔ آپ ہمارا ایک زبان نہیں سیکھ سکتے؟ اور تقریر کو طول دیا۔ میں نے کہا۔ صاحب ہم زبان کا سیکھنا اُسے کہتے ہیں کہ اُس میں بات چیت ہر قسم کی تحریر تقریر اس طرح کریں جس طرح اہلِ زبان کرتے ہیں۔

قطع نظر اس سے کہ آزاد صاحب کے لہجے کی پوری نقل نہیں اُتار سکے، ذوق اس واقعے کے راوی نہیں ہو سکتے۔ دیوانِ خاص چاندنی چوک کا بازار نہیں تھا کہ جس کا جب جی چاہے، مُنہ اُٹھائے چلا آئے۔ پھر یہ بھی نظر میں رہے کہ یہ "اتفاق" طبع دوم میں پہلی بار آیا ہے۔ ہے یوں کہ آزاد کو ڈاکٹر لائٹنر سے بہت تکلیف پہنچی تھی۔ لہٰذا آبِ حیات میں انشا اور ذوق کی زبان سے اُنھیں کا منہ چڑایا ہے۔

یہ تو ہیں وہ روایات جن کا راوی ذوق کو بنایا گیا ہے، اور یہ سب غلط ہیں۔ ویسے آزاد

> اُس پر سفید چاندی کا فرش، پیچھے گاؤ تکیہ سامنے لیمپ پہلو میں کشمیری قلمدان اُس کے برابر تھال، اُس میں مختلف طرح کے قلم اور مختلف رنگوں کی دواتیں پنسلیں ـــ آزاد تحریر میں حسنِ ظاہر کے بہت قائل تھے۔ مختلف رنگوں کی روشنائیاں اور پنسلیں استعمال کرتے تھے۔
>
> (محمد حسین آزاد)

رنگ رنگ کی روشنائیوں کا استعمال آزاد نے ذوق کو بخش دیا۔ (ملاحظہ ہو آغازِ شعرگوئی کا واقعہ) بہ ہر حال ابتدا میں موسیقی کے شوق کی تصدیق کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہوتی۔ خود آزاد نے جہاں تعلیم و تربیت کا ذکر کیا ہے وہاں اس کا ذکر نہیں۔ معاصر تذکرے ذوق کی تحصیل علمی کو بہت بعد کا واقعہ بتاتے ہیں، اور یہ سب آزاد کے مذکورہ بیان سے میل نہیں کھاتا۔ پھر ذوق کا یہ کہنا کہ "آتا ہے" محلِ نظر ہے۔ جب باقاعدہ سیکھتے تھے تو آتا کا طعنہ کون اور کیوں کر دیتا؟

> ۱۴۔ نجوم و رمل کا بھی شوق کیا۔ اس میں دستگاہ پیدا کی۔ نجوم کا ایک صاحبِ کمال مغل پورے میں رہتا تھا۔ (نام لکھنے میں کیا امر مانع تھا؟) اس سے نجوم کے مسائل حل کیا کرتے تھے۔ یہ بھی کہا کہ ایک ایک ستارہ کا حال، اُس کے خواص معلوم کرنے کے لیے ۷۷ برس چاہییں ہیں۔ یہ سُن کر اس سے بھی دل برداشتہ ہو گیا۔

اس پر بھی وہی تنقید ہے جو شوقِ موسیقی سے متعلق ہے۔ ایک طرف تو مومن کا ماہرِ نجوم ہونا آزاد کے ذہن میں ہے اِس لیے انھوں نے ذوق کو بھی اس فن سے متصف کرنا چاہا لیکن دوسری طرف اُنھیں معلوم ہے کہ ذوق کے کلام پر نجوم کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی۔ (حمل سے حوت تلک جا بجا ہیں تصویریں، قسم کے دو ایک شعر علمِ نجوم میں مہارت کا ثبوت نہیں ہو سکتے۔ اِس سے تو کہیں زیادہ غالب کے ایک فارسی قصیدے میں مہارت کا ثبوت ملتا ہے جس میں انھوں نے اپنے زائچے کی تفصیل سے بحث کی ہے) اس لیے اُس کی ایک غیر معقول تاویل کر کے اُسے ترک کر دیا۔ مومن خاں عمر میں ذوق سے چھوٹے تھے، انتقال بھی پہلے کیا۔ علمِ نجوم میں ان کی مہارت کا ایک آدھ واقعہ تو خود آزاد نے حالی کے خط سے لے کر آبِ حیات میں شامل کر لیا ہے گویا اُن کی مہارت کے قائل تھے۔ وہاں اُنھیں ۷۷ برس والا فقرہ نہ سوجھا۔

باوجود شرفا اِسے ڈوموں کا فن سمجھتے تھے۔ چناں چہ موسیقی سے خاص دلچسپی کے باوجود انشانے مرزا قاسم علی خاں کی ہجو میں اِس قسم کے مصرعے کہے جو مزاج وقت کی نمایندگی کرتے ہیں ؛

گھمنڈ اِن ڈومڑوں کا یہ نہایت مجھ کو بھاتا ہے ؛ جو کہتے ہیں کہ ہم کو بادشاہوں ساتھ ناتا ہے

مرزا قاسم علی خاں کی خاندانی شرافت میں کلام نہیں۔ موسیقی میں صاحب کمال تھے۔ اس کے باوجود انشانے انھیں ڈومڑوں میں شمار کیا ہے۔ یہی نظریہ آزاد کا بھی تھا۔ میرعلی کے لیے لکھا کہ علم موسیقی میں حکما کا مرتبہ حاصل کیا تھا، لیکن سعادت علی خاں کے گھر پر مجلس نہیں پڑھی تو وہ ناراض ہوگئے اور آزاد نے اُن سے کچھ اس قسم کے خیالات کا اظہار کروایا ہے " سیّد میرے یہاں ہزاروں ہیں۔ میرصاحب نے اگر فخر پیدا کیا تو یہ کہ آگے سیّد تھے۔ اب ڈوم بھی ہوگئے" (یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ سعادت علی خاں سادات کی بڑی عزت کرتے تھے۔ انشا کو اِسی سبب سے پیغمبر زادہ کہتے تھے۔ تفصیل لطائف السعادت میں دیکھی جا سکتی ہے) آزاد اپنی عقیدت کی وجہ سے یہ بھی چاہتے ہیں کہ ذوق کا دامن کسی علم اور کسی فن سے خالی نہ رہے، لیکن جن فنون سے انھیں خود دلچسپی نہیں، اُس کے لیے کوئی ایسی تاویل پیش کر دیتے ہیں کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ آبِ حیات کے کرداروں کے زندۂ جاوید ہوجانے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ آزاد اپنے خصائص اُن میں منتقل کرتے رہتے ہیں اور چوں کہ اُن کے اپنے حقیقی خصائص ہیں، اِس لیے کرداروں کی زندگی کی ضمانت بن جاتے ہیں۔ یہ دعویٰ بے دلیل نہ سمجھا جائے اِس لیے دو ایک واقعات کی طرف اِشارہ کر دینا نامناسب نہ ہوگا۔

انشا کی خانہ نشینی کے زمانے میں رنگین نے تربوز کی فرمایش کی تھی۔ آزاد کی حیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ خود اُن کو بہت مرغوب تھا۔ شاہ نصیر کی فرمایشی طبیعت میں بھی آزاد کے مزاج کا عکس نظر آتا ہے جس کا اندازہ " محمد حسین آزاد" ص ۱۰۔ مصنفہ ڈاکٹر اسلم فرخی دیکھ کر لگایا جا سکتا ہے مثلاً شاہ صاحب کی ڈھاکے کی ململ کی فرمایش۔ خود آزاد نے لالا دُنی چند (تلمیذ آزاد) سے کپڑے کی فرمایش کی تھی۔ یا شاہ صاحب نے کشمیری قلمدان کی فرمایش اِن الفاظ میں کی ہے " مثلاً غزل کو اصلاح دینے لگے۔ قلمدان سے قلم اُٹھاتے اور کہتے میاں کشمیر کے قلمدان کیا خوب خوب آیا کرتے تھے۔ کیا ہوگیا ہے اب تو آتے ہی نہیں۔ بھلا کوئی نظر چڑھ جائے تو لانا" اب آغا محمد باقر کا یہ بیان ملاحظہ ہو ؛

زمین پر دری بچھادی جاتی تھی، سردیاں ہوتیں تو اُس پر ایک پتلا سا گدیلا ہوتا۔

ایک ملکۂ راسخہ دیا تھا اور لطیفہ یہ کہ احکام اکثر مطابق واقع ہوتے تھے۔ (جب ملکۂ راسخہ دیا تھا تو احکام کا مطابق ہونا فطری تھا، تعجب کا کیا مقام ؟) اگرچہ وسعتِ نظر بہم پہنچانے کا تعجب ہے مگر اس سے زیادہ تعجب یہ ہے کہ اُن کے حافظے میں اس قدر مضمون محفوظ کیونکر رہے۔

اِسے کہتے ہیں عقیدت۔ آزاد چاہتے ہیں کہ کوئی ایسا علم، کوئی ایسا فن رہ جائے جسے وہ ذوق کی ذات میں نہ دکھائیں۔ حق یہ ہے کہ عقیدت مندی کے جوش میں انھوں نے اپنا سارا علم "اُستاد" کی جھولی میں ڈال دیا ہے۔ ذوق کے کلام سے اُن کی ایسی علمیت کا ثبوت نہیں ملتا۔ وہ اوّل و آخر شاعر تھے اور بہتر ہوتا کہ آزاد اُنھیں شاعر ہی رہنے دیتے۔ اپنے مبالغہ آمیز بیانوں سے اُنھوں نے ذوق کو علم و فضل تو کیا بخشا، اُن کا شاعرانہ مرتبہ مشکوک ضرور کردیا۔

اِس اقتباس کے شروع میں آزاد نے ذوق کی زبانی ساڑھے تین سو دیوان پڑھنے اور خلاصہ کرنے کی بات کہی ہے۔ شاید اُنھیں یہ تعداد بہت کم محسوس ہوئی۔ چناں چہ دیوانِ ذوق میں یہ تعداد بڑھ کر ساڑھے سات سو ہوگئی۔ پروفیسر شیرانی مرحوم نے اپنے مضمون "آزاد اور دیوانِ ذوق" میں اِس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا اس سے نصف تعداد میں بھی دواوین اُس وقت دلّی میں کسی ایک جگہ جمع نہیں ہوئے، بلکہ یوروپ کے کُتب خانوں میں بھی نہیں۔

۱۳۔ وہ کہتے تھے کہ اگرچہ شعر کا مجھے بچپن سے عشق ہے مگر ابتدا میں دنیا کی شہرت اور ناموری اور تفریحِ طبع نے مجھے مختلف کاموں کے رستے دکھاتے۔ چند روز موسیقی کا شوق ہوا اور کچھ حاصل بھی کیا۔ مگر خاندیس سے ایک بڑا صاحبِ کمال گویا آیا اُس سے ملاقات کی۔ باتوں باتوں میں اُس نے کہا جو گانے کا شوق کرے اُسے ۲۰۰ برس کی عمر چاہیے ۔۔۔ ۱۰۰ برس سیکھے، ۱۰۰ برس سُنتا پھرے اور جو سیکھا ہے اُسے مطابق کرے پھر سو برس بیٹھ کر اَوروں (کذا) کو سُنائے اور اُس کا لُطف اُٹھائے۔ (آزاد نے یہ نہ بتایا اُس صاحبِ کمال کی اپنی عمر کیا تھی ؟) یہ سُن کر دل برداشتہ ہوگیا۔ اور یہ بھی خیال آیا کہ ابراہیم نے (کذا) اگر بڑا کمال پیدا کیا تو ایک ڈوم ہوگئے۔ اس پر بھی جو کلاونت ہوگا وہ ناک چڑھا کر کہے گا کہ اتائی ہے۔ سپاہی زادے سے ڈوم بننا کیا ضرور۔

آزاد کو موسیقی سے دلچسپی نہیں تھی۔ محمد شاہ کے عہد میں اس فن کو بہت فروغ ہوا۔ اِس کے

کبوتروں کو چھتری بنایا ہے۔ ایک طرف میں بیٹھا تھا۔ ایک طرف حافظ ویران بیٹھے
تھے۔ وہ نابینا ہیں۔ انھوں نے پوچھا کہ حضرت کیا؟ میں نے حال بیان کیا۔ ویران
بولے کہ ہمارے سر پر تو نہیں بیٹھتی۔ اُستاد نے کہا، بیٹھے کیونکر؟ جانتی ہے کہ یہ
مُلّا ہے، عالم ہے۔ ابھی اُحِلَّ لَکُمْ الصَّیْدُ آیت پڑھ کر کُلُوْا وَاشْرَبُوْا۔ بسم اللہ اللہ اکبر
کر دے گا۔ دیوانی ہے جو تمھارے سر پر آئے۔

اس واقعے میں کتنی صداقت ہے یہ تو معلوم نہیں، لیکن حیاتِ ذوق کی روایت اس کے برعکس ہے
معلوم نہیں، دونوں میں کون سا بیان درست ہے۔

ایک چڑیا حافظ ویران کے سر پر آ بیٹھی حافظ جی نے ہاتھ سے اُڑا دیا۔ تھوڑی دیر میں
وہ پھر آ بیٹھی۔ حافظ جی نے غصّے میں سر پر جو ہاتھ مارا تو چڑیا اُڑ گئی مگر فرقدان پر صدمہ
پہنچا۔ شیخ مرحوم کھل کھلا کر ہنسے اور کہا کہ فیبانی حافظ جی کا سر نہ ہوا کبوتروں کی چھتری
ہوا۔ کچھ خبر بھی ہے، یہ مُلّا ہیں، عالم ہیں، حافظ ہیں...... (کذا) ابھی اُحل اللھم الصید
کی آیت پڑھ کر، کلوا واشربو، کہہ کر بسم اللہ اللہ اکبر، کر دیں گے۔ (کذا)

(ذوق سوانح اور انتقاد)

غلط ہونے کے باوجود مولانا کی روایت بہتر معلوم ہوتی ہے۔

۱۲۔ فرماتے تھے میں نے ساڑھے تین سو دیوان اساتذۂ سلف کے دیکھے اور ان کا خلاصہ
کیا۔ خان آرزو کی تصنیفات، ٹیک چند بہار کی تحقیقات اور اس قسم کی اور کتابیں گویا
ان کی زبان پر تھیں۔ مگر مجھے اس کا تعجّب نہیں۔ اگر شعرائے عجم کے ہزاروں شعر
انھیں ازبر تھے تو مجھے حیرت نہیں۔ گفتگو کے وقت جس تڑاقے سے وہ سند میں شعر
دیتے تھے مجھے اس کا بھی خیال نہیں۔ کیونکہ جس فن کو وہ لیے بیٹھے تھے یہ سب
اُس کے لوازمات ہیں۔ ہاں تعجب یہ ہے کہ تاریخ کا ذکر آئے تو وہ ایک صاحب
نظر مورخ تھے۔ تفسیر کا ذکر آئے تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا تفسیر کبیر دیکھ کر اٹھے ہیں۔
خصوصاً تصوّف میں ایک عالم خاص تھا کہ وحدت الوجود اور وحدتِ شہود میں علم
اشراق کا پرتو دے کر کبھی ابوسعید ابوالخیر تھے کبھی محی الدین عربی پھر جو کہتے کانٹے
کے تول کہتے تھے کہ دل پر نقش ہو جاتا۔ اور جو کچھ اُن سے سُن لیا آج تک دل پر
نقش ہے۔ رمل و نجوم کا ذکر آئے تو وہ نجومی تھے۔ خواب کی تعبیر میں تھانے میں

انداز کو دیکھ کر تو یہی لگتا ہے اُنھوں نے بھی اس قصیدے کا کوئی شعر منتخب یا نقل نہیں کیا۔

۱۰۔ قوتِ حافظہ کے باب میں ذوق سے یہ واقعہ روایت کیا ہے:

کہتے تھے مجھے اب تک یاد ہے کہ اُسی عالم میں (کس عالم میں؟) ایک دن مجھے بخار تھا۔ والدہ نے پلنگ پر لٹا کر لحاف اُڑھا دیا۔ اور آپ کسی کام سے چلی گئیں۔ ایک بلی لحاف میں گھس آئی۔ مجھے اُس سے اور اُس کی خُرخُر کی آواز سے نہایت تکلیف معلوم ہونے لگی، لیکن نہ ہاتھ سے ہٹا سکتا تھا اور نہ زبان سے پکار سکتا تھا۔ گھبراتا تھا اور رہ جاتا تھا۔ تھوڑی دیر میں والدہ آگئیں۔ اُنھوں نے اسے ہٹایا تو مجھے غنیمت معلوم ہوا۔ اور وہ دونوں کیفیتیں اب تک یاد ہیں۔ چناں چہ جب میں بڑا ہوا تو میں نے والدہ سے پوچھا۔ انھوں نے یاد کر کے اس واقعہ کی تصدیق کی اور کہا فی الحقیقت اُس وقت تیری عُمر برس دن سے کچھ کم تھی۔

اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔

۱۱۔ خوفِ خدا | عمر بھر میں اپنے ہاتھ سے جانور ذبح نہیں کیا۔ عالمِ جوانی کا ذکر کرتے تھے کہ یاروں میں ایک مجرّب نسخہ قوتِ باہ کا بڑی کاوشوں سے ہاتھ آیا شریک ہو کر اُس کے بنانے کی صلاح ٹھہری۔ ایک ایک جُز کا بہم پہنچانا ایک ایک شخص کے ذمّے ہوا۔ چناں چہ بہ چڑوں کا مغز ہمارے سر ہوا۔ ہم نے گھر آ کر ان کے پکڑنے کے سامان پھیلا دیئے اور دو تین چڑے پکڑ کر ایک پنجرے میں ڈالے۔ اُن کا پھڑکنا دیکھ کر خیال آیا کہ ابراہیم ایک پل کے مزے کے لیے بہ بے گناہوں کا مارنا کیا انسانیت ہے۔

یہ ایک بزرگ کی گفتگو ہے اُس لڑکے سے جو اُسے والد کی جگہ سمجھتا ہے۔

خوفِ خدا میں لطیفہ | ایک دفعہ برسات کا موسم تھا۔ بادشاہ قطب میں تھے۔ اُس وقت قصیدہ لکھ رہے تھے ؏ شب کو میں اپنے سربسترِ خوابِ راحت چڑیاں سائبان میں تنکے رکھ کر گھونسلا بنا رہی تھیں اور ان کے تنکے جو گرتے تھے انھیں لینے کو بار بار ان کے پاس آ بیٹھتی تھیں۔ یہ عالمِ محویت میں تھے۔ ایک چڑیا سر پر آن بیٹھی۔ اُنھوں نے ہاتھ سے اُڑا دیا۔ تھوڑی دیر میں پھر آن بیٹھی۔ اُنھوں نے پھر اُڑا دیا۔ جب کئی دفعہ ایسا ہوا تو ہنس کر کہا۔ اس غیبانی نے میرے سر کو

ب طرف میں بیٹھا تھا۔ ایک طرف حافظ ویران بیٹھے
نے پوچھا کہ حضرت کیا؟ میں نے حال بیان کیا۔ ویران
ی ۔ اُستاد نے کہا، بیٹھے کیونکر؟ جانتی ہے کہ یہ
لصَّمَدُ آیت پڑھ کر کُلُوا وَ اشربُوا ۔ بسم اللہ اللہ اکبر
دے سر پر آئے۔
علوم نہیں، لیکن حیاتِ ذوق کی روایت اس کے برعکس ہے
ست ہے۔

بیٹھی حافظ جی نے ہاتھ سے اُڑا دیا۔ تھوڑی دیر میں
میں سر پر جو ہاتھ مارا تو چڑیا اُڑ گئی مگر فرقدان پر صدمہ
ر کہا کہ فیبانی حافظ جی کا سر نہ ہوا کبوتروں کی چھتری
الم ہیں؟ حافظ ہیں .... (کذا) ابھی اُحل للھم الصید
بسم اللہ اللہ اکبر، کردیں گے۔ (کذا)
(ذوق سوانح اور انتقاد)

تر معلوم ہوتی ہے۔
ا سو دیوان اساتذۂ سلف کے دیکھے اور ان کا خلاصہ
چند بہار کی تحقیقات اور اس قسم کی اور کتابیں گویا
تعجب نہیں۔ اگر شعرائے عجم کے ہزاروں شعر
نتگی کے وقت جس ترلاتے سے وہ سند میں شعر
۔ کیونکہ جس فن کو وہ لیے بیٹھے تھے یہ سب
ہے کہ تاریخ کا ذکر آئے تو وہ ایک صاحب
معلوم ہوتا تھا گویا تفسیر کبیر دیکھ کر اٹھے ہیں۔
وحدت الوجود اور وحدتِ شہود میں علم
تے کبھی محی الدین عربی پھر جو کہتے کانٹے
در جو کچھ اُن سے سن لیا آج تک دل پر
اب کی تعبیر میں خدا نے انھیں

دونوں روایتوں کا فرق اور دروغ ہونا صاف ظاہر ہے۔ یہاں یہ عرض کر دینا نامناسب نہ ہوگا کہ حیاتِ ذوق کے مصنف نے ذوق کی پیدایش کے وقت خود ہی اُن کے والد کے ایک خواب کا ذکر کیا ہے میر تقی میر نے اُنھیں صاحبِ کمال بیٹے کی ولادت کی بشارت دی تھی' اور خود ہی اُسے ایشیائی توہم پرستی کہہ کر رد کر دیا تھا۔

اب پورے واقعے پر ایک تحقیقی نظر بھی ڈال لی جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ ذوق کو دربار سے خطاب ملا تھا لیکن یہ معلوم نہیں کہ خطاب کب اور کس قصیدے پر ملا۔ اس ضمن میں آزاد نے جو کچھ لکھا ہے وہ درست نہیں۔ پہلے ۱۹ سال کی عمر والے بیان کو دیکھا جائے۔ آزاد خطاب کو مرزا سلیم کی شادی سے چند سال بعد کا واقعہ بتاتے ہیں "ذوق سوانح اور انتقاد" کے مصنف کے مطابق یہ شادی ۱۲۲۵ - ۱۲۲۶ کا واقعہ ہے۔ ذوق کی عمر اُس وقت ۲۲ برس کی ہونی چاہیے۔ ۱۹ برس کی عمر میں وہ نہ صرف مُبتدی تھے بلکہ اُن کی ۱۹ برس کی عمر بھی ۱۲۲۲ھ میں ہونی چاہیے (آزاد کو ۱۹ برس سے بہت محبت معلوم ہوتی ہے مثلاً ذوق معروف کے پاس ۱۹ برس کی عمر میں گئے۔ دربارِ ولی عہدی میں ۱۹ برس کی عمر میں پہنچے۔ خاقانیِ ہند کا خطاب بھی ۱۹ برس کی عمر میں ملا۔) اگر مرزا سلیم کی شادی ۱۲۲۶ کا واقعہ ہے تو پھر ذوق کی عمر اُس وقت ۲۳ برس کی تھی۔ قصیدہ اُس کے چند سال بعد پڑھا گیا۔ اگر یہ مدت تین برس کی بھی ہو تو اُس وقت ذوق کی عمر ۲۶ برس ہوگی اور سنہ ۱۲۲۹ھ۔ (ویسے مختلف محققین کی تمام تر تحقیق کے باوجود ذوق کا ۱۲۳۰ھ سے پہلے دربارِ شاہی سے تعلق کسی طرح ثابت نہیں ہوتا۔)

اُس موقعے پر ذوق نے کون سا قصیدہ کہا تھا اُس کے لیے کوئی معاصر شہادت موجود نہیں۔ مولوی محمد باقر مالک دہلی اردو اخبار نے بھی ذوق کے انتقال کے بعد یہ وعدہ کیا تھا کہ قصیدۂ مذکور شائع کیا جائے گا، لیکن وہ اپنا وعدہ پورا نہ کر سکے۔ دہلی اردو اخبار میں بھی مختلف صنعتوں اور ۱۸ زبانوں کا ذکر ہے (اِسی سے ہمارا خیال ہے کہ ۱۸۵۴ء میں یہ رپورٹنگ بھی مولانا آزاد ہی کے قلم سے تھی۔ ڈاکٹر فرخی کے مطابق اُس زمانے میں آزاد نے اخبار کے لیے مضامین لکھنا' یا خبروں کی رپورٹنگ شروع کر دی تھی) اِس لیے اٹھارہ زبانوں کا ذکر کیا۔ اِسی کے ساتھ اُس کے ذہن میں اِنشا کا وہ قصیدہ بھی ہے جس کے لیے تذکروں میں "بسی و چہار زبان قصیدہ گفتہ" کا فقرہ ملتا ہے۔ اِس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ آزاد نے جس قصیدے سے یہ روایت منسوب کی ہے اُس کی بحر اور زمین بھی وہی ہے۔

بگتیاں نور کی تیار کرا سے بوے سمن ؛ کہ ہُوا کھانے کو نکلیں گے جوانانِ چمن

بہرحال قصیدۂ مذکور پر خطاب ملنا مشکوک ہے۔ بادشاہ سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ جس کے مطلعے ہی میں ایک صریح معنوی سُقم موجود ہو، اُس پر خاقانیِ ہند کا خطاب عطا فرمائے۔ پھر ایسا مشہور اور اہم قصیدہ کسی تذکرے میں آیا نہ انتخاب میں اور نہ دیوان میں۔ آزاد کے مرتبہ دیوان میں صرف تین شعر ملتے ہیں۔ عین ممکن ہے ذوق نے ایسا کوئی قصیدہ کہنا شروع کیا ہو یا کہا ہو، لیکن وہ نہ اب ملتا ہے نہ تب ملتا تھا۔ ہے یوں کہ آزاد نے دیوان مرتبہ ویران میں تین شعر دیکھے تو اُنھیں خاقانیِ ہند کے خطاب کے لیے یہ گم گشتہ قصیدہ نہایت موزوں معلوم ہوا۔ اگر اس قصیدے پر خطاب ملتا تو اِس کا ذکر حافظ ویران کرتے کہ ان سے زیادہ نزدیکی شاگرد اور کون تھا؟ آزاد نے مذکورہ تین شعر نسخۂ ویران سے لیے۔ اِس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ دہلی اردو اخبار اور آزاد کی روایت کے مطابق قصیدۂ مذکور ۱۸ زبانوں میں تھا۔ حافظ ویران نے اپنے مرتبہ دیوان میں اِس ناتمام قصیدے کا عنوان "قصیدۂ ہفدہ زبان" دیا ہے اور آزاد نے یہی عنوان دیوان میں نقل کر دیا ہے اور ایسا کرتے وقت وہ اپنے ۱۸ زبانوں کے دعوے کو بھول گئے۔ بہرحال خطاب کس قصیدے پر ملا اس کا فیصلہ فی الوقت ہمارے موضوع سے خارج ہے، لیکن وہ مطلع ایک بار پھر ملاحظہ ہو، جب کہ سرطان واسد مہر کا ٹھہرا مسکن ؛ آب وایلولہ ہوئے نشو و نمائے گلشن

آب = بھادوں، ایلولہ = اسوج۔ اِن مہینوں میں سورج برجِ اسد اور سرطان میں ہوتا ہے۔ گویا بہار کا موسم اِن کے بعد شروع ہوتا ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہُوا کہ جب سورج برجِ اسد اور سرطان میں آیا تو بھادوں اور اسوج گلشن کی نشو و نما ہوئے، اور یہ مُہمل ہے۔ کہنا یہ تھا کہ بھادوں اور اسوج گلشن کی نشو و نما کا مُوجب ہوئے لیکن یہاں خود آب وایلولہ نشو و نمائے گلشن ہوئے، جو معنوی اعتبار سے درست نہیں۔ مزید حیرت اِس پر ہے کہ قصیدۂ مذکور محفل میں لاکر پڑھا گیا تاکہ لوگ خود فیصلہ کریں کہ بادشاہ نے غلط بخشی تو نہیں کی۔ گویا قصیدے کی ایک سے زیادہ نقلیں موجود تھیں لیکن ذوق کے انتقال کے وقت قصیدے کی ایک نقل بھی دستیاب نہ ہو سکی۔ بعد میں بھی نہیں ملی ورنہ یہ قصیدہ کہیں تو نقل ہوتا۔ ۱۲۷۹ میں حافظ ویران نے دیوانِ ذوق شائع کیا۔ ظہیر دہلوی نے، جو اُس کی ترتیب میں شریک تھے، اُسی زمانے میں نگارستانِ سخن کے نام سے ایک انتخاب دواوین شائع کیا اور اُس میں ذوق سے کچھ ایسی غزلیں بھی منسوب کیں جو اور کہیں نہیں ملتیں۔ کیا ظہیر نے اُستاد کے نام سے اپنے اشعار منسوب کر کے کی بنیاد رکھی؟ کم از کم اُن کی فراہم کردہ غزلوں کے

دونوں روایتوں کا فرق اور دروغ ہونا صاف ظاہر ہے۔ یہاں یہ عرض کر دینا نامناسب نہ ہوگا کہ حیاتِ ذوق کے مصنف نے ذوق کی پیدایش کے وقت خود ہی اُن کے والد کے ایک خواب کا ذکر کیا ہے میر تقی میر نے اُنھیں صاحبِ کمال بیٹے کی ولادت کی بشارت دی تھی' اور خود ہی اُسے ایشیائی توہم پرستی کہہ کر، ذکر دیا تھا۔

اب پورے واقعے پر ایک تحقیقی نظر بھی ڈال لی جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ ذوق کو دربار سے خطاب ملا تھا لیکن یہ معلوم نہیں کہ خطاب کب اور کس قصیدے پر ملا۔ اس ضمن میں آزاد نے جو کچھ لکھا ہے وہ درست نہیں۔ پہلے ۱۹ سال کی عمر والے بیان کو دیکھا جائے۔ آزاد خطاب کو مرزا سلیم کی شادی سے چند سال بعد کا واقعہ بتاتے ہیں ۔" ذوق سوانح اور انتقاد" کے مصنف کے مطابق یہ شادی ۱۲۲۵ ۔ ۱۲۲۶ کا واقعہ ہے ۔ ذوق کی عمر اُس وقت ۲۲ برس کی ہونی چاہیے ۔ ۱۹ برس کی عمر میں وہ نہ صرف مُبتدی تھے بلکہ اُن کی ۱۹ برس کی عمر بھی ۱۲۲۲ھ میں ہونی چاہیے (آزاد کو ۱۹ برس سے بہت محبت معلوم ہوتی ہے مثلاً ذوق معروف کے پاس ۱۹ برس کی عمر میں گئے ۔ دربارِ ولی عہدی میں ۱۹ برس کی عمر میں پہنچے ۔ خاقانیِ ہند کا خطاب بھی ۱۹ برس کی عمر میں ملا۔) اگر مرزا سلیم کی شادی ۱۲۲۶ کا واقعہ ہے تو پھر ذوق کی عمر اُس وقت ۲۳ برس کی تھی ۔ قصیدہ اُس کے چند سال بعد پڑھا گیا ۔ اگر یہ مُدت تین برس کی بھی ہو تو اُس وقت ذوق کی عمر ۲۶ برس ہوگی اور سنہ ۱۲۲۹ھ (ویسے مختلف محققین کی تمام تر تحقیق کے باوجود ذوق کا ۱۲۳۰ھ سے پہلے دربارِ شاہی سے تعلق کسی طرح ثابت نہیں ہوتا۔)

اُس موقعے پر ذوق نے کون سا قصیدہ کہا تھا اُس کے لیے کوئی معاصر شہادت موجود نہیں۔ مولوی محمد باقر مالک دہلی اردو اخبار نے بھی ذوق کے انتقال کے بعد یہ وعدہ کیا تھا کہ قصیدۂ مذکور شائع کیا جائے گا، لیکن وہ اپنا وعدہ پورا نہ کر سکے ۔ دہلی اردو اخبار میں بھی مختلف صنعتوں اور ۱۸ زبانوں کا ذکر ہے (اِسی سے ہمارا خیال ہے کہ ۱۸۵۴ء میں یہ رپورٹنگ بھی مولانا آزاد ہی کے قلم سے تھی۔ ڈاکٹر فرخی کے مطابق اُس زمانے میں آزاد نے اخبار کے لیے مضامین لکھنا یا خبروں کی رپورٹنگ شروع کر دی تھی) اس لیے اٹھارہ زبانوں کا ذکر کیا۔ اِسی کے ساتھ اُس کے ذہن میں اِنشا کا وہ قصیدہ بھی ہے جس کے لیے تذکروں میں" بسی و چہار زبان قصیدہ گُفتہ" کا فقرہ ملتا ہے اِس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ آزاد نے جس قصیدے سے یہ روایت منسوب کی ہے اُس کی بحر اور زمین بھی وہی ہے۔

خاقانیِ ہند کے خطاب پر لوگوں نے چرچے کیے۔ بادشاہ نے کیا کیا۔ کہن سال اور نامی شاعروں کے ہوتے ایک نوجوان کو ملک الشعرا بنایا اور ایسا عالی درجہ کا خطاب دیا! ایک جلسہ میں یہی گفتگو (ہو) رہی تھی۔ کسی نے کہا کہ جس قصیدہ پر یہ خطاب ہوا ہے اُسے بھی تو دیکھنا چاہیے۔ چناں چہ قصیدہ مذکور لاکر پڑھا گیا۔ میر کلّو حقیر کہ شاعر سن رسیدہ اور شعرائے قدیم کے صحبت یافتہ تھے سُن کر بولے کہ بھئی انصاف شرط ہے کلام کو بھی تو دیکھو۔ ایسے شخص کو بادشاہ نے خاقانیِ ہند کے خطاب سے ملک الشعرا بنایا تو کیا بُرا کیا۔ مجھے یاد ہے جب اُستاد مرحوم نے یہ حال بیان کیا تھا اُس وقت بھی کہا تھا اور جب میں اربابِ زمانہ کی بے انصافی یا اُن کی بے خبری اور بے بصری سے دق ہو کر کچھ کہتا تو فرماتے تھے کہ بے انصافوں ہی میں سے کوئی با انصاف بھی بول اُٹھتا ہے۔ بے خبروں میں باخبر بھی نکل آتا ہے۔ اپنا کام کیے جاؤ۔

آخری خط کشیدہ جملوں کا مطلب یہ ہے کہ اس ساری داستان کے راوی خود ذوقؔ ہیں۔ اب کچھ داستان کے متعلق بھی گفتگو ہو جائے۔ اس ضمن میں پہلی بات یہ ہے کہ خطاب پر یہ چرچے آبِ حیات کی تصنیف کے وقت آزاد کے ذہن سے محو ہو گئے تھے۔ لہٰذا طبعِ اوّل میں شامل نہیں ہوئے۔ داستانِ خواب کو مولانا کے ایک شاگرد نے کچھ اور سُدھار کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے لہٰذا بلا تبصرہ اُن کی روایت پیش کی جاتی ہے:

حافظ احمد یار نے جو ایک نامور حافظ تھے اور سرکارِ عالی میں حافظانِ قرآن میں نوکر تھے اور سیّد انشاؔ کے یارِ غار تھے، بیان کرتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک جنازہ رکھا ہے اور بہت سے لوگ جمع تھے۔ سیّد انشاؔ بھی برہنہ سر کھڑے ہیں۔ اتنے میں حافظ ابراہیم نے جو حافظ احمد یار کے والد تھے انشاؔ کے کان میں کچھ کہا۔ انشاؔ نے ایک پیالہ دودھ سے لبریز شیخ ابراہیم کے ہاتھ میں دیا اور کہا کہ پی جاؤ۔ شیخ علیہ الرحمۃ جھجکے کہ حافظ عبدالرحیم خود اُٹھے اور کہا کہ پی لو۔ حافظ سے موصوف نے پوچھا کہ قبلہ یہ کیا معاملہ ہے اور جنازہ کس کا ہے۔ جواب ملا کہ یہ مرزا رفیع کا جنازہ ہے اور میاں ابراہیم ان کے جانشین مقرر کیے گئے (مخاطب خود ذوقؔ تھے پھر جواب صیغۂ واحد غائب میں کیوں؟) یہ دودھ جو میاں ابراہیم نے پیا ہے اُن کے کلام میں جُوئے شیر ہو کر رہے گا۔ (ابھی دودھ پیا کہاں تھا! حیاتِ ذوقؔ بحوالہ ذوقؔ سوانح اور انتقاد)

اتنا بھی نہیں جانتے کہ الٰہی بخش خاں کے صرف ایک لڑکا نہیں تھا۔ اُن کی چار اولادیں تھیں دو بیٹے دو بیٹیاں۔ بڑے بیٹے میرزا علی نواز خاں (ان کے حالات کا علم نہیں) پھر بنیادی بیگم زوجۂ غلام حسین مسرورؔ پھر اُمراؤ بیگم غالب کی بیوی' اور چوتھے علی بخش خان۔

لطیفہ ، اُستادِ مرحوم فرماتے تھے کہ ان دنوں مرزا خان (۹ میرزا خانی) مرزا قتیل کے شاگرد کے شاگرد' فارسی نگاری اور انشاپردازی کے ساتھ سخن فہمی کے دعوے رکھتے تھے۔

منشی محمد حسن خان میر منشی تھے' اور فی الحقیقت نہایت خوش صحبت ...... الخ

خدا جانے اس لطیفے کے بیان سے آزاد کا مقصد کیا ہے' لیکن "الٰہی بخش خاں معروف کی یہ عادت نہ تھی کہ خواہ مخواہ جو آئے اُسے اپنے شعر سنانے لگیں ......" بالکل وہی باتیں ہیں جو انھوں نے ناسخ سے بھی منسوب کی ہیں اور اِک ذرا فرق کے ساتھ مومن سے بھی۔ غالباً آزاد کا مقصود الٰہی بخش خاں کے مُردی یہ جُملے ہیں یہ"کہنے لگے میاں ابراہیم تم نے دیکھا ؟ اور ان کے اشعار بھی سُنے عجیب مجہول الکنفیت ہیں۔ کچھ حال ہی نہیں کھلتا کہ ہیں کیا۔ یہی میرزا خان (کہنا) اور منشی صاحب ہیں جن کی سخن پردازی اور نکتہ یابی کی اتنی دھوم ہے۔ اور اُس (پر) تماش بینی کے بھی دعوے ہیں۔ رنڈی تو ان کے منہ پر دو جوتیاں بھی نہ مارتی ہو گی۔ بھلا یہ کیا کہیں گے اور کیا سمجھیں گے؟

۹۔ جب بادشاہِ عالم ولیعہدی میں تھے تو مرزا سلیم کے بیاہ کی تہنیت میں مثنوی ہم نے لکھی تھی ......

چند سال کے بعد انھوں نے ایک قصیدہ اکبر شاہ کے دربار میں کہہ کر سنایا کہ جس کے مختلف شعروں میں انواع و اقسام کے صنائع و بدائع صرف کیے تھے' اس کے علاوہ ایک ایک زبان میں جو ایک ایک شعر تھا اُن کی تعداد اٹھارہ تھی۔ مطلع اس کا یہ ہے:

جبکہ سرطان و اسد مہر کا ٹھہرا مسکن ؛ آب و ایلولہ ہوئے نشو و نمائے گلشن

اِس پر بادشاہ نے خاقانیِ ہند کا خطاب عطا کیا۔ اُس وقت ......

حافظ احمد یار نے چند روز پہلے خواب میں دیکھا کہ ایک جنازہ رکھا ہے۔ بہت سے لوگ گرد جمع ہیں۔ وہاں حافظ ابراہیم کہ حافظ احمد یار کے والد تھے' ایک کھیر کا پیالہ لیے کھڑے ہیں اور شیخ علیہ الرحمۃ کو اس میں سے چمچے بھر بھر کر دیتے جاتے تھے۔ حافظ موصوف نے اُن سے پوچھا کہ یہ کیا معرکہ ہے اور جنازہ کس کا ہے۔ انھوں نے کہا یہ مرزا رفیع کا جنازہ ہے اور میاں ابراہیم اُن کے قائم مقام مقرر ہوئے ہیں۔

ہے کہ یہ سعادت مند بھائی عمر میں معروف سے بڑا تھا، چھوٹا نہیں جیساکہ آزاد کے بیانات سے متبادر ہوتا ہے۔

اُستاد مرحوم فرماتے تھے کہ ایک دن میں بیٹھا غزل بنا رہا تھا کہ نواب احمد بخش خاں آئے ..... الخ

یہ قصہ بہت طویل ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ احمد بخش خاں اِن اخراجات سے کتنے پریشان رہتے تھے۔ اس کے علاوہ ریذیڈنٹ سے ملاقات کا ایک واقعہ بھی اس ذیل میں بیان کیا ہے لیکن ہم یہ ثابت کر چکے ہیں کہ آزاد جسے "بڑے صاحب" کہتے ہیں وہ احمد بخش خاں کی وفات کے بعد ریذیڈنٹ ہوئے۔ چناں چہ اِس سے الٰہی بخش خاں معروف کے صاحبِ کرامات ہونے کا جو تاثر آزاد نے پیدا کرنا چاہا ہے وہ اِس کے فوراً بعد کے واقعے سے مٹ کر رہ جاتا ہے۔

ساتھ ہی اُستاد مرحوم یہ بھی کہتے تھے اور یہ بات لکھنے کے قابل ہے کہ زبان سے الٰہی بخش خاں مرحوم نے کبھی نہیں کہا مگر میں جانتا ہوں انھیں آرزو تھی کہ علی بخش خاں (ایک ہی بیٹا تھا) بذاتِ خود صاحبِ منصب اور صاحبِ امارت ہو۔ چچا کا اور اُس کی اولاد کا دست نگر نہ ہو۔ ساز و سامان کر کے ریاستوں میں بھی بھیجا۔ صاحب لوگوں کے ہاں بھی بندوبست کیے۔ ظاہری اور باطنی ساری کوششیں کیں۔ یہی بات نصیب نہ ہوئی۔ مشیت اللہ مشیت اللہ اور وہ خود بھی اخیر میں سمجھ گئے تھے ایک دن انھیں باتوں میں اُستاد نے فرمایا کہ علی بخش بھی خوب صورت اور شاندار امیر زادہ تھا۔ میں نے عرض کی کہ حضرت کئی دفعہ بعض جلسوں میں، بعض درباروں میں (میں) نے دیکھا، ایسے تو نہیں۔ افسردہ ہو کر کیا کیا کہتے ہو۔ ذکرِ جوانی در پیری اور ذکرِ امیری در فقیری کس کو یقین آتا ہے۔

ظاہر ہوا کہ معروف کی کرامت بھی مشیتِ الٰہی کے آگے کچھ نہیں کر سکی۔ احمد بخش خاں کو چچا کہنا آزاد ہی کی نہیں ذوق کی بھی ناواقفیت کا ثبوت ہے کہ وہی اس کے راوی ہیں۔ "شاندار امیر زادہ تھا" سے تو یہی نکلتا ہے کہ علی بخش خاں کا انتقال ہو چکا ہے، لیکن وہ ذوق کے انتقال کے بعد بھی زندہ تھے۔ غالب سے ۴ برس چھوٹے تھے اور ۳۱ دسمبر ۱۸۶۳ء کو دہلی میں انتقال کیا۔ شاعر بھی تھے اور رنجور تخلص کرتے تھے۔ آزاد کا اُنھیں جلسوں اور درباروں میں دیکھنا بھی مشکوک ہے مگر سب سے تعجب خیز امر یہ ہے کہ استاد ذوق جو برسوں الٰہی بخش خاں سے قرب اور استادی کے مدعی ہیں،

بدستِ یکے از مجاوران بقعہ شریف آں سلطان الاولیا الکرام میاں مجیب الدین نام کہ از خلفا برہان العاشقین مولانا محمد فخر الدین روح اللہ روحہ بحلیہ صلاح و تقوی آراستہ و بزیور صبر و استقامت پیراستہ بود' داد و دل بطلب مطلبِ اعلیٰ و مقصد قصوی نہادہ ترکِ شاعری نمودہ و توجہ موجہ بزھد و ورع فرمود۔" (مجموعہ نغز) یہ بیان ۱۲۲۱ کا ہے۔ اِس سے مقدّم بیان یہ ہے: "آشفتہ تخلص عظیم الدین خاں عرف بھورے خاں، قوم افغان، شاگردِ میر مہدی مائل' جوانِ خوش فکر و خوش معاش، خلیق دیار باش' اکثر در مشاعرۂ مہدی علی خاں مرحوم وارد می شد۔ غزل ہائے طرحی بفصاحت می گفت۔ بعدِ چندے بصحبت فقرا و درویشاں آمد و رفت اختیار نمود۔ از انجا کہ صحبتِ بابرکتِ این طائفہ' غنی باطن اثر تمام دارد' شدہ شدہ ذوقے و شوقے واردِ حالش گشتہ' و دست بیع بہ سلسلہ چشتیہ بہشتیہ یکے از خلفائے جناب مخدومی محمد فخر الدین قدس اللہ سرہ گشتہ' ترکِ شعر گفتن نمود' مشغول بہ اشغالِ معاد گردید" (عمدۂ منتخبہ)۔ گویا ذوق کے آغازِ شعرگوئی سے پہلے آشفتہ شعرگوئی سے تائب ہو چکے تھے۔ پھر مندرجہ بالا واقعے کی حقیقت؟ یہ بھی مشکوک ہے کہ آشفتہ معروف کے مرید تھے' بلکہ دونوں سلسلۂ چشتیہ میں بیعت تھے اس لیے خواجہ تاش ہوئے۔

خلیفہ صاحب (میاں محمد اسمٰعیل) چھوٹے تھے۔ ایک دن اُستاد کے ساتھ چلے گئے۔ رخصت ہوئے تو ایک چھوٹا سا ٹانگن اصطبل سے منگایا' زین زریں کسا ہوا۔ اس پر سوار کر کے رخصت کیا کہ یہ بچّہ ہے کیا جانے گا کہ میں کس کے پاس گیا تھا۔

اب یہ تو معلوم نہیں کہ خلیفہ صاحب کی ولادت کب ہوئی اور اُس وقت اُن کی عُمر کیا تھی' لیکن زین زریں کسا ہوا چھوٹا سا ٹانگن اصطبل سے منگانا ضرور غور طلب ہے۔ دراصل اِن واقعات کے ذکر سے آزاد کا مقصد معروف مرحوم کی سخاوت کی تعریف کرنا نہیں' بلکہ:

(کسی کھانے کو جی چاہتا تو آپ نہ کھاتے۔ بہت سا پکواتے۔ لوگوں کو بلواتے۔ آپ کھڑے رہتے۔ اُنھیں کھلواتے۔ خوش ہوتے اور کہتے کہ دل سیر ہو گیا۔ یہ ساری سخاوتیں اُسی سعادت مند بھائی کی بدولت تھیں جو دن بھر سرانجام مہام میں جان کھپاتا تھا۔ راتوں سوچ میں گُھلتا تھا اور خاندان کے نام کو زندہ کرتا تھا اور اُن سے فقط دُعا کی التجا رکھتا تھا۔

خط کشیدہ جُملوں کا مطلب کوئی بھی سمجھ سکتا ہے' وضاحت کی ضرورت نہیں۔ البتہ اِتنا کہنا ضروری

اور اس طرح ذکر کرتے تھے جیسے کوئی با اعتقاد اپنے مرشد کا ذکر کرتا ہے۔ اُن کی سیکڑوں باتیں بیان
کرتے جو دین و دُنیا کے کاموں کا دستور العمل ہیں" وہیں استفاماً اُنھیں ہر شاعر کا شاگرد اور دریوزہ گر
بھی بنا ڈالا۔ ملاحظہ ہو:

جن دنوں اس کے دانے پروتے تھے تو نواب صاحب مرحوم کی سب پر فرمایش
تھی کہ کوئی مثل، کوئی محاورہ سبزی کا بتاؤ۔ اُن کا بذل و کرم اور حسن اخلاق اور علو مرتبہ
کے سبب اکثر شرفا خصوصاً شعرا آکر جمع ہوتے تھے اور اشعار سُنتے سُناتے تھے ان
دنوں اُن کے شوق سے اوروں پر بھی سبز رنگ چھایا ہوا تھا۔ بھورے خاں آشفتہ
ایک پرانے شاعر شاہ محمدی مائل کے شاگرد تھے اور اُن کے مُرید۔ ہر وظیفہ (پانچ
روپے) بھی پاتے تھے۔ اُن کے شعر میں ہری چُگ کا لفظ آیا تھا کہ اُن کے ہاں
ابھی تک نہ بندھا تھا۔ اُن سے وہ شعر لے لیا اور اپنے انداز سے سجایا ؎
آج یہاں کل وہاں کرتے یونہیں مچگ ہیں
اُنھیں سو روپے ایک رومال میں باندھ کر دیئے کہ تمھاری کاوش کیوں خالی جائے۔
کہتے ہیں سب سبزہ رنگ اس سے ہری چگ ہیں
افسوس کہ اخیر میں کمبخت بھورے خاں نے روسیاہی کمائی اور سب تعلقات پر خاک
ڈال کر اُن کی ہجو کہی۔ لطف یہ کہ دریا دل نواب طبیعت پر اصلاً (؟ اصلا) میل نہ لائے۔
لیکن اس نا اہل کو انھیں آزردہ کرنا ہی منظور تھا۔ جب دیکھا کہ اُنھیں کچھ رنج نہیں
تو نواب حسام الدین حیدر خاں نامی کی ہجو کہی۔ نامی مرحوم سے اُنھیں ایسی محبت تھی
کہ وہ خود بھی کہتے تھے اور لوگ بھی کہتے تھے ان دو بزرگوں میں محبت نہیں عشق ہے
(اگلے لوگوں کی دوستیاں ایسی ہی ہوتی تھیں)
اس سے قطع نظر کہ بین السطور میں آزاد کیا کہنا چاہتے ہیں، بھورے خاں آشفتہ کا "نواب" کی ہجو
کہنا مشکوک ہے۔ اور اگر کہی ہوگی تو وہ اور پہلے کا واقعہ ہوگا۔ ورنہ جس زمانے میں آزاد نے
ذوق کو معروف کا اُستاد بنایا ہے (۱۲۲۱-۱۲۲۲) اُس سے پہلے بھورے خاں کا عالم یہ تھا:
"عظیم الدین خاں عرف بھورے خاں وے جانے است خوش فکر شیریں زبان عالی طبیعت فصاحت
بیان، غزل طرح ازو خوب سرانجام می یافت، بفصاحت می نگاشت و طرحِ مراختہ بخانۂ خود چندے
انداختہ بود و بجوئیہائے اہلِ سخن مدرجۂ اعلیٰ نمود۔ بعدِ یک چند کہ بصحبتِ اہلِ دل در پیوست و از حرص و
آزِ دُنیا وارست و اشارۃ باشارۃ جناب کرامت مآب حضرت سلطان المشائخ قدس سرہ دست بیعت

مذکورہ دونوں تاریخوں سے ۱۲۳۶ نکلتا ہے۔ اسے کیا سمجھا جائے؟

عُمدہ میں تسبیح کے سو شعر ہیں، اور نام کی مناسبت سے دُرست بھی۔ آزاد ۱۰۱ مطلع بتاتے ہیں۔ مذکورہ قطعۂ تاریخ کا ایک شعر ہے:

صد و یک مطلعِ رنگیں آخر ✽ گفت با نالۂ گرم و دمِ سرد

اس کے معنی ہیں جس کا یہ کلام ہے اُسے یہ غلط فہمی ہے کہ اس میں ایک سو ایک مطلعے ہیں (ظاہر ہے یہ غلط فہمی خالقِ تسبیح کو نہیں ہو سکتی) بہرحال قطعۂ مذکور کے کچھ اشعار سے یہ قرینہ نکلتا ہے کہ یہ اشعار تسبیح پروے جانے کے بہت مُدت بعد کہے گئے ہیں۔ مُدتوں پہلے کی تصنیف کی تاریخ بعد میں نکالنے کا کوئی جواز نہیں، خصوصاً جب کہ اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوا اور اس کی اشاعت یا طباعت بھی اس زمانے میں نہیں ہوئی۔ قلمی دیوان میں تو وہ پہلے ہی سے موجود تھی۔

آزاد نے چوں کہ پہلے یہ کہا ہے کہ "یہ تسبیح بھی اُستاد مرحوم نے پروئی تھی" اس لیے انھوں نے ذوقؔ سے ایک فارسی تاریخ منسوب کر دی۔ ایسا کرتے ہوئے انھیں استاد کی ۱۹-۲۰ برس کی عُمر کا بھی خیال نہیں رہا۔ ۱۲۳۶ھ میں ذوقؔ کی عُمر ۳۲ برس کی تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ انھوں نے ۱۲۳۶ کی تاریخیں کیوں کہلوائیں (یا کہیں؟) قیاس یہ ہے کہ وہ عُمدہ میں تسبیح دیکھ چکے تھے۔ اگر نہ بھی دیکھی ہو تو بھی انھیں یہ خیال ضرور تھا کہ تذکرۂ مذکور ۱۲۳۶ میں لکھا گیا اور اسی لیے انھوں نے ذوقؔ کی تاریخ "دریاے اعظم" کو تذکرے کی تاریخ سمجھا (یا اپنے قاری کو سمجھانے کی کوشش کی؟) جو دراصل مثنوی کی تاریخ ہے۔ اب چوں کہ وہ تذکرے کو ۱۲۳۶ کی تالیف سمجھتے تھے، تسبیح کی بھی وہی تاریخ نکالی، ورنہ آبِ حیات کی تصنیف اور دیوانِ ذوقؔ کی ترتیب کی درمیانی مدت میں ایک سے دو تاریخیں نہ ہو جاتیں۔ دیوانِ ذوقؔ مُرتبۂ آزاد میں اس قطعے کا عنوان "معروف کے دیوان کی تاریخ" ہے، اور یہ مستزاد ہے۔

غالباً آزاد کی طبیعت معروفؔ کو ذوقؔ کا شاگرد ثابت کرنے کے باوجود نہیں بھری چناں چہ انھوں نے اُن کے واقعی اُستاد، شاہ نصیر کے علاوہ بھی کئی لوگوں کو اُن کا اُستاد بنا ڈالا، اور تسبیح زمرّد کے سلسلے میں دریوزہ گر بھی۔ اور یہ سب انھوں نے آب کی طبعِ ثانی میں کیا۔ سبب؟ طبعِ اوّل پر معروفؔ کے اہلِ خاندان کی طرف سے اعتراض ہوا تھا کہ معروفؔ ذوقؔ کے شاگرد نہیں تھے۔ بلکہ ذوقؔ اُن سے مُریدوں کی طرح ملتے تھے۔ طبعِ ثانی میں جہاں آزاد نے یہ فقرے بڑھائے:
"اُن کی باتیں کرتے اور بار بار افسوس کرتے اور کہتے ہائے الٰہی بخش خاں۔ اُن کا نام ادب سے لیتے

... خیر اور چیزوں کے ساتھ وہ تلوار بھی لے لی۔ میں حیران ہُوا کہ یہ تو ان کے معاملات وحالات سے کچھ تعلق نہیں رکھتی، اسے کیا کریں گے۔ خدا کی قدرت دو تین دن کے بعد بڑے صاحب (فریزر صاحب رزیڈنٹ دہلی) ایک اور صاحب کو اپنے ساتھ لے کر نواب احمد بخش خاں مرحوم کی ملاقات کو آئے۔ وہاں سے اُن کے پاس آ بیٹھے۔ باتیں چیتیں ہوئیں۔ جو صاحب ساتھ تھے اُن سے ملاقات کروائی۔ جب چلنے لگے تو انھوں نے وہی تلوار منگا کر صاحب کے ہمراہی کی کمر سے بندھوائی اور کہا: برگ سبز است تحفۂ درویش ؛ چہ کند بے نوا ہمیں دارد

اس عبارت کا ایک ایک فقرہ غلط ہے، اور اک ذرا غور سے ہر شخص پر حقیقت واضح ہو سکتی ہے۔ البتہ اِس سلسلے میں ایک لطیفہ سُن لیجیے۔ جس سال آزاد پیدا ہوئے (۱۸۳۰ء) "بڑے صاحب" یعنی فریزر صاحب دِلّی کے رزیڈنٹ ہو کر آئے۔ ظاہر ہے کہ رزیڈنٹ ہونے کے بعد ہی نواب احمد بخش خاں کی ملاقات کو گئے ہوں گے۔ (ورنہ آزاد تو سین میں رزیڈنٹ دہلی کی تصریح کیوں کرتے؟) لیکن یہ یاد رہے کہ نواب احمد بخش خاں کا اِنتقال اِس ملاقات سے تین سال پہلے (اکتوبر ۱۸۲۷ء) ہو چکا تھا۔ ظاہر ہے ملاقات عالم بالا میں نہیں ہوئی ہوگی۔ لطیفہ در لطیفہ یہ کہ تلوار خرید کر صاحب کے ہمراہی کی کمر سے بندھوانے والا اُس سے بھی ایک سال پہلے (۱۸۲۶ء) راہیِ مُلکِ بقا ہو چکا تھا۔ کہتے ہیں دروغ کو فروغ نہیں، لیکن اس دروغ نے کامل ایک صدی فروغ پایا، اور محققین کی نظر اس پر نہیں پڑی۔ اِسی ایک واقعے سے بخوبی اندازا ہو جاتا ہے کہ آزاد نے جتنے لطائف الٰہی بخش خاں سے منسوب کیے ہیں اُن کی حقیقت کیا ہے تاہم کچھ اور واقعات کو دیکھ لینا بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔

ان کے اشعار کا ایک سلسلہ ہے جس میں ردیف وار ۱۰۱ مطلع ہیں اور کوئی سبزی کے مضمون سے خالی نہیں۔ اِس رعایت سے اِس کا نام تسبیحِ زمرّد رکھا۔ یہ تسبیح بھی اُستاد مرحوم نے پروئی تھی، اور آخر میں ایک تاریخ فارسی زبان میں اپنے نام سے کہہ کر لگائی تھی۔

آزاد نہایت نیک نیتی سے معروف کو اُن کے قلم رو سخن سے بے دخل کرنے پر تُلے ہوئے ہیں اور اِس میں اُستاد مرحوم کو فریق بنایا ہے۔ لیکن ان کی تمام تر سعی بھی معروف کی شاعرانہ حیثیت کو مٹانے میں ناکام رہی ہے۔ آزاد کبھی کبھی اپنی سعی میں اِتنی دُور کی کوڑی لاتے ہیں کہ اُسے

تسلیم کرنے میں تامّل ہوتا ہے۔ تسبیحِ زمرّد اُستاد مرحوم نے تو جب پروئی ہوتی جب وہ اُستاد ہوگئے ہوتے۔ وہ ابھی خود شاگرد تھے کہ یہ تسبیح پروئی جا چکی تھی۔ چناں چہ عمدہ میں پوری تسبیح موجود ہے۔ حیرت اس پر ہے کہ واقعات تراشتے ہوئے آزاد مسلّمات سے بھی چشم پوشی کر جاتے ہیں تسبیح میں سَو دانے ہوتے ہیں پھر اس میں ۱۰۱ مطلعے کیوں کر تھے؟ اگر ایسا ہوتا تو اس کے نام "تسبیح" کی معنویت ہی فوت ہو جاتی۔ عمدہ آزاد نے یقیناً دیکھا ہوگا۔ اُس میں سَو کے سَو مطلعے موجود ہیں۔ اِس کے باوجود آزاد کو ایک سو ایک مطلعے کہنے میں تامّل نہ ہوا۔ اگرچہ اس میں کئی ردیفیں نہیں ہیں تاہم اِسے ردیف وار کہہ لیجیے لیکن اِس کے آخر میں ذوقؔ نے کوئی فارسی تاریخ لگائی تھی تو آزاد کو وہ تاریخ بھی نقل کرنا تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ذوقؔ نے آخر میں کوئی تاریخ نہیں لگائی اور تسبیح کے مضامین کے پیشِ نظر اسے بڑھاپے کا کلام قرار دینا بھی مشکوک ہے۔

یہ حصّہ لکھ چکنے کے بعد حسنِ اتفاق سے دیوانِ ذوقؔ مرتبہ آزاد (۱۹۳۲ء مطبوعہ لاہور) اور کلیاتِ ذوقؔ مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی (مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور) میسّر آ گئے۔ (اس کے لیے میں کرم فرمائے محترم رشید حسن خاں کا ممنون ہوں) اُن میں تیرہ شعر کا ایک فارسی قطعہ موجود ہے لیکن اُسے بہ وجوہ ذوقؔ سے منسوب کرنا ممکن نہیں: (۱) آزاد نے ایک تاریخ کا ذکر کیا تھا، اس قطعے میں دو تاریخیں ہیں:

ذوق چوں خواست دو تاریخش را	اندریں دفترِ معنی بد و فرد
اوّل از دانۂ خوش رنگ شمار	کرد و آں عقدۂ مطلب واکرد
باز با خامۂ رنگیں بنوشت	طُرفہ تسبیحِ زمرّد آورد

"دانۂ خوش رنگ" اور "طُرفہ تسبیحِ زمرّد آورد" دونوں سے ۱۲۳۶ نکلتے ہیں۔ (دوسرا شعر اپنے بیان کے لحاظ سے توجہ طلب ہے) اس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے کہ تسبیحِ زمرّد عمدہ منتخبہ میں موجود ہے۔ اس تذکرے کی ایک روایت ۱۲۱۹ھ اور دوسری ۱۲۲۴ھ میں مکمل ہوئی، مگر اضافے ۱۲۴۶ تک ہوتے رہے۔ اس لیے قطعیت سے حکم لگانا ممکن نہیں کہ انتخاب کب ہے (۱۲۲۴ھ کا نسخہ لاہور میں ہے لیکن جن اوراق میں ذوقؔ کا ذکر ہے وہ بعد کے ہیں) گلشنِ بے خار ۴۸-۱۲۵۰ کی تصنیف ہے۔ خوش قسمتی سے اُس میں تسبیح کا ایک شعر آ گیا ہے اور معروفؔ کے انتخاب سے پہلے بتایا گیا ہے کہ یہ پہلے دیوان کا انتخاب ہے۔ مجموعۂ نغز ۱۲۲۱ھ میں مکمل ہوا۔ اس میں معروفؔ کا دیوان مدوّن ہو جانے کی اطلاع موجود ہے۔ گویا پہلا دیوان ۱۲۲۱ھ سے پہلے مرتّب ہو چکا تھا۔

... خیر اور چیزوں کے ساتھ وہ تلوار بھی لے لی۔ میں حیران ہوا کہ یہ تو ان کے معاملات وحالات سے کچھ تعلق نہیں رکھتی، اسے کیا کریں گے۔ خدا کی قدرت دو تین دن کے بعد بڑے صاحب (فریزر صاحب ریذیڈنٹ دہلی) ایک اور صاحب کو اپنے ساتھ لے کر نواب احمد بخش خاں مرحوم کی ملاقات کو آئے۔ وہاں سے اُن کے پاس آ بیٹھے۔ باتیں چیتیں ہوئیں۔ جو صاحب ساتھ تھے اُن سے ملاقات کروائی۔ جب چلنے لگے تو انھوں نے وہی تلوار منگا کر صاحب کے ہمراہی کی کمر سے بندھوائی اور کہا، برگِ سبز است تحفۂ درویش ؛ چہ کند بے نواہمیں دارد

اس عبارت کا ایک ایک فقرہ غلط ہے اور اک ذرا غور سے ہر شخص پر حقیقت واضح ہو سکتی ہے۔ البتہ اس سلسلے میں ایک لطیفہ سُن لیجیے۔ جس سال آزاد پیدا ہوئے (۱۸۳۰ء) "بڑے صاحب" یعنی فریزر صاحب دلّی کے رزیڈنٹ ہو کر آئے۔ ظاہر ہے کہ رزیڈنٹ ہونے کے بعد ہی نواب احمد بخش خاں کی ملاقات کو گئے ہوں گے۔ (ورنہ آزاد تو سین میں رزیڈنٹ دہلی کی تصریح کیوں کرتے؟) لیکن یہ یاد رہے کہ نواب احمد بخش خاں کا انتقال اس ملاقات سے تین سال پہلے (اکتوبر ۱۸۲۷ء) ہو چکا تھا۔ ظاہر ہے ملاقات عالم بالا میں نہیں ہوئی ہوگی۔ لطیفہ در لطیفہ یہ کہ تلوار خرید کر صاحب کے ہمراہی کی کمر سے بندھوانے والا اُس سے بھی ایک سال پہلے (۱۸۲۶ء) راہیِ مُلکِ بقا ہو چکا تھا۔ کہتے ہیں دروغ کو فروغ نہیں، لیکن اس دروغ نے کامل ایک صدی فروغ پایا، اور محققین کی نظر اس پر نہیں پڑی۔ اسی ایک واقعے سے بخوبی اندازا ہو جاتا ہے کہ آزاد نے جتنے لطائف الٰہی بخش خاں سے منسوب کیے ہیں اُن کی حقیقت کیا ہے تاہم کچھ اور واقعات کو دیکھ لینا بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔

> ان کے اشعار کا ایک سلسلہ ہے جس میں ردیف وار ۱۰۱ مطلع ہیں اور کوئی سبزی کے مضمون سے خالی نہیں۔ اس رعایت سے اس کا نام تسبیح زمرد رکھا۔ یہ تسبیح بھی اُستادِ مرحوم نے پروئی تھی، اور آخر میں ایک تاریخ فارسی زبان میں اپنے نام سے کہہ کر لگائی تھی۔

آزاد نہایت نیک نیتی سے معروف کو اُن کے قلمروِ سخن سے بے دخل کرنے پر تُلے ہوئے ہیں اور اس میں اُستادِ مرحوم کو فریق بنایا ہے۔ لیکن ان کی تمام ترسعی بھی معروف کی شاعرانہ حیثیت کو مٹانے میں ناکام رہی ہے۔ آزاد کبھی کبھی اپنی سعی میں اتنی دُور کی کوڑی لاتے ہیں کہ آُسے

بڑی کاہشیں اُٹھانی پڑیں، مگر اُن کی غزل بنانے میں ہم آپ بن گئے۔

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ الٰہی بخش معروف ۱۲۲۱ - ۱۲۲۲ میں جوان تھے (ذوق کی ۱۹ - ۲۰ برس کی
عمر تک)، آزاد نے اُن کے تارک الدنیا ہونے کو بڑھاپے کی سند بنایا ہے، جو حقیقت سے
دُور ہے۔ اِس اقتباس میں لغوترین جملہ "ضعفِ پیری" والا ہے۔ مضمون کو لفظوں میں بٹھانا نہ ہوا
اکھاڑے ہوئے درِ خیبر کی از سرِ نو چولیں بٹھانا ہوگیا۔ بھلا مضمون کو لفظوں میں بٹھانے کے لیے جسمانی
زور آزمائی کی کیا ضرورت ہے؟ جب شیخ مرحوم نے اُن کی غزل بنائی ہی نہیں تو خود کیا بنتے،
لیکن آزاد نے اُنھیں بہرحال بنا ڈالا۔

یہ بھی فرماتے تھے کہ ایسا سخی میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ جو آتا تھا، امیر، فقیر، بچہ،
بوڑھا اُسے بغیر دیے نہ رہتے تھے، اور دینا بھی وہی جو اُس کے مناسبِ حال ہو۔
کوئی سوداگر نہ تھا کہ آئے اور خالی پھر جائے۔ اُنھیں اِس بات کی بڑی خوشی تھی کہ
ہماری غزل ہمارے پاس بیٹھ کر بناتے جاؤ، سناتے جاؤ۔ میں نے اِس باب میں
پہلو بچایا تھا مگر اُن کی خوشی اسی میں دیکھی تو مجبور ہوا۔ اور یہی خوب ہوا (اُن کی
مناسبِ حال داد و دہش کا کرشمہ جو دیکھنا تھا) ایک دن میں اُن کی غزل بنا رہا تھا اس
کا مقطع تھا:

ایک غزل پُر درد سی معروف لکھ اس طرح میں — ذوق ہے دل کو نہایت درد کے اشعار سے
کون روتا ہے یہ لگ کر باغ کی دیوار سے — جانور گرنے لگے جاے ثمر اشجار سے

سوداگر آیا اور اپنی چیزیں دکھانے لگا۔ ان میں ایک اصفہانی تلوار بھی تھی۔ وہ پسند
آئی، خم دم، آبداری اور جوہر دیکھ کر تعریف کی اور میری طرف دیکھ کر کہا کہ ؏
اس ضعیفی میں یہاں تک شوق ہے تلوار سے (دیوانِ معروف پیشِ نظر نہیں لیکن
آمدِ پیری سے پہلے "اس ضعیفی" غور طلب ہے۔ آزاد واقعات کی دلچسپی کے پیشِ نظر
خود اشعار تصنیف کر کے دوسروں سے منسوب کر دینے میں دریغ نہیں کرتے۔
ہوسکتا ہے یہ شعر بھی اُنھیں میں سے ہو۔ یہاں یہ لکھ دینا بے جا نہ ہوگا کہ عمدہ
میں معروف کے ۲۹۷ شعر مُنتخب ہوئے ہیں، لیکن اِس زمین میں کوئی شعر نہیں۔
گلشنِ بے خار میں البتہ ایک شعر ہے جس میں تلوار کا قافیہ اس طرح بندھا ہے
؎ کاٹ ڈالوں جی میں ہے اپنا گلا تلوار سے۔)

اُنھوں نے تو ذوق کو ١٩۔ ٢٠ برس کی عمر میں خاقانیِ ہند بھی بنا دیا تھا) آزاد نے دُوسرے جُملے سے قارئین کو گمراہ کرنے کا سامان پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ عموماً لوگ آخرِ عمر میں تارک الدّنیا ہوتے ہیں۔ مجموعۂ نغز جس میں ذوق کو نومشق کہا گیا ہے۔ معروف کو "جوانے است خوش خُلق دیگر دمحبت سیر نیک خو شیریں کلام" کہا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی کہا گیا ہے کہ "دریں ایّام نیک فرجام دنش از دُنیا سیر گردیدہ" گویا معروف کی جوانی کا زمانہ ہے۔ ذوق خود شاہ نصیر کے تلامذہ میں داخل ہیں۔ اس لیے " نواب صاحب " کا مذکورہ اشتیاق مشکوک۔ اسی نشست میں ذوق کے قدیمی اُستاد حافظ غلام رسول شوق بھی پہنچ گئے۔ ذوق نے چلتے چلتے معروف کی فرمائش پر اُنھیں دنوں کی کہی ہوئی غزل کے دو شعر سنائے جن کا جینا نظر اپنا ہمیں اصلا نہیں آتا۔ یہ غزل اتنے ابتدائی دَور کی نہیں ہوسکتی۔ اس غزل کے دو شعر پہلی بار عُمدۂ منتخبہ میں نظر آتے ہیں۔ بہ ظاہر یہ تذکرہ ١٢١٦ میں شروع ہوکر ١٢٢٣ میں ختم ہوگیا۔ لیکن ١٢٢١ھ میں ذوق مُبتدی تھے۔ عمدہ کا انتخاب یقیناً بعد کا ہے۔ اس قیاس کا ایک سبب انتخابِ کلام ہے جس میں الف، ی، ن، ر، و، ت، ص، ہ، وغیرہ ردیفیں شامل ہیں۔

> اُس دن سے معمول ہوگیا ہفتہ میں دو دن جایا کرتے تھے اور غزل بنا آیا کرتے تھے چنانچہ جو دیوانِ معروف اب تک رائج ہے وہ تمام و کمال انہی کا اصلاح کیا ہُوا ہے۔

آزاد نے اگرچہ مجموعۂ نغز سے استفادہ کیا ہے لیکن جہاں انھیں کوئی افسانہ تراشنا ہوتا ہے وہاں وہ اُس کے اندراجات کی طرف سے آنکھیں مُوند لیتے ہیں یا پھر تحریف کر ڈالتے ہیں۔ مجموعۂ نغز میں جہاں معروف کو "جوانے است" کہا گیا ہے وہاں یہ بھی بتایا گیا ہے " دربدو شوق سخن گاہے از محمد نصیر الدین نصیر استشارہ نمودہ و حالا بتائید ذہن رسائے خود دیوانے ملو بیشتر از انواع سخن تالیف فرمودہ "۔ ظاہر ہُوا کہ ذوق کی استادی سے پہلے دیوان مُرتب تھا۔ پھر آزاد کے بیان کی وقعت؟

> نواب مرحوم اگرچہ ضعفِ پیری کے سبب سے خود کاوش کر کے مضمون کو لفظوں میں نہیں بٹھا سکتے تھے مگر اس کے حقائق ودقائق کو ایسا پہونچتے تھے کہ جو حق ہے۔ اس عالم میں اُستاد مرحوم کی جوان طبیعت اور ذہن کی کاوش اُن کی فرمایش کے نکتے نکتے کا حق ادا کرتی تھی۔ شیخ مرحوم کہا کرتے تھے کہ اگرچہ بڑی

معلوم ہوتا ہے کہ رنگ رنگ کی روشنائیاں استعمال کرنا خود آزاد کے مزاج کا جزو تھا۔ آزاد نے اپنی عادت یا خاصیت کو ذوق سے منسوب کر دیا ہے۔ اُنھوں نے ذوق کو محض رنگ رنگ کی روشنائیاں ہی نہیں بخشیں بلکہ اپنا قاموسی علم بھی سارے کا سارا ذوق کی جھولی میں ڈال دیا ہے۔ ذوق کے حالات اور کلام اس کی تصدیق نہیں کرتے۔ (تفصیل حسبِ موقع بیان ہوگی)

۸ - ذوق کے احوال میں الٰہی بخش معروف کے حالات بھی لکھے ہیں۔ ڈاکٹر اسلم فرخی کا بیان ہے کہ طبعِ اوّل میں اُن کے خاندانی حالات بہت مختصر (محض تین چار فقروں پر مشتمل) تھے۔ طبعِ ثانی میں طویل فٹ نوٹ کا اضافہ ہُوا۔ اس کے علاوہ تمام تر لطائف بھی طبعِ ثانی میں اضافہ ہوئے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ طبعِ اوّل کے بعد کچھ بزرگوں نے معروف کے تلمّذِ ذوق پر اعتراض کیا تھا۔ لہٰذا آزاد نے ازسرِنو حالات لکھنے اور ترمیم کرنے کا وعدہ کیا لیکن ترمیم سے معروف کی شعرگوئی تک کو مشکوک کر دیا۔ بہرحال اُن میں کچھ بیانات جو بالتصریح ذوق سے مروی ہیں، کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

جب شیخ مرحوم کا شہرہ ہُوا تو انھیں (معروف کو) بھی اشتیاق ہُوا۔ یہ موقع وہ تھا کہ نواب موصوف نے اہلِ فقر کی برکتِ صحبت سے ترکِ دُنیا کر کے گھر سے نکلنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ چناں چہ اُستاد مرحوم فرماتے تھے میری ۱۹ - ۲۰ برس کی عمر تھی۔ گھر کے قریب ہی ایک قدیمی مسجد تھی۔ ظہر کے بعد وہاں بیٹھ کر میں وظیفہ پڑھ رہا تھا، ایک چوبدار آیا۔ اُس نے سلام کیا اور کچھ چیز رومال میں لپٹی ہوئی میرے سامنے رکھ کر الگ بیٹھ گیا۔ وظیفہ سے فارغ ہو کر اُسے دیکھا تو اُس میں ایک خوشہ انگور کا تھا، ساتھ ہی چوبدار نے کہا نواب صاحب نے دُعا فرمائی ہے یہ بھیجا ہے اور فرمایا ہے کہ آپ کا کلام تو پہونچا، مگر آپ کی زبان سے سننے کو جی چاہتا ہے۔ شیخ مرحوم نے وعدہ کیا اور تیسرے دن تشریف لے گئے۔

یہ ساری تمہید آزاد نے معروف کو ذوق کا شاگرد ثابت کرنے کے لیے باندھی ہے۔ اس کا قطعی فیصلہ تو اِس قسم کے تمام واقعات کے جائزے کے بعد ہی ہو سکے گا، سرِدست اِسی بیان پر غور فرمائیے۔ پہلا جملہ ہے "جب شیخ مرحوم کا شہرہ ہُوا" دوسرا "یہ وہ موقع .... دیا تھا" اور تیسرا "میری ۱۹ - ۲۰ برس کی عمر تھی"۔ شیخ مرحوم کی عمر جب ۱۹ - ۲۰ برس کی تھی، اُن کا شہرہ ہونا ممکن نہیں۔ ثبوت اِس کا یہ ہے کہ وہ ۱۲۰۳ھ (بہ قولِ آزاد ۱۲۰۴ھ) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹ - ۲۰ برس کی عمر ۱۲۲۲ - ۱۲۲۳ھ میں ہوگی۔ اُس وقت وہ محض مبتدی تھے۔ ایک مبتدیِ محض کا شہرہ کیا؟ (مگر آزاد کا کیا ہے،

> شیخ مرحوم فرماتے تھے کہ ... دل میں شوق تھا اور خدا سے دعائیں مانگتا تھا کہ الٰہی مجھے شعر کہنا آجائے۔ ایک دن خوشی (؟) میں آکر خود بخود میری زبان سے دو شعر نکلے اور یہ فقط حسنِ اتفاق تھا کہ ایک حمد میں تھا، ایک نعت میں۔ اُس عمر میں مجھے اِتنا ہوش کہاں تھا کہ اِس مبارک مُہم کو خود اِس طرح سمجھ کر شروع کرتا کہ پہلا حمد میں ہو اور دوسرا نعت میں ہو۔ جب یہ بھی خیال نہ تھا کہ اِس قدرتی اِتفاق کو مبارک فال سمجھوں مگر اِن دو شعروں کے موزوں ہو جانے سے جو خوشی دل کو حاصل ہوئی، اُس کا مزہ اب تک نہیں بھولتا۔ انھیں کہیں اپنی کتاب میں کہیں جا بجا کاغذوں پر رنگ رنگ کی روشنائیوں سے لکھتا تھا۔ ایک ایک کو سناتا تھا اور خوشی کے مارے پھولوں نہ سماتا تھا۔

اِس واقعے میں کوئی خلافِ عقل یا غیر فطری بات نہیں، اس کے باوجود یہ واقعہ درست نہیں ہو سکتا۔ جب اِتنی خوشی تھی کہ وہ دو اشعار ایک ایک کو سُناتے پھرتے تھے اور کبھی کتاب میں اور کبھی جا بجا کاغذوں پر لکھتے پھرتے تھے، تو اُن کا حافظے سے محو ہو جانا مشکل ہے۔ چوں کہ اُن کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ایک حمد میں تھا اور دوسرا نعت میں، اِس لیے اُن کا بھولنا اور بھی مشکل ہے۔ پھر وہ اشعار اُنھوں نے آزاد کو کیوں نہ سُنائے! واقعہ یہ ہے کہ آزاد کسی کو ذوق سے بڑا شاعر نہیں سمجھتے اور یہی وہ آگے چل کر ثابت کرنے والے تھے۔ اِس کے لیے کچھ اُدھر کا اشارہ بھی چاہیے تھا۔ لہٰذا نیک شگون کے لیے آزاد نے ایک واقعہ تراش لیا۔ اس واقعے کا سب سے کم زور پہلو "رنگ رنگ کی روشنائیوں سے" لکھتے پھرنا ہے۔ ذوق کے مسودات کا ذکر کلیاتِ ذوق اور "ذوق سوانح اور انتقاد" مصنفہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی میں اکثر آیا ہے۔ رنگ رنگ کی روشنائیوں کا ذکر کہیں نہیں۔ ایک غریب شخص (جسے کوئی دربان، کوئی حجّام اور کوئی سپاہی کہتا ہے) کے بیٹے کو رنگ رنگ روشنائیوں کا میسّر آنا ذرا مشکوک ہے۔ آزاد نے ذوق کے خصائل میں انتہائی سادگی پر زور دیا ہے، یہ نمایش اُن کے مزاج سے میل نہیں کھاتی۔ کوئی کہہ سکتا ہے بچپن میں ایسا ہونا ممکن ہے، لیکن ہم وہاں بھی غربت کو مانع دیکھتے ہیں۔ البتہ مولانا آزاد کے جو مسوّدات ملے ہیں اُن سے یہ ضرور

ـــہ سب سے پہلا تذکرہ جس میں ذوق کا ذکر ایک نومشق کی حیثیت سے آیا ہے، مجموعۂ نغز ہے۔ انتخابِ کلام بھی دو شعر سے زیادہ نہیں۔ لیکن اُن میں نہ حمد ہے نہ نعت۔

...ذور ہوگئیں تو گھر بھی ایک سے انیک ہوگئے ورنہ اس فقرے کا کیا مطلب،" چناں چہ
بے تکلف گھروں میں جانے لگے. اب پردہ کی کیا ضرورت تھی؟" اسے کہتے ہیں ماروں گھٹنا پھوٹے
آنکھ. اگلے ہی محلے میں گھر پھر ایک ہوگیا. وہیں دن رات کا رہنا ہے. عجیب خوش اعتقاد لوگ
تھے کہ ایک شخص کی باتیں سننے کو گھڑی دو گھڑی کے لیے گھر بلاتے تھے اور پھر گھر ہی انہیں کے
حوالے کردیتے تھے. اب بھی کوئی اس افسانے کو سچ مانے تو اس کی خوش عقیدگی قابلِ رشک ہے

۶ - انشا کے احوال میں لکھا:
استاد مرحوم فرماتے تھے کہ منجملہ اور اعتراضوں کے مصحفی کی غزل میں ماہی سقنقور
کی جوی بہ تشدید پڑھی جاتی ہے سید انشا نے اس پر بھی تمسخر کیا اور شیخ مصحفی نے
یہ شعر سند میں دیا کہ ؎

ماہیم و فقیری و سیہ روئی کونین ؛ رخسارِ سفید امرا را نشناسیم

سمجھ میں نہیں آیا کہ اس تمسخر کے لیے استاد مرحوم کو زحمت دینے کی ضرورت تھی؟ (ویسے یہ
شعر آزاد کو انشا کی سرخ و سفید رنگت کی بدولت سوجھا) یہ واقعہ ۱۲۱۰ھ میں بہ مقام لکھنؤ پیش
آیا جب ذوق کی عمر صرف سات سال تھی اور وہ دلی میں تھے. ابھی مکتب بھی نہ جاتے ہوں گے
یہ صریحاً غلط ہے کہ انشا نے ماہی کی تشدید پر مصحفی کا مذاق اڑایا تھا. یہ اعتراض مرزا سلیمان شکوہ
نے کیا تھا. انشا نے تو صرف یہ کہا تھا ؏ ماہی کا ذکر کیا ہے سقنقور میں بھلا. مصحفی کا اعتراض تھا
میں لفظ سقنقور مجرد نہیں دیکھا. اور اس کا جواب خود آزاد نے آب میں دیا ہے. مرزا سلیمان
شکوہ کا معترضانہ شعر ہے؎

اور تیسرے ماہی کو جو ماہی پڑھو ہو ؛ ہاں اس پہ بلے عقل کے معذور کی گردن

آزاد نے اپنی بہم پہنچائی ہوئی سند ذوق سے منسوب کرنے کی زحمت ناحق اٹھائی. شاگردان
اور ہوا خواہانِ مصحفی پہلے ہی اس ضمن میں اسناد فراہم کرچکے تھے. ؎

عرفی نے خموشی کو خموشی کہا ہے ؛ اس سے ہے یہ ماہیِ سقنقور کی گردن

یہ اور بات ہے کہ آزاد کو عرفی کی سند پسند نہیں آئی. نیز مصحفی کے اشعار میں انھیں اس اعتراض
کا جواب نہیں ملا لہٰذا انہوں نے ایک نامعلوم شاعر کا (یا اپنا؟) شعر ذوق کے منہ میں رکھ دیا.

۷ - ذوق سے سب سے زیادہ روایتیں خود ذوق ہی کے احوال میں منسوب ہوئی ہیں. اب
انھیں کا جائزہ لیا جاتا ہے. ذوق کے آغازِ شعر گوئی سے متعلق فرماتے ہیں:

دُکھنے آئیں چند روز ضعفِ بصر کا بہانہ کر کے ظاہر کیا کہ آنکھیں معذور ہوگئیں۔
مطلب یہ تھا کہ اہلِ حُسن کے دیدار سے آنکھیں سُکھ پائیں۔ چناں چہ بے تکلف
گھروں میں جانے لگے۔ اب پردہ کی کیا ضرورت تھی ؟ یہ بھی قاعدہ ہے کہ میاں
بیوی جس مہمان کی بہت خاطر کرتے ہیں نوکر اُس سے جلنے لگتے ہیں۔ ایک دن
دوپہر کو سو کر اُٹھے۔ لونڈی سے کہا کہ بڑے آفتابے میں پانی بھر لا۔ لونڈی نہ بولی
اُنھوں نے پھر پکارا۔ اُس نے کہا بیوی جا ئے ضرور لے گئی ہیں۔ اُن کے مُنہ سے
نکل گیا غیبانی دیوانی ہوئی ہے۔ سامنے تو رکھا ہے دیتی کیوں نہیں بیوی دوسرے
دالان میں تھیں۔ لونڈی گئی اور کہا اُوئی یہ مُوا کہتا ہے کہ وہ بندہ اندھا ہے' یہ تو
خاصا اچھا ہے۔ ابھی میرے ساتھ یہ واردات گزری۔ اُس وقت یہ راز کھُلا۔ مگر
اِس میں شُبہ نہیں کہ آخر آنکھوں کو رو بیٹھے۔

اس داستان کے پہلے حصّے کے خط کشیدہ جملے آبِ حیات کی طبعِ اوّل میں نہیں تھے۔ گویا اُستاد مرحوم
نے طبعِ اوّل کے وقت تک کُچھ نہیں فرمایا تھا۔ لیکن طبعِ اوّل اور طبعِ ثانی کے درمیانی وقفے میں
اُستادِ مرحوم جنّت سے یہ قصّہ سُنانے تشریف لائے تھے۔ کہا جاسکتا ہے کہ طبعِ اوّل کے
وقت یہ واقعہ آزاد کے ذہن سے اُتر گیا تھا۔ طبعِ ثانی کے وقت یاد آگیا لہٰذا اضافہ کر دیا۔ یہ
اِمکان بعید از قیاس نہیں، اِس کے باوجود دُرست نہیں۔ حیرت اِس امر پر ہے کہ آخر گذشتہ
سو برس میں اس افسانے کی خامیوں پر نظر کیوں نہیں گئی ؟ اِسے آزاد کے دل فریب بلکہ نظر
فریب اُسلوب کا کمال کہیے ورنہ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ اس سو برس میں اہلِ نظر کا قحط رہا ہو یا اہلِ
تحقیق ایسے ہی سہل انگار واقع ہوئے ہیں کہ صریح لغویات بھی اُن کی نظر میں نہیں کھٹکتیں۔ آئیے اِس
افسانے کے چند جھولوں پر نظر ڈال لی جائے تاکہ کوئی شُبہ باقی نہ رہے۔

مولانا آزاد نے شروع میں فرمایا ہے کہ عین جوانی میں آنکھوں سے معذور ہوگئے۔ اب
افسانے کا یہ حصّہ دیکھیے: "گھر میں کوئی دادا نانا، کوئی ماموں چچا کہتا" کیا سارا گھر اندھا تھا کہ
ایک نوجوان کو دادا نانا پُکارتا تھا ؟ جب گھر میں چُٹکلے اور نقلیں سُنی تھیں تو پھر گھر میں لاکر کھانا
کھلانے سے کیا مُراد ہے ؟ (یہ بیان کا عیب ہے) پھر گھر میں کھانا کھلانے کو بُلایا تھا کہ گھر ہی
اُن کے ہاتھ رہن رکھ دیا تھا کہ مُدّتوں رہے بھی اور یگانگت کی یہ نوبت ہوئی کہ خاص خاص بیبیوں
کا برائے نام پردہ رہ گیا۔ بُلایا ایک بیگم نے تھا باقی غالباً پڑوس سے بُلوالیتی ہوں گی۔ آنکھیں

کو خبر بھی نہ ہوتی۔ خدا جانے دوسرے مصرعے کی فکر میں تھے یا مصرعہ کی کیفیت میں تھے۔

یہ واقعہ بیان کرنے کا مقصد سوائے اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ میر کو بہری یا متکبر ثابت کیا جائے؟ خدا کشیدہ حصے توجہ طلب ہیں۔ ہمارا یہ منہ نہیں کہ ہم مولانا پر لاعلمی کا حرف رکھیں۔ البتہ یہ کہنے کی جسارت ضرور کر سکتے ہیں کہ مولانا نے نادانستگی میں ذوق کو بھی لاعلم ثابت کر دیا مصرعِ مذکور صرف ایک لفظ کے فرق سے (اور یہ تصرف غالباً آزاد نے دانستہ کیا ہے) سودا کا ہے۔ جب مصرعِ میر کا ہے ہی نہیں تو دوسرے مصرعے کی فکر میں ہونے یا کیفیت میں غرق ہونے کے کیا معنی؟ آزاد نے تو یہ بھی خیال نہیں کیا کہ شروع میں انھوں نے "بہار کی آمد" لکھا ہے جب بہار کی آمد تھی تو ایسا بے محل مصرع پڑھوانا کیا ضرور تھا جس میں بہار کے گزر جانے کا بیان ہو۔ اگر افسانہ ہی سنانا تھا تو کوئی برمحل شعر انتخاب کیا ہوتا۔ یہاں یہ امر بھی غور طلب ہے کہ میر جن کا انتقال ۱۲۲۵ھ میں ہوا، اور ذوق کی عمر اُس وقت ۲۲ برس کی تھی، اس کے باوجود آزاد نے واقعہ براہِ راست ذوق سے نہیں، ایک دیرینہ سال شخص کی معرفت بیان کیا ہے جب کہ سودا جن کا انتقال ذوق کی ولادت سے پہلے ہو چکا تھا، کا واقعہ خود ذوق سے بیان کروایا ہے۔

۵۔ میاں جرأت کے حال میں بلکہ ساری کتاب میں افسوس کی بات تو یہ ہے کہ عین جوانی میں آنکھوں سے معذور ہو گئے، بعض کہتے ہیں کہ حادثہ چیچک سے ہوا تھا۔ اُستاد مرحوم نے ایک مرتبہ فرمایا کہ بھئی زمانہ کی دو آنکھیں ہیں۔ نیکی کی آنکھ نے اُن کے کمال کو بڑی قدردانی سے دیکھا۔ بدی کی آنکھ نہ دیکھ سکی اور ایک بدنما داغ اُن کے دامن پر دکھایا، مشہور کرتے ہیں کہ پہلے اصلی اندھے نہ تھے بعض ضرورتوں سے کہ شوخی عمر کا مقتضیٰ ہے خود اندھے بنے۔ رفتہ رفتہ اندھے ہی ہو گئے.......
.... ایک بیگم صاحب نے گھر میں .... اور نواب صاحب سے کہا کہ ہم اُن کے چٹکلے اور نقلیں سُنیں۔ بہت خوش ہوئیں۔ پردے یا چلمنیں چھُٹ گئیں۔ اندر بھی باتیں سُنیں گے۔ گھر میں لاکر کھانا کھلاؤ۔ پردے یا چلمنیں چھُٹ گئیں۔ اندر وہ بیٹھیں باہر یہ بیٹھے۔ چند روز کے بعد خاص خاص بیبیوں کا برائے نام پردہ رہا۔ باقی گھر والے سامنے پھرنے لگے۔ رفتہ رفتہ یگانگی کی یہ نوبت پہنچی کہ آپ بھی باتیں کرنے لگیں۔ گھر میں کوئی دادا نانا، کوئی ماموں چچا کہتا۔ شیخ صاحب کی آنکھیں

آزاد کو سودا کے قیام و مقام کا علم' مندرجہ اقتباس کی روشنی میں یہی معلوم ہوتا ہے' ذوق سے ہوا۔ اگر یہ مان لیا جائے سودا ۱۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے (جو درست نہیں) تو ذوق اُس کے ۸۷ سال بعد پیدا ہوئے۔ آزاد' ذوق کے بھی تقریباً نصف صدی بعد پیدا ہوئے۔ اگر یہ مانا جائے کہ جب آزاد ذوق کی میت میں کابلی دروازے کی طرف جا نکلتے تھے اُس وقت اُن کی اپنی عمر بیس برس تھی تو یہ زمانہ ڈیڑھ سو برس کا ہوگا۔ آخر ذوق ڈیڑھ سو برس پہلے کے واقعات اور مقامات کا ذکر کیوں کرتے تھے۔ کیا قدرتِ خدا کو یاد کرنے کے لیے؟

۳۔ کیفیت چشم اُس کی مجھے یاد ہے سودا ؛ ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں

اُستاد مرحوم کہا کرتے تھے کہ جب سودا کے سامنے کوئی یہ شعر پڑھ دیتا تھا یا اپنی زبان پر آجاتا تو وجد کیا کرتے تھے اور مزے لیتے تھے۔

سودا کا انتقال ذوق کی ولادت سے ۸ سال پہلے ہوگیا تھا۔ کیا ذوق ولادت سے پہلے عالمِ غیب سے سودا کو وجد کرتے دیکھتے تھے؟ اصلاً یہ واقعہ اس لیے تراشا گیا کہ سودا پر سرقے کا حرف رکھنے کا موقع نکالا جاسکے۔ اگرچہ انداز معترضانہ نہیں لیکن مقصد وہی ہے' ملاحظہ ہو:

اسی انداز کا ایک شعر نظیری کا یاد آگیا۔ اگرچہ فارسی میں ہے مگر جی نہیں چاہتا کہ دوستوں کو لطف سے محروم رکھوں:

بوے یار من ازیں سست وفا می آید ؛ گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم

مخلص کاشی کا شعر کیا اردو میں تھا جو بغیر معذرت پیش کیا گیا؟

۴۔ اُستاد مرحوم ایک دیرینہ سال شخص کی زبانی بیان کرتے تھے۔ ایک دن میر صاحب کے پاس گئے۔ نکلتے جاڑے تھے۔ بہار کی آمد تھی۔ دیکھا کہ ٹہل رہے ہیں۔ چہرہ پر افسردگی کا عالم ہے اور رہ رہ کر یہ مصرع پڑھتے ہیں: اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی گزر گئے۔ یہ سلام کرکے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد اُٹھے اور سلام کر کے چلے آئے۔ میر صاحب

یہ ہیں: دلّی دروازہ، راج گھاٹ دروازہ، خضری دروازہ، کلکتہ دروازہ، نگم بودھ دروازہ، کیلہ گھاٹ دروازہ، لال دروازہ، کشمیری دروازہ، بدرو دروازہ (جو اب موری دروازہ کہلاتا ہے)، کابلی دروازہ، پتھر گھٹی، لاہوری دروازہ، اجمیری دروازہ اور ترکمان دروازہ۔

گویا کابلی دروازہ موجودہ تیس ہزاری کے پیچھے موری دروازے کے آس پاس کہیں تھا۔

فصیل سے باہر تھا۔ آخری مغل عہد میں فصیل کے باہر آبادی نہیں تھی۔ شیر شاہ سوری کے زمانے میں ممکن ہے رہی ہو۔ آزاد نے ذوق کے گھر کے پاس ایک قدیمی مسجد کا ذکر بھی کیا ہے۔ مذکورہ محلِ وقوع پر ایک چھوٹی سی پُرانی مسجد اب بھی دیکھی جا سکتی ہے، لیکن یہ علاقہ سودا اور ذوق کی رہائش کا علاقہ نہیں ہو سکتا۔ آزاد کے بیانوں سے محسوس ہوتا ہے کہ کابلی دروازہ تیس ہزاری باغ کے آس پاس کہیں تھا۔ آج اس علاقے میں کابلی دروازے کا نام تک نہیں۔ سرسید کا مذکورہ دروازہ خود ان کے زمانے میں کھنڈر ہو چکا تھا۔ خود تیس ہزاری کا آج نام ہے باغ کا نشان نہیں۔ ایک ہی نام کے دو دروازوں کا وجود مشکوک ہے۔ دلّی میں کئی دروازوں کے نام آج تک موجود ہیں۔ چار دروازے تو شہر پناہ کے، اور وہی اصل دروازے ہیں۔ ممکن ہے آزاد کا مُبیّنہ کابلی دروازہ کسی بُزرگ کے مزار سے باہر کی طرف بنا ہُوا کوئی چھوٹا سا دروازہ ہو، جس طرح ترکمان دروازہ[1]

---

[1] ترکمان دروازے سے متعلق معلومات رشید حسن خاں صاحب کی فراہم کردہ ہیں۔ خطوطِ غالب میں میر مہدی مجروح کے نام ایک بلکہ دو خطوں میں کابلی دروازے کا ذکر آیا ہے، اگرچہ اُن سے محلِ وقوع ظاہر نہیں ہوتا۔ غالب نے آہنی سڑک (ریل) بچھانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک میدان ہو گیا ہے۔ یہ دونوں دروازے ہمارے علم میں نہیں۔ تاہم اندازہ ہے کہ کابلی دروازہ تیس ہزاری کے سامنے کا علاقہ ہوگا جہاں سے اب ریلوے لائن گزرتی ہے اور پُل شمالی کہلاتا ہے۔

آثار الصنادید مطبوعہ ۱۹۰۴ء سے کچھ مزید تفاصیل ہاتھ آئی ہیں، جس سے ہمارے قیاس کی ایک حد تک تصدیق ہوتی ہے نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کابلی دروازہ شیر شاہ کی دلّی میں بھی تھا جو دلّی گیٹ سے باہر جیل کے سامنے تھا اور شاہجہاں کی دلّی میں بھی۔ تفصیل اس طرح ہے:

اجمیری دروازے کے باہر غازی الدین خاں فیروز جنگ، پدر نظام الملک آصف جاہ کا مقبرہ تھا جو "مدرسہ" کہلاتا تھا۔ اس کو بھی شہر پناہ کے اندر لے لیا (اب صفدر جنگ کا مقبرہ مدرسہ کہلاتا ہے جو اجمیری دروازے سے بہت دُور صفدر جنگ ہوائی اڈّے کے پاس ہے۔ قابد) ۱۸۱۱ء مطابق ۱۲۲۶ھ اس مدرسے کے گرد بھی شہر پناہ بنائی گئی تھی۔ اس نئی شہر پناہ کے بُرج پر سنگِ مرمر پہ "بُرجِ اکبر شاہ" کھدا ہوا تھا۔ ۱۸۵۲ء میں انگریزی سرکار کے حکم سے ایک نیا دوہرا دروازہ بنایا گیا، ایک آنے کے لیے اور دوسرا جانے کے لیے۔ اس کا نام کلکتہ دروازہ رکھا گیا۔ بہرحال اُس وقت شہر پناہ میں کُل ۱۴ دروازے اور چودہ ہی کھڑکیاں تھیں۔ دروازوں کے نام بالترتیب

کی تصدیق دوسرے ذرائع سے کی جا سکتی ہے لیکن جو بات سمجھ میں نہیں آتی وہ یہ ہے کہ آزاد نے اس کے ساتھ ذوق کی روایت کو کیوں نتھی کر دیا؟ "قرابین ماری" پر آزاد حاشیہ لکھتے ہیں:

اُستاد مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ دُگاڑے کا نشان ہم نے بھی دیکھا ہے۔ کیول رام کے کوٹھے پر ڈیوڑھی کی دیوار میں اب تک موجود تھا۔

گویا ذوق کے زمانے تک موجود تھا، آزاد کے زمانے میں نہیں۔ (ویسے کیول رام بانیے کے کوٹھے کا علم آزاد کو دریائے لطافت سے ہوا) ظاہراً یہ کوئی اَن ہونی بات نہیں۔ میرزا مظہر کی شہادت ۱۱۹۵ھ کا واقعہ ہے۔ ذوق ۱۲۰۳ھ میں پیدا ہوئے۔ اگر بیس برس کے سن میں اُنھوں نے وہ نشان دیکھا ہو تو ۱۲۲۳ھ ہوا جو آزاد کی ولادت سے کم و بیش رُبع صدی پہلے کا زمانہ ہے۔ پھر اُستاد مرحوم آزاد سے کب فرماتے تھے؟ چلیے مان لیجیے کہ جب آزاد اندازاً بیس برس کے ہو گئے۔ ذرا سوچیے آخر ۴۸۔۵۰ برس کے بعد ایک لڑکے سے اُس نشان کے دیکھنے کا ذکر کس تقریب سے آیا ہوگا؟ اسے بھی فی الوقت نظر انداز کیجیے اور اس پر غور فرمائیے کہ کیا واقعی ذوق نے یہ واقعہ بیان کیا ہوگا؟ ہرگز نہیں۔ ثبوت خود آزاد کے اسی حاشیے میں موجود ہے۔ متن میں لکھا ہے "قرابین ماری"۔ اُستاد مرحوم نے "دُگاڑے" کا نشان دیکھا۔ کیا اُستاد مرحوم ایسے ہی دروغ باف تھے؟ آخر چند سال بعد (اصلاً چند سطروں کے بعد) قرابین دُگاڑے میں کیوں کر بدل گئی؟ جو لوگ آزاد کے علم و فضل سے واقف ہیں وہ یہ کہنے کی جرأت تو نہیں کر سکتے کہ مرحوم کو قرابین اور دُگاڑے کا فرق معلوم نہیں تھا۔ (قرابین چھوٹی بندوق ہوتی ہے اور دُگاڑا دو نالی بندوق کو کہتے ہیں۔) اب کس کا منہ ہے جو کہے کہ دروغ گورا حافظہ نباشد۔

۳۔ سودا ۱۱۲۵ میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں پرورش پائی۔ کابلی دروازے کے علاقہ میں اُن کا گھر تھا۔ ایک بڑے پھاٹک میں نشست رہتی تھی۔ شیخ علیہ الرحمۃ اکثر اُدھر ٹہلتے ہوئے جا نکلتے تھے۔ مرزا کے وقت کے واقعات اور حالات کا ذکر کر کے قدرتِ خدا کو یاد کرتے تھے۔

ممکن ہے دلّی میں کوئی کابلی دروازہ رہا ہو، لیکن نہ اب ہے اور نہ آزاد کے وقت میں تھا۔ (آثار الصنادید اور دو ایک دوسری کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کابلی دروازہ دلّی دروازے سے باہر سنٹرل جیل کے سامنے تھا۔ جیل کی جگہ اب مولانا آزاد میڈیکل کالج ہے۔ بہ قولِ آزاد، ذوق بھی کابلی دروازے میں رہتے تھے۔ سرسید کابلی دروازے کو شیر شاہ کی دلّی میں بتاتے ہیں اور یہ علاقہ

تعجب یہ ہے کہ اِس مضمون کو مخلص کاشی نے بھی باندھا ہے۔

در فراقِ تو چہا لے بُتِ محبوب کُنَم ؛ صبر ایوب کُنَم گریۂ یعقوب کُنَم

ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ شعر مخلص کاشی کا ہے یا نہیں، لیکن اگر ہے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے ؟ دورِ اوّل بلکہ آج تک شعرائے فارسی یا دیگر زبانوں کے شعرا دخیالات سے متاثر ہوتے رہتے ہیں اور انھیں اپنے انداز سے بیان کرتے رہتے ہیں۔ خود آزاد نے آب میں بے شمار مثالیں درج کی ہیں۔ پھر یہاں تعجب کیوں ؟ مضمون تو ابتدائی ریختہ گویوں میں تھے۔ آزاد نے ایک جگہ لکھا ہے ؎ خطائے بزرگاں گرفتن خطا است۔ عملاً انھوں نے ہر بزرگ پر حرف رکھا ہے لیکن اپنے کمالِ بیان سے محسوس نہیں ہونے دیا۔ یہاں بھی مضمون پر دہ صریحاً سرقے کا الزام وارد کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا ایک واقعہ تراشا، اُس کے پردے میں اعتراض جڑ دیا اور اپنا دامن صاف بچا گئے۔ ورنہ غور فرمائیے ایک بزرگ (ذوقؔ) اپنی ولادت سے بہت پہلے کا ایک "چشم دید" واقعہ بیان کر رہا ہے اور وہ بھی ایک ناپختہ لڑکے سے، لیکن اُس کی تقریب ؟ آخر یہ واقعہ سُنانے کی ضرورت کیوں پڑی ؟ اگر عہدِ مضمون کا کوئی بزرگ یہ واقعہ ذوقؔ سے بیان کرتا تو شاید اِس میں کچھ واقعیت پیدا ہو جاتی۔

۲ - میرزا مظہر کے حال میں لکھا ہے :

فرض ساتویں محرم کی تھی کہ رات کے وقت ایک شخص مٹھائی کی ٹوکری ہاتھ میں لیے آیا۔ دروازہ بند تھا۔ آواز دی اور ظاہر کیا کہ مُرید ہوں، نذر لے کر آیا ہوں۔ وہ باہر نکلے تو قرابین ماری کہ گولی سینے کے پار ہو گئی۔

قطع نظر اِس سے کہ یہ واقعہ اُس طرح پیش نہیں آیا جس طرح آب میں درج ہے (اصحابِ نظر اس میں کئی چٹکیاں دیکھ سکتے ہیں) تاہم میرزا مظہر کے قتل کا واقعہ پیش ضرور آیا۔ اِس

لہ نذر و نیاز کے ضمن میں میرزا مظہر کے متعلق معمولاتِ مظہریہ کا یہ بیان توجہ طلب ہے :

" نذر و نیاز کے لیے ایسی کڑی شرطیں لگا رکھی تھیں کہ مشکل ہی سے پوری ہوتی ہوں گی۔ (۱) یہ کہ پیش کرنے والا شریف و نجیب ہو۔ (۲) دُنیا داروں سے اختلاط نہ رکھتا ہو (۳) فی الجملہ صالح و پرہیزگار ہو۔ (۴) حلال و حرام میں تمیز کرنے کا علم رکھتا ہو۔ (۵) ایسے مُلک سے تازہ وارد نہ ہو جہاں لوٹ مار ہوتی ہو۔ (۶) اخلاص و عقیدت سے پیش کرتا ہو۔ (بحوالہ گلِ رعنا ص ۲۷)

سے محل میں آئے اور پلنگ پر لیٹ گئے۔ ایک بڑھیا ماما نئی نوکر ہوئی تھی وہ حقّہ بھر کر لائی اور سامنے رکھا۔ نواب صاحب کی زبان پر اُس وقت مضمون کا یہ شعر تھا:

ہم نے کیا کیا نہ ترے عشق میں محبوب کیا ⁂ صبر ایوب کیا گریۂ یعقوب کیا

ماما سُن کر بولی، الٰہی تیری امان، اِس گھر میں تو آپ ہی پیغمبری وقت پڑ رہا ہے بیچارے نوکروں پر کیا گزرے گی؟ چلو بابا یہاں سے۔

قصّہ یقیناً بہت دل چسپ ہے۔ اسی لیے اس کی خامیوں کی طرف قاری کی توجہ نہیں جاتی، لیکن ذرا غور کیجیے تو اسکے تانے بانے میں کئی تار ڈھیلے نظر آتے ہیں۔ مثلاً پہلے کوئی امیر باہر سے آئے تھے۔ دُوسرے ہی جملے میں وہ نواب ہو گئے۔ گو نوابین کے لیے امیر کا لفظ آتا ہو، پھر بھی یہاں بیان میں تضاد پیدا ہوتا ہے۔ پھر کیا مضمون کا محل کوئی جنگل کی سرائے تھی کہ کوئی رہ گیر مسافر اُدھر سے گزرے تو گھڑی کی گھڑی سستا لے۔ نوکرانی نہ ہوئی، بی بھٹیاری ہوگئیں کہ اِدھر مسافر نے سرائے میں قدم رکھا اُدھر وہ حقّہ بھر کر حاضر۔ اُسے اپنے آقا کی حیثیت کا بھی علم نہیں۔ ایک اجنبی کی زبانی شعر سُنا تو معلوم ہُوا کہ گھر پر پیغمبری وقت پڑا ہے۔ امیروں اور نوابوں کے یہاں مہمان کیا چوروں کی طرح چُپکے سے آجاتے تھے؟ نہ مالک مکان سے ملے، نہ اجازت لی۔ آئے اور لیٹ گئے، اور حقّہ بھی حاضر ہو گیا۔ اس پر بھی غور فرمایئے کہ راوی اُستاد مرحوم (ذوقؔ) ہیں جنھوں نے مضمونؔ کا زمانہ نہیں پایا۔ سوداؔ کا زمانہ بھی نہیں پایا۔ پھر واقعہ اس طرح بیان فرمایا جیسے چشم دید گواہ ہوں۔ بھلا اُستاد مرحوم نے اپنی پیدایش سے پہلے کا واقعہ کیوں کر دیکھا ہوگا؟ ہے یہ کہ آزادؔ کا زرخیز ذہن کسی شعر کے پیشِ نظر کوئی واقعہ ترتیب دے لیتا ہے اور آزادؔ اُسے اعتبار بخشنے کے لیے کسی معتبر راوی سے منسوب کر دیتے ہیں تاکہ اگر قاری کو کوئی شُبہ ہو تو وہ راوی کے مرتبے کے پیشِ نظر اعتراض کی جرأت نہ کر سکے۔ آزادؔ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ کسی نہ کسی پہلو سے ہر شاعر پر کوئی نہ کوئی اعتراض وارد کر دیتے ہیں (جسے حامد حسن قادری مرحوم نے چُٹکی لینا کہا ہے)، پیرایۂ بیان اتنا دل چسپ ہوتا ہے کہ عام قاری کو یہ گمان تک نہیں ہوتا کہ آزادؔ چُٹکی لے رہے ہیں۔ قطب الدین باطنؔ نے گلشن بے خار پر رائے دیتے ہوئے لکھا تھا "ہر ایک کو بہ بدی یاد کیا، اپنی اوقات برباد کیا"۔ عملاً آزادؔ نے بھی یہی کیا ہے لیکن بہ بدی یاد کرنے کی حقیقت قاری پر نہیں کھلتی۔ لہٰذا آزادؔ کی اوقات برباد ہونے سے بچ گئی۔ یہاں شعر مذکور پر واقعہ تراشنے کا مقصد بھی چُٹکی لینا ہے، ملاحظہ ہو:

(۱)

آبِ حیات میں آزاد نے تقریباً ایک سو پندرہ مرتبہ ذوق کا نام لیا ہے، سب سے زیادہ
خود ذوق کے احوال میں۔ ہمیں محض نام لینے سے بحث نہیں بلکہ اُن واقعات سے غرض ہے جو
ذوق سے روایت کیے گئے ہیں۔ ہمارا خیال ہے خود ذوق کے احوال کے علاوہ جہاں کہیں ذوق
سے واقعات روایت کیے گئے ہیں، وہ بعد کا اضافہ ہیں۔ خود ذوق کے حالات بھی آبِ حیات کی
طبعِ ثانی کے لیے از سرِ نو لکھے گئے تھے، اس لیے ان میں ترمیم و اضافے کا عمل ہوا ہے[۱]۔ شومیِ
قسمت سے ہماری دسترس میں نہ آبِ حیات کا مسودہ ہے اور نہ اُس کا پہلا اڈیشن۔ اِس لیے
قطعیت سے کوئی حکم لگانا شاید غلط ہو، تاہم جن واقعات کے بارے میں بہ یقین علم ہے یا جن
کے خلاف داخلی شواہد موجود ہیں، اُن کی بُنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ خود آزاد کے ذہن کی پیداوار
ہیں۔ یہی حال ذوق کو اُستاد کہنے کا بھی ہے۔ اکثر تو اُن کے نام کے ساتھ اُستاد کا لفظ اِس
لیے آیا ہے کہ وہ اُستادِ شاہ تھے اور جگت اُستاد کہلاتے تھے۔ کہیں کہیں صریحاً تلمذ کا پہلو بھی نکلتا
ہے اور یہ انگریزی محاورے کے مطابق AFTER THOUGHT ہے۔ یہ بھی کچھ کم تعجب خیز نہیں
جہاں ذوق کو اُستاد کہنا چاہیے تھا، وہاں ایسا نہیں کیا گیا۔ بہ ہرحال، آئیے پہلے کچھ بیانات کی
صحت کو تحقیق و تدقیق کی کسوٹی پر کس کر دیکھیں۔

۱۔ مضمون کے حال میں لکھا ہے :

"اُستاد مرحوم نے ایک دن فرمایا کہ شیخ مضمون کے زمانے میں کوئی امیر باہر

---

[۱] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو : محمد حسین آزاد مصنفہ ڈاکٹر اسلم فرخی، ج ۲۔

قیمت : ایک سو پچیس روپے ۱۲۵/=
اشاعت : ۱۹۸۷ء
سرورق : نفیلت
تعداد : ایک ہزار
طباعت : لکشمی پریس، نئی دہلی ۲

ناشر : ادارہ فکرِ جدید
۹۲۲۔ کوچہ روہیلا۔ تراہا بہرام
دریاگنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ZAUQ AUR MUHAMMAD HUSAIN AZAD : Literature

Dr. ABID PESHAWARI : 1987 : Rs. 125.00

IDARAH FIKRE JADEED
922, Kucha Rohella, Daryaganj,
NEW DELHI-110002

ذوق اور محمد حسین آزاد

ڈاکٹر عابد پیشاوری

ادارہ فکرِ جدید
دریا گنج نئی دہلی ۲